

کتاب کا تعارف

اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ علماء، محققین وائمہ مفسرین کی تحقیقات کے حوالہ سے قرآن وحدیث میں ذکر کئے علم کے حقیقی مصداق کو واضح کیا جائے، اس سلسلہ میں ہونے والے مغالطوں کا ازالہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مفتی ابوبکر جابر قاسمی ومفتی رفیع الدین حنیف قاسمی کو کہ علمی اور تحقیقی کاموں کا حوصلہ رکھنے والے ان نوجوان فضلاء نے اس طرف توجہ فرمائی اور کتاب وسنت کے نصوص اورائمہ تفسیر وحدیث کی تشریحات کے حوالہ سے مسئلہ کو بے غبار کر دیا، قریب ۵۶۰ صفحات پر مشتمل زیر نظر کتاب میں اس تعلق سے جو کچھ مواد اکٹھا کیا گیا ہے، اس مسئلہ سے متعلق کسی قسم کی تشنگی نہیں رہتی، کتاب میں مسلمان سائنس دانوں کی علمی خدمات پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ موجودہ دور میں یورپ جس سائنس وٹیکنالوجی پر ناز کرتا ہے، اس کے اصل بانی ہمارے اسلاف ہیں، دور حاضر میں سائنسی ترقی اور بے دینی کو لازم وملزوم سمجھ لیا گیا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دین کے تقاضوں کی پاسداری کرتے ہوئے عصری علوم میں ترقی ممکن نہیں، فاضل مؤلفین نے اس مفروضہ کو بھی غلط ثابت کیا ہے، دونوں نوجوان فضلاء تصنیف وتالیف کے میدان میں نووارد نہیں ہیں، اس سے قبل بھی ان حضرات کی کئی ایک وقیع علمی کتابیں اشاعت پذیر ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں، امید ہے کہ ان کی اس کتاب کو بھی قبول عام حاصل ہوگا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جواں سال مفتیان کرام کے علم میں مزید برکت عطاء فرمائے اور ان کے علمی کاموں کا سلسلہ اسی طرح جاری وساری رہے۔

مقدمہ کتاب: از مولانا سید احمد ومیض ندوی، استاذ حدیث وادب دارالعلوم حیدرآباد

فون: ۹۷۰۴۱۷۲۶۷۲+91

عصری علوم

مسلمان ماہرین فنون واداعات دکارنارے

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی
مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی

عصری اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کام کرنے والوں کے لئے ایک جامع کتاب



شرعی حیثیت وفضیلت
مسلمان ماہرین فنون واداعات دکارنارے



مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی
مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

ناشر

دامر الدعوة والارشاد حیدرآباد

عصری اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کام کرنے والوں کے لئے ایک جامع کتاب

عصری علوم

شرعی حیثیت و فضیلت

مسلمان ماہرین فنون، واقعات و کارنامے

عصری علوم کی فضیلت اور اس کی واقعی شرعی حیثیت، علم کا حقیقی مصداق، دوسری زبانوں کے سیکھنے کی اہمیت و ضرورت، عصری فنون میں غیروں سے مشابہت سے احتراز، حکم اقراء کا پیغام، مسلمان ماہرین فنون کے واقعات و کارناموں کا ایمان افروز تذکرہ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

پہلا ایڈیشن: ۱۴۳۶ھ = ۲۰۱۵ء

نام کتاب : عصری علوم، شرعی حیثیت و فضیلت
مصنفین : مسلمان ماہرین فنون، واقعات و کارنامے
مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی، 09885052592
مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی، فون: 09550081116
صفحات : 576
کمپوزنگ : حافظ محمد حسام الدین حنیف، فون: 07386561390
تصحیح و سیٹنگ : مفتی محمد عبداللہ سلیمان مظاہری
قباگرافکس، حیدرآباد، 097041 72672
ناشر : دار الدعوة والارشاد، حیدرآباد

ملنے کے پتے

- * مدرسہ خیر المدارس، بورا بنڈہ، حیدرآباد، فون: 040 - 23836868
- * دکن ٹریڈرس، پانی کی ٹانگی، مغلیہ پورہ، حیدرآباد، فون: 040 - 66710230
- * فضل بک ڈپو، جامع مسجد ملے پلی، حیدرآباد، فون: 9440039231 - 40 +91
- * ہندوستان پیپر ایپرو ریم، مچھلی کمان، حیدرآباد، فون: 040 - 66714341
- * ہڈی بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدرآباد، فون: 040 - 24514892
- * مکتبہ کلیمہ، یوسفین ویڈنگ مال، نامپلی، حیدرآباد

مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

ناشر

دار الدعوة والارشاد، حیدرآباد

فہرست مضامین

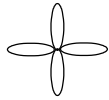
- ✽ کلماتِ تئسین (مفتی عبداللہ مظاہری) ۹
- ✽ مقدمہ (مولانا سید احمد و میض ندوی) ۱۲
- ✽ پہلی بات ۱۶
- اسلام اور سائنس**
- ✽ سائنس وسیلہ، اسلام مقصود ۲۳
- ✽ دنیا مقصود اصلی نہیں، مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے ۲۴
- ✽ قرآن کا مقصد اصلی خلافت ۲۷
- ✽ انبیائے علیہ السلام کی بعثت کا مقصد ۲۷
- ✽ تحقیق کائنات وسیلہ معرفت نہ کہ مقصد زندگی ۳۰
- ✽ تحقیق کائنات کو مقصد زندگی بنانے کے نقصانات ۳۴
- ✽ مقصود اصلی معرفت رب، خدمتِ انسانیت ۳۸
- ✽ سائنسی علوم اور علومِ الہی کی حقیقت میں ۴۱
- ✽ سائنس اور مذہب کی تعلیمات میں فرق ۴۲
- ✽ کیا سائنسی تحقیقات پر قرآن فہمی موقوف ہے؟ ۴۳
- ✽ جدید اور قدیم سائنس کا فرق ۴۸
- ✽ سائنس اور مفروضات ۴۹
- ✽ جدید سائنس کے نقصانات ۴۹
- ✽ ماحولیاتی تباہی اور سائنس و ٹیکنالوجی ۵۱
- ✽ انسان جس کو سائنس دریافت نہ کر سکی ۵۲
- ✽ سائنس صرف مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے ۵۳
- ✽ قرآن کی ہزاروں آیتیں جدید سائنس کی مخالف ہیں ۵۴
- ✽ جدید سائنس عیسائیت سے مادیت پرستی تک ۵۵
- ✽ سائنس: نیچرل فلاسفی کہلاتی تھی ۵۶
- ✽ ہندوستان کی دولت ایجادات کی باعث ۵۷
- ✽ سائنسی ترقی میں براعظموں کی لوٹ مار: مرکزی عامل ۵۸
- ✽ سائنسی تحقیقات کا مقصد: سرمایہ کس کا تھا؟ ۵۹
- ✽ انبیاء علیہ السلام کا کام، تسخیر کائنات یا تسخیر قلوب انسانی ۶۰

- ✽ انبیاء علیہ السلام انسان تیار کرتے ہیں، مشینیں نہیں ۶۲
- ✽ اللہ پر قربان ہونے میں کامیابی ۶۲
- ✽ یہ مشینوں کی ترقی ہے نہ کہ انسان کی ۶۴
- عصری تعلیم اسلامی نقطہ نظر**
- ✽ اسلام میں عصری فنون کی اہمیت ۶۷
- ✽ اقوالِ اکابر مختلف زبانوں کے سیکھنے کی اہمیت و فضیلت ۸۰
- ✽ لفظ ”علم“ کا حقیقی مصداق ۸۲
- ✽ علم کے حقیقی مصداق کے متعلق متقدمین کے کچھ اقوال ۸۴
- ✽ حقیقت علم ۹۲
- ✽ مقصدِ تعلیم ۹۴
- ✽ حکم ”اقرأ“ کا پیغام ۹۵
- ✽ ”أطلبوا العلم ولو بالصحین“ کی تحقیق ۹۷
- ✽ ڈگری کا مقصد روٹی نہیں ۱۰۰
- ✽ بندگانِ خدا کی خدمت خدا کی خدمت ہے ۱۰۲
- ✽ خدمت بھی عبادت ہے ۱۰۳
- ✽ خدمت سب کی کی جائے ۱۰۵
- ✽ خدمتِ خلق کے مختلف طریقے ۱۰۷
- ✽ صنعت و حرفت میں تعاون کی اہمیت ۱۱۰
- ✽ فنون میں غیروں سے مشابہت ناجائز ۱۱۳
- ✽ عصری علوم میں غیروں کے محتاج نہ بنیں ۱۲۲
- ✽ عالمِ اسلام میں کرنے کا پہلا کام ۱۲۷
- ✽ عصری مدارس اور عصری علم محتاج اصلاح ۱۳۳
- ✽ تعلیم اور اسلاف ۱۳۵
- ✽ زوالِ اسپین کے بعد ۱۳۶
- ✽ خلافت عثمانیہ کے زوال کے اسباب ۱۳۶
- ✽ اکابرِ دین امت کا عصری تعلیم کے تعلق سے اظہارِ خیال ۱۴۴
- ✽ لڑکیوں کے لئے عصری تعلیم ۱۵۲
- ✽ موجودہ صورتِ حال ۱۵۶
- ✽ انتظامیہ کی خدمت میں کچھ اہم گذارشات ۱۵۹
- مسلمان سائنسدانوں کے خصوصیات و امتیازات**
- ✽ (۱) تجرباتی طریقہ کار ۱۶۳
- ✽ (۲) عملی طریقہ کار ۱۶۵
- ✽ (۳) علمی امانتداری ۱۶۶
- مسلمان اطباء اور ان کے کارنامے**
- ✽ (۱) خالد بن یزید ۱۷۳
- ✽ (۲) جابر بن حیّان ۱۷۴
- ✽ (۳) ابوالحسن علی بن سہل ربن طبری ۱۷۵
- ✽ (۴) ابو حنیفہ دینوری ۱۷۶
- ✽ (۵) علی بن عباس مجوسی ۱۷۷

عصری علوم	۵	فہرست
✽ (۶) ابویوسف یعقوب بن اسحاق کندی ۱۸۰	✽ (۲۹) حکیم علی گیلانی ۲۲۶	
✽ (۷) ثابت بن قزہ جزانی ۱۸۱	✽ (۳۰) حکیم محمد ہاشم علوی خاں ۲۲۷	
✽ (۸) ابوبکر محمد زکریا رازی ۱۸۲	✽ (۳۱) حکیم محمد شریف خاں ۲۲۸	
✽ (۹) سنان بن ثابت حرانی ۱۸۹	✽ (۳۲) حکیم مومن خان ۲۲۹	
✽ (۱۰) ابن الجزار ۱۹۰	✽ (۳۳) حکیم شیر علی بن حکیم محی الدین ۲۳۰	
✽ (۱۱) ابومنصور موفق بن علی ہروی ۱۹۳	✽ (۳۴) حکیم کفایت اللہ ۲۳۱	
✽ (۱۲) غریب بن سعید اکاتب قرطبی ۱۹۵	✽ (۳۵) حکیم محمود خان دہلوی ۲۳۲	
✽ (۱۳) ابوالقاسم عمار مصلیٰ ۱۹۶	✽ (۳۶) حکیم عبدالولی بن حکیم ۲۳۳	
✽ (۱۴) ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی ۱۹۷	✽ عبدالعلی لکھنوی ۲۳۳	
✽ (۱۵) علی بن عیسیٰ ۲۰۰	✽ (۳۷) شفاء الملک حکیم حبیب ۲۳۴	
✽ (۱۶) شیخ حسین عبداللہ بن علی سینا ۲۰۲	✽ الرحمن خان آخوندزادہ ۲۳۴	
✽ (۱۷) ہبۃ اللہ ابوالبرکات بغدادی ۲۰۶	✽ (۳۸) حکیم عبدالحمید خاں ۲۳۵	
✽ (۱۸) علاء الدین ابوالحسن ابن النفیس ۲۰۸	✽ (۳۹) مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان ۲۳۶	
✽ (۱۹) لسان الدین ابن الخطیب ۲۱۱	✽ (۴۰) حکیم عبدالوہاب انصاری ۲۳۶	
✽ (۲۰) اسحاق بن عمران بغدادی ۲۱۲	✽ عرف ناپینا ۲۳۹	
✽ (۲۱) ابن واند ۲۱۴	✽ (۴۱) حکیم عبدالعزیز ۲۴۲	
✽ (۲۲) ابن زہر ۲۱۵	✽ (۴۲) ڈاکٹر مقبول علی حیدر آبادی ۲۴۴	
✽ (۲۳) صالح بن بہلہ ۲۱۸	✽ (۴۳) ڈاکٹر عبدالمنان حیدر آبادی ۲۴۴	
✽ (۲۴) ابن بيطار ۲۲۰	✽ طب میں مسلمانوں کے نمایاں ۲۴۶	
✽ (۲۵) ابن جلیجل ۲۲۱	✽ اور امتیازی کارنامے ۲۴۶	
✽ (۲۶) تہیمی ۲۲۲	✽ طب میں اطباء اسلام کے ۲۴۶	
✽ (۲۷) ابن رضوان ۲۲۳	✽ چند امتیازات ۲۴۹	
✽ (۲۸) ابن عین زرنبی ۲۲۵	✽ غیر مسلم اطباء کے ساتھ فارغ دلائل برتاؤ ۲۶۱	

عصری علوم	۶	فہرست
✽ سائنس وطب میں دنیائے اسلام	۳۶۳	✽ (۷) اسد بن فرات
✽ اور ہم عصر اقوام کا موازنہ	۲۶۵	✽ (۸) محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ
✽ دنیائے اسلام کے اطباء کا	۳۶۶	✽ (۹) اسماعیل بن علیہ
✽ ہم عصر اقوام سے ایک موازنہ	۲۶۷	✽ (۱۰) امام ابویوسف
✽ مسلمانوں کے شفا خانے	۲۶۸	✽ (۱۱) امام محمد شیبانی
چند سیاست دان، قلم کار		✽ (۱۲) سوار بن عبداللہ
اور مصلحین امت		✽ (۱۳) قاسم بن معن
✽ ڈاکٹر سید محمود	۲۹۳	مسلمان حکمرانوں اور قضاۃ کے
✽ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی	۲۹۵	دیگر عدل گستری اور صدق
✽ مسلم سائنس یورپ میں	۲۹۸	وامانت کے واقعات
مسلم قضاۃ کی عادلانہ فیصلے		✽ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ
✽ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مبنی بر عدل فیصلے	۳۱۳	✽ قاضی امیر حکم کی شہادت کو رد کرتا ہے
✽ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے	۳۲۶	✽ گورنر کے سامنے اس کا بیٹا
✽ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے قضا کے واقعات	۳۳۰	✽ کوڑے کھاتا ہے
✽ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ		✽ مجھ سے اپنا بدلہ لے لو
بحیثیت قاضی یمن	۳۳۱	✽ مظلوم کی بددعا سے بچو
✽ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ان کے		✽ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں
عدالتی فیصلے	۳۳۲	✽ مظلوم کی قدر
✽ (۱) قاضی شریح بن حارث	۳۳۲	✽ عمر بن عبدالعزیز کا مدعی
✽ (۲) کعب بن سور	۳۳۹	✽ کے ساتھ حسن برتاؤ
✽ (۳) آیاس بن معاویہ	۳۴۱	✽ رشوت کا اثر و کردار
✽ (۴) شریک بن عبداللہ النخعی	۳۵۱	✽ حجاج کے سامنے دو ٹوک جواب
✽ (۵) حفص بن غیاث	۳۵۷	✽ عدل ہی ملک ہے
✽ (۶) یحییٰ بن یعمر رضی اللہ عنہ	۳۶۲	✽ حاکم وقت کی گواہی مسترد

✽ معدنیات (Mineralogy)	۴۸۷	✽ (۱۲) ابراہیم بن سنان
✽ ۵۳۴ میں مسلمانوں کے کارنامے	۴۹۰	✽ انجینئرنگ میں مسلمانوں کے کارنامے
✽ ۵۳۷ معدنیات پر طبی تحقیق	۴۹۰	✽ (۱) احمد بن موسیٰ شاکر
✽ علم طبقات الارض میں	۴۹۱	✽ (۲) ابوطیب سند بن علی
✽ ۵۳۹ مسلمانوں کے کارنامے	۴۹۱	✽ (۳) ابو حاتم مظفر اسفرازی
✽ ۵۴۱ نباتیات	۴۹۵	✽ (۴) (ابو عباس) احمد بن محمد کثیر فرغانی
✽ علم زراعت (Agronomy)	۴۹۷	✽ عظیم مسلمان فلاسفر
✽ ۵۴۶ میں مسلمانوں کے کارنامے	۴۹۷	✽ (۱) (ابو یوسف) یعقوب بن اسحاق کندی
✽ حیوانیات (Zoology) میں	۴۹۷	✽ (۲) حکیم ابونصر محمد بن فارابی
✽ ۵۴۹ مسلمانوں کے کارنامے	۵۰۰	✽ (۳) ابن سینا
✽ علم الکیمیاء (Chemistry)	۵۰۶	✽ (۴) امام غزالی
✽ ۵۵۴ میں مسلمانوں کے کارنامے	۵۰۹	✽ (۵) ابن باجہ
✽ علم کیمیاء میں تجربہ کی اہمیت	۵۱۲	✽ (۵) ابن رشد
✽ ۵۵۷ مسلمانوں کی ایجاد	۵۱۴	✽ (۶) ابن خلدون
✽ ۵۶۲ فہرست مراجع	۵۱۷	✽ علم جغرافیہ (Geography)
✽ ۵۶۷ تعارف کتب	۵۲۳	✽ میں مسلمانوں کے کارنامے



✽ ۱۔ ابو عبد اللہ محمد بن ادریسی	۵۲۶	✽ ۲۔ ابو عبد اللہ یاقوت حموی
✽ دیگر جغرافیہ دان اور ان کے تصانیف	۵۲۸	✽ مسلمانوں کے سفر نامے
✽ ۵۳۰	۵۳۰	✽ علم جغرافیہ کی ترقی میاں مسلمانوں کا رول
✽ ۵۳۱	۵۳۱	✽ جغرافیائی ذخیرہ علم میں جہاز راں
✽ ۵۳۲	۵۳۲	✽ مسلمانوں کا حصہ

✽ غصے میں فیصلہ نہ کریں	۴۰۸	✽ ۷۔ احمد بن محمد سجستانی
✽ ایک چوکیدار کی فرض شناسی	۴۰۸	✽ ۸۔ ابوریحان محمد بن احمد بیرونی
✽ سلطان محمود کا بے مثال انصاف	۴۰۹	✽ ۹۔ ابوالفتح عمر بن خیام
✽ قاضی محمد بن بشیر کی بے باکی	۴۱۱	✽ ۱۰۔ حکیم یحییٰ بن منصور
✽ نور الدین کا اپنے امراء کے خلاف عدالتیں قائم کرنا	۴۱۱	✽ ۱۱۔ (ابو محمود) حامد بن الخضر النجندی
✽ بادشاہ کا بہنوئی قید خانے میں	۴۱۳	✽ ۱۲۔ عباس بن فرناس
✽ بادشاہ کے سامنے ایک بیوہ کی بے باکی	۴۱۳	✽ ۱۳۔ (ابو الحسنین) عبد الرحمن بن عمر
✽ بادشاہ کو کوئی گواہ نہیں مل سکا	۴۱۴	✽ ۱۴۔ (ابو عبد اللہ) محمد ابن عیسیٰ المہابانی
✽ جھوٹا مقدمہ	۴۱۵	✽ ۱۴۔ نصیر الدین الطوسی ابو جعفر
✽ رعایا کی مصلحت کے لئے بیٹے کی قربانی!	۴۱۶	✽ ۱۵۔ ویجن بن رستم الکلبی
✽ ایک بیوہ کی آزادانہ فریاد	۴۱۸	✽ علم ریاضی میں مسلمانوں کے کارنامے
✽ ایک فیصلہ	۴۲۰	✽ (۱) احمد بن عبد اللہ حبش حاسب
✽ قاضی منذر کا فیصلہ	۴۲۱	✽ (۲) حجاج بن یوسف مطر
✽ بادشاہ سکندر لودھی کا فیصلہ	۴۲۲	✽ (۳) محمد بن موسیٰ خوارزمی
✽ امیر کا بل عبد الرحمن کا فیصلہ	۴۲۴	✽ (۴) ابوالوفاء محمد بن احمد بوزجانی
		✽ (۵) ابوالحسن علی احمد نسوی

مسلم سائنسدانوں کے کارنامے

✽ علم فلکیات میں مسلمانوں کے کارنامے	۴۲۹	✽ (۶) الکاشی غیاث الدین
✽ ۱۔ ابواسحاق ابراہیم بن جندب	۴۳۴	✽ جمشید مسعود الکاشی
✽ ۲۔ عباس بن سعید الجوهری	۴۳۵	✽ (۷) احمد بن یوسف بن ابراہیم
✽ ۳۔ علی بن عیسیٰ اصطرلابی	۴۳۶	✽ (۸) ابوالعباس الفضل بن حاتم النیریری
✽ ۴۔ جابر بن سنان حرانی	۴۳۷	✽ (۹) حسن بن موسیٰ شاکر
✽ ۵۔ ابو عبد اللہ محمد بن جابر البنانی	۴۳۷	✽ (۱۰) (ابو کامل) شجاع بن اسلم
✽ ۶۔ ابوالحسن علی بن عبد الرحمن پونس صوفی	۴۴۰	✽ (۱۱) (حکیم ابو محمد) العدلی القانی

کلمات تحسین

حضرت الاستاذ جامع المنقول والمعقول مفتی عبد اللہ صاحب مظاہری دامت برکاتہم
بانی و مہتمم جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، ضلع بھروچ، گجرات

Estd. 1405 A.H. / 1985 A.D. Regd. No. B-914

دارالعلوم ہانسوٹ

DARUL ULOOM HANSOT

محترم مفتی ابوبکر مفتی رفیع الدین صاحبان زید مجدہما
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
بہر تسلیما! امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا!

ما قالہ اللہ تعالیٰ کنتم خیر امتہ اخرجت للناس - امت مسلمہ خیر امت ہے
جو لوگوں کیلئے بر پاکہ گئی ہے۔ اس امت کا امتیاز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس شان کو
ہر میدان و مجال میں قائم رکھا ہے۔ عدل و قضاء ہو کہ فلسفہ و حکمت ہو، فن طب، علاج و معالجہ ہو،
سائنس و ٹیکنالوجی ہو، فن تعمیر، ہندسہ و فن ریاضی ہو، تاریخ کے اوراق میں مسلمان ہی
رہبر و قائد و سالار نظر آتے ہیں۔ قیادت و سیادت میں آگے مسلمان ہی رہے ہیں۔
دیگر امتیں مسلمانوں کی خوشہ چیں اور رہن منت رہی ہیں۔ اس یاد ماضی کو یاد رفتگاں
کی شکل میں اس کتاب میں پیش کیا گیا..... "وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَی تَنْفَعُ
الْمُؤْمِنِیْنَ" (۲) (نصیحت کیجئے، نصیحت کرنا مومنین کے لئے نفع بخش ہوتا ہے)،
بقول علامہ اقبال:

تھے وہ آباء تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو
اسلام کسی بھی علم کے حصول کا مخالف نہیں ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:
"الحکمة ضالة المؤمن حیث وجدھا فهو احق بہا" (۳) بس اسلام حدود
و قیود متعین کرتا ہے، جو ضروری ہے۔

"عصری علوم - شرعی حیثیت و فضیلت، مسلمان ماہرین فنون و واقعات و کار
نامے" یہ کتاب نوجوانان اسلام کے لئے عبرت و سبق بھی ہے، فخر و شکر بھی ہے
اور بننے بنانے کا نسخہ بھی ہے، احساس عمل پیدا ہو جائے، غیرت و حمیت کے ساتھ
نوجوانان اسلام اپنا مستقبل روشن کرنے کے لئے کمر کس لیں تو کام بنے۔

۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱-۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۵-۱۴۶-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷-۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۳۳-۴۳۴-۴۳۵-۴۳۶-۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۵۹-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۷۲-۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۳-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۴-۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸-۵۵۹-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۳-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۵۸۵-۵۸۶-۵۸۷-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۵۹۳-۵۹۴-۵۹۵-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷-۶۰۸-۶۰۹-۶۱۰-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۷-۶۱۸-۶۱۹-۶۲۰-۶۲۱-۶۲۲-۶۲۳-۶۲۴-۶۲۵-۶۲۶-۶۲۷-۶۲۸-۶۲۹-۶۳۰-۶۳۱-۶۳۲-۶۳۳-۶۳۴-۶۳۵-۶۳۶-۶۳۷-۶۳۸-۶۳۹-۶۴۰-۶۴۱-۶۴۲-۶۴۳-۶۴۴-۶۴۵-۶۴۶-۶۴۷-۶۴۸-۶۴۹-۶۵۰-۶۵۱-۶۵۲-۶۵۳-۶۵۴-۶۵۵-۶۵۶-۶۵۷-۶۵۸-۶۵۹-۶۶۰-۶۶۱-۶۶۲-۶۶۳-۶۶۴-۶۶۵-۶۶۶-۶۶۷-۶۶۸-۶۶۹-۶۷۰-۶۷۱-۶۷۲-۶۷۳-۶۷۴-۶۷۵-۶۷۶-۶۷۷-۶۷۸-۶۷۹-۶۸۰-۶۸۱-۶۸۲-۶۸۳-۶۸۴-۶۸۵-۶۸۶-۶۸۷-۶۸۸-۶۸۹-۶۹۰-۶۹۱-۶۹۲-۶۹۳-۶۹۴-۶۹۵-۶۹۶-۶۹۷-۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰-۷۰۱-۷۰۲-۷۰۳-۷۰۴-۷۰۵-۷۰۶-۷۰۷-۷۰۸-۷۰۹-۷۱۰-۷۱۱-۷۱۲-۷۱۳-۷۱۴-۷۱۵-۷۱۶-۷۱۷-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۱-۷۲۲-۷۲۳-۷۲۴-۷۲۵-۷۲۶-۷۲۷-۷۲۸-۷۲۹-۷۳۰-۷۳۱-۷۳۲-۷۳۳-۷۳۴-۷۳۵-۷۳۶-۷۳۷-۷۳۸-۷۳۹-۷۴۰-۷۴۱-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۴-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۷-۷۴۸-۷۴۹-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۲-۷۵۳-۷۵۴-۷۵۵-۷۵۶-۷۵۷-۷۵۸-۷۵۹-۷۶۰-۷۶۱-۷۶۲-۷۶۳-۷۶۴-۷۶۵-۷۶۶-۷۶۷-۷۶۸-۷۶۹-۷۷۰-۷۷۱-۷۷۲-۷۷۳-۷۷۴-۷۷۵-۷۷۶-۷۷۷-۷۷۸-۷۷۹-۷۸۰-۷۸۱-۷۸۲-۷۸۳-۷۸۴-۷۸۵-۷۸۶-۷۸۷-۷۸۸-۷۸۹-۷۹۰-۷۹۱-۷۹۲-۷۹۳-۷۹۴-۷۹۵-۷۹۶-۷۹۷-۷۹۸-۷۹۹-۸۰۰-۸۰۱-۸۰۲-۸۰۳-۸۰۴-۸۰۵-۸۰۶-۸۰۷-۸۰۸-۸۰۹-۸۱۰-۸۱۱-۸۱۲-۸۱۳-۸۱۴-۸۱۵-۸۱۶-۸۱۷-۸۱۸-۸۱۹-۸۲۰-۸۲۱-۸۲۲-۸۲۳-۸۲۴-۸۲۵-۸۲۶-۸۲۷-۸۲۸-۸۲۹-۸۳۰-۸۳۱-۸۳۲-۸۳۳-۸۳۴-۸۳۵-۸۳۶-۸۳۷-۸۳۸-۸۳۹-۸۴۰-۸۴۱-۸۴۲-۸۴۳-۸۴۴-۸۴۵-۸۴۶-۸۴۷-۸۴۸-۸۴۹-۸۵۰-۸۵۱-۸۵۲-۸۵۳-۸۵۴-۸۵۵-۸۵۶-۸۵۷-۸۵۸-۸۵۹-۸۶۰-۸۶۱-۸۶۲-۸۶۳-۸۶۴-۸۶۵-۸۶۶-۸۶۷-۸۶۸-۸۶۹-۸۷۰-۸۷۱-۸۷۲-۸۷۳-۸۷۴-۸۷۵-۸۷۶-۸۷۷-۸۷۸-۸۷۹-۸۸۰-۸۸۱-۸۸۲-۸۸۳-۸۸۴-۸۸۵-۸۸۶-۸۸۷-۸۸۸-۸۸۹-۸۹۰-۸۹۱-۸۹۲-۸۹۳-۸۹۴-۸۹۵-۸۹۶-۸۹۷-۸۹۸-۸۹۹-۹۰۰-۹۰۱-۹۰۲-۹۰۳-۹۰۴-۹۰۵-۹۰۶-۹۰۷-۹۰۸-۹۰۹-۹۱۰-۹۱۱-۹۱۲-۹۱۳-۹۱۴-۹۱۵-۹۱۶-۹۱۷-۹۱۸-۹۱۹-۹۲۰-۹۲۱-۹۲۲-۹۲۳-۹۲۴-۹۲۵-۹۲۶-۹۲۷-۹۲۸-۹۲۹-۹۳۰-۹۳۱-۹۳۲-۹۳۳-۹۳۴-۹۳۵-۹۳۶-۹۳۷-۹۳۸-۹۳۹-۹۴۰-۹۴۱-۹۴۲-۹۴۳-۹۴۴-۹۴۵-۹۴۶-۹۴۷-۹۴۸-۹۴۹-۹۵۰-۹۵۱-۹۵۲-۹۵۳-۹۵۴-۹۵۵-۹۵۶-۹۵۷-۹۵۸-۹۵۹-۹۶۰-۹۶۱-۹۶۲-۹۶۳-۹۶۴-۹۶۵-۹۶۶-۹۶۷-۹۶۸-۹۶۹-۹۷۰-۹۷۱-۹۷۲-۹۷۳-۹۷۴-۹۷۵-۹۷۶-۹۷۷-۹۷۸-۹۷۹-۹۸۰-۹۸۱-۹۸۲-۹۸۳-۹۸۴-۹۸۵-۹۸۶-۹۸۷-۹۸۸-۹۸۹-۹۹۰-۹۹۱-۹۹۲-۹۹۳-۹۹۴-۹۹۵-۹۹۶-۹۹۷-۹۹۸-۹۹۹-۱۰۰۰-۱۰۰۱-۱۰۰۲-۱۰۰۳-۱۰۰۴-۱۰۰۵-۱۰۰۶-۱۰۰۷-۱۰۰۸-۱۰۰۹-۱۰۱۰-۱۰۱۱-۱۰۱۲-۱۰۱۳-۱۰۱۴-۱۰۱۵-۱۰۱۶-۱۰۱۷-۱۰۱۸-۱۰۱۹-۱۰۲۰-۱۰۲۱-۱۰۲۲-۱۰۲۳-۱۰۲۴-۱۰۲۵-۱۰۲۶-۱۰۲۷-۱۰۲۸-۱۰۲۹-۱۰۳۰-۱۰۳۱-۱۰۳۲-۱۰۳۳-۱۰۳۴-۱۰۳۵-۱۰۳۶-۱۰۳۷-۱۰۳۸-۱۰۳۹-۱۰۴۰-۱۰۴۱-۱۰۴۲-۱۰۴۳-۱۰۴۴-۱۰۴۵-۱۰۴۶-۱۰۴۷-۱۰۴۸-۱۰۴۹-۱۰۵۰-۱۰۵۱-۱۰۵۲-۱۰۵۳-۱۰۵۴-۱۰۵۵-۱۰۵۶-۱۰۵۷-۱۰۵۸-۱۰۵۹-۱۰۶۰-۱۰۶۱-۱۰۶۲-۱۰۶۳-۱۰۶۴-۱۰۶۵-۱۰۶۶-۱۰۶۷-۱۰۶۸-۱۰۶۹-۱۰۷۰-۱۰۷۱-۱۰۷۲-۱۰۷۳-۱۰۷۴-۱۰۷۵-۱۰۷۶-۱۰۷۷-۱۰۷۸-۱۰۷۹-۱۰۸۰-۱۰۸۱-۱۰۸۲-۱۰۸۳-۱۰۸۴-۱۰۸۵-۱۰۸۶-۱۰۸۷-۱۰۸۸-۱۰۸۹-۱۰۹۰-۱۰۹۱-۱۰۹۲-۱۰۹۳-۱۰۹۴-۱۰۹۵-۱۰۹۶-۱۰۹۷-۱۰۹۸-۱۰۹۹-۱۱۰۰-۱۱۰۱-۱۱۰۲-۱۱۰۳-۱۱۰۴-۱۱۰۵-۱۱۰۶-۱۱۰۷-۱۱۰۸-۱۱۰۹-۱۱۱۰-۱۱۱۱-۱۱۱۲-۱۱۱۳-۱۱۱۴-۱۱۱۵-۱۱۱۶-۱۱۱۷-۱۱۱۸-۱۱۱۹-۱۱۲۰-۱۱۲۱-۱۱۲۲-۱۱۲۳-۱۱۲۴-۱۱۲۵-۱۱۲۶-۱۱۲۷-۱۱۲۸-۱۱۲۹-۱۱۳۰-۱۱۳۱-۱۱۳۲-۱۱۳۳-۱۱۳۴-۱۱۳۵-۱۱۳۶-۱۱۳۷-۱۱۳۸-۱۱۳۹-۱۱۴۰-۱۱۴۱-۱۱۴۲-۱۱۴۳-۱۱۴۴-۱۱۴۵-۱۱۴۶-۱۱۴۷-۱۱۴۸-۱۱۴۹-۱۱۵۰-۱۱۵۱-۱۱۵۲-۱۱۵۳-۱۱۵۴-۱۱۵۵-۱۱۵۶-۱۱۵۷-۱۱۵۸-۱۱۵۹-۱۱۶۰-۱۱۶۱-۱۱۶۲-۱۱۶۳-۱۱۶۴-۱۱۶۵-۱۱۶۶-۱۱۶۷-۱۱۶۸-۱۱۶۹-۱۱۷۰-۱۱۷۱-۱۱۷۲-۱۱۷۳-۱۱۷۴-۱۱۷۵-۱۱۷۶-۱۱۷۷-۱۱۷۸-۱۱۷۹-۱۱۸۰-۱۱۸۱-۱۱۸۲-۱۱۸۳-۱۱۸۴-۱۱۸۵-۱۱۸۶-۱۱۸۷-۱۱۸۸-۱۱۸۹-۱۱۹۰-۱۱۹۱-۱۱۹۲-۱۱۹۳-۱۱۹۴-۱۱۹۵-۱۱۹۶-۱۱۹۷-۱۱۹۸-۱۱۹۹-۱۲۰۰-۱۲۰۱-۱۲۰۲-۱۲۰۳-۱۲۰۴-۱۲۰۵-۱۲۰۶-۱۲۰۷-۱۲۰۸-۱۲۰۹-۱۲۱۰-۱۲۱۱-۱۲۱۲-۱۲۱۳-۱۲۱۴-۱۲۱۵-۱۲۱۶-۱۲۱۷-۱۲۱۸-۱۲۱۹-۱۲۲۰-۱۲۲۱-۱۲۲۲-۱۲۲۳-۱۲۲۴-۱۲۲۵-۱۲۲۶-۱۲۲۷-۱۲۲۸-۱۲۲۹-۱۲۳۰-۱۲۳۱-۱۲۳۲-۱۲۳۳-۱۲۳۴-۱۲۳۵-۱۲۳۶-۱۲۳۷-۱۲۳۸-۱۲۳۹-۱۲۴۰-۱۲۴۱-۱۲۴۲-۱۲۴۳-۱۲۴۴-۱۲۴۵-۱۲۴۶-۱۲۴۷-۱۲۴۸-۱۲۴۹-۱۲۵۰-۱۲۵۱-۱۲۵۲-۱۲۵۳-۱۲۵۴-۱۲۵۵-۱۲۵۶-۱۲۵۷-۱۲۵۸-۱۲۵۹-۱۲۶۰-۱۲۶۱-۱۲۶۲-۱۲۶۳-۱۲۶۴-۱۲۶۵-۱۲۶۶-۱۲۶۷-۱۲۶۸-۱۲۶۹-۱۲۷۰-۱۲۷۱-۱۲۷۲-۱۲۷۳-۱۲۷۴-۱۲۷۵-۱۲۷۶-۱۲۷۷-۱۲۷۸-۱۲۷۹-۱۲۸۰-۱۲۸۱-۱۲۸۲-۱۲۸۳-۱۲۸۴-۱۲۸۵-۱۲۸۶-۱۲۸۷-۱۲۸۸-۱۲۸۹-۱۲۹۰-۱۲۹۱-۱۲۹۲-۱۲۹۳-۱۲۹۴-۱۲۹۵-۱۲۹۶-۱۲۹۷-۱۲۹۸-۱۲۹۹-۱۳۰۰-۱۳۰۱-۱۳۰۲-۱۳۰۳-۱۳۰۴-۱۳۰۵-۱۳۰۶-۱۳۰۷-۱۳۰۸-۱۳۰۹-۱۳۱۰-۱۳۱۱-۱۳۱۲-۱۳۱۳-۱۳۱۴-۱۳۱۵-۱۳۱۶-۱۳۱۷-۱۳۱۸-۱۳۱۹-۱۳۲۰-۱۳۲۱-۱۳۲۲-۱۳۲۳-۱۳۲۴-۱۳۲۵-۱۳۲۶-۱۳۲۷-۱۳۲۸-۱۳۲۹-۱۳۳۰-۱۳۳۱-۱۳۳۲-۱۳۳۳-۱۳۳۴-۱۳۳۵-۱۳۳۶-۱۳۳۷-۱۳۳۸-۱۳۳۹-۱۳۴۰-۱۳۴۱-۱۳۴۲-۱۳۴۳-۱۳۴۴-۱۳۴۵-۱۳۴۶-۱۳۴۷-۱۳۴۸-۱۳۴۹-۱۳۵۰-۱۳۵۱-۱۳۵۲-۱۳۵۳-۱۳۵۴-۱۳۵۵-۱۳۵۶-۱۳۵۷-۱۳۵۸-۱۳۵۹-۱۳۶۰-۱۳۶۱-۱۳۶۲-۱۳۶۳-۱۳۶۴-۱۳۶۵-۱۳۶۶-۱۳۶۷-۱۳۶۸-۱۳۶۹-۱۳۷۰-۱۳۷۱-۱۳۷۲-۱۳۷۳-۱۳۷۴-۱۳۷۵-۱۳۷۶-۱۳۷۷-۱۳۷۸-۱۳۷۹-۱۳۸۰-۱۳۸۱-۱۳۸۲-۱۳۸۳-۱۳۸۴-۱۳۸۵-۱۳۸۶-۱۳۸۷-۱۳۸۸-۱۳۸۹-۱۳۹۰-۱۳۹۱-۱۳۹۲-۱۳۹۳-۱۳۹۴-۱۳۹۵-۱۳۹۶-۱۳۹۷-۱۳۹۸-۱۳۹۹-۱۴۰۰-۱۴۰۱-۱۴۰۲-۱۴۰۳-۱۴۰۴-۱۴۰۵-۱۴۰۶-۱۴۰۷-۱۴۰۸-۱۴۰۹-۱۴۱۰-۱۴۱۱-۱۴۱۲-۱۴۱۳-۱۴۱۴-۱۴۱۵-۱۴۱۶-۱۴۱۷-۱۴۱۸-۱۴۱۹-۱۴۲۰-۱۴۲۱-۱۴۲۲-۱۴۲۳-۱۴۲۴-۱۴۲۵-۱۴۲۶-۱۴۲۷-۱۴۲۸-۱۴۲۹-۱۴۳۰-۱۴۳۱-۱۴۳۲-۱۴۳۳-۱۴۳۴-۱۴۳۵-۱۴۳۶-۱۴۳۷-۱۴۳۸-۱۴۳۹-۱۴۴۰-۱۴۴۱-۱۴۴۲-۱۴۴۳-۱۴۴۴-۱۴۴۵-۱۴۴۶-۱۴۴۷-۱۴۴۸-۱۴۴۹-۱۴۵۰-۱۴۵۱-۱۴۵۲-۱۴۵۳-۱۴۵۴-۱۴۵۵-۱۴۵۶-۱۴۵۷-۱۴۵۸-۱۴۵۹-۱۴۶۰-۱۴۶۱-۱۴۶۲-۱۴۶۳-۱۴۶۴-۱۴۶۵-۱۴۶۶-۱۴۶۷-۱۴۶۸-۱۴۶۹-۱۴۷۰-۱۴۷۱-۱۴۷۲-۱۴۷۳-۱۴۷۴-۱۴۷۵-۱۴۷۶-۱۴۷۷-۱۴۷۸-۱۴۷۹-۱۴۸۰-۱۴۸۱-۱۴۸۲-۱۴۸۳-۱۴۸۴-۱۴۸۵-۱۴۸۶-۱۴۸۷-۱۴۸۸-۱۴۸۹-۱۴۹۰-۱۴۹۱-۱۴۹۲-۱۴۹۳-۱۴۹۴-۱۴۹۵-۱۴۹۶-۱۴۹۷-۱۴۹۸-۱۴۹۹-۱۵۰۰-۱۵۰۱-۱۵۰۲-۱۵۰۳-۱۵۰۴-۱۵۰۵-۱۵۰۶-۱۵۰۷-۱۵۰۸-۱۵۰۹-۱۵۱۰-۱۵۱۱-۱۵۱۲-۱۵۱۳-۱۵۱۴-۱۵۱۵-۱۵۱۶-۱۵۱۷-۱۵۱۸-۱۵۱۹-۱۵۲۰-۱۵۲۱-۱۵۲۲-۱۵۲۳-۱۵۲۴-۱۵۲۵-۱۵۲۶-۱۵۲۷-۱۵۲۸-۱۵۲۹-۱

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
اللہ تعالیٰ کتاب کو مقبولیت عطا فرمائے۔ مرتبین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

۲۲ / جمادی الاولیٰ / ۱۴۳۵ھ، پیر (مفتی) عبداللہ المظاہری

مقدمہ

حضرت مولانا سید احمد و میض ندوی صاحب دامت برکاتہم
استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد

دور حاضر میں عصری تعلیم کی ضرورت و افادیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، صنعت و حرفت اور اقتصاد و معیشت میں ترقی عصری تعلیم کے بغیر ممکن نہیں، نیز مختلف عصری میدانوں میں باصلاحیت افراد کی فراہمی بھی اس کے بغیر ممکن نہیں، موجودہ سائنس و ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کے دور میں عصری تعلیم سے دوری نے مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں غیروں کا دست نگر بنا کر رکھ دیا ہے، ملت اسلامیہ کو قابل اور باصلاحیت ڈاکٹروں کی ضرورت ہے اور قانون کے ماہر و کلاء کی بھی، تعلیمی میدان میں کام کرنے کے لئے مسلمان ماہرین تعلیم درکار ہیں اور مختلف علوم و فنون میں پیشہ وارانہ صلاحیت کے حامل عظیم اسکا لربھی، امت مسلمہ اپنی ہمہ جہت ترقی کے لئے ماہرین معاشیات کی بھی محتاج ہے اور سائنس و ٹکنالوجی پر عبور رکھنے والے افراد کی بھی، الغرض امت مسلمہ کے لئے عصری علوم کی ضرورت ایک مسلم حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں اور علماء امت نے مسلمانوں کو عصری علوم کی تحصیل سے بھی منع نہیں کیا اور نہ انہیں شجر ممنوعہ قرار دیا؛ البتہ عصری علوم کے ساتھ آنے والے الحاد و بے دینی اور مخلوط نظام تعلیم کے اثرات بد سے ضرور آگاہ کیا ہے۔

گذشتہ نصف صدی کے عرصہ میں امت مسلمہ میں عصری تعلیم کے تعلق سے جو غیر معمولی شعور بیدار ہوا ہے، اس سے انکار ممکن نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ عصری تعلیم

اور مغربی ثقافت کے تعلق سے مرعوبانہ ذہنیت میں بھی اضافہ ہوا ہے، عصری علوم سے مرعوبیت کے جہاں اور اثرات مرتب ہوتے ہیں وہیں ایک اثر یہ ہوا کہ قرآن وحدیث میں جہاں کہیں علم اور اہل علم کی فضیلت وارد ہوئی ہے، عصری تعلیم کو اس کا مصداق قرار دیا جانے لگا اور تمام آیتوں کو جو خدا کی معرفت تک پہنچانے والے حقیقی علم کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں عصری علوم پر منطبق کیا جانے لگا، اسکولوں اور عصری تعلیم گاہوں کے پروگراموں میں فضیلتِ علم پر دلالت کرنے والی آیتیں دھڑلے سے پڑھی جان لگیں اور اس بے باکی سے ان کا استعمال ہونے لگا گویا وہ آیات اس کے خاطر نازل ہوئی ہیں، قرآن وحدیث عصری علوم کے مخالف نہیں ہیں؛ لیکن آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کی من مانی تشریح یا انہیں ان کے حد درجہ مرعوب اس قسم کی من مانی تشریحات پر اصرار کی حد تک زور دیتا ہے، یہ طبقہ جب علماء کرام سے متبادلہ خیال کرتا ہے تو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ علماء نے عصری تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے والی آیات کا مطلب سرے سے سمجھا ہی نہیں، اس طبقہ کے افراد اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے بالعموم آیات قرآنیہ کو ان کے سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں مثلاً خواندگی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی وحی کا آغاز ”اقراء“ سے ہوا؛ لیکن آیت کے آگے ٹکڑے ”یا نسیم ربّک الذی خلق“ کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مطلق علم قابل ستائش نہیں؛ بلکہ وہ علم لائق حوصلہ افزائی ہے جو رب کے نام کے ساتھ مربوط ہو، قرآن وحدیث میں علم نافع کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، نبی رحمت ﷺ کی منجملہ دعاؤں میں ایک دعا یوں ہے ”اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا“ (۱) اے اللہ! میں آپ سے علم نافع مانگتا ہوں، آپ نے ”غیر نافع“ علم سے پناہ مانگی ہے، چنانچہ آپ ﷺ پوری دعا یوں فرماتے ”اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ“ (۲)

(۱) سنن ابن ماجہ: باب ما یقال بعد التسلیم، حدیث: ۹۲۵، علامہ بیہقی فرماتے ہیں: اس کو طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن درجے کی ہے۔

(۲) سنن ابن ماجہ: باب الانتفاع بالعلم والعمل بہ، حدیث: ۵۲۰، اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں یونس بن خباب ضعیف ہیں۔

میں ایسے علم سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ پہنچاتا ہو، انسانیت کے لئے حقیقی معنی میں وہی علم نافع ہو سکتا ہے جس کے ساتھ رب کا نام جڑا ہوا ہو، ورنہ نرا علم جو وحی الہی کی روشنی سے محروم ہو انسانیت کے لئے تباہی کے سوا کچھ نہیں، مغربی ممالک نے وحی الہی کی روشنی سے محروم ہو کر انسانیت کی تباہی کے سوا کچھ نہیں کیا، مغربی ممالک نے وحی الہی سے بے نیاز ہو کر علم میں ترقی کی تو آخر ان کے علوم نے پوری انسانیت کے لئے ایسے تباہ کن ہتھیاروں کی سوغات پیش کر دی جو لحوں میں ساری دنیا کو تھس تھس کر کے رکھ دیتے ہیں، قرآن مجید ان اصحاب علم کی دھجیاں بکھیرتا ہے جن کے علم کا مقصد محض چند روزہ دنیوی زندگی ہو، ارشادِ باری ہے:

”فَاعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۚ
ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ“ (۱)

”آپ ان پر توجہ نہ دیں جو ہماری یاد سے منہ پھیرتے ہیں اور بس دنیوی زندگی کی چاہت میں لگے ہوئے ہیں، یہی ان کے علم کی رسائی ہے“

جو علم انسان کو صرف چند روزہ دنیا میں جینے کے اسباب کی رہنمائی کرتا ہے، قرآن اسے ظاہری علم سے تعبیر کرتا ہے، ارشاد ہے: ”وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ“ (۲) لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں، یہ بس دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو جانتے ہیں، قرآن حقیقی اہل علم ان لوگوں کو قرار دیتا ہے جن کا دل خشیتِ الہی سے معمور ہوتے ہیں، ارشاد ہے: ”اِنَّمَّا یُخْشِی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ“ (۳) اللہ سے اس کے بندوں میں سے اہل علم ہی ڈرتے ہیں، یہ آیت واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ اسلام کا مطلوب علم وہ ہے جو انسان کے قلب میں خشیتِ الہی اور خوفِ خداوندی پیدا کر دے، قرآنی نقطہ نظر سے علم کی بنیاد اور اس کا محور اللہ رب العزت کی ذات ہے، چنانچہ قرآن صاف اعلان کرتا ہے ”فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ (۴) اس علم کو دل میں

(۲) الروم: ۶-۷

(۳) محمد: ۱۹

(۱) النجم: ۲۹-۳۰

(۴) الفاطر: ۲۸

بٹھا لو کہ اللہ کے علاوہ کوئی لائق عبادت نہیں۔

اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ علماء، محققین و ائمہ مفسرین کی تحقیقات کے حوالہ سے قرآن و حدیث میں ذکر کئے علم کے حقیقی مصداق کو واضح کیا جائے، اس سلسلہ میں ہونے والے مغالطوں کا ازالہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مفتی ابوبکر جابر قاسمی و مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی کو کہ علمی اور تحقیقی کاموں کا حوصلہ رکھنے والے ان نوجوان فضلاء نے اس طرف توجہ فرمائی اور کتاب و سنت کے نصوص اور ائمہ تفسیر و حدیث کی تشریحات کے حوالہ سے مسئلہ کو بے غبار کر دیا، قریب ۵۲۵ صفحات پر مشتمل زیر نظر کتاب میں اس تعلق سے جو کچھ مواد اکٹھا کیا گیا ہے، اس مسئلہ سے متعلق کسی قسم کی تشکیک نہیں رہتی، کتاب میں مسلمان سائنس دانوں کی علمی خدمات پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ موجودہ دور میں یورپ جس سائنس و ٹیکنالوجی پر ناز کرتا ہے، اس کے اصل بانی ہمارے اسلاف ہیں، دورِ حاضر میں سائنسی ترقی اور بے دینی کو لازم و ملزوم سمجھ لیا گیا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دین کے تقاضوں کی پاسداری کرتے ہوئے عصری علوم میں ترقی ممکن نہیں، فاضل مؤلفین نے اس مفروضہ کو بھی غلط ثابت کیا ہے، دونوں نوجوان فضلاء تصنیف و تالیف کے میدان میں نوازد نہیں ہیں، اس سے قبل بھی ان حضرات کی کئی ایک وقیع علمی کتابیں اشاعت پذیر ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں، امید ہے کہ ان کی اس کتاب کو بھی قبول عام حاصل ہوگا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جوں سال مفتیان کرام کے علم میں مزید برکت عطاء فرمائے اور ان کے علمی کاموں کا سلسلہ اسی طرح جاری و ساری رہے۔ آمین یا ربّ العالمین۔

۲۹/ربیع الاول/۱۴۳۵ھ

۲۰/۱/۲۰۱۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم



موجودہ زمانہ میں امتِ مسلمہ کی اٹھانوے فیصد نسل کالجوں اور اسکولوں میں زیر تعلیم ہے؛ ظاہر ہے کہ ہمیں اپنے اسکول قائم کرنا چاہئے اور کر رہے ہیں؛ لیکن یہ کام بہت زیادہ حساس اور نزاکت کا حامل ہے، ایک طرف یہ تقاضا ہوتا ہے کہ عصری تعلیم معیاری ہو، دوسری طرف تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ حدودِ شریعت کی پامالی نہ ہو اور مغربی نظام تعلیم اور اسلام مخالف عقائد و نظریات کے جراثیم منتقل نہ ہونے پائیں، یہی وجہ ہے کہ اسکولی میدان میں بہت کم لوگ ہیں جو اس سلسلہ میں کامیاب ہیں، یہ معنوی تحریف ہوتی جا رہی ہے کہ علمِ الہی، علم قرآن و حدیث کے معانی کو عصری فنون پر چسپاں کیا جا رہا ہے اور خود عصری علوم سے متعلق شرعی فضائل، فقہی مقام بتلانے والا مواد اوجھل ہوتا جا رہا ہے، اسکول و کالجس کے منتظمین اور بعض جگہوں پر اس کے سرپرست علماء کرام کو یاد دہانی کی ضرورت ہے کہ نصاب و نظام میں کہاں کہاں احکام شریعت کو ذبح کیا جا رہا ہے، ایسے طریقہ کار اور حل کو تلاش کر لیا جائے جس سے معیار تعلیم بھی باقی رہے اور ادمرا الہی بھی نہ ٹوٹیں، اس سلسلہ میں جو تجربات عالمی سطح پر ہوئے ہیں اس سے انہیں آگہی ہو، ورنہ دیکھا گیا کہ ہر آدمی اپنے اسکول کو از سر نو تختہ مشق بنا رہا ہے۔

۱۔ نظام اسلامی کے ساتھ نصاب کو بدل دیا جائے اور دین و دنیا کے علم کی تعریف ختم کر دی جائے ”وحدت علم“ اولین دور کی طرح عالم اور وکیل، عالم اور ڈاکٹر، عالم اور سرکاری ملازم پیدا کئے جائیں۔

۲۔ نصاب تعلیم تو مروجہ ہو یا اس کو بتدریج اسلامی مزاج کے ساتھ تدوین کیا جائے؛

لیکن خالص عصری فنون سائنس، انگلش، جغرافیہ، ریاضی کے ساتھ دینیات کی تعلیم بھی نصاب کا لازمی حصہ بنایا جائے، البتہ ماحول نہایت دینی ہو۔

۳۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے بچوں کے لئے دینی اقامت گاہوں کو قائم کیا جائے، ایسے ہاسٹل تعمیر کئے جائیں یا کرایہ پر لئے جائیں، جہاں کوئی مری عالم دین ان طلبہ کا نگران ہو۔

مسلمانوں کی ترقی کا اصل راز ایمان و عمل ہے؛ لیکن مادی فنون سے انہوں نے صرف نظر نہیں کیا، اس کے بعد ایمانی صفات بھی مضحک ہو گئے، پھر سائنس و ٹکنالوجی کی طرف سے توجہ ہٹ گئی، مغرب نے سیاست و تعلیم، معاشیات و تمدن پر بالادستی حاصل کر لی، یہ انقلاب خیر سے شر کی طرف تھا، اس سے انکار نہیں کہ ان کی ترقیات حیران کن، مخیر العقول ہیں، مسلمان سائنسدان، اطباء، قاضی جتنے خدا ترس، انسانیت نواز، بااخلاق تھے، اتنے ہی مغربی اقوام خُدا نافرست، معذہ پرست، خود غرض ہیں، آج ہمارے نوجوان کو یہ مسلم اطباء، قاضیوں کی صفات اور بلند کردار کو جاننے کے ساتھ موجودہ مغربی نظریات کی ہر اعتبار سے تباہ کن ہونا سمجھنا ضروری ہے، ان ہی سب عناوین پر بڑی عرق ریزی سے مواد جمع کیا گیا ہے۔

۲۰۰۴ء میں باقاعدہ طور پر دعوت و تبلیغ سے وابستگی ہوئی اور اکابر کے حکم سے آبائی ضلع نظام آباد چھوڑ کر حیدرآباد کا قیام طے ہوا، تبلیغ و تعلیم کے پلیٹ فارم سے اور کبھی دینیات کے عنوان پر عصری طلباء میں خطاب کے مواقع آتے رہے، اس بات کا بہت احساس ہوا کہ قرآن و سنت اور اکابر کے معتدل نقطہ نظر کو اہتمام سے پیش کیا جانا چاہئے، عصری فنون کو دینی یعنی قرآن و حدیثی یا فرض عین والے مقصد کا درجہ رکھنے والے عصری علوم کی ترجیح اور عصری فنون کی شرعی حیثیت اور اس کے فضائل کا مواد پیش کر دیا جائے، بالخصوص ان روایتوں کو ذکر کیا جائے جس کی وجہ سے ایک ڈاکٹر، ایک وکیل اور سرکاری

ملازم عبادت و دعوت کے ساتھ اور اس کا دھیان رکھے تو اس کے وہ سارے کام عبادت بن جائیں۔

اور پھر اکابرین امت کے ملفوظات کو بھی شامل کیا جائے جو طلباء کے جوش و ولولہ کو بڑھاتے ہوں، ساتھ ہی ایسے قصے جو ہمارے طلبہ میں جذبہ تحقیق، انسانیت نوازی، امانت و دیانت کا اعلیٰ کردار پیدا کرتے ہوں، ہزاروں صفحات سے انتخاب کر کے نقل کر دیئے گئے ہیں۔

ریاضی، فلکیات، طب اور دیگر عصری فنون سے اور انگریزی زبان سے نہ مجھے اچھی طرح واقفیت ہے اور نہ میرے شریک تصنیف کو، اس عنوان پر ہمارا کام تقریباً نقل بازی کا رہا؛ البتہ ان فنون کے مدرسین سے نظر ثانی کروائی گئی، بہت دل چاہتا تھا کہ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آباد، ڈاکٹر عبدالحی عارفی، حکیم اختر صاحب اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں غیر معمولی حصہ لینے والے بے شمار ڈاکٹرس و انجینئرس کا تذکرہ کیا جاتا، ان کے ایمان افروز واقعات لکھے جاتے؛ لیکن کتاب ضخیم ہو جاتی اور مزید وقت لگ جاتا؛ اس لئے یہ کام چھوڑ دیا گیا، بعض مضامین کا تکرار ضرور ہے اور ایک ہی مضمون کو مختلف پیرائے میں الگ الگ جگہوں پر ذکر کیا گیا ہے، صرف اس لئے تاکہ اپنی طرف سے کوئی بات نہ ہو؛ بلکہ جو نقل کیا جائے اکابر کی تحریروں کی روشنی میں ہی رہے۔

اس درمیان میں الحمد للہ متقدمین و متاخرین کی تحریروں کی ورق گردانی کا بہت موقع ملا، عصر حاضر کے معروف مفکرین کی تحریروں و تقریروں سے بھی کافی استفادہ کیا گیا، ان حضرات کی فہرست تو لمبی ہے؛ لیکن حضرت مولانا خلیل الرحمن سبحان نعمانی دامت برکاتہم کی تقریروں سے بہت زیادہ تحریک پیدا ہوتی رہی۔

احقر کو خوشی ہے کہ حضرت الاستاذ جامع المنقول والمعقول مفتی عبد اللہ صاحب مظاہری دامت برکاتہم بانی و مہتمم جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، ضلع بھروچ، گجرات کی

ہمت افزائی شامل حال رہی اور حضرت مولانا احمد ومیض صاحب استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد نے بھی اپنی بابرکت تقریظ عنایت فرمائی اور ہماری ہمت وقوت کا سامان فرمایا۔ میرے مسلسل اسفار، تدریسی مصروفیات کے ساتھ یہ کام انجام ہرگز نہیں پاتا اگر مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی صاحب کی یکسوئی اور بے لوث تعاون، ہزاروں صفحات سے مواد کی ترتیب، عرق ریزی کے ساتھ تخریج و تحقیق کا کام نہیں ہوتا، جزاۃ اللہ احسن الجزاء۔

اور میرے رفیق درس و تدریس مولانا مدثر حسین رضوان صاحب قاسمی باریک بینی اور اپنائیت کے ساتھ تصحیح فرمائی۔ اللہ جل جلالہ اپنے فضل سے قبول فرمائے۔

ابوبکر جابر قاسمی

۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ استاذ مدرسہ خیر المدارس، بورا بنڈہ، حیدرآباد

۷ مارچ ۲۰۱۴ء



استعمال کیا جائے۔

اس لئے دنیا کے سائنس عناصر اربعہ کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبان نبوی سے دی گئی ہے جس حد تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہو ارشاد نبوی ہے۔

اعْمَلْ لِدُنْيَاكَ مِقْدَارَ بَقَائِكَ فِيهَا، وَاعْمَلْ لِلْآخِرَةِ
بِمِقْدَارِ بَقَائِكَ فِيهَا
”دنیا کے لئے اتنا کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کرو
جتنا وہاں رہنا ہے۔“

علامہ اقبال نے اس سائنس اور اس کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں ، رونق میں ، صفا میں
گر جوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے ، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبیر ، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

دنیا مقصود اصلی نہیں، مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے

یہ دنیا اور اس دنیا کی ساری جدوجہد بس ایک وسیلہ آخرت سے زیادہ حیثیت

سائنس وسیلہ، اسلام مقصود

جب یہ معلوم ہوا کہ یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلتِ نفس کا ثمر پیدا ہوتا ہے، سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ اور ایثار جس سے استغناء عزتِ نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، اسلام کا موضوع عمل ہیں تو یہ نتیجہ نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلتِ نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام عزت اور فلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے، بہر حال یہ عناصر اربعہ اور اس سے بنایہ محض ایک ڈھانچہ جس کی زندگی روح کے بدولت ہے، روح اسے زندہ رکھ رہی ہے، علوم و کمالات اسکے ذریعہ ظاہر کرتی ہے، اس لئے جسم حقیقت میں فاعل نہیں، بلکہ محض قابل ہے اور اصل نہیں بلکہ وسیلہ ہے، اور اس جسم کو مقصود کا درجہ دیا جاتا ہے، تو یہ فی الحقیقت بغیر روح کے ایک لاشہ محض ہے، جس کا انجام سڑنے اور گلنے کے سوا کچھ بھی نہیں، جب کہ سائنس کا موضوع محض یہ جسمانیت اور مادی چیزیں ہیں اس لئے سائنس کے تمام کوششیں بھی وسائل سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے، جب کہ اسلام اصل موضوع اور روحانی افعال ہیں، اس سے پتہ چلا کہ جیسے بدن روح کے لئے وسیلہ عمل ہے، ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ، جس کی زندگی اور اسلامی اخلاق و افکار اور اسلامی اقوال و افعال ہوں گے، اگر یہ روح اصل ڈھانچہ میں ہے تو یہ پوری سائنس اور اس کی تشکیل بے فائدہ ہوگی، جب یہ ثابت ہوا کہ سائنس محض وسیلہ ہے تو وسیلہ کو مقصود کی ضرورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور اسی قدر استعمال کیا جاتا ہے جس حد تک وہ مقصود کے لئے معین و مددگار ہوں۔

اس لئے یہ بات معلوم ہوئی کہ مقصود اصلی یعنی دین سے جدا رہ کر سائنس میں انہماک کرنا یہ عقل مندی کا کام نہیں، بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اور ضرورت کی مقدار میں

نہیں رکھتے، اسی کو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: ”إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ“ (۱) بلاشبہ دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا تمہاری آخرت کے لئے بنائی گئی ہے، یعنی وسیلہ آخرت ہے، مقصود زندگی نہیں، مقصود زندگی تو قرآن کے بیان کے مطابق ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“ (۲) میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

یعنی انسان اور جنات کو دنیا اور دنیا داری کی خاطر پیدا نہیں کیا، یہی کلمہ حصر کا مفہوم ہو سکتا ہے اور جب دنیا غایت تخلیق نہیں تو لامحالہ پوری دنیا کا وسیلہ عبادت ہونا ثابت ہوتا ہے، اور ایک جگہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”أَلَلَّهِمَّ أَعِجِّي عَلَى دِينِي بِالْدُّنْيَا وَعَلَى آخِرَتِي بِالثَّقْوَى“ (۳) اے اللہ! میرے دین کو دنیا کے ذریعہ مدد دے اور میری آخرت کو پرہیزگاری سے۔

بہر حال ان نصوص سے دنیا وسیلہ دین ثابت ہوتی ہے اور عقلی اصول ہے کہ وسائل صرف تکمیل مقاصد کے لئے بقدر ضرورت اختیار کئے جاتے ہیں، اگر وہ ضرورت سے بڑھ جائیں یا ضد مقصود کے لئے وسیلہ ثابت ہونے لگیں یا مقصد فوت ہو کر محض وسائل ہی وسائل رہ جائیں گو یا تخم تو گل جائے اور جڑ میں پانی ہی پانی رہ جائے جو تخم کے نشوونما کا محض ایک وسیلہ تھا تو شرعاً ہی نہیں عقلاً بھی مذموم سمجھا گیا۔ گویا یہ تمام سامان دنیا بدن کی پرورش اور بقاء کا ذریعہ ہے اور بدن روح کے لئے مرکب اور سواری ہے جس پر سوار ہو کر وہ راہ حق اور آخرت کی منزلیں طے کرتی ہے؛ اس لئے ضروری ہوا کہ انسان روح کے اُس گھوڑے یعنی بدن کے لئے گھاس دانہ فراہم کرے؛ تاکہ وہ سفر کر کرنے کے قابل ہو، پس سفر سے مقصود منزل ہوتی ہے نہ کہ گھوڑا یا گھاس دانہ، اس صورت میں اگر مقصد سفر ہی

(۱) الدر المنثور: ۸/۱۶۹، دار الفکر، بیروت

(۲) الذاریات: ۵۶

(۳) کشف الخفاء: ۱/۱۸۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت

سامنے نہ ہو تو سواری اور گھاس دانہ ہی کی ضرورت باقی نہیں رہتی؛ لیکن جس صورت میں مقصد سامنے ہو تو تحصیل مقصد کی حد تک سواری کا بندوبست کرنا ناگزیر ہوتا ہے، مگر وہ وسیلہ ہی رہتی ہے مقصد نہیں بن جاتی۔

بہر حال سموات و ارض کے عجائبات کی طرف متوجہ کرنے اور ان میں غور و فکر کا امر کرنے کا مقصد قرآنی ہدایات کی روشنی میں معرفت خالق، معرفت توحید، ذات و صفات اور معرفت توحید افعال سے نفس انسانی کی تکمیل اور اُسے فضائل علم و اخلاق سے آراستہ اور مہذب بنانا ہے، ریل و تار، فون و لاسکی، موٹر اور جہاز وغیرہ کے کارخانے کھلوانا نہیں، کیوں کہ یہ سب کچھ بننا نہ قرآن پر موقوف ہے نہ ختم نبوت کی لائی ہوئی معرفت و بصیرت پر، البتہ بطور وسیلہ عبادت ان مادی اشیاء اور تمدنی صنائع سے کلیۃ الگ کر دیا جانا بھی مقصود نہیں؛ بلکہ بضرورت عبادت اور بضرورت نفاذ خلافت ان وسائل کی تحصیل بھی ضروری قرار دی گئی ہے، تاکہ معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر ایک انسان معاد کی فکر کر سکے اور قانون الہی کو قوت سے دنیا میں پھیلانے اور رواج دینے سے کوئی چیز مانع نہ بن سکے۔

اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد یہ جرأت نہ ہونی چاہئے کہ مقاصد عبودیت کو چھوڑ کر صرف ان فانی وسائل میں کھوجانے اور انہیں ہی مقصد زندگی ٹھہرا لینے کو خلافت الہی کہا جائے، کوئی بھی سنجیدہ عقل اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ جس خلافت الہی کے برپا کرنے کے لئے ہزار ہا انبیاء علیہ السلام مبعوث ہوئے، لاکھوں حواری اور صحابہ علیہم السلام، انبیاء علیہم السلام پیدا کئے گئے اور کروڑوں نائبان انبیاء اور صلحاء ظاہر ہوئے اس خلافت کے معنی لوہے، پیتل، لکڑی اور پتھر وغیرہ کے مختلف معاشی سامان ڈھالنے اور ان سامانوں سے اسباب عیش و نشاط یا اسباب تباہی و ہلاکت افراط کے ساتھ مہیا کر کے دنیا میں فساد مچانے کے ہیں، اگر یہی خلافت الہی تھی تو معاذ اللہ فرعون مصر، کسرائے فارس، قیصر روم، خاقان چین، راجائے ہند، نیز دوسرے اور بڑے بڑے عیش پسند یا جنگ جو سرمایہ دار؛ بلکہ تمام دشمنان انبیاء علیہم السلام جیسے قارون اور ہامان، نمرود اور شداد، ابو جہل اور ابولہب وغیرہ سب

سے بڑے خلفائے الہی ہوتے، یا پھر بڑے بڑے صنایع لوہار، بڑھئی، صراف اور سنار وغیرہ خلفائے الہی ثابت ہوں گے اور جب کہ ان فنون اور فن کاروں کے وجود کے لئے قرآن اور نبوت ہی کی ضرورت نہ تھی تو دوسرے لفظوں میں اس خلافت کے لئے بھی نہ نبوت کی ضرورت رہتی ہے نہ قرآن کی؛ بلکہ اس خلافت کے حق میں نبوت حارج نکلتی ہے۔

قرآن کا مقصد اصلی خلافت:

قرآن کا مقصد اصلی انسان کو اس حد کمال پر پہنچا کر اس کی انسانیت کی تکمیل کرنا ہے اور جب کہ کمال کا حقیقی سرچشمہ ذات خداوندی کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جس کے اوصاف و افعال سے اسی کے فرمان کے مطابق مشابہت پیدا کر کے ان کمالات کو بقدر استعداد و قابلیت اپنانا ہی انسانیت کی تکمیل ہے، خلیفہ اصل کا قائم مقام ہوتا ہے، اس لئے خدا برتر و بالا کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو خدائی اوصاف و کمالات کا پرتو ہو، اگر اللہ عز و جل کے لامحدود کمالات جن کے اجتماع سے آدمی کو خلیفہ الہی قرار پاتا ہے، اصولی نقطہ نظر سے تین نوعوں میں منحصر نظر آتے ہیں: (۱) کمالات علم و ادراک (۲) کمالات وصف و اخلاق (۳) کمالات صنعت و افعال؛ چنانچہ کتاب و سنت میں جس قدر بھی اسماء و صفات اسم یا فعل کی صورت میں ذکر فرمائے ہیں وہ سب ان ہی تین انواع کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں یا وہ علمی اسماء ہیں جن سے اللہ کے علمی کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں اور علمی اسماء یہ ہیں، علیم، خبیر، سمیع، بصیر، مدبر، وادع وغیرہ، یا وہ اخلاقی اسماء ہیں جن سے اس کے جوہری اخلاق اور پاکیزہ و لطیف قوائے باطن پر روشنی پڑتی ہے جیسے صبور، شکور، رؤف، غفور، رحیم، کریم، عفو، حلیم، وغیرہ یا افعال اور صنایع اسماء ہیں جن سے اس کے صنعتی کمالات پر روشنی پڑتی ہے جیسے: خالق، باری، بدیع، مصور، مبدی، معید، مجبی، ممیت، نافع و ضار وغیرہ بقیہ اسماء اس کے متعلقات ہیں۔

انبیائے علیہ السلام کی بعثت کا مقصد

انبیاء علیہ السلام جو کہ روئے زمین پر اللہ عز و جل کے اولین خلفاء میں سے ہیں، ان کی بعثت کی غرض و غایت بھی ان ہی تین کمالات ”علم و خلق و صنع“ سے بنی آدم علیہ السلام کو

آشنا بنانا اور عملی طور پر اس راہ پر چلانا ہے؛ تاکہ انسان خلیفہ الہی بن کر اپنے منیب کی منشاء کے مطابق ان ہی تین کمالات کی روشنی میں اس کائنات کا انتظام کرے اور مالک کائنات کی مرضی پر خود چل کر اس کی رعایا کو چلائے۔

اس لئے سردار انبیاء علیہ السلام نے اپنی بعثت کی غرض و غایت ان ہی تین کمالات کی ترویج و اشاعت ظاہر فرمائی، چنانچہ علمی کمالات کی ترویج کا فرض بعثت ہونا تو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ: ”إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ (۱)

اخلاقی کمالات کی ترویج کا غرض بعثت ہونا ان الفاظ میں ظاہر فرمایا: ”بُعِثْتُ لِأَتَمِّسَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ“ (۲) میں بھیجا ہی اس لئے گیا ہوں کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی تکمیل کر دوں۔

عملی اور صنعتی کمالات کے غرض بعثت ہونے کے اعلان کے لئے شریعت غراء کی ترویج کو غرض بعثت ظاہر فرمایا جو ہر نوع کی حکمت عملی یعنی تہذیبی، منزلی، مدنی، تمدنی، اقتصادی، سیاسی اور صنعتی وغیرہ افعال کے فطری اصول پر مشتمل ہے اور جس کے مجموعہ کا نام شریعت ہے:

”بُعِثْتُ بِالْخَنَفِيِّ السَّامِعَةِ“ (۳)

”میں بھیجا گیا ہوں سیدھی، سہل روشن اور رعایتوں پر مشتمل شریعت

دے کر“

(۱) ابن ماجہ: باب فضل العلماء، حدیث: ۲۲۹، بویصری مصباح الزجاجة میں فرماتے ہیں: اس کی سند میں بکر، داؤد، عبد الرحمن وغیرہ ضعیف ہیں۔

(۲) مجمع الزوائد: باب فی حسن خلقه و حیاءه و حسن معاشرته، حدیث: ۱۴۱۸۸، علامہ بیہقی فرماتے ہیں: اس کو احمد نے روایت کیا ہے اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں،، بزار کے الفاظ ہیں: ”لَا تَمْلِكُ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ“ اس کے رجال بھی اسی طرح ہیں سوائے رزق اللہ الکلوذانی کے جو ثقہ ہیں۔

(۳) المعجم الكبير: صدى بن العجلان، حدیث: ۷۷۱۵، علامہ بیہقی فرماتے ہیں: اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے، اس میں عفیر بن معدان ضعیف ہیں۔

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد
می شناسی عصر ما با ما چه کرد
عصر ما ، مارا زما بیگانہ کرد
از جمال مصطفیٰ بیگانہ کرد

جب اللہ عزوجل نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت ارضی سے نواز کر زمین پر بھیجنے کا ارادہ کیا تو پہلے انہیں ”علم الاسماء“ سے نوازا ”وَعَلَّمَهُ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا“ (۱) اس طرح دنیا میں آنے والے پہلے انسان کو اللہ عزوجل نے ان اشیاء کے ناموں کے ساتھ ان کی خصوصیات کا علم عطا فرما کر بھیجا جن کی تمدنی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی چیزوں کی ایجاد پہلی مرتبہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کے ذریعہ ہوئی، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ گری کی صنعت سکھائی گئی، حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانا سکھایا گیا ”وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا“ (۲) حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے تانبہ کا چشمہ بہایا گیا، ان کے زیر نگرانی شیاطین و جنات بڑے بڑے مکانات اور دیگر چیزیں بنایا کرتے ”يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَّحَارِبٍ وَتَمَاثِيلٍ“ (۳) حتیٰ کہ امام حدیث شمس الدین الذہبی ”الطب النبوی“ میں روایت نقل کی ہے انسانی زندگی کے لئے جتنی اہم اور ضروری صنعتیں ہیں مثلاً: مکان بنانا، کپڑا بنانا، درخت اور پودے لگانا، کھانے کی چیزیں تیار کرنا، حمل و نقل کے لئے پہیوں کی گاڑی بنا کر چلانا وغیرہ، سب اللہ عزوجل بذریعہ وحی اپنے نبی کو سکھائی تھی۔ (۴)

غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو صنعت کاری کی دعوت نہیں دی، حضرت داؤد علیہ السلام و سلیمان علیہ السلام نے ان فنون کی دعوت کو مقصد نہیں بنایا، پورا قرآن شاہد ہے کہ انہوں نے ایک خدا کی بندگی اور آخرت اور نبیوں کی اطاعت پر انہیں ابھارا۔

(۱) البقرة: ۳۱

(۲) هود: ۳۷

(۳) معارف القرآن: ۷/۲۶۲

(۴) السبا: ۱۳

تحقیق کائنات وسیلہ معرفت نہ کہ مقصد زندگی

جن تین کمالات ربانی سے انسان کو مزین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، جن کی تکمیل پر انسان خدا کا نائب اور خلیفہ بن کر دنیا کی زمام اور حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے، ان تین کمالات ربانی میں سے ایک علم وادراک ہے، یہ ایک ایسا ربانی اور الہی وصف ہے کہ وہ وسائل اور وسائط کا محتاج نہیں، وہ کسی کا نہیں؛ بلکہ خود اپنا ہے، وہ استدلالی نہیں؛ بلکہ ذاتی ہے کہ ماضی و مستقبل اور شاہد اور غائب سب اس کے سامنے بطور علم ضروری کے خود بخود حاضر ہیں، اسے حصول علم کے لئے استدلال کی حاجت نہیں کہ وہ قیاسات سے معلومات کے اندازے لگائے؛ کیوں کہ یہ جہل کی علامت ہے اور وہ جہل سے بری و بالا ہے، اسے ظن و تخمین سے نتائج تک پہنچنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ یہ لاعلمی کا عیب ہے اور وہ ہر عیب سے منزہ اور مقدس ہے، اسے کتابوں سے پڑھ کر اور استاذوں سے سیکھ کر معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ یہ ذات کا کمالات سے خالی ہونا اور تکمیل کو چاہنا ہے جو سراسر محتاجی ہے اور وہ اس محتاجی سے بری ہے، غرض اللہ عزوجل کے علم کے دائرہ میں پہلی چیز وہاں اسباب علم سے غنائے مطلق ہے؛ اسی لئے علم کے مبادی ہوں یا نتائج، ہیئت ہو یا حقیقت، صورت ہو یا ماہیت سب وہاں بیک دم حاضر ہیں، نہ اس کے اول میں محتاجی ہے اور نہ اخیر میں، نہ ظاہر میں نہ باطن میں ”هُوَ الْأَوَّلُ لَيْسَ قَبْلَهُ شَيْءٌ وَهُوَ الْآخِرُ لَيْسَ بَعْدَهُ شَيْءٌ وَهُوَ الظَّاهِرُ لَيْسَ فَوْقَهُ شَيْءٌ وَهُوَ الْبَاطِنُ لَيْسَ دُونَهُ شَيْءٌ“ اس لئے علم الہی کی بنیاد استغناء ہے، چنانچہ علم کے دائرہ میں اللہ عزوجل کے حقیقی خلفاء وہی ہو سکتے ہیں جن کے علم کی شان یہ غنائے کامل ہو کہ وہ یا تو بلا کسب و محنت اور بلا واسطہ کتاب و استاد نیز بلا ریاضت و مجاہدہ، وہی اور الہامی طور پر براہ راست اللہ سے اس کا علم پائیں جس کا نام علم لدنی ہے، جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہے، اگر وہ علم کسب و محنت کے ذریعے حاصل بھی ہو تو انبیاء علیہم السلام ہی کے تعلیم کردہ اصول و ضوابط کی اور انہیں کے پیش کردہ اسوہ کے مطابق ہو، اگرچہ یہ علم ابتداء کسی اور حصولی ہی کہلائے گا مگر آخر کار علم الہی سے ایک نسبت پیدا کر

کے وہی بن جائے اور خود ہی قلب سے علم کا سوتا پھوٹ نکلے گا اور اس میں وہی استغناء کی شان آئے گی کہ پھر اس میں رسمی وسائط کی احتیاج و ضرورت باقی رہے اور نہ کتاب و استاذ اور دوسرے وسائل کی۔

یہی صورت اخلاق ربانی کی بھی ہے کہ ان کا منتہا بھی یہی غنائے کامل ہے، جو اس اخلاق کی بنیاد ہے، اور ہر حسن خلق کی روح آخر میں غناء اور عدم احتیاج نکلتی ہے جیسا کہ ہر خلق بدکی روح اور انجام کار محتاجگی اور غیر کی غلامی اور اسیری نکلتی ہے۔

مثلاً تواضع کے معنی ہیں کہ ہم رسمی جاہ اور خودی سے کنارہ کش اور بے نیاز ہیں، سخاوت و قناعت کے معنی ہیں کہ ہم مال و منال کی محبت و طلب سے آزاد اور بے پرواہ ہیں، صبر کے معنی ہیں کہ ہمیں فوت شدہ کا غم نہیں یعنی ہمیں اس کی احتیاج نہیں، شکر کے معنی ہیں کہ ہم اس نعمت سے اٹکے ہوئے نہیں؛ بلکہ نعمت دینے والے سے وابستہ ہیں جو بے نیازی کا سرچشمہ ہے، شجاعت کے معنی ہی جان سے بے نیازی اور استغناء کے ہیں، حیاء کے معنی حق کی خاطر نفس کی مرغوبات و محبوبات سے بے پرواہ ہو جانے کے ہیں، ایثار کے معنی ہیں کہ دوسرے کے نفع کی خاطر اپنے منافع سے دست بردار ہو جائیں، حلم کے معنی ہی انتقام سے بے نیازی اور جذبات انتقام سے بالاتر ہونے کے ہیں۔

اس کے بالمقابل تواضع کے مقابل تعلیٰ ہے جس کے معنی ہیں غیر پر اپنی برتری ثابت کرنا جس میں سراسر غیر کا احتیاج ہے، سخاوت کے مقابلے میں بخل کا مطلب ہے کہ مالی محتاجگی کے ہیں نہ کہ اس سے غنی اور بے نیاز ہونے کے، بے صبری اور جزع و فزع کے معنی فوت شدہ سے اٹکاؤ اور اس کے غم میں گھل جانے کے ہیں، یہی محتاجگی ہے، شجاعت کے مقابل بزدلی کے معنی ہیں کہ سامنے والے کی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کا محتاج ہو جانا ہے، ناشکری کا مطلب ہے منع حقیقی سے کٹ کر اپنے نفس کے اسیر اور غلام ہو جانے کے جو سراپا بندۂ احتیاج ہے، حرص کے معنی ہیں دولت اور اسباب عیش و عشرت کے احتیاج کے ہیں۔

بس اخلاق کے سلسلے میں اللہ کا نائب وہی ہو سکتا ہے جو ان اخلاق حسنہ سے

متصف ہو کر غیر کی احتیاج اور ضرورت سے بے نیاز ہو جائے، بے نیازی اور بے احتیاجی اس کی ہر حرکت و سکون سے ظاہر ہو، پھر کیوں کر دنیا کے برق و بخار، آب و آتش یا خاک و باد کا محتاج ہو کر انسان خلیفۃ اللہ فی الارض بن سکتا ہے۔

اسی طرح یہی نوعیت خدا کی صفت صناعتی اور فعالی کی ہے کہ وہاں بھی احتیاج کا کوئی شائبہ تک نہیں، یعنی اللہ کا کوئی فعل اور نہ کوئی صنعت و وسائل کی محتاج ہے، نہ اسباب کے تابع ہے، وہ خود ہی مسبب الاسباب ہے اور خود وسائل کو بناتا ہے، نہ اس کے لئے مادہ درکار ہے اور نہ مدت، خود اسی کی باطنی قوت ایک فعل کو ذہنی وجود دے کر اسے بیک دم خارج میں نمایاں کرتی ہے، جس کے لئے اسباب و مسببات کی کوئی احتیاج نہیں، بلکہ صرف ”کُنْ فَيَكُونُ“ کی لاحد و طاقت کافی ہے۔

اس لئے خدا کا نائب اور اس کا خلیفہ بھی وہی ہو سکتا ہے جس کے اندر ظاہری وسائل سے استغناء پیدا ہو جائے، اپنے صنع و عمل میں کسی غیر اللہ کا محتاج نہ رہے، خواہ وہ بے شعور وسائل ہوں یا باشعور اشخاص و اعیان عناصر و موالید ہوں یا فلکیات و ارضیات، یہ تمام اشیاء نہ اس کی صنعت میں خارج ہو سکیں، وہ چاہے تو پرواز کے وسائل کے محض خدا کی طاقت کے بھروسہ اور اپنی قوت یقین سے آسمانوں تک پرواز کر سکے، اور چاہے تو بلا وسائل رصد گاہ اپنے اثرات فلکیات تک پہنچا دے، وہ چاہے تو بلا وسیلہ لاسکی اور فون و انٹرنیٹ کے اپنی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچا دے۔

اسی اعتماد علی اللہ اور استغناء و بے نیازی کی طاقت تھی جس کی بناء پر غزوہ بدر میں ملائکہ مسوّمین ہزاروں کی تعداد میں آئے، تاکہ ان قلیل التعداد مسلمانوں کے دلوں میں جماؤ اور استقلال پیدا کریں، اسی کے تحت حضور ﷺ نے اعداء اللہ پر مٹھی بھر کنکریاں پھینک ماریں جو انہیں تیر و تفنگ ہو کر لگیں، تمام عرب مرتدین کے مقابلے صرف تنہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قتال کے لئے کھڑے ہونا، اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ساٹھ ہزار رومیوں کو صرف ساٹھ مسلمان صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ شکست دینا یہ اسی قوت کی بنا پر تھا۔ ہاں اگر قوت یقین عین الیقین کے درجہ کا نہ ہو اور غناء و توکل کا مادہ راسخہ قلب میں

جاگزیں نہ ہو تو بھی حق الیقین کے تحت غناء و توکل کی بشاشت دل میں ہو، دل میں انشراح ہو، علم و اخلاق اور صناعات ظاہرہ سے بے نیاز نہ ہو؛ لیکن اعتقاداً ان اسباب و وسائل کی اہمیت و وقعت دل میں نہ ہو، اسباب کے اختیار کرنے کے وقت دل میں یہ خیال ہو کہ یہ اسباب ہمارے ضعیف نفوس کو سہارا دینے کے لئے ہیں، خلافتِ الہی کے معنی علم و عمل اور صنعت و افعال میں مادی اسباب سے بالکل منقطع ہونے کے نہیں ہیں، جیسا کہ خود حق تعالیٰ شانہ نے باوجود اس غنائے مطلق کے اسباب بھی پیدا کئے، اور اپنی قوتوں کو عادتاً ان ہی کی ضمن میں پیدا فرمایا، اس لئے اسباب جنگ کے سلسلہ میں ہتھیار، اسباب و صنائع کے سلسلہ میں اوزار اور اسبابِ معاش کے سلسلہ میں کاروبار، اپنی اپنی جگہ رہیں گے؛ مگر دل میں ان وسائل کی اہمیت اور محتاجی نہ ہوگی اور نہ عملاً ان وسائل کے اختیار کرنے میں مبالغہ سے کام لیا جائے گا۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ پہلے کے لوگ بھی طاقت کی حقیقت و وسائل سے بے نیازی کو سمجھتے تھے، وسائل کی محتاجی کو نہیں، چنانچہ لوگ حسی مادوں کے بجائے زیادہ تر نفسانی اور معنوی قوتوں کی تسخیر کو کمال سمجھتے تھے اور زیادہ تر طلسمات، نجومیات، فلکیات اور خود نفسِ انسانی کی اندرونی طاقتوں پر ان کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ ریاضیات مجاہدات کے ذریعہ نفس کی قوت کو مجتمع کیا اور اس سے بلا وسائل کام لیا، لیکن اسلام نے ان تمام طاقتوں کو جس میں مسمریزم، شعبدہ بازی، سحر وغیرہ شامل ہیں جس میں ظاہری اسباب کچھ نہیں ہوتے مگر مد مقابل زیر ہو جاتا ہے مخلوقاتی طاقتیں قرار دے کر ارضیات، فلکیات، نفسیات یعنی تمام سفلیات اور علویات سے آگے بڑھ کر الہیات کی لامحدود طاقتوں سے روشناس کرایا۔

بہر حال جو قوتیں رات و دن لوہے، لکڑی، اینٹ، پتھر اور عام مادی وسائل کی محتاجی اور غلامی میں نہ صرف بسر ہی کر رہی ہیں، بلکہ ان مادیات کی بندشوں نے ان کے خیال تک کو اپنا اسیر اور قیدی بنا لیا ہے، جس سے وہ روحانیت سے بیگانہ اور منقطع ہیں، نہ وہ غناء و توکل سے عقیدتاً سرفراز ہیں نہ حالاً، تو انہیں خلافتِ الہی سے کیا تعلق؟ کیوں کہ خلافتِ الہی کا استحقاق ہی ان اشیاء سے استغناء پر ہے۔

تحقیق کائنات کو مقصد زندگی بنانے کے نقصانات:

قرآن یہ کتاب ہدایت ہے، اسے تقویٰ و طہارت، اخلاق و روحانیت، زہد و عبادت، خشوع و انابت، اتباعِ سنت و اقتضائے آثارِ سلف اور خلافتِ الہی کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے بجائے عصری بنیادوں، فلسفہ و سائنس، معاشیات، اقتصادیات، عمرانیات و سیاسیات، تفریح و تفریح اور رسی جاہ و اقتدار یعنی ملوکیت و سلطنت اور موجودہ دنیا کے خالص مادی افکار و نظریات کے نقطہ نظر سے دیکھنا کہ اس کی ہر آیت سے خالص مادیت کا ایک سیلاب اُٹتا ہوا نظر آئے یہ بالکل زیب نہیں دیتا۔ اگر قرآن کو بجائے کتابِ ہدایت کے مادی کھود کرید اور اس کے عناصرِ اربعہ دُخان و بخار، گیس و برق، ریل و تار، طیارہ و سیارہ اور فون و لاسکلی وغیرہ پھر ان وسائلِ نقل و حمل اور اسبابِ علم و خبر کے وسیلہ سے ایک طرف اسبابِ زینت و تفریح کی توسیع سے دنیا میں ہوسناکی، عیاشی، حرص و آزادی، بد اخلاقی و سیاہ کاری اور ہمہ اقسامِ فسق و فجور کی وسعت و کثرت، دوسری طرف اسبابِ تباہی و ہلاکت اور مہلک آلاتِ حرب و ضرب، گن اور بم، ایٹم اور گیس و بارود اور تیزاب وغیرہ کی تیاری سے استبدادی طور پر اقوامِ عالم پر زور آزمائی، غلام سازی، قتل و غارت گری، اعلانیہ جور و جفا اور عالمی امن و سکون کی بربادی کی بہتات اور پھر یہ سب کچھ بنام امن و صلاح، یعنی کھلی عیاری و مکاری، ڈپلومیسی، نفاق اور باہمی بے اعتمادی کی وسعت یہ سائنس کے نتیجے میں قرآن کا مقصود ٹھہرایا ہے؛ حالانکہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اس جور و ظلم کو مٹانا، ایمانداری اور شرافت کا سبق دینا تھا۔

یہ جدید سائنس کی دین جس کی تباہ کاریاں اور اس کے نقصانات عیاں اور بیاں ہیں بقول حکیم مشرق:

یہ عیش فرواں یہ حکومت، یہ تجارت
دل سینہ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھویں سے
یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلی

اور ایک جگہ فرمایا:

حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت ، خود فروشی ، ناٹھکیبائی ، ہوس ناک

اگر قرآن کریم کو سائنس اور ہمہ جہت ترقی، مادہ و عنصر پر محنت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مہلکات کا ذریعہ قرار دیا جائے جیسا کہ کتاب اللہ کو کائنات ارضی و سماوی پر غور و فکر اور اس غور و فکر کے ذریعے مختلف قسم کے نتائج اخذ کرنے کی کتاب بعض لوگ قرار دیتے ہیں، اگر قرآن کا مقصد یہی ہو تو اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کا قرن اول اور صحابہ مقبولین کا طبقہ معاذ اللہ سب سے زیادہ ضعیف الایمان، قلیل العلم اور محروم العمل قرار پائے گا، جس نے منشاء قرآنی کے مطابق جیسا کہ بعض لوگوں کا زعم ہے نہ ایک مشین بنائی، نہ ایک انجن ہی ایجاد کیا، نہ دھان و بخار سے چلائیں، نہ خوبصورت چھری کانٹے ڈھالے، نہ کریم اور پاؤڈر تیار کئے، نہ چہروں کو گلگوں بنانے کے لئے غازے اور لوش بنائے، نہ آرائشی سامانوں کی تخلیق کی، نہ ہواؤں میں اڑتے پھرے، نہ پانیوں میں بہتے دکھائی دیئے، نہ کسی نے مہلک آلات ایجاد کر کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا منٹوں میں صفایا کیا، نہ استعماری اغراض کے ماتحت دنیا میں جبر و استبداد اور ظلم و ستم پھیلایا، نہ سائنٹفک آلات کی طاقت کے بل بوتہ پر قوموں کی غلام سازی کی، نہ اپنی استعماری اغراض کی خاطر زیر دستوں کے کچلے ہوئے جذبات کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی اور نہ ہی دنیا کا سرمایہ سمیٹ کر آلات لہو و لعب، باجے گاجے، سینما و تھیٹر، فواحش و منکرات کے مناظر، بے حیائی اور نہ بے حجابی کے عریاں نقشے دنیا میں رائج کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیا۔

اگر قرآن کو سائنسی علوم کا جو یا قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس قدر یہ سائنٹفک ترقیات بڑھتی گئیں گویا علوم قرآنی ترقی کرتا گیا، فہم انسانی تیز تر ہوتا ہو گیا اور عمل بالقرآن کا ذوق بڑھتا گیا، گویا نبوت کے قرن سے بعید ہونا ہی امت کے حق میں رحمت ثابت ہوا کہ سمجھ اور فہم صحیح ہو گئے۔ اور لوگ ایمان داری کا مفہوم صحیح صحیح سمجھنے لگے، معاذ اللہ قرن اول بلحاظ علم و عمل کے معاذ اللہ شر القرون ثابت ہو گیا، حالانکہ حضور ﷺ

کی زبان خدائی دعویٰ یہ تھا کہ:

”خَيْرُكُمْ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ“ (۱)

”زمانوں میں سب سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو خیر القرون والوں سے متصل ہوں اور پھر جو ان لوگوں سے متصل ہوں“

اگر قرآن کو علمی قرآن اور سائنس اور کائناتی ریسرچ کو عملی قرآن قرار دیا جاتا ہے اور قرآن کو کائناتی کھوج و تحقیق کا ذریعہ بنایا جاتا ہے تو اس اصول پر تمام انبیاء علیہ السلام پر بھی حرف آتا ہے؛ کیوں کہ ان کے دور میں مادی اور تمدنی ترقیات تو کیا ہوئیں برپا شدہ ترقیات بھی فناء کے گھاٹ اتار دی گئیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کلدانیوں کی تمدنی ترقیات پر پانی پھیر دیا، جو بعض حیثیات سے آج کی تمدنی ترقیات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھیں اور لوگوں کو پھر سے اسی سادہ تمدن کی دعوت دی جس میں تکلفات اور افراط عیش کا وجود نہ تھا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور فرعونوں کا وہ ملکی اور شہری کڑ و فرخم کر کے چھوڑا جس پر فرعون ”أَلَيْسَ لِي مُلْكٌ مِصْرَ وَهَذِهِ الْأُمَمُ هَارٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي“ (۲) کہہ کر فخر کیا کرتا اور انہیں اسی بے تکلف سادہ تمدن پر لانے کوشش فرمائی۔

حضرت خاتم الانبیاء ﷺ نے اپنے دور کے دو عظیم الشان مادی تمدنوں یعنی رومی اور ایرانی کروفر اور عمرانی عجائبات کو مٹا دینے کا اعلان فرمایا اور ان کے مٹ جانے کی پیشن گوئی فرمائی اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عین منشاء نبوی کے مطابق اپنی فتوحات سے ان تکلف آمیز تمدنوں اور ان سرپرست حکومتوں کو تہہ وبالا کر ڈالا، اور وہ سادہ تمدن قائم کیا جو مقاصد عبودیت کے لئے حارج اور رکاوٹ نہ ہو، کسری کے وہائٹ ہاؤز کے بے نظیر سامانوں، مافوق العادت سیم وزر کے ظروف و تاج اور اعلیٰ اعلیٰ نمونوں کے انمول قالینوں وغیرہ کو دیکھ کر جو بسلسلہ مال غنیمت مسجد نبوی میں لائے گئے تھے،

(۱) بخاری: باب فضائل أصحاب النبی ﷺ، حدیث: ۳۴۵۰

(۲) الزخرف: ۵۱

فاروق اعظم ؓ رو پڑے اور فرمایا کہ یہی سامانِ نعیش ہے جس کی بدولت فارسی قوم آج مسلمانوں کی مفتوح بنی۔

بہر حال عیش و نشاط کے وافر سامان ہوں یا قوت و شوکت کے مضبوط دلائل، اسبابِ رزم ہوں یا وسائلِ بزم، دربار سے متعلق کروفر ہو یا بازار سے متعلق سیم وزر، جو آج کی نہیں ہمیشہ کی دنیا پرست اقوام کا سرمایہ غرور رہا ہے، جو اقوامِ عالم کی اصل تباہی کا سبب بنا ہے، قرآن اسی تمدن اور اسی سامانِ عیش اور وسائل کو اختیار کرنے کا کیوں کر حکم دے سکتا ہے؟

چنانچہ قرآن کریم نے جگہ جگہ سابقہ اقوام کی تباہی کی مثالیں پیش کی ہیں کہ وہ وقتی عیش و لذت میں پڑ کر، نعیش کی افزائش کے لئے دماغی کاوشوں سے اختراعات و ایجادات میں غرق ہو کر بڑی بڑی جابر قومیں آن کی آن میں کس طرح برباد کر دی گئیں کہ آج ان کا کوئی نام و نشان بتلانے والا نہیں ہے، قومِ نوح طوفان کے تھپیڑوں سے، قومِ عاد آندھیوں کے جھکڑوں سے، قومِ ثمود ہولناک گرج اور غیبی چنگھاڑ سے، قومِ شعیب آسمان کی آتش باری سے، قومِ لوط فضا کی سنگباری اور بستیوں کے الٹ دیئے جانے سے، قومِ ابراہیم سلبِ نعمت و ملک سے، قومِ فرعون قلزم کی موجوں سے، اس طرح بے نشان کر دیئے گئے کہ نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین۔

مصریوں کی سائنٹفک ترقیات، بے نظیر باغات، خوشنما آبشار، سرسبز کھیتیاں، وافر سبزیوں، اسبابِ عیش و نشاط، فرعونی دماغ کے مجوزہ سربفلک منارے جن کی مدد سے وہ آسمان کے دروازوں سے قریب ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کے خدا سے مقابلہ کا حوصلہ کر رہا تھا، ان کے لئے کچھ بھی کارآمد ثابت نہ ہوئے اور یہی ساری سائنٹفک ترقیات فرعون اور فرعونوں کے حق میں موجبِ ہلاکت و تباہی بنیں، بالآخر نام اور کام اگر باقی رہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا۔

عاد و ثمود کو ان کی سائنسی ترقیات اور فن کاریوں کی بے مثال تعمیر و ترقی قومِ عاد کو فنِ انجینیری کے تحت نادر و روزگار تعمیرات سربفلک بلڈنگیں اور قومِ ثمود کو پہاڑوں سے تراشی ہوئی قلعہ بند عمارتیں اور منزل در منزل تعمیریں اس عذابِ الہی سے نہ بچا سکیں جو نمائشی

بہاروں میں غرق ہو جانے کے سبب ان پر آیا، اسی لئے قرآن نے ان کے خالص مادیت کے شاہکاروں اور اخلاق و روحانیت سے ہٹے ہوئے کارناموں کو مقصود زندگی قرار دے لینے کو نفرت و حقارت سے یاد کیا ہے۔ یہ سارے مادی مشاغل ان کی نجات یا سزا ہننے کا ذریعہ نہیں بنے؛ بلکہ ان مادی مشاغل میں لگ کر ان اقوام نے فرائضِ عبودیت کو ترک کر دیئے، اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو ٹھکرا دیا تو قہرِ خداوندی نے انہیں نیست و نابود کر کے دنیا کو عبرت دلائی۔

جو مغربی فلسفہ کو قرآنی آیات پر منطبق کرنا چاہتے ہیں انہیں کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

مقصود اصلی معرفتِ رب، خدمتِ انسانیت

بہر حال مسلمان کے لئے ان مادی سامان کے حصول کے لئے ترقی کے میدان میں گھس جانا اس کی مدح اور تعریف کا معیار نہیں؛ کیونکہ مادیات کی دنیا میں گھس جانا ایمان داری وغیرہ ایمانداری اور اسلام و کفر کا معیار نہیں بن سکتا، مسلمان کے لئے معیارِ مدح و ذم تو صرف علم و اخلاق، تصرفِ روحانی اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، مادی تصرفات کو بقدرِ ضرورت اس کے لئے رکھے گئے ہیں، وہ فی نفسہ مقصود و معیار نہیں۔

خلافت فی الارض کا مقصود تلوار اٹھانا نہیں، بلکہ قانونِ حق کو نافذ العمل بنانا ہے، پہلے اپنے اوپر، پھر ماحول اور اس کے پس و پیش، اگر کسی قوم نے تلوار اٹھائے بغیر قرآن کو اپنے اور اپنے ماحول پر نافذ کیا تو وہ بلاشبہ آقا ہے ورنہ قطعی طور پر غلام ہے، خواہ نفس کا غلام ہو یا غیر کا، پیغمبر ﷺ اور صحابہ کرام ؓ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں بھی آقا تھے، جب کہ تلوار ہاتھ میں نہ تھی اور مدینہ کی دس سالہ زندگی میں بھی ویسے ہی آقا تھے جب کہ

وسائلِ شوکت ان کے ہاتھ میں تھے، کتنے ہی انبیاء علیہم السلام کو جہاد و سیاست سرے سے دیئے ہی نہیں گئے، لیکن اوامر اللہ کی تنفیذ میں خلیفہ فی الارض تھے۔

یہی دونوں حالتیں امت پر گزری ہیں، امت کے بعض طبقے مکہ کی زندگی میں آگئے جس کا حاصل محض پٹ لینا اور صبر کرنا نہیں؛ بلکہ مارکھا کر اعلائے کلمۃ اللہ کرنا اور ترویج کلام اللہ کو برابر انجام دینا ہے جس کو قرآن کریم نے جہاد کبیر کہا ہے، اور بعض مدینہ کی زندگی میں آگئے، جس کا حاصل قوت سے استیصالِ فتنہ کر کے اشاعتِ دین کی راہیں ہموار کرنا اور شعائر اللہ کو اونچا بنانا ہے؛ تاکہ دین حق ہمہ گیر اور غالب ہو جائے، جس کو جہادِ صغیر کہا گیا ہے۔ دونوں کا مقصود وہی اعلائے کلمۃ اللہ، تبلیغ کلام اللہ اور تربیت خلق اللہ نکلتا ہے، پس ”وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا سَتَطْعَمُوهُ“ جیسی آیات کریمہ سے تیر و تفنگ جمع کر لینا، یا تکوین کائنات کی آیات سے بے محل استنباط کر کے صنعتی، تجارتی اور عسکری کاروبار پھیلانا فی نفسہ خواہ کتنا ہی ضروری ہو؛ مگر خود حریت و آقائی نہیں، آقائی قرآن کو نافذ العمل بنانا ہے، جس کے لئے یہ قوت کی تیاری محض ایک وسیلہ اور ذریعہ سے زائد نہیں جیسے وضو قرآن کی رو سے فرض و واجب سہی مگر ہے بہر حال محض نماز کی کنجی، بلکہ وہ نماز ہی کی وجہ سے ضروری ہے، فی نفسہ نہیں۔

پس اگر ایک قوم نے شوکت حاصل کر لی؛ لیکن اس کی شوکت دین کے حدود و شعائر قائم کرنے سے غافل یا عاجز رہی تو اسے حریت و آقائی کے دعویٰ یا تصور کا کوئی حق نہیں، وہ بدستور غلام ہے، دوسروں کی ہو یا اپنے نفس کی، زیادہ سے زیادہ دوسرے غلاموں اور اس میں فرق یہ ہوگا کہ ایک بے تلوار کے غلام ہوں گے اور ایک باتلوار؛ لیکن فی نفس غلامی میں کوئی فرق نہیں ہوگا، بلکہ تلوار سمیت غلامی زیادہ ننگ و عار ثابت ہوگی۔

بہر حال جو لوگ قرآن کی آیاتِ تکوین کی رو سے مادی وسائلِ زندگی اور مادہ کی توڑ پھوڑ یا ترکیب و تحلیل سے کچھ اسبابِ تعیش اور کچھ اسبابِ ہلاکت ایجاد کرتے رہتے اور بالفاظِ دیگر ان سے تاجرانہ طریق پر منتفع ہوتے رہتے ہی کو مقصدِ حیات اور اسلام کی اصل ترقی باور کرتے ہیں اور پھر ان پر قابو پالینے اور ان کے ذریعہ کچھ رسی جاہ و اقتدار حاصل کر لینے ہی

کا نام خلافت اور ایمان داری بتلاتے ہیں؛ حالاں کہ ان کا یہ دعویٰ غلط ہے:

(۱) آیاتِ تکوین کی رو سے صحیفہ کائنات کا مطالعہ ضروری ہے؛ لیکن معرفتِ صانع کے لئے نہ کہ محض معرفتِ مصنوعات اور مادہ کی توڑ پھوڑ کے لئے۔

(۲) مادی اقتدار ضروری ہے؛ لیکن قانونِ فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد و تعیش کے لئے۔

(۳) استخلاف فی الارض ضروری ہے؛ لیکن مادی حوائج سے غنی بن کر کامل بننے اور بنانے کے لئے، نہ کہ وفورِ اسباب سے اپنی محتاجگی کو بڑھانے اور دنیا کی نقالی کرنے کے لئے۔

(۴) مدنیت اور تمدنی اکتشافات بقدر ضرورت ضروری ہیں؛ لیکن تعاونِ باہمی میں ازدیاد کے لئے؛ نہ کہ مادیت میں غلو اور فناء فی العیش ہو جانے کے لئے۔

(۵) تسخیر کائنات ضروری ہے؛ لیکن روحانی تصرفات کی مشق بہم پہنچانے اور صورتوں کے راستہ سے حقائق تک پہنچنے کے لئے، نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستوں اور مختلف الاشکالِ ڈیزائنوں میں غرق ہو جانے کے لئے۔

(۶) اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے امکانی تیاری (اعداد مستطاع) ضروری ہے؛ لیکن دشمن کی نقالی یا اس کی طرح عدد اور عدد پر کلیتہً اعتماد کے ساتھ نہیں؛ بلکہ فی الجملہ ان اشیاء کی رعایت رکھ کر، قوتِ قلب، حوصلہ یقین اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام امور، تمدن، سیاست، امارت، تسخیر، تکوین وغیرہ ضروری ہیں، مگر رضائے الہی اور قربِ حق کے لئے، نہ کہ رضائے نفس اور رضائے غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے جب کہ ان تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباعِ نبوی کے ناممکن ہے، جو حقیقتاً عملی قرآن ہے، تو بطور تفنن طبع کے اگر تعدد قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو ”تین قرآن“ کے عنوان کے ساتھ تاکہ کتاب اللہ علمی قرآن ہو، کائنات اللہ برہانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس عملی

قرآن ہو، نہ کہ ”دو قرآن“ کے نظریہ کے ساتھ، جس سے تمثیلی قرآن تو سرے سے حذف ہو جائے اور عملی قرآن باقی بھی رہے، تو تلبیس کے ساتھ اور غیر واقعی ہو کر، یعنی بجائے ذات نبوی کے کائنات آجائے جس سے کوئی اسوہ اور عملی نمونہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ (۱)

سائنسی علوم اور علوم الہی کی حقیقت میں فرق:

وحی اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ایسا ذریعہ علم نہیں جس کے ذریعہ انسان حقیقت کا ادراک کر سکے، حقیقت کی معرفت ایمان اور دائمی شریعت پر عمل کئے بغیر کسی اور ذریعہ سے ممکن ہی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام روایتی اور مذہبی تہذیبوں میں علم کا منبع اور ذریعہ خارجی ہوتا ہے اور یقین کا فائدہ دیتا ہے، وحی اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے حاصل شدہ علم صرف مرنی اور طبعی دنیا (physical world) تک محدود نہیں ہوتا؛ بلکہ غیر مرنی دنیا (یعنی موت، برزخ، آخرت) کا بھی علم فراہم کرتا ہے، اس علم سے انسان کو اس بات کا علم بھی ہو جاتا ہے کہ انسان کون ہے، کہاں سے آیا ہے؟ مرنے کے بعد کہاں جائے گا؟ اس کا خالق کون ہے؟ اس کا مقصد زندگی کیا ہے؟ اس علم سے انسان الہیات، ایمانیات، اعتقادیات، مابعد الطبیعیات اور مادی دنیا سے ماوراء کائنات کا علم بھی حاصل کرتا ہے اس علم کا مقصد خدا کی تلاش، قربت، معرفت اور جستجو ہے، جب کہ اس کے مقابل سائنسی تصور علم اس سے بالکل منفرد ہے، سائنسی تصور علم میں یقین علم کی موت ہے، اس کا منبع انسان ہے، لہذا وحی کے ذریعہ حاصل کیا جانے والا علم صحیح معنوں میں علم کہلانے کا مستحق ہے؛ کیونکہ اس علم کی بنیاد انسان سے باہر ہے، یعنی خدا کی طرف سے ہے، سائنسی علوم تصور علم میں جس علم (knowledge) پر یقین ہو وہ سائنسی و فلسفی دنیا میں علم ہی نہیں کہلاتا، علم کی بنیاد پر علم کا آغاز اور علم کا انجام شک ہے، شک سے ماوراء علم بلا شک و شبہ دائرہ علم سے خارج ہے، جدید سائنس (modern science) درحقیقت وحی کے علم الرغم اور بغاوت پر مبنی علم کا نام ہے جو یہ کہتا ہے

(۱) یہ سارا مضمون قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی کتاب ”ایک قرآن“ اور سائنس اور اسلام“ کا خلاصہ ہے۔

انسان ہی مرکز کائنات (Centre of the universe) ہے، معبود اور فاعل خود مختار ہے، خالق خیر و شر ہے، علم کی تشکیل وحی کے بغیر خالصتا عقل کی بنیادوں پر کی جاسکتی ہے، عقل کو بنیاد بنا کر ایک ایسے علم کی تعمیر کی جاسکتی ہے جو نہ صرف آفاقی ہوگا؛ بلکہ ہر قسم کی ایمانیات، نظریات و معروضات سے پاک ہوگا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام دعوے جھوٹے ہیں، مغرب کا اہم ترین فلسفی (Hume) اصول استقراء (Induction) کی منطقی اور تجرباتی توجیہ کو ناممکن تصور کرتا ہے کہ سائنس کو عقلی طور پر واضح نہیں کیا جاسکتا ہے۔ (۱)

سائنس اور مذہب کی تعلیمات میں فرق

مذہب کی تعلیمات وحی پر مبنی ہوتی ہیں؛ جب کہ سائنس صرف عقل اور حواس ظاہرہ پر، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی جو عقل و دانش ہوتی ہے، اس کی بہ نسبت سائنسدانوں کے علم و عقل پر حقیقی معنی میں علم و عقل کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہوگا۔

مذہب کی بنیاد انبیاء کرام علیہم السلام پر موقوف ہوتی ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کا علم قطعی اور ان کے تمام نظریات و تحقیقات محکم اور یقینی ہیں اور فلاسفہ اور اہل سائنس کا علم مشکوک اور ان کی بہت سی نظریات و تحقیقات محکم اور یقینی ہیں اور فلاسفہ اور اہل سائنس کا علم مشکوک اور ان کی بہت سی تحقیقات ظنی اور تخمینی ہیں؛ کیوں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا تعلق علم کے حقیقی سرچشمہ رب کائنات سے ہے، جس کا علم ساری کائنات کو محیط اور جس کے علم میں بھول چوک کا کوئی امکان ہی نہیں، قرآن کریم میں ہے کہ ”لَا يَصْلُ رَیُّ وَلَا يَنْدَسُ“ دوسری جگہ ہے ”أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ“ (۲)

بخلاف سائنسدانوں کے کہ ان کے علم کا تعلق یا تو ان کے افکار سے ہے یا تجربوں سے یا مشاہدات سے جن میں کسی ایک کو بھول چوک اور غلطی سے ماوراء نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور سائنس دانوں کے مابین ایک

(۱) ذاکر ناک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق، ۷۷، سمیع الحق، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی

(۲) الملک: ۱۳

اور فرق یہ بھی ہے کہ ہر آنے والا سائنس دان اپنے پیش رو کی تغلیط و مخالفت کو اپنی زندگی کا ایک اہم کارنامہ سمجھتا ہے؛ چنانچہ مشہور فلسفی عالم لطفی جمعہ کے بقول ارسطو طالیس نے اپنے ماقبل الہین کی پوری پوری تردید کی یہاں تک کہ ان سب سے برأت حاصل کر لی۔ اور حضرات انبیاء علیہ السلام کی شان یہ ہے کہ ہر آنے والا پیغمبر اپنے سابق پیغمبر کی کھلے دل سے تصدیق و تائید کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَءِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ“ (۱)

”اور جب عیسیٰ ابن مریم نے فرمایا کہ: اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں کہ مجھ سے پہلے تورات ہے، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا ان کی بشارت دینے والا ہوں“

یہی فرق انبیاء کرام علیہ السلام کے دیئے ہوئے علم اور ان کے دیئے ہوئے نظریات و افکار کی غیر مشکوک اور تخمینی ہونے پر ایک بین دلیل ہے، ورنہ ایک سائنسدان دوسرے کی کس طرح تردید و مخالفت کر سکتا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ جب تغلیط و تردید کر رہا ہے تو ضرور ایک نہ ایک غلطی پر ہوگا۔ (۲)

کیا سائنسی تحقیقات پر قرآن نہی موقوف ہے؟

بعض لوگ جدید سائنس سے مرعوب ہو کر یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ قرآن میں اتنی آیات کا تعلق سائنس سے ہے، قرآن کی کوئی آیت بھی جدید سائنس سے نہیں ٹکراتی، تو سوال یہ ہے کہ ان سائنسی تحقیقات پر قرآن کا سمجھنا موقوف ہے اور چاند، مرتخ اور زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرتا ہے: اس کو سمجھنے کے لئے

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب کا یہ اقتباس جو آیت قرآنیہ ”تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا“ کے ذیل میں مذکور ہے:

”حقائق کونیہ اور قرآن:- یہاں ایک بات اصولی طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ یا ہیئت کی کتاب نہیں جس کا موضوع بحث حقائق کائنات یا آسمانوں اور ستاروں کی ہیئت و حرکات وغیرہ کا بیان ہو مگر اس کے ساتھ ہی وہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی کائنات کا ذکر بار بار کرتا ہے ان میں غور و فکر کی طرف دعوت بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم کی ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز ان حقائق کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتی ہے جن کا تعلق اس کے عقیدے اور نظریے کی درستی سے ہو یا اس کے دینی اور دنیوی منافع ان سے متعلق ہوں۔ مثلاً قرآن کریم نے آسمان و زمین اور ستاروں، سیاروں کا اور ان کی حرکات اور حرکات سے پیدا ہونے والے آثار کا ذکر بار بار ایک تو اس مقصد سے کیا ہے کہ انسان ان کی عجیب و غریب صنعت اور مافوق العادت آثار کو دیکھ کر یہ یقین کرے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہو گئیں ان کو پیدا کرنے والا کوئی سب سے بڑا حکیم سب سے بڑا علیم اور سب سے بڑا صاحب قدرت و قوت ہے اور اس یقین کے لئے ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ آسمانوں کی اور فضائی مخلوقات اور ستاروں، سیاروں کے مادے کی حقیقت اور ان کی اصلی ہیئت و صورت اور ان کے پورے نظام کی پوری کیفیت اس کو معلوم ہو بلکہ اس کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے جس کو ہر شخص مشاہدہ سے دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ شمس و قمر اور دوسرے ستاروں کے کبھی سامنے آنے اور کبھی غائب ہو جانے سے نیز چاند کے گھٹنے بڑھنے سے اور رات دن کے انقلاب سے پھر مختلف موسموں اور مختلف خطوں

میں دن رات کے گھٹنے بڑھنے کے عجیب و غریب نظام سے جس میں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان سب امور سے ایک ادنیٰ عقل و بصیرت رکھنے والا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا، کوئی اس کو بنانے چلانے والا اور باقی رکھنے والا ہے اور اتنا سمجھنے کے لئے انسان کو نہ کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ وغیرہ کی حاجت پڑتی ہے نہ قرآن نے اس کی طرف دعوت دی۔ قرآن کی دعوت صرف اسی حد تک ان چیزوں میں غور و فکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آلات رصدیہ بنانے یا مہیا کرنے اور اجرام مساویہ کی سیستیں دریافت کرنے کا مطلقاً کوئی اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا یہ مطلب ہوتا کہ ان کے حقائق اور ہدایت اور ان کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس کا اہتمام نہ فرماتے، خصوصاً جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ دنیا میں اس وقت موجود بھی تھا۔ مصر، شام، ہند، چین وغیرہ میں ان فنون کے جاننے والے اور ان پر کام کرنے والے موجود تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچ سو سال پہلے فیشا غورس کا اور اس کے کچھ بعد بطلمیوس کا نظریہ دنیا میں شائع اور رائج ہو چکا تھا اور اس زمانے کے حالات کے مناسب آلات رصدیہ وغیرہ ایجاد بھی ہو چکے تھے، مگر جس ذات قدسی پر یہ آیات نازل ہوئیں اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بلا واسطہ آپ سے ان کو پڑھا انہوں نے بھی اس طرف التفات تک نہیں فرمایا۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا وہ منشا ہرگز نہ تھا جو آج کل کے بعض تجدد پسند علمائے یورپ اور اس کی تحقیقات سے متاثر

ہو کر اختیار کی ہے کہ خلائی سفر، چاند اور مریخ وزہرہ پر کمندیں بھیکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔ بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے نہ ان سے بحث کرتا ہے اور نہ ان کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کا حکیمانہ اصول و اسلوب کائنات و مخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے صرف اسی قدر لیتا اور بیان کرتا ہے جس قدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل بھی کر سکتا ہے اور جس کے حصول پر تخمیناً اس کو اطمینان بھی ہو سکتا ہے فلسفیانہ دوراز کا رجحانوں سے اور ایسی تحقیقات سے جو عام انسانوں کے قابو سے باہر ہیں اور جن کو کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہی صحیح ہیں بلکہ حیرانی اور شکوک بڑھتے ہیں، ایسی بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا۔ کیونکہ قرآن کی نظر میں انسان کی منزل مقصود ان تمام زمینی اور آسمانی کائنات و مخلوقات سے آگے اپنے خلاق کی مرضیات پر چل کر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو حاصل کرنا ہے۔ حقائق کائنات کی بحث نہ اس کے لئے ضروری ہے اور نہ اس پر پورا عبور انسان کے بس میں ہے۔ ہر زمانے کے فلاسفوں اور ماہرین فلکیات کے نظریات میں شدید اختلافات اور روزمرہ کے نئے انکشافات اس کی واضح دلیل ہیں کہ کسی نظریہ اور تحقیق کو یقین اور آخری نہیں کہا جاسکتا۔ انسانی ضرورت سے متعلقہ تمام فنون، فلکیات، کائنات فضاء، ابر باراں، خلا، طبقات الارض، پھر زمین پر پیدا ہونے والی مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات سے اور عام انسان اور انسانی علوم و فنون، تجارت، زراعت صنعت وغیرہ ان سب میں سے قرآن حکیم صرف ان کی روح

اور مشاہداتی حصہ کو اس قدر لیتا ہے جس سے انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت متعلق ہے، دوران کار تحقیقات کی دلدل میں انسان کو نہیں پھنساتا؛ البتہ کہیں کہیں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ یا صراحت پائی جاتی ہے۔

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات افلاک و فضا اور کائنات اراضی میں غور و فکر اس حیثیت سے کہ انہیں پیدا کرنے والے کے وجود اور توحید اور اس کی بے مثال علم و قدرت پر استدلال کیا جاسکے عین مقصود قرآنی ہے اور قرآن جا بجا اس کی دعوت دے رہا ہے اور اس حیثیت سے کہ ان چیزوں سے انسان کے معاشی مسائل کا تعلق ہے وہ بھی ضرورت کی حد تک منشا قرآنی ہے اور قرآن اس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ معاش اور معاشی ضروریات کو اصل مقصد قرار دیکر اس میں انہماک نہ کرے؛ بلکہ اس موجودہ زندگی کو اصلی زندگی کی طرف ایک سفر کا درجہ قرار دے کر اس کے مطابق اس میں مشغول ہو اور تیسری حیثیت چونکہ انسانی ضرورت سے زائد بھی ہے اور اس کا حصول بھی مشکل ہے اس میں عمر عزیز صرف کرنے سے گریز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ موجودہ سائنس کی جدید ترقیات و تحقیقات کو عین منشا قرآنی سمجھنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض پسند علمائے لکھا ہے اور قرآن کو ان کا مخالف کہنا بھی غلط ہے جیسا کہ بعض قدامت پسند علماء نے کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نہ ان چیزوں کے بیان کے لئے آیا ہے نہ یہ اس کا موضوع بحث ہے نہ انسان کے لئے ان کا حاصل کرنا آسان ہے نہ انسانی ضروریات سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ قرآن ان معاملات میں ساکت ہے۔ تجربات و مشاہدات سے کوئی چیز ثابت ہو جائے تو اس کو قرآن کے منافی کہنا بھی صحیح نہیں۔ چاند کے

اوپر پہنچنا، رہنا بسنا اور وہاں کی معدنیات وغیرہ سے نفع اٹھانا وغیرہ سب اس میں داخل ہیں ان میں سے کوئی چیز مشاہد اور تجربہ سے ثابت ہو جائے تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں اور جب تک ثابت نہ ہو خواہ مخواہ اس کے تصورات باندھنا اور اس میں عمر عزیز کے اوقات صرف کرنا بھی کوئی دانشمندی نہیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔ (۱)

جدید اور قدیم سائنس کا فرق

جدید اور قدیم سائنس کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سترہویں صدی تک سائنس نے کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا، کوپرنیکس، گیلو، نیوٹن اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا، مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الہی نظریہ سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے، جو اس نظام کو چلا رہی ہیں، لیکن اس نظریہ نے جدید وقت میں ایک بے خدا سائنس تیار کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا؛ کیونکہ سائنس کے نزدیک انسان کا کائناتی تسلط ہی اصل حقیقت اور مقصد انسانی ہے۔

(۱) قدیم سائنس میں فطرت کا مطالعہ برائے مطالعہ ہوتا تھا، جب کہ جدید سائنس میں تسخیر فطرت کے لئے ہوتا ہے۔

(۲) قدیم سائنس معاشرے کے لئے ایک خادم کی حیثیت سے کام کرتی تھی جب کہ جدید سائنس حاکمانہ تسلط قائم کرتی ہے۔

(۳) قدیم سائنس کا وجود حقیقت کے تصور سے نکلتا تھا، وہ جو حقیقت مطلق اور حقیقت ازلی ہے جیسے باری تعالیٰ، اس کے برعکس جدید سائنس کا تصور حقیقت مطلقہ ”خدا“ سے انکار پر مبنی ہے۔

(۴) قدیم سائنس میں زندگی کا ایک مقصد اور نصب العین ہوا کرتا تھا، جب کہ جدید سائنس نے مادی ترقی کو فروغ دے کر انسان کو ہر گناہ میں مبتلا کر دیا، زندگی کا مقصد، لہو و لعب اور پریشانی زندگی گزارنا قرار دیا، جس کے لئے ایجادات کا

سیل رواں چل رہا ہے۔

(۵) جدید سائنس کا تعلق سرمایہ داری سے ہے، اگر جدید سرمایہ داری کو الگ کر دیا جائے تو جدید سائنس کی بنیادیں ہی متزلزل ہو جائیں گی، جدید سائنس اور سرمایہ داری لازم و ملزوم ہیں۔ (۱)

سائنس اور مفروضات

قیاس و گمان، مفروضات، اندازوں کے ذریعے سائنس کا سفر آگے بڑھتا ہے، کوئی سائنسدان سائنسی نتائج کو قطعی اور حتمی تسلیم نہیں کرتا، سائنسدان کہتے ہیں کہ ہم ایک وقت میں سب کچھ نہیں جان سکتے، ہم ایک وقت میں مادہ کا مقام جان سکتے ہیں یا اس کی رفتار، اسی طرح تمام سائنسی نظریات تجربات کے بعد قائم نہیں کرتے، بہت سے سائنسی نظریات قیاس و گمان، وجدان اور اندازے پر قائم کئے جاتے ہیں، جیسا کہ (yulawa) نے مختلف ذرات کے بارے میں پیشن گوئی کی تھی جو پوری ہوئی، مشاہدات اور تجربات ہونے کے بعد کوئی یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ یہ ثابت کرے کہ یہ ٹھیک ہے، یا غلط۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بڑے بڑے سائنسی نظریے پہلے صرف مفروضات کی سطح پر ہوتے ہیں، تجربات اور مشاہدات کے نتائج کی بنیاد پر اخذ نہیں کئے جاتے، جیسے آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت ۱۹۱۳ء میں منظر عام پر آیا تھا اور اس کی تصدیق و تائید ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی، مفروضات، قیاس، وجدان اور گمان سے بڑے بڑے نظریے وجود میں آتے ہیں، اور بعد میں تصدیق و توثیق ہوتی ہے، لہذا سائنس کو حقیقی علم کیسے کہا جاسکتا ہے؟ (۲)

جدید سائنس کے نقصانات

جدید فلسفہ اور جدید سائنس جس کی بنیاد ہی مذہبی قیود کی آزادی پر رکھی گئی ہے،

ایک مدت سے بڑی آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے کے بعد اپنے ثمرات و برکات دنیا کو دے رہی ہے، آئیے اس چلتی پھرتی دینا کا ایک سرسری جائزہ لے لیں۔

سائنس کی نت نئی ایجادات اور انکشافات انسان کا فائدہ کم اور نقصان کا زیادہ موجب بن سکتی ہیں، ہاتھ سے کام کرنے کے بجائے اگر انسان مشین سے کام کرنے لگے، جانوروں پر سفر کرنے کے بجائے اگر ریل، موٹر اور بحری و ہوائی جہازوں پر میں دوڑنے لگے، ڈاک چوکیوں کے بجائے آج موبائل فون، ٹیلیفون اور انٹرنیٹ پر خبر رسانی ہونے لگی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان پہلے سے زیادہ خوش حال ہو گیا، ان چیزوں سے اس کی جس قدر خوشحالی بڑھ سکتی ہے، آج جنگی سامان، راکٹ، ایٹم اور ہائیڈروجن بم اور ایسے ایسے آتشیں سامان جنگ وجود میں آچکے ہیں کہ اب اگر انسان چاہے تو چند گھنٹوں میں اپنے مسکن یعنی کرہ ارضی کو مخلوق سمیت عدم کی راہ دکھا سکتا ہے، پھر تمدن کے نئے نئے مسائل اور نئے حالات سامنے آنے کی وجہ سے مختلف قسم کے نئے علوم، نئے قوانین حیات، نئے ضوابط سیاست و جہانبانی، نئے اصول تجارت اور نئے انداز کار و بار بھی ایجاد ہو گئے ہیں، ان تمام نئے اسباب و وسائل اور نئی ایجادات و مصنوعات کی اتنی افراط و بہتات کی حالت میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خود حضرت انسان اب کس حال میں ہے؟ اس مشینی دور میں کیا ایسا تو نہیں ہے کہ خود انسان بھی کمانے، کھانے اور اڑانے کی ایک مشین ہی بن کر رہ گیا ہے، ہر وہ انسان جس کے چہرے پر دو آنکھیں، سینے میں دل اور سر میں دماغ موجود ہے، وہ دیکھ سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے کہ مصنوعات اور سامان آرام و آسائش کی کثرت کی بدولت آج انسان کا یہ حال ہے کہ وہ ختم نہ ہونے والی نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کا غلام بن کر قلبی سکون اور روحانی طمانینت کو کھو بیٹھا ہے، پہلے ادوار میں جب کہ طرز زندگی اور فیشن ایک عرصہ کے بعد بدلا کرتے تھے، اب نئے نئے سامان مہیا ہونے کی وجہ سے ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔

انہیں سائنسی ایجادات کی وجہ سے انسان آج اصلی دودھ، گھی اور انڈوں سے محروم ہے، البتہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے گھی، دودھ، پنیر اور دہی دستیاب ہیں، جس کے

(۱) ڈاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق، ۷۷، سمیع الحق، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی

(۲) ڈاکر نائک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق، ۹۹، سمیع الحق، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی

بارے میں ہم نہیں جانتے کہ اس میں خالص حصہ کتنا ہے؟ اور ملاوٹ کتنی؟

تاریخ انسانی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لوگوں کو نیند نہ آئی ہو، سونے کے لئے گھر سے باہر سونے کی دکانوں میں جانا پڑا ہو، یورپ میں لوگوں کو نیند نہیں آتی؛ لہذا ان کی خدمت کے لئے ملٹی نیشنل کمپنیوں نے سونے کی دکانیں کھول رکھی ہیں، جہاں پیسے دے کر سو جائیے، وہ کونسی تہذیب ہے؟ اس کا کیا نظام اور اقدار لی؟ کہ لوگ اپنے گھر کے بستروں کے بجائے بازار میں سونا چاہتے ہیں۔

سائنس و ٹیکنالوجی کی بدولت بے پردگی، عریانی، سینما اور تھیٹر کی زندگی اور محرک اشیاء، شراب وغیرہ کے استعمال سے انسان کے شہوانی جذبات حد اعتدال سے زیادہ براہیجنتہ ہونے لگے، جس کے نتیجے میں صحت اور اعتدال مزاج سے ہاتھ دھونا پڑا، پھر طرح طرح کی بیماریاں اور پھر ہسپتالوں اور علاج و معالجوں کی جکڑ نے انسانی زندگی کو مفلوج بنا رکھا ہے، کسی بالا و برتر طاقت کے سامنے جو ابدهی کے احساس کے فقدان کی وجہ سے ہر معاملہ اور زندگی کے ہر موڑ پر افراط و تفریط کی راہ اختیار کر لی گئی ہے، یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس وقت خواہشات و جذبات کا سمندر موجزن ہو، اسباب مہیا ہوں، کوئی روکنے والا نہ ہو، تو ایک عقل مند اور زیرک سے زیرک انسان کس حد تک جا پہنچتا ہے؟ چنانچہ یورپی ممالک میں مرد وزن کے آزادانہ اختلاط اور ساتھ ساتھ تعدد ازدواج پر پابندی کی وجہ سے ایک طرف تو نکاحوں اور طلاقوں کی بھرمار ہے، خاندانی نظام تباہ ہو کر رہ گیا ہے، کیا ایسی تہذیب جو جدید سائنس زیر سایہ پنپ رہی ہے، اس کو ترقی کا نام دینا کہاں تک موزوں ہو سکتا ہے؟

ماحولیاتی تباہی اور سائنس و ٹیکنالوجی

سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں نئی ایجادات عطاء کی ہیں اور صنعتی سرگرمیوں نے بے پناہ ترقی کر کے انسان کو اس کی ضروریات مہیا کی ہیں، وہاں ان ایجادات نے انسان کو نفسیاتی امراض میں مبتلا کیا ہے اور بہت سے تباہ کن نقصانات بھی پہنچائے ہیں، صنعتی ترقی زمین کے درجہ حرارت میں تیز رفتار اضافہ کا سبب بن رہی ہے، جو محض چند

دہائیوں میں دنیا آگ کی بھٹی میں تبدیل ہو گئی ہے، یہ سب کچھ ان نئی مصنوعات (products) کے استعمال کی وجہ سے جس کی وجہ سے ہر فرد انفرادی لذت حاصل کرنے اور دنیا کو جہنم میں تبدیل کرنے میں لگا ہوا ہے، گذشتہ کئی سالوں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ (Co2) اور گرین ہاؤس گیسز (Green House Gases) برف پگھلنے کے باعث خارج ہو کر فضاء میں شامل ہو رہی ہیں، اور گلوبل وارمنگ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، کئی ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر آئندہ پچاس برس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کے عمل کو کم نہیں کیا گیا تو تباہی پھیل جائے گی۔

اسی ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آرٹک اور بحر اٹلانٹک کی برفانی تہیں اور گرین لینڈ کے علاقوں میں برف مسلسل پگھل رہی ہے، ماہرین کے اندازے کے مطابق ۲۰۵۰ تک دنیا کے ہزاروں شہر ڈوب جائیں گے، تو دوسری طرف عالمی جنگ بھی پانی کے حصول کے لئے لڑی جائے گی۔ (۱)

انسان جس کو سائنس دریافت نہ کر سکی

جدید علماء سائنس طویل تجربہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سائنسدانوں کی عقل و فکر حقیقت انسانی کے ادراک میں بے بس اور ناکام ثابت ہوئی ہیں؛ کیونکہ انسان کے جسم میں حیاتیاتی مظاہر گویا ایک طلسماتی جنگل ہیں جہاں رنگ رنگ کے بے شمار درخت مسلسل طور پر اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں۔

چنانچہ فرانس کے ایک بڑے نامی گرامی کاریل نے پوری ایک کتاب ”نامعلوم انسان“ کے نام سے لکھ ڈالی کہ انسان نے گو بے شمار علوم و فنون کے کتب خانے بھر ڈالے ہیں؛ لیکن خود یہ یا اس کی انسانیت ہے کیا؟ اس سے جاہل ہی چلا جاتا ہے، اس طرح ایک اور بڑے عالم سائنس نے ایک ضخیم کتاب ”سائنس کے نازل مسائل“ پر لکھ ڈالی، اس میں بھی سائنس کا سب سے نازل مسئلہ انسان کو قرار دے کہا:

”سائنس دان کسی بحث و مسئلہ میں اس سے زیادہ عاجز در ماندہ جتنا خود

انسان کے معاملے میں: وہ ایٹم کو توڑ سکتا ہے، بعید سے بعید ستاروں کی روشنی کی تحلیل و تجزی کر سکتا ہے، وہ بجلی کو غلام بنا سکتا ہے، لیکن یہی سائنسدان جب زندگی کی حقیقت اور اس سے بڑھ کر خود اپنی یا انسان کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے تو مشکلات ہی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے“ (۱)

سائنس صرف مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے

سائنس صرف محسوسات، تجربات اور مشاہدات کی بات کرتی ہے، مثلاً جب کوئی آدمی یہ دریافت کرے کہ پانی کیسے بنا؟ تو اس کے اس سوال کے جواب سے یہ منشا ہوگا کہ جواب دینے والا پانی بننے کے واقعے کا تجزیہ کر کے یہ بتلائے کہ جس مرکب کا نام پانی ہے، اس کی ترکیب کن عناصر سے ہوئی ہے اور ان عناصر کے باہم ملانے کا طریقہ کیا ہے؟ تو سوال کا یہ منشا جواب کو واقعات اور ان کے مشاہدات اور ان کے اور ان کے درمیان علت و معلول کے رشتوں کی دریافت تک محدود کر دینا ہے، سائنس صرف محسوسات و مشاہدات اور تجربات کی بات کرتی ہے۔

جب کہ مذہب صرف حسی مشاہدوں ہی نہیں؛ بلکہ بصیرت کی آنکھوں سے ضروری ہے؛ تاکہ اس مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر خدا کو پہچانا جائے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان لوگوں کو اندھا اور بہرا کہہ دیا جو محسوسات میں الجھ گئے؛ حالانکہ وہ حقیقی طور پر اندھے اور بہرے نہیں تھے؛ بلکہ بصیرت اور معرفت خداوندی سے اندھے اور بہرے تھے۔

قرآن مجید میں ارشاد بانی ہے:

”صُمُّ بُكْمٌ عُمًیٰ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ“ اور اک بالحواس کے ہوتے ہوئے اگر

معرفت الہی کی سعادت سے محروم ہو جائے تو اس کو اندھا اور بہرا ہی کہا جاتا ہے، چاہے وہ مادی ترقی کتنا ہی کرے، اسی وجہ سے سائنس اندھی اور بہری جو کسی صورت میں معرفت خداوندی کے لئے کافی نہیں۔

سائنس جو کہ صرف حسی اور مشاہداتی اور تجرباتی حقائق سے گفتگو کرتی ہے اور جو چیز

مشاہدہ اور تجربہ میں نہ آسکے اس کا انکار کرتی ہے، جب کہ مذہب ہزاروں ایسی چیزوں کی باتیں کرتا ہے جو مادہ محسوس ہو، محسوس اور غیر محسوس کا یہ فرق ان دونوں کے درمیان تضاد اور تخالف کو نمایاں کرتا ہے، مثلاً معجزہ، ملائکہ، روح، جنت، دوزخ، حضرت آدم علیہ السلام کا مٹی سے پیدا ہونا، حیات بعد المات، خدا، آخرت، وحی، مذہب میں بنیادی عقائد ہیں اور ایک مذہبی آدمی ان سب عقائد کو محسوس نہ ہونے کے باوجود دل و جان سے قبول کرتا ہے۔ سائنس جو خدا کا انکار کرتی ہے، آخرت اور وحی کا انکار کرتی ہے، اس کی اسلام کاری کیسے ممکن ہو سکتی ہے، البتہ اسے محض اپنے آرام و راحت کے حصول کے لئے ذریعہ ضرور بنایا جاسکتا ہے، لیکن اس کو محض نظر اور مقصد زندگی نہیں بنایا جاسکتا، چونکہ اس سائنس نے اور جدید ایجادات نے انسان کا اپنے خدا سے روحانی رشتہ ختم کر دیا، جس نے خدا کی جگہ ایک نئے دیوتا کا روپ دھار لیا اور جس نے انسان کو قائم بالذات ہونے کے زعم میں مبتلا کر دیا اور اس کو عیش پرست کر دیا۔ (۱)

اقبال یہاں نام نہ لے علم و خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسا مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے مولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم و نباتات

قرآن کی ہزاروں آیتیں جدید سائنس کی مخالف ہیں

بہت سارے لوگوں کا یہ دعویٰ کہ قرآن کے کسی بھی بیان کو جدید سائنس کی روشنی میں غلط نہیں قرار دیا جاسکتا، یہ دعویٰ بالکل غلط اور حقائق سے کوسوں دور ہے اور یہ قرآن اور سائنس کو بے جا ایک لائن میں لا کھڑا کرنا سعی لا حاصل ہے، قرآن بالکل علاحدہ چیز ہے اور سائنس بالکل علاحدہ چیز ہے جیسا کہ مذکور ہوا، قرآن کا مقصد بھی سائنس بیان کرنا نہیں ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ: خدا موجود ہے جو کہ تمام مخلوقات کا رب ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ (۱) ”وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيُّمَا تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ“ (۲) ”إِلَٰهُ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ“ (۳) قرآن کہتا ہے کہ خدا موجود ہے؛ لیکن سائنس تو خدا کا انکار کرتی ہے؛ کیوں کہ سائنسی نظریہ میں اب انسان حواس ظاہرہ اور اپنی عقل کی بناء پر بالغ ہو چکا ہے، اب کسی ماورائے انسان، وجود یا ذریعے سے علم و رہنمائی کا محتاج نہیں، اس کے برعکس قرآن یہ علم اور یقین بخشا ہے کہ خالق کا وجود ہے، وہی خالق کھانا بھی کھلاتا ہے، شفاء بھی بخشتا ہے، اختیار و قدرت بھی صرف اسی کو حاصل ہے، انسان ہر لحظہ اس کا فقیر اور غلام ہے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر آخرت کا ذکر آیا ہے، کیا کوئی جدید سائنس سے آخرت کو ثابت کر سکتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

”مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“ (۴)

اسی طرح صلاۃ (نماز) کا ذکر قرآن میں ۶۷ مقامات پر، رسول پیغمبر انبیاء کا ذکر ۵۰۰ سے زائد مقامات پر، جنت ۷۰ مرتبہ، جہنم ۶۴ مرتبہ، جنات ۷۰ مرتبہ، قیامت: ۶۶ مرتبہ بیان کئے گئے ہیں، لیکن ان میں کوئی بھی چیز جدید سائنس سے ثابت نہیں کی جاسکتی ہے، ان متعدد آیات کا سائنس کے ساتھ ٹکراؤ ہے؛ بلکہ جدید سائنس کی روشنی میں یہ آیات غلط ہیں۔

جدید سائنس عیسائیت سے مادیت پرستی تک

جدید سائنس کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں مادیت پرستی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا، عیسائیت سے مادیت کا یہ سفر کیسے طے ہوا؟ کون اس کا ذمہ دار تھا؟ یورپ

(۱) الفاتحة: ۱

(۲) البقرة: ۱۱۵

(۳) البقرة: ۲۵۵

(۴) البقرة: ۲۶۰

میں نصف سے زیادہ زمینوں کی ملکیت کا کلیسا کے پاس ہونا، کلیسا کی دولت پرستی میں مبتلا ہونا، قوت کے زعم میں مظالم کا ارتکاب یونانی سائنسی نظریات کو عیسائی الہیات و اعتقادات کا حصہ بنانے کے بعد اس کے سائنسی ابطال کو تسلیم کرنے سے انکار اور ان مذہبی و سائنسی نظریات کے ابطال کرنے والوں پر بہیمانہ تشدد کی تاریخ جب کلیسا نے ہزاروں عیسائیوں اور عورتوں پر مظالم کئے، قتل کیا، عورتوں کو زندہ جلادیا، کلیسا کے اخلاقی انحطاط کے نتیجے میں کلیسا کی شکست، کلیسا کی دنیا پرستی اور بربریت کے رد عمل میں یہ پروٹسٹنٹ ازم کا فروغ، تحریک تنویر، تحریک رومانویت، قومی ریاستوں کا قیام، سرمایہ داری کا وجود، جدید فلسفہ اور جدید سائنس کا فروغ، نوآبادیات کا قیام کے نتیجے میں دولت کی لوٹ مار اور اس کے دروازے سمیٹ کر یورپ میں جمع ہونا، سرمایہ دارانہ فکر کا ارتقاء، سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ، امریکی ریاست کا قیام، بنیادی حقوق کے منشور کی تاریخ وغیرہ وغیرہ، ان مباحث پر گہری نظر کے بغیر جدید سائنس کے حیرت انگیز ارتقاء کی کہانی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

سائنس: نیچرل فلاسفی کہلاتی تھی

انیسویں صدی کے آخر تک سائنس نیچرل فلاسفی کہلاتی تھی، لیکن انیسویں صدی کے اختتام پر اسے فلسفہ سے الگ کر دیا گیا اور سائنس خود ایک ذریعہ علم بن گئی، سائنس اور فلسفہ میں جب تک ہم آہنگی تھی چیزوں کی حقیقت اور قدر کا سوال برقرار رہتا تھا مثلاً یہ سوال موجود رہتا تھا کہ میں پانی کیوں پیوں؟ لیکن سائنس جب فلسفہ سے الگ ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سوال بے کار تھا کہ پانی پیا جائے یا نہیں، اس سوال کی ضرورت ہی نہ رہی، اصل سوال یہ ہو گیا کہ اچھے طریقے سے پانی کیوں پیا جائے دلیل (reason) اور (rational) عقلیت جب آلاتی (instrumental) ہو گئے تو سائنس فلسفہ سے الگ ہو گئی، جدید سائنس کا بانی نیوٹن ایک مذہبی شخص اور فلسفی بھی تھا، اس نے بھی سائنس کو فلسفہ سے الگ نہیں سمجھا، اس کی کتاب کا نام (principle mathematical natural philosophy) تھا، نیوٹن نے نصف زندگی مذہبی کتابیں لکھیں، وہ خدا

کے وجود کا قائل تھا؛ لیکن اس کا خیال کہ خدا کائنات بنا کر اس سے الگ تھلگ ہو گیا ہے، اس تصور نے ایک نئے بے خدا سائنس تیار کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا، لطف کی بات ہے کہ ڈیکارٹ نے بھی ذہن سے خدا کا تصور پیش کیا، کانٹ نہایت مذہبی شخص تھا؛ لیکن ڈیکارٹ، نیوٹن اور کانٹ جو خدا کے قائل تھے ان کے پیش کردہ فلسفہ کے نتیجے میں خدا کا وجود مغربی تہذیب و تاریخ سے خارج کر دیا گیا، قدیم سائنس میں خدا کا تصور، خدا کا کردار موجود تھا؛ کیوں کہ وہاں انسان مخلوق تھا، خالق نہ تھا، اپنے مخلوق ہونے کا احساس اسے خدا اور آخرت کے تصورات سے وابستہ رکھتا تھا، لیکن (newonian) تصور کائنات کے بعد کائنات ایک (subject) ہے اور انسان محض (object) اس کے نتیجے میں مادی تصور کائنات وقوع پذیر ہوا جس نے خالق کی جگہ لے کر انسان کو خالق قرار دیا۔

ہندوستان کی دولت ایجادات کی باعث

اٹھارہویں صدی کے وسط تک انگلستان زرعی ملک تھا؛ لیکن پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان کی دولت سمندری طوفان کی طرح انگلستان میں آنے لگی، یہی دولت ایجادات کا باعث بنی، برطانیہ کی صنعتی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر کننگھم نے لکھا ہے کہ ”ایجادیں اتنے بڑے پیمانے پر صرف اس لئے نہیں ہونیں کہ جیسے لوگوں کی ذہانت آناً فاناً پھوٹ پڑی ہو، اصل وجہ یہ تھی کہ ملک میں سرمایہ اتنا اکٹھا ہو گیا تھا کہ ان ایجادات کا مصرف نکلنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا“ اس موضوع پر (leo huberman) کی کتاب (man's worldly goods) بہت سے حقائق آشکارا کرتی ہے، نوآبادیات میں لوٹ مار کہانی مائیکل مین کی کتاب (Darkside of Democracy) اور رومیل کی کتاب (Death by Government) میں پڑھی جاسکتی ہے، مائیکل مین کہتا ہے کہ نسلی قتل عام مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے جس کی بنیاد قوم پرستی پر رکھی گئی جو مغربی تہذیب کی بہیمیت کا فطری جواز مہیا کرتی ہے، اس کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

the unfortunately for us murderous ethnic

cleansing is not primitive or it belongs to
our own civilization and us. most say this
is the rise of nationalism in the world and
this ture

پچاس کروڑ لوگوں کی لاشوں اور کھربوں روپیئے کی لوٹ مار پر جدید سائنس کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، لوٹ مار کی یہی دولت اس حیرت انگیز سائنسی ترقی کی بنیاد بنی جو آج ہر شخص کو فطری حقیقی ضروری اور عین اسلامی معلومات دیتی ہے، کیا مذہبی ریاستیں جبر و استبداد اور لوٹ مار کا مذہبی جواز فراہم کر سکتی تھیں، مذہبی معاشروں میں اس بہیمیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، عیسائیت کی خامیوں، کوتاہیوں اور مذہبی استبداد کے باوجود اس کا موازنہ اگر مہذب متمدن جدید سائنسی یورپی انسانوں کی لوٹ مار سے کیا جائے تو ہمیں مذہبی دور جو مغرب کی اصطلاح میں (dark age) تاریک دور، جدید دور (enlightened) روشن خیال کے مقابلے میں زیادہ شریفانہ، محبت اور قابل رشک نظر آئے گا، اس کے ظلم و جبر بھی لامحدود نہیں تھے، محدود ہی تھے؛ کیوں کہ عسکری آلات بھی اسی علمیات کے نتیجے میں تیار ہوئے تھے، جس کے مطابق تمام مخلوق اللہ کا کنبہ سمجھی جاتی تھی اور اس کنبہ کی ہولناک تباہی کا تصور الہامی مذاہب میں نہیں پایا جاتا، مذہبی تہذیبوں کی سائنس ایٹم بم بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مغربی تہذیب و معاشرت تین سو سال میں ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ، حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ جیسی ہستی پیدا نہ کر سکی، اس سوال کو دوسری طرح بھی دیکھا جائے کہ اسلامی معاشرے میں نیوٹن، آئن اسٹائن کیوں پیدا نہیں ہو سکے اور اسلامی تاریخ جدید سائنس کیوں مہیا نہ کر سکی؟

سائنسی ترقی میں براعظموں کی لوٹ مار: مرکزی عامل

مغربی فکر و فلسفہ سے نکلنے والی خلق جدید کی بہیمیت کی اس تاریخ کو اور سرمایہ داری کی ابتدائی تاریخ کو پڑھیں بغیر سائنسی ایجادات و ترقی کا سبب سمجھ میں نہیں آسکتا، اس

سلسلے میں جو مظالم ہوئے ہیں اور براعظموں کو جس طرح لوٹا گیا ہے خصوصاً امریکہ، آسٹریلیا، افریقہ، ایشیا اور وہاں کے لوگوں کو جس طرح تہس نہس کر کے مال لوٹا گیا، اس کے نتیجے میں صنعتی ترقی اور سائنس کا پہیہ چلا ہے، صنعتی ترقی کے لئے کروڑوں افریقی غلام استعمال ہوئے، اور ہلاک کئے گئے، غلاموں کا اس طرح استعمال کسی مذہبی معاشرے میں نہیں ہوا، ۱۷ ویں صدی سے پہلے ہونے والے عیسائیوں کے مظالم وغیرہ بھی اس کے سامنے بچے ہیں، پھر سرمایہ داری نے مزدور کا جو حشر کیا وہ عبرتناک ہے، جاگیر داری کے زمانے میں ظلم تھا؛ لیکن محدود۔ (۱)

سائنسی تحقیقات کا مقصد: سرمایہ کس کا تھا؟

ہم لوگ سرمایہ کاری کے آغاز ارتقاء کی تاریخ سے واقف نہیں ہیں؛ لہذا سائنسی ایجادات سے متاثر ہو جاتے ہیں، اس وقت بھی جتنی سائنسی تحقیقات ہو رہی ہیں اس کے پیچھے سرمایہ کس کا ہے؟ سائنسی تحقیقات کا مقصد کیا ہے؟ انسانیت کی خدمت؟ یا دولت کمانا؟ دولت کمانا ہی اصل مقصد ہے، لہذا یہ محرک تیزی سے ایجادات کا سبب بن رہا ہے؛ لہذا سائنس یا اس کی ترقی کو مغرب کے فلسفے تاریخ، مابعد الطبیعیات، نوآبادیات میں لوٹ مار، تصور انسان تصور نفس اور تصور کائنات تصور آخرت کو سمجھے بغیر مجرد دیکھنا اور سمجھنا مناسب نہیں ہے، کوئی مذہبی ریاست دوسروں کو لوٹ کر ترقی کا پہیہ نہیں چلا سکتی، ایسے ظالم ترقی یافتہ معاشرے کو ترجیح دینا دین کا تقاضہ بن جاتا ہے۔ آج کل سائنس کمپیوٹر کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی، یعنی آج سائنس ٹکنالوجی کی محتاج ہو چکی ہے، اور ٹیکنالوجی سرمایہ کی محتاج ہے اور سرمایہ صرف سرمایہ کے ذریعے ہی اپنی مقدار میں اضافہ کر سکتا ہے، لہذا سائنس، ٹیکنالوجی اور سرمایہ داری کے مثلث کے بغیر سائنسی ترقی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے؛ چوں کہ ٹیکنالوجی پر بھاری سرمایہ کاری کرنا پڑتی ہے، لہذا سرمایہ کار صرف ان شعبوں میں ٹیکنالوجی پر سرمایہ کاری کرتا ہے، جہاں وہ بھاری منافع حاصل کر سکے، اس کے نتیجے میں سائنس کے افق بڑھنے کے بجائے سکڑ رہے ہیں اور سائنس و ٹیکنالوجی

(۱) اس کے لئے مطالعہ کیجئے مفتی ابولبابہ شاہ منصور کی کتاب ’ہنسائیہ سے امریکہ تک‘

صرف سرمایہ داری کے بہترین خدمت گزار بن گئے ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ سرمایہ طب، آلات حرب و ضرب، تفریحات اور تعیشات فسق و فجور کی صنعتوں میں ہو رہی ہے، جس کا علمی نام میڈیکل ٹیکنالوجی انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے، جدید سائنس و ٹیکنالوجی کو اس حال تک مادیت پرستی کے مغربی فلسفے نے پہنچایا تھا، پہلے پہل سائنس مغربی فکر و فلسفے سے الگ ہو گئی اور اب وہ خود ایک علم بن چکی ہے، حالانکہ دنیا کی تاریخ میں سائنس اور فلسفہ میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، دنیا کا پہلا فلسفی تھیلس سائنس دان بھی تھا، تھیلس کے فلسفے اور سائنس کا مقصد حقیقت مطلق تک رسائی تھا وہ نہیں جو آج کی سائنس اور فلسفے کا محور و مرکز ہے کہ دنیا کی زندگی کو کس طرح خوبصورتی سے بسر کیا جائے اور زمین کو جنت بنا دیا جائے، تمام بڑے بڑے سائنس دان فلسفی تھے، لیکن بیسویں صدی میں صرف سائنس دان پیدا ہو رہے ہیں، یہ سائنس دان فلسفی نہیں ہیں؛ لہذا سائنس کی سمت، اہداف مقرر کرنے والا کوئی عامل باقی نہیں رہا، اس پر نقد کرنے والا کوئی ادارہ اس سے وابستہ نہیں رہا؛ لہذا جدید سائنس جو اول دن سے آزادی کی قدر پر اپنے وجود کا اظہار کر رہی تھی، اب بے مہار ہو گئی ہے اور اس کے پیدا کردہ خطرات کا ازالہ مشکل ہو گیا ہے، اس جدید سائنس کی اسلامی صورت گری ممکن ہی نہیں، البتہ عارضی طور پر دفاعی ضرورت کے پیش نظر اس سے حدود کے اندر استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

انبیاء علیہ السلام کا کام، تسخیر کائنات یا تسخیر قلوب انسانی

مسلمانوں کے زوال پر گفتگو میں بار بار ان کے سائنسی اور جدید علوم و ٹیکنالوجی سے محرومی کو زوال کا اصل سبب قرار دیا جاتا ہے، لیکن جب انبیاء علیہ السلام اور ان کے پیروکار پرانی تہذیبوں سے نبرد آزما ہوئے تو وہ کون سے پڑھے لکھے تھے ان کے پیروکار فلسفی سائنس دان تھے، یا ان پڑھے تھے، قرآن نے بعض انبیاء علیہ السلام کے پیروکاروں کے بارے میں ان کے مخالفین کا قول نقل کیا ہے کہ تمہاری پیروی تو ’اراذل‘ نے اختیار کی ہے اور خود تم مادی طور پر ہمارے مقابلے میں کچھ نہیں، تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت کے جدید علوم تو انبیاء علیہ السلام کے مد مقابل کے پاس تھے؛ لیکن انہوں نے سب پر فتح

پائی، یہ اعتراف کہ ہم تسخیر کائنات میں پیچھے رہ گئے احقانہ اعتراف ہے، اصل بات یہ ہے کہ ہم تسخیر قلوب انسانی میں پیچھے رہ گئے جو انبیاء ﷺ کی دعوت کا اصل مقصد ہے جس کی بنیاد محبت کا بے پناہ جذبہ ہے، انبیاء ﷺ تسخیر کائنات کے لئے انہیں تسخیر قلوب انسانی کے لئے آتے ہیں، یہ کام صرف اور صرف محبت سے ہوتا ہے، عدل و انصاف مساوات سے نہیں، محبت سے کیوں کہ تمام نیکیوں کا سرچشمہ اللہ سے محبت ہے، یہ محبت جتنی مستحکم ہوگی عروج بھی اسی قدر مستحکم ہوگا، انبیاء ﷺ اللہ تعالیٰ سے محبت کا یہ چراغ ہر دل میں روشن کرتے ہیں، اللہ سے محبت کرنے والے انبیاء ﷺ اس محبت کو امتوں میں تقسیم کرتے ہیں، اور ہر دل کو یاد الہی کا آستانہ بناتے ہیں، وہ صرف اللہ سے نہیں اس کی مخلوق سے بھی محبت کرتے ہیں اور مخلوق سے محبت انہیں اس درد مندی سے آشنا کرتی ہے، جس کے ذریعے مخلوق کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے بے قرار ہو جاتے ہیں، ان کی بے قراری اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مداخلت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ فرماتے ہیں: «لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ» (۱) اے نبی (ﷺ)! شاید تم اس غم میں اپنی جان کھود دو گے کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔

محبت کا یہ معاملہ اپنے مخاطب کفار و مشرکین سے صرف انبیاء ﷺ کا نہیں ہوتا؛ بلکہ ان کے پیروکاروں کا بھی یہی رویہ ہوتا ہے؛ اسی لئے قرآن نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو، مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے «تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ» (۲) یہ محبت انبیاء ﷺ اور ان کے امتی اپنی امتوں سے کرتے ہیں اور اس محبت کا چراغ ہر دل میں روشن کرتے ہیں، یہ محبت ہی دلوں کے دروازے کھولتی ہے اور انقلاب پیدا کرتی ہے، انبیاء اور ان کے پیروکاروں کا یہ معاملہ صرف انسانوں سے نہیں ہوتا، تمام مخلوق سے محبت کا یہی عالم ہوتا ہے، امتیوں کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ جانوروں کو کس طرح ذبح کیا جائے کہ انہیں پانی پلا یا جائے، تیز چھری استعمال کی جائے؛ تاکہ انہیں اذیت نہ ہو، خوف زدہ نہ کیا

جائے، زندہ جانور کے سامنے اس کے ساتھی کو ذبح نہ کیا جائے، الگ رکھا جائے، ان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے وغیرہ وغیرہ۔

انبیاء ﷺ انسان تیار کرتے ہیں، مشینیں نہیں

انبیاء ﷺ کتابیں نہیں لکھتے، وہ انسان تصنیف کرتے ہیں، وہ انسان تیار کرتے ہیں، ایسے انسان جو بڑی بڑی کتابوں، بڑے بڑے فلسفوں اور بڑے بڑے سائنس دانوں پر بھاری ہوں؛ کیوں کہ انسان تیار کرنا سب سے مشکل کام ہے، سائنس و ٹیکنالوجی اپنی جدید شکل میں بھی کوئی انسان تیار کرنے سے قاصر ہے، انبیاء ﷺ لوگوں کے دلوں کی دنیا بدلتے ہیں، سائنس و ٹیکنالوجی آسائش دے سکتی ہے، وہ نہ ذہن انسانی کو پڑھ سکتی ہے، نہ دلوں کو بدل سکتی ہے، دلوں کو بدلنے کا طریقہ صرف اور صرف انبیاء ﷺ اور ان کے صالح امتیوں کے پاس ہوتا ہے، انبیاء ﷺ انسانوں کے قلوب تسخیر کرتے، ان کے ذہن تبدیل کرتے اور ان کے طرز زندگی اور طرز معاشرت کو بدل ڈالتے ہیں، وہ امتوں کے موضوعات گفتگو تک بدل دیتے ہیں؛ حتیٰ کہ ان کے سونے اور جاگنے کے اوقات بھی بدل دیتے ہیں، دنیا کو تبدیل کرنا زمین و آسمان کو بدل ڈالنا آسان ہے، لیکن کسی انسان کو تبدیل کرنا محال ہے، یہ کام انبیاء ﷺ اور ان کے امتی کرتے ہیں۔

اللہ پر قربان ہونے میں کامیابی

نظام کائنات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ادنیٰ اعلیٰ پر قربان ہو رہا ہے، ہر بے اہمیت، قیمتی اور اہم چیز پر قربان ہو رہی ہے، جمادات، زمین، پتھر وغیرہ قربان ہو رہے ہیں نباتات یعنی پودوں پر، ان کے لئے بچھ جاتے ہیں، سڑ جاتے ہیں، پھٹ جاتے ہیں، اسی طرح نباتات، پھل پھول، گھاس پھوس قربان ہو جاتے ہیں حیوانات کے لئے اور بڑا سے بڑا درندہ حیوانات میں سے گرفتار ہو جاتا ہے انسان کے ہاتھوں، اب انسان کا قیمتی ہونا یہ ہے کہ وہ رب کریم پر قربان ہو جائے، یہ اس کی اہمیت کا گرجانا ہے کہ وہ اپنے سے ادنیٰ پر اپنے آپ کو کھپائے۔

ڈگری کا روزی سے کوئی تعلق نہیں، حکماء نے کہا: اگر روزی عقل سے ہوتی تو سارے بیوقوف بھوکے مر جاتے اور یہ انسان اتنا مکار ہے کہ اپنی چال بازی سے درندوں کی روزی کھا جاتا ہے، ایک ہی سال ایک ہی ڈگری حاصل کرنے والے ہم سبق و طلباء کا مقدر ایک نہیں ہوتا، ایک باپ کے دو عالم یا دو حافظ بیٹوں کا نصیب بھی ایک نہیں ہوتا؛ لہذا دو کف جو کو مقصد زندگی بنالینا دین اور قوم و ملت کے اعتبار سے نہایت نقصان دہ ہے، سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ موجودہ عصری علوم کو معرفت رب اور خدمت انسانیت سے کاٹ دیا جائے؛ اس لئے سارے عالم میں یہ واقعات سامنے آرہے ہیں کہ جو جتنا بڑا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے وہ اتنی بڑی چوری اور رشوت ستانی اور گھوٹالے میں ملوث ہے، ایک طرف لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم ہو رہے ہیں، دوسری طرف مہیلا عدالتوں اور دارالقضاء میں طلاق و خلع کا بازار گرم ہے، شرح پیدائش گھٹتی جا رہی ہے، مادری شفقت سے دل خالی ہوتے جا رہے ہیں، انجینئروں اور ڈاکٹروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہے اور دارالمعمرین، آرام گھر، اولڈ ایج ہوم کی تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے، جو نیوکلیر کا مالک ہے، وہی انسانیت کا قاتل ہے، دنیا کا سب سے بڑا ڈاکو اور چور ہے، دوائیں اصل مواد سے خالی ہوتی جا رہی ہیں، ڈاکٹر مردوں سے بھی حصول مال کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

علامہ اقبال کیا خوب فرماتے ہیں:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی مگر تیشہ فرہاد بھی ساتھ

اور علامہ اقبال نے اور جگہ فرمایا:

علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

یہ مشینوں کی ترقی ہے نہ کہ انسان کی

کیا انسان بجائے نو مہینے کے دو مہینے میں بننے لگ گیا، بجائے دو پیر کے چار پیر سے چلنے لگ گیا، دنیا گلوبل ویلج تو بن گئی؛ لیکن بہن بھائی کو بھی ایک دسترخوان پر کھانے کے لئے سالوں، مہینوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے، مواصلاتی فاصلہ، کمیونیکیشن گیا پ ختم ہو گیا؛ لیکن محلے کی بیوہ اور یتیم کی خبر لینے والا کوئی نہیں، تیز رفتار سواریاں بڑھ گئیں، پھر بھی انسان کے پاس وقت نہیں، ماؤں کو دو خانہ لے جانے والی اولاد نہیں، ہواؤں میں انسان تو اڑنے لگ گیا؛ لیکن زمین پر چلنے کا سلیقہ نہ مل سکا، انسانی ترقی یہ ہے کہ حیاء میں اضافہ ہو، اخلاق و اقدار میں ترقی ہو، انسانیت کا درد بڑھے، رشتے استوار ہوں، اللہ والی مائیں اور گودیں نصیب ہوں، قوم و ملت کے ہی خواہ، تعمیر کے خواہش مند وجود میں آئیں، موجودہ اسکولس اور کالجس کے فارغین نہ اپنے لئے باعث راحت ہیں، نہ والدین کے آنکھ کا تارہ ہیں، نہ اہل محلہ کے لئے نافع ہیں، نہ حکومت کے لئے نفع بخش ہیں، نہ یہ گاندھی جی کا خواب ہے نہ ابوالکلام اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا نظریہ تعلیم۔

علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

تیرا وجود سراپا تجلی افروغ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیاں ہے تو زر نگار و بے شمشیر
تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود تیرا



اسلام میں عصری فنون کی اہمیت و شرعی حیثیت

اسلام نے علوم دینیہ کے سوا دیگر علوم و فنون کے حصول کو شجر ممنوعہ نہیں قرار دیا، بلکہ ضرورت اور حاجت کے درجے اور مراتب کے لحاظ سے ان علوم اور فنون کے حصول کی بھی ترغیب دی ہے اور ان علوم و فنون کے حصول پر ابھارا ہے جس پر تمدنی زندگی کا دار و مدار ہے اور جن پر انسانی معاشرت، عمرانی ضرورت اور جسمانی آسائش کا مدار ہے، اسلام نے نہ صرف ہمیں دنیاوی، عمرانی، اجتماعی اور معاشرتی ضرورتوں کے لئے دوسرے علموں کے حاصل کرنے کی اجازت دی؛ بلکہ بعض موقعوں پر ہمت افزائی کی ہے اور ان کے تعلیم و تعلم میں دینی حیثیت سے کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھی ہے، ارشاد نبوی ہے: ”أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ“ (۱) ”تم اپنے دنیوی امور کے زیادہ جاننے والے ہو۔“ یہ ملحوظ رہے کہ ہر کام میں اصل مدار انسانوں کی نیتوں پر رکھا گیا ہے؛ اس لئے اگر کسی دنیوی سی دنیوی علم کی تحصیل بھی مثلاً مخلوق خدا کو فائدہ پہنچانے اور شہر و وطن کے لئے لوگوں کو آرام دینے اور اہل و عیال کی پرورش کرنے کے لئے اس نیت سے کئے جائیں ان کے حقوق ادا کر کے اور انہیں فائدہ پہنچا کر حکم خداوندی بجالانے کی توفیق حاصل ہوگی تو بارگاہ الہی سے اسے مقبولیت کی سند عطا ہوگی۔

احادیث میں اس مفہوم کی مختلف روایتیں ہیں مثلاً:

☆ اگر کسی شخص نے اپنے بچہ کے منہ میں ایک لقمہ بھی اس نیت سے ڈالا کہ حکم خداوندی پورا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کا اجر عطا فرمائے گا، بہت سے ایسے عمل جو دنیاوی معلوم ہوتے ہیں وہ حسن نیت سے اخروی اعمال بن جاتے ہیں، اور بہت سے وہ عمل جو دینی نظر آتے ہیں، وہ نیت کی برائی سے دنیوی بن جاتے ہیں۔

بہر حال اس حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے دنیوی امور سے متعلق علوم کی جانکاری کی ترغیب دی ہے اور ان پر بھی علم کا اطلاق کیا ہے، البتہ وہی اخلاص نیت، خدمت خلق اور حلال رزق کی تلاش اس سے مقصود ہو۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان جو بھی میوہ دار درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس سے پرندے، آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں اس کا ثواب اس کو ملتا ہے: ”فَيَأْكُلُ مِنْهُ سَبْعٌ أَوْ طَائِرٌ أَوْ شَيْءٌ إِلَّا كَانَ لَهُ فِيهِ أَجْرٌ“ (۱) پودا لگانے پر وہ اگر کسی جانور کے لئے نفع بخش ہو جائے تو اس میں ثواب ملتا ہے تو کیا انسانی جان کی حفاظت کے لئے اگر کوئی انجکشن اور کوئی ٹائبلٹ وغیرہ بناتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملے گا؟

☆ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کی دو باتوں کو یاد کر رکھا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر بھلائی فرض کر دی ہے تو جب بھی تم قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو اور جب بھی تم ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو اور تم میں سے ایک کو چاہئے کہ اپنی چھری کو تیز کرے اور اپنے جانور کو آرام دے۔ (۲)

جب جانور کے ذبح کرنے میں مہارت اور لیاقت ضروری ہے تو کیا انسان کے آپریشن اور رہائش کے لئے تعمیرات میں مہارت ضروری نہیں؟ چنانچہ انجینئرنگ اور میڈیکل میں مہارت ضروری ہوئی۔

☆ ہر اچھی اور مفید چیز میں مہارت اور قابلیت مطلوب ہے اس کی طرف حضور اکرم ﷺ کی یہ روایت اشارہ کرتی ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ عز و جل یہ پسند کرتا ہے جب کوئی کام کیا جائے تو مہارت کے ساتھ کیا جائے:

(۱) مسلم: باب فضل الغرس والزرع، حدیث: ۴۰۵۲

(۲) مسلم: باب الأمر بإحسان الذبح، حدیث: ۵۱۶۷

(۱) مسلم: باب وجوب امتثال ما قالہ، حدیث: ۲۳۶۳

”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ إِذَا عَمِلَ أَحَدُكُمْ عَمَلًا أَنْ يُتْقِنَهُ“ (۱)

☆ اور ایک روایت میں پیشہ ور مومن کی فضیلت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُؤْمِنَ الْمُحْتَزِفَ“ (۲) اللہ عزوجل پیشہ ور مومن کو پسند فرماتے ہیں۔

☆ اور ایک جگہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ”إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ“ (۳) اللہ عزوجل جمال کے حامل ہیں اور جمال اور خوبصورتی کو پسند فرماتے ہیں۔

اس میں جسمانی ظاہری جمال کے ساتھ کردار کا جمال، کارکردگی کا جمال، خدمات کا جمال شامل ہے، ہر وہ چیز جس میں کمال و جمال حاصل کیا جانا اللہ کی مشیت کے موافق ہو۔

اسی کو مرحوم اکبر الہ آبادی نے یوں کہا تھا:

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پر جھولو
بس ایک سخن بندہ ناچیز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو علم نجوم اور علم انساب سیکھنے کا حکم کیا تھا:

”تم علم نجوم سیکھو، تاکہ تم خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہیاب ہو جاؤ، پھر اس سے رک جاؤ“ (تَعَلَّمُوا مِنْ هَذِهِ النُّجُومِ تَهْتَدُوا بِهِ فِي ظُلُمَاتِ اللَّيْلِ وَالْبَحْرِ ثُمَّ أَمْسِكُوا) اور ایک روایت میں ہے: تم علم نجوم سیکھو تاکہ راستے

(۱) شعب الایمان: الأمانات وما يجب أدائها إلى أهلها، حدیث: ۵۳۱۲، علامہ بیہقی فرماتے ہیں: اس کو ابویعلیٰ نے روایت کیا ہے، اس میں مصعب بن ثابت ہیں جن کی ابن حبان نے توثیق کی ہے اور ایک جماعت نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔

(۲) المعجم الاوسط: من اسمه مقدم، حدیث: ۸۹۳۴، اس حدیث کو سالم سے عاصم بن عبید اللہ کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اسی سند سے مروی ہے، اس کو روایت کرنے میں ابوالریح السمان منفرد ہیں۔

(۳) مسلم: باب تحريم الكبر وبيانها، حدیث: ۹۱

کی رہنمائی حاصل کر سکو اور علم انساب سیکھو تاکہ صلہ رحمی کر سکو، رشتہ داری جوڑ سکو
”تَعَلَّمُوا مِنْ هَذِهِ النُّجُومِ تَهْتَدُوا بِهَا وَتَعَلَّمُوا مِنَ الْأَنْسَابِ مَا تَتَوَصَّلُونَ بِهَا“ (۱)

☆ نبی کریم ﷺ نے غزوہ خندق کے موقع سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے ایرانیوں کی معروف جنگی حکمت عملی سے فائدہ اٹھایا تھا اور مدینہ کے اطراف ان کے مشورہ کے مطابق خندق کھدوائی تھی اور اس طرح دشمنوں کے حملہ کے خطرے سے حفاظت کر لی تھی۔ (۲)

☆ ان ہی سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے غزوہ طائف کے موقع پر آپ ﷺ نے دو نئے آلات حرب استعمال فرمائے جو بعض روایات کے مطابق حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے خود اپنے ہاتھ سے بنائے تھے، ان میں ایک منجنیق تھی جسے اس زمانے کی توپ کہنا چاہئے، اور دبا بے تھے جسے اس دور کے ٹینک کہا جاسکتا ہے۔ (۳) اس زمانے کے اعتبار سے نشانے پر مارنے والی ٹکنا لوجی حاصل کرنا اور اس کا صحیح استعمال کرنا بھی ضروری ہے۔

☆ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

آپ ﷺ نے دو صحابہ حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت غیلان رضی اللہ عنہ کو باقاعدہ شہر ”جرس“ بھیجا، تاکہ وہاں سے دبا بے، منجنیق اور صنوبر کی صنعت سیکھ کر آئیں، ”جرس“ شام کا مشہور صنعتی شہر تھا اور صنوبر دبا بے کی ہی طرح کا ایک آلہ تھا، جسے اہل روم جنگوں میں استعمال کرتے تھے، چنانچہ یہ دونوں صحابہ غزوہ حنین اور غزوہ طائف میں اسی لئے شریک نہ ہو سکے کہ وہ دونوں حضرات شام میں یہ صنعت

(۱) حیاة الصحابة: ۲/۲۸۷، کنز العمال: علم النجوم، حدیث: ۲۹۴۳۰۔

(۲) سیرت ابن ہشام: ۲/۲۲۲ (۳) البداية والنهاية: ۴/۳۲۸

سیکھ رہے تھے۔ (۱)

☆ حافظ ابن جریر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

”زراعت کی ترقی کے لئے آپ نے اہل مدینہ کو زیادہ سے زیادہ کاشت کرنے کا حکم دیا اور پیداوار کو بڑھانے کے لئے یہ تدبیر بتائی کہ کھیتوں میں اونٹوں کی کھوپڑیاں استعمال کیا کریں“ وَأَكْثَرُوا فِيهَا مِنْ الْجِمَاءِ (۲)

زراعت اور معدنیات سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
”اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِي خَبَايَا الْأَرْضِ“ یعنی زمین کی پوشیدہ نعمتوں میں رزق تلاش کرو“ (۳)

☆ عرب بحری بیڑے سے ناواقف تھے، لیکن حضور ﷺ نے مسرت کے ساتھ پیشن گوئی فرمائی کہ میری امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے سمندری موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت نشین بادشاہ

”يَرْكَبُونَ هَذَا الْبَحْرَ الْخَضِرَ كَالْمَلُوكِ عَلَى الْأَسْرِ“ (۴) اور پھر مسلمانوں کی پہلی بحریہ کے بیڑے کے فضائل بیان فرمائے، چنانچہ حضرت معاویہ رحمہ اللہ نے حضرت عثمان غنی رحمہ اللہ کے عہد خلافت میں پہلا بحری بیڑا تیار کیا، اور اس سے مسلمانوں کی تگ و تاز، قبرص اور صقلیہ تک پہنچ گئی، یہاں تک پورا بحرہ روم ان کے لئے مسخر ہو گیا۔

☆ حضرت ابن زبیر رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے سوغلام تھے، ان میں

(۱) طبقات ابن سعد: ۲/۲۲۱، تاریخ طبری: ۱۶۶۹، البدایہ والنہایہ: ۴/۳۲۸

(۲) کنز العمال: أنواع الکسب، حدیث: ۹۸۷۶، ابن جریر کہتے ہیں: یہ سند ہمارے یہاں صحیح ہے۔

(۳) مسند ابی یعلیٰ، مسند عائشہ، حدیث: ۴۳۸۴، علجونی نے ”کشف الخفاء: ۱/۱۳۸، دار احیاء التراث العربی“ میں کہا ہے کہ اس کو ابو یعلیٰ، طبرانی اور بیہقی نے سند ضعیف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

(۴) بخاری: کتاب الجہاد، فضل من یصرع فی سبیل اللہ، حدیث: ۲۶۴۶۔

سے ہر غلام علاحدہ زبان میں گفتگو کرتا تھا، چنانچہ حضرت ابن الزبیر رحمہ اللہ کو ان غلاموں میں سے ہر ایک کی زبان پر درک حاصل تھا، اور وہ ہر ایک سے اس کی زبان میں گفتگو کرتے تھے، عمرو بن قیس راوی کہتے ہیں:

”میں جب ان کو ان کے دنیوی امور و مشاغل میں دیکھتا تو ان کی دانائی اور دانشمندی سے یہ باور کرتا کہ: یہ شخص لمحہ بھر کے لئے اللہ کا طلب گار نہیں ہوگا اور جب میں ان کے دینی امور اور مشاغل کو دیکھتا تو لگتا کہ شاید یہ شخص لمحہ بھر کے لئے دنیا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا“ (۱)

”إِذَا نَظَرْتُ إِلَيْهِ فِي أَمْرِ دُنْيَاةٍ قُلْتُ: هَذَا رَجُلٌ لَمْ يُرِدِ اللَّهَ طَرَفَةَ عَيْنٍ، وَإِذَا نَظَرْتُ إِلَيْهِ فِي أَمْرِ آخِرَتِهِ قُلْتُ: هَذَا رَجُلٌ لَمْ يُرِدِ الدُّنْيَا طَرَفَةَ عَيْنٍ“ (۲)

اقوال اکابر

چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ نے حدیث نبوی ﷺ ”طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ“ (۳) پیش کر کے جس علم کی تحصیل ہر مسلم پر ہے، اس کو دکھا کر اس علم کا بیان جس کی تحصیل فرض کفایہ ہے، کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”علوم کی اولاد دو قسمیں ہیں: (۱) علوم شرعیہ (۲) علوم غیر شرعیہ۔

علوم شرعیہ سے میری مراد وہ علوم ہیں جو انبیائے کرام علیہم السلام سے براہ راست حاصل ہوتے ہیں، ان کی طرف عقل کی رہنمائی اس طریقہ سے نہیں ہو سکتی، جیسے عقل کے ذریعہ علم حساب سیکھا جاتا ہے، نہ وہ تجربہ سے حاصل ہو سکتے ہیں جیسے علم طب کی تدوین ہوتی ہے اور نہ محض سننے سے ان کا حاصل کرنا ممکن ہے، جیسے علم لغت حاصل کیا جاتا ہے۔

(۱) حیاة الصحابة: ۳/۲۷۸

(۲) المستدرک: ذکر عبد اللہ بن الزبیر، حدیث: ۶۳۳۵

(۳) احیاء علوم الدین: الباب الثانی فی العلم: ۱/۱۴، دار المعرفۃ، بیروت

اس کے بعد جو علوم غیر شرعیہ ہیں، ان میں بعض پسندیدہ ہیں اور بعض ناپسندیدہ اور بعض ایسے جو صرف درجہ مباح رکھتے ہیں“

- ۱- علوم پسندیدہ وہ ہیں جن سے دنیاوی امور کی مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں جیسے علم طب اور حساب وغیرہ، پھر ان علوم پسندیدہ میں اپنے درجوں کے لحاظ سے بعض ایسے ہیں جن کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، بعض ایسے ہیں جنہیں حاصل کرنا افضل ہے اور بعض ایسے ہیں جن کو حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی تحصیل فرض نہیں ہے۔
- پھر ان میں سے فرض کفایہ وہ علم ہے جس سے ہم دنیاوی زندگی اور کاروبار کے قائم اور باقی رکھنے میں بے پروا نہیں ہو سکتے، جیسے علم طب ہے کہ اس کی تحصیل صحت کے باقی رکھنے کے لئے لازم ہے، یا علم حساب ہے مختلف معاملوں، وصیتوں اور ترکہ کی تقسیم میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کوئی شہر ان علوم کے جاننے والوں سے خالی ہو جائے، تو شہر والوں کو دقت پیش آئے گی، اور جب کوئی شخص بھی ان کا جاننے والا ان کے درمیان پیدا ہو جائے تو اس کے ذریعہ سے شہر کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں، اسلئے یہ فرض اس کی موجودگی میں دوسروں کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، اسی طرح مختلف پیشے کا شتکاری، باغبانی، پارچہ بانی، ایسے ہی، حجامت اور خیاطی وغیرہ ہیں، کہ اگر ان میں سے کسی پیشہ والے سے کوئی شہر خالی ہو جائے تو زحمت پیش آئے اور بعض پیشہ والوں کی غیر موجودگی میں ہلاکت تک کی نوبت آجائے، پس جس نے بیماری اتاری، اس نے دوا بھی بتائی، ان کے استعمال کے طریقے بتائے اور ان کے مہیا کرنے کے اسباب پیدا کئے، اسلئے ان پیشوں کو چھوڑنا جائز نہ ہوگا۔
- اور بعض علوم جن کا حاصل کرنا فرض نہیں، مگر افضل ہے، وہ جیسے علم حساب و طب میں باریکیاں پیدا کرنا ہے کہ انسان ان سے مستغنی نہیں ہو سکتا ہے؛ لیکن ان کی تحصیل سے فائدہ پہنچنے کے پہلوؤں میں اضافہ ہوتا ہے۔
- ناپسندیدہ علوم میں سحر، شعبدہ بازی، اور نظر بندی وغیرہ ہیں اور علم مباح میں جیسے

- ایسے اشعار کا پڑھنا جن میں رکاکت نہ ہو یا علم تاریخ وغیرہ سے دلچسپی رکھنا ہے“
- پھر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک دوسرے موقع پر بھی ”علم“ کے مصداق میں مختلف علوم اور پیشوں کو داخل کیا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:
- ”جب علم تمام امور میں افضل ہے تو اس کا حاصل کرنا افضل چیز کا حاصل کرنا ہے اور اس کی تعلیم دینا افضل چیز کا مہیا کرنا ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے مقاصد دین اور دنیا دونوں کے مجموعہ پر مشتمل ہے، کیونکہ دین کا نظام جب تک دنیاوی نظام قائم نہ ہو، قائم نہیں ہو سکتا اور امر دنیاوی کا انتظام انسانوں کے کاموں اور پیشوں پر موقوف ہے اور انسانی پیشے تین قسم کے ہیں:
- ایسے پیشے جو عالم کے قیام کے لئے بنیاد کے طور پر ہیں اور وہ چار ہیں:
- (۱) زراعت انسان کی غذا کے لئے (۲) پارچہ بانی تن پوشی کے لئے (۳) تعمیر سکونت کی جگہ کے لئے (۴) اور سیاست خاندان اور ملک کے نظام اور معیشت کے اسباب کے مہیا کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے۔
- ۲- دوسرے وہ پیشے جو ان چاروں پیشوں کے لئے آلات اور وسیلے مہیا کریں، جیسے لوہاری، اور ندانی (دھناتی) وغیرہ۔
- ۳- تیسرے وہ پیشے ہیں جو پہلی قسم کے پیشوں کو مدد پہنچائیں، جیسے کھانا پکانے اور سینے پروانے وغیرہ کے پیشے۔
- ان سب پیشوں میں پہلی قسم کے پیشوں کو فضیلت حاصل ہے، اور ان میں سے بھی سے افضل سیاست کا پیشہ ہے جس سے نظم اور ضبط کا وجود عمل میں آتا ہے اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی اصلاح کی جاتی ہے اور انہیں حق کی راہ دکھائی جاتی ہے۔
- پیشہ سیاست کے چار درجہ قرار پاسکتے ہیں:

(۱) پہلے درجہ میں انبیائے کرام علیہم السلام کی سیاست ہے جو وہ اپنے پیغاموں سے خلق کی رہبری فرماتے ہیں۔

(۲) دوسرا درجہ خلفاء اور سلاطین کو حاصل ہے، ان کے احکام عوام و خواص پر نظم و انتظام کے لئے جاری ہوتے ہیں؛ لیکن ان کی حکومت ظاہر پر ہوتی ہے، باطن پر نہیں۔

(۳) تیسرے علمائے کرام ہیں، یہ انبیاء کرام کے وارث ہیں ان کی حکومت لوگوں کے دلوں پر ہوتی ہے اور یہ باطن کی اصلاح کرتے ہیں۔

(۴) چوتھے واعظ ہیں جو صرف عوام کی اصلاح کرتے ہیں۔

پس ان پیشوں میں سب سے بڑھ کر پیشہ نبوت کے بعد علم کا فائدہ پہنچانا اور لوگوں کو تہذیب اور اخلاق سکھانا ہے اور یہی فن تعلیم کا حقیقی مقصود ہے، (۱)

اس کے ساتھ اسلامی نقطہ نظر سے علم دین کے حاصل کرنے والوں کے لئے یہ بھی جائز نہ تھا کہ وہ اس علم کی فضیلت پر ناز کر کے دوسرے غیر شرعی علوم کو حقارت سے دیکھیں؛ کیونکہ دنیاوی زندگی میں ان علوم کی ضرورتیں مسلم تھیں، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بحث میں اس لحاظ سے بھی گفتگو کی ہے اور نتیجہ کے طور پر دکھایا ہے کہ علم دین حاصل کرنے والوں کی مثال ان مجاہدین سے دیجا سکتی ہے جو جہاد کے میدان میں اپنا سر تھیلی پر لئے دین کی حمایت میں لڑ رہے ہیں اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے والوں کی مثال فوج کے اس دستہ سے دی جائے گی جو سرحدی قلعوں پر سرحد کی حفاظت کیلئے متعین ہوتا ہے۔ (۲)

یہ کیا جاسکتا ہے کہ علم نافع میں بھی وہ علم مقدم ہے جو مقصد زندگی ہے جس سے آدمی اپنے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات کو درست کرتا ہے یہ فرض

(۱) احیاء علوم الدین: الباب الثانی فی العلم: ۱/۱۴، دار المعرفۃ، بیروت

(۲) احیاء علوم الدین: الباب الثانی فی العلم: ۱/۱۴، دار المعرفۃ، بیروت

عین ہے، اور جو علم ضرورتِ زندگی ہے (جیسے ڈاکٹر، انجینئر) اس کا درجہ بعد کا ہے اور وہ فرض کفایہ ہے، ضرورتِ زندگی والا علم بھی ایمانی مزاج کے ساتھ ساتھ ہی انسانیت کے حق میں نفع بخش ہو سکتا ہے، کتنے انجینئروں کو اپنے والدین کی خدمت تو کجا ان کے جنازہ کو کا ندھا دینا بھی نصیب نہیں ہے، اور کتنے ڈاکٹر مردہ جنازوں کو زندہ بتلا کر روپے بٹورتے ہیں، کتنے نج غلام زانی کے حامی بن چکے ہیں، کتنوں نے سائنس کو پڑھ کر بجائے قدرتِ خداوندی کے معترف ہونے کے ملحد اور بددین ہو گئے۔

ہر وہ علم جس سے دین یا دنیا میں انسانیت کو فائدہ پہنچ سکتا ہو اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اسلام علم و حکمت کو گمشدہ خزانہ قرار دیتا ہے، آپ نے عبرانی اور سریانی زبانوں کے سیکھنے کی تعلیم دی۔

عباسی خلیفہ مامون رشید نے ۱۲۵ھ میں ”بیت الحکمت“ قائم کیا، یہ ایک علمی انجمن تھی، جس میں ایک رسد خانہ اور پبلک لائبریری تھی، اس کام کے لئے مامون نے دو لاکھ درہم خرچ کئے جو اس زمانے کے اعتبار سے سات ملین سے زیادہ ہوتے ہیں اور مترجمین کا ایک ایسا گروہ ملازم رکھا جو مختلف زبانوں اور علوم میں مہارت رکھتے تھے۔

مامون نے ”ابن طریق“ اور ”حجاج بن مطرح“ جیسے لوگوں کو جو مختلف زبانوں کے ماہر تھے، دوسرے ممالک میں اس لئے بھیجا کہ وہاں سے ہر فن کی علمی کتابیں مثلاً طب، فلسفہ، ریاضی کی تصانیف جو ہندی، کلدانی، عبرانی، یونانی زبانوں میں لکھی گئی ہوں، خرید خرید کر بغداد روانہ کر دیں، مورخین نے لکھا ہے ان کتابوں کو سو (۱۰۰) اونٹوں پر لادا گیا۔ (۱)

مسلمانوں کے ہر نفع بخش علوم کے تئیں حصول کا جذبہ اس سے سمجھ میں آتا ہے؛ چنانچہ یورپی مؤرخ لکھتا ہے:

”جس زمانہ میں کتاب والا بیچیری یورپ والوں کے لئے کوئی اہمیت

(۱) دائرة المعارف بحوالہ دینی و عصری تعلیم۔ مولانا سید احمد میض ندوی مدظلہ

نہیں رکھتی تھی اور تمام کلیساؤں میں راہبوں کے پاس سو سے زیادہ کتابیں نہ تھیں، اور وہ بھی مذہبی تھیں، اس وقت بھی اسلامی ممالک میں کافی سے زیادہ کتابیں اور لائبریریاں تھیں، خود بغداد کی لائبریری بیت الحکمت میں چار ملین اور قاہرہ کی لائبریری میں ایک ملین اور طرابلس کی لائبریری میں تین ملین کتابیں تھیں، اور تنہا اسپین میں سالانہ ستر، اسی ہزار کتابیں اکٹھا کی جاتی تھیں“ (۱)

بہر حال روزِ اول سے ہی اسلام نے ضروریاتِ زندگی سے متعلق علوم و فنون کو سیکھنے کی ترغیب دی تھی، خود حضراتِ انبیاء ﷺ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نبی کریم ﷺ تک ضروریاتِ زندگی سے متعلق فنون کو انبیاء ﷺ نے بذاتِ خود برتا ہے، یا اس کی ترغیب دی ہے، پھر یہ سلسلہ اسلام کی تاریخ میں عہدِ اخیر تک رہا ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

”دشمن کے مقابلے کے لئے قوتِ حرب (جنگی طاقت) کو اس حد تک بڑھانا چاہئے کہ دشمن پر ہیبت طاری ہو جائے، ہمارے پہلے خلفاء و سلاطین اس حکم پر پوری طرح عامل تھے، حضرت معاویہ رحمۃ اللہ نے خلافتِ عثمانیہ میں پانچ سو بحری جہازوں کا جنگی بیڑہ تیار کیا تھا، دشمن کی جنگی قوت کی مدافعت کا پورا سامان تیار کرتے تھے، دوسروں کے دستِ نگر نہ تھے، جیسے آج کل ہم دوسروں کے محتاج ہیں، سب مسلمانوں کو مل کر اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کرنے چاہئے، اور نئی نئی ایجادیں بھی کرنی چاہئے، یہ سب ”أَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ“ میں داخل ہیں“ (۱)

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب عثمانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”صبر و تقویٰ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان و توکل تو مسلمانوں کی اصل

اور ناقابلِ تسخیر طاقت ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر زمانے اور ہر مقام کے مناسب اسلحہ اور سامانِ جنگ بھی جمع کیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ جنگی مشقوں کا اہتمام فرمایا، اس زمانے میں جنگ کے جوہر تھے ان کو جمع کرنے کی ہدایتیں فرمائیں، امام حدیث و تفسیر ابن کثیر نے اپنی تاریخی کتاب ”البدایۃ والنہایۃ“ میں غزوہ حنین کے تحت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دو صحابہ حضرت عروہ بن مسعود رحمۃ اللہ علیہ اور غیلان بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ اس جہاد میں اسلحے شرکت نہیں کر سکے کہ وہ بعض جنگی اسلحہ اور سامانوں کی صنعت سیکھنے کے لئے دمشق کے مشہور صنعتی شہر میں اس لئے گئے تھے کہ وہاں دباہ اور صنوبر کی وہ جنگی گاڑیاں بنائی جاتی تھیں جن سے اس وقت ٹینکوں جیسا کام لیا جاتا تھا، اسی طرح منجنیق کی صنعت بھی وہاں موجود تھی۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ملک کو جنگی اسلحہ اور سامان کے لئے خود کفیل بنائیں، دوسروں کے محتاج نہ رہیں ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ جنگی گاڑیاں اور منجنیق وہاں سے خرید کر درآمد کر لی جاتیں، ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر غور کریں..... ہم جیسے لوگوں کو اس کی ضرورت کس قدر زیادہ ہے، موجودہ زمانے میں جنگ کے لئے جس طرح اسلحہ اور آلات اور سامان کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی سے پیچھے نہ رہیں اور اس کوشش میں لگ جائیں تو قریب سے قریب مدت میں ان چیزوں کے لئے اپنے ملک کو خود کفیل بنا سکیں“ (۲)

حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ نت نئی ایجادات اور یورپی صنعتی انقلابات اور اس

کے زندگی پر اثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

(۱) ماہنامہ البلاغ: جمادی الاولیٰ: ۱۳۷۸ھ

(۲) جہاد: ۵۳-۵۶، مطبوعہ کراچی

(۱) تاریخ تمدن اسلام و عرب: ۳۲۹/۳، بحوالہ دینی و عصری تعلیم: از مولانا سید احمد میض ندوی مدظلہ

”اس سلسلے میں ہمیں عرض کرنا یہ ہے کہ یورپ کے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبہ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ دو قسم کی ہیں: کچھ تو تبدیلیاں وہ ہیں جو موجودہ ترقی کے لئے ناگزیر اور ضروری تھیں اور ان کے بغیر سائنس اور ٹکنالوجی کا موجودہ معیار تک پہنچنا ممکن نہ تھا، انہی کی بدولت دنیا میں نئی ایجادات سے آشنائی، بڑے بڑے کارخانے بنے، پل تعمیر ہوئے، بند باندھے گئے، اور انسانی معلومات میں مفید اضافے ہوئے، صنعتی انقلاب کا پہلو بلاشبہ قابل تعریف ہے، عالم اسلام کے لئے اس میدان میں آگے بڑھنا ضروری ہے، اور اسلام نہ صرف یہ کہ اس راہ میں کوئی رکاوٹ عائد نہیں کرتا؛ بلکہ ”اعداد قوت“ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ تبدیلیاں وہ ہیں جو صنعتی اور مادی ترقیات کے لئے ہرگز ضروری نہیں تھیں، مغرب نے انہیں خواہ مخواہ صنعتی انقلاب کے سرمنڈھ دیا تھا، چنانچہ آج وہ بھی اپنی اس خامکاری پر نوحہ پڑھ رہا ہے، فحاشی و عریانی، مخلوط اجتماعات، رقص و موسیقی، سوا و ضبط و ولادت وغیرہ“ (۱)

اس سلسلے میں شاہ محدث ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”حجة الله البالغة“ میں منصف تر اربع الاداریۃ نے اور علامہ تلمسانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”التراتیب الاداریۃ والدالات السبعیۃ“ میں بسط و تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے کہ اسلام شعبہ معاشیات و انتظامیات میں کیا رہبری کرتا ہے، قانون بین الممالک یعنی انٹرنیشنل لایمیں ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی کی تحریریں اردو، عربی، فرانسیسی زبان میں بے مثال ہیں، حربیات و عسکریات پر مختلف مسلمان جنرلوں نے اردو اور عربی زبان میں بہت خوب لکھا ہے، کاش ہم لوگ متقدمین علماء کی ان ساری خوبیوں سے فائدہ اٹھاتے اور نسل نو کو عصری لب و لہجہ

میں پیش کر پاتے، اس طرح انسانیت کے نہایت پیچیدہ مسائل کا حل بھی ہو جاتا اور ہمارے نوجوانوں میں خود اعتمادی و داعیانہ کردار بھی بلند ہو جاتا۔

صوبہ آندھرا پردیش کے امیر تبلیغی جماعت محترم الحاج نعیم اللہ خان صاحب بہت اہتمام سے مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ نقل فرماتے ہیں:

”عصری طلبہ میں تبلیغی کام گویا یورپ کا اسلام ہے، یعنی ان تمام طلبہ کو اگر تقویٰ والی زندگی کے ساتھ اپنے ہنر کا ماہر بنادیا جائے اور دعوت کی صفات سے آراستہ کر لیا جائے تو جس صوبہ و حکومت میں وہ جائیں گے اسلام کا صحیح نمائندہ بنیں گے، جس ملک اور یونیورسٹی میں جائیں گے اپنے ایمان کا سودا نہیں کریں گے، ان کی بے داغ جوانی اور پاک دامنی، معاملات کی صفائی اور حسن معاشرت یورپ کی پیاسی قوم کے لئے دعوت کا ذریعہ بن جائے گا۔“

مختلف زبانوں کے سیکھنے کی اہمیت و فضیلت

آج پوری امت کو بالخصوص عصری مدارس کے طلباء کو یہ بات پوری قوت سے سمجھانے کی ضرورت ہے کہ دین کی ضروری باتیں جاننے کے ساتھ دوسری زبانوں میں مہارت حاصل کرنا اس کی دعوت دینے کے لئے بھی ضروری ہے اور تجارت و ملازمت کرنے کے لئے اور بھی تحقیق شدہ بات ہے کہ بحیثیت زبان اسلام کسی زبان کی مخالفت نہیں کرتا، لیکن اگر کوئی قرآن و حدیث اور اس کی زبان کو بالکل چھوڑ دیتا ہے یا ہلکا سمجھتا ہے اور دوسری زبانوں میں بولنے کو باعث فخر سمجھتا ہے یا اغیار کی زبان سیکھنے کے ساتھ ان کے مزاج و طبیعت کو بھی قبول کر لیتا ہے، ان کی تہذیب و تمدن میں ڈوب جاتا ہے تو اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، آج مصیبت یہ ہے کہ ہمارے طلبہ انگریزی زبان جاننے سے پہلے انگریز بن جاتے ہیں، یا انگریزی زبان کم سیکھتے ہیں اور انگریزی تہذیب زیادہ جذب کر لیتے ہیں، اس لئے ذیل کی روایتوں میں ان سارے پہلوؤں پر غور کر لیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ایران کے فتح ہونے سے پہلے فارسی زبان جو ایرانی روایات و تہذیب و معاشرت کی ترجمان تھی، اسلامی روایات اور تمدن سے بالکل متضاد تھی، اس لئے اسلام نے فارسی کی عمومی تعلیم کی اجازت نہیں دی، کیونکہ اس صورت میں فارسی زبان کے راستہ سے ایرانی روایات و طرز معاشرت کے اسلامی معاشرے میں راہ پانے کا اندیشہ تھا، جس کی وجہ سے عرب قوم فارسی سے مانوس ہونے کی بناء پر کچھ تو اپنی عربی تہذیب کی نمائندگی کرتی اور فارسی زبان کے راستہ سے اس کے روایات کو بھی اپنے اندر سموتی، کچھ ادھر کچھ ادھر کے ہو جاتے، اس کو حضور ﷺ نے نفاق سے تعبیر فرمایا: «مَنْ يُحْسِنُ أَنْ يَتَكَلَّمَ بِالْعَرَبِيَّةِ فَلَا يَتَكَلَّمُ بِالْعَجَمِيَّةِ فَإِنَّهَا يُورِثُ الدِّفَاقَ» (۱) جو عربی اچھی طرح بول سکتا ہے وہ (عجمی) نہ بولے؛ کیونکہ وہ نفاق پیدا کرتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی تھی «إِيَّاكُمْ وَرِطَانَةَ الْأَعْرَابِ» عجمیوں کی سی بک کب سے بچو، اور فرمایا کہ وہ دھوکہ ہے۔ (۲) اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو عجمی یعنی فارسی میں قبل از فتح ایران گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: «مَا بَالُ الْمَجُوسِيَّةِ بَعْدَ الْحَنْفِيَّةِ؟» (۳) یہ حنفیت کے بعد مجوسیت کیسی؟

یہاں حضور ﷺ نے اس وقت کی فارسیت کو نفاق اور فاروقِ اعظم نے دھوکہ بتلا کر یہ اصول بتایا کہ جب تک کسی قوم کی زبان پر اپنا اور اپنے مزاج و ذوق کا رنگ چڑھ نہ جائے، اور ہمارے مخصوص اعتقادات و اخلاقیات اس کا غالب عنصر نہ بن جائے اس کی عام تعلیم یا اسے عام طور پر قبول کرنا دھوکہ، نفاق اور دورخی پن پیدا کرتا ہے، جس سے انسان نہ پوری طرح اپنا ہی رہتا ہے، نہ غیر ہی کا ہوتا ہے۔

اگر کسی زبان کو اس پر مکمل غلبہ حاصل کرنے اور بالکل فتح کرنے سے پہلے کسی

اسلامی ضرورت سے مثلاً دعوت و تبلیغ یا غیر ممالک سے سیاسی و غیر سیاسی تعلقات کو قائم کرنے کیلئے سیکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ایک تو ہے کسی غیر زبان میں کلام کرنا، یا خصوصی طور یا مخصوص افراد کو اس کی تعلیم دینا ہے، اور دوسرے اسے بطور شعار قبول کرنا، پہلی صورت تو جائز ہے، دوسری صورت میں بطور شعار کے اس زبان کو اسی وقت استعمال کیا جاسکتا ہے جبکہ وہ زبان بالکل مفتوح ہو کر اس کی روایات کی فارسی زبان کی طرح اسلامی حامل ہو جائے، محض دینی یا سیاسی ضروریات کیلئے غیر عربی زبان کو سیکھنے کی اجازت ان روایات سے معلوم ہوتی ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے بعض اقوام سے عبرانی زبان میں مراسلت کرنے کیلئے یہود کو ترجمان بنایا، لیکن جب لکھنے پڑھنے میں ان سے خیانت ثابت ہوئی تو آپ ﷺ نے مخصوص صحابہ رضی اللہ عنہم کو عبرانی زبان سیکھنے پر مامور فرمایا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سترہ دن میں عبرانی زبان سیکھ کر اس بارے میں حضور ﷺ کو یہود سے مستغنی کر دیا۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حبشی زبان کے بعض کلمات کا تکلم فرما کر خصوصاً مخصوص حالات میں غیر زبانوں کے خصوصی تکلم کی اجازت دی، حضرت ام خالد بنت ابن سعید ابن العاص حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں، جبکہ ان کے والد نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی، حضور ﷺ نے ان کو قمیص مبارک پہنایا اور فرمایا: «يَا أُخْتُ خَالِدٍ! هَذَا سَنَاءٌ» (۱) اے ام خالد! یہ بہت خوشناما ہے (سنا حبشی زبان میں خوبصورت کو کہتے ہیں)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (جب کہ ایک فارسی کے پیٹ میں درد ہوا)

”اشکم بدرد“ (۲) کیا پیٹ میں درد ہے۔

لفظ ”علم“ کا حقیقی مصداق

قرآن وحدیث میں وارد لفظ علم کا حقیقی مصداق کیا ہے؟ کیا اس کا اطلاق عصری

(۱) اقتضاء الصراط المستقیم: فصل فی الاعیاد: ۵۱/۱۱

(۲) اقتضاء الصراط المستقیم: باب الاعیاد: ۵۲/۱۱

(۱) اقتضاء الصراط المستقیم: فصل فی الاعیاد: ۴۹/۱۱

(۲) اقتضاء الصراط المستقیم: ۶/۱۱، دار عالم الکتب، بیروت

(۳) اقتضاء الصراط المستقیم: فصل فی الاعیاد: ۴۸/۱۱

علوم پر بھی ہو سکتا ہے۔ اختراعات کے اس دور میں جو فتنوں کے عروج کا دور ہے، جہاں بہت سارے الفاظ و اصطلاحات کو اس کے اصل مفہوم سے ہٹا کر غیر اصل کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، انہیں میں سے ایک علم بھی ہے، ”روشن خیال“ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہمارا اچھا خاصا، سنجیدہ دین دار طبقہ بھی بے جا وسعت ظرفی کا مظاہر کرتے ہوئے معنی علم میں وسعت کے درپے ہے، ان کا کہنا ہے کہ: علم ایک اکائی ہے، اس کی تقسیم ممکن نہیں؛ لہذا علم دین اور علم دنیا کی یہ تقسیم غلط ہے، تمام علوم ایک ہی ہیں، قرآن وحدیث نے جس علم کی فضیلت بیان کی ہے وہ ان تمام کو شامل ہے، جب کہ علمائے ربانین اور راسخین فی العلم کی اکثریت بلکہ جمہور علماء اس کے قائل ہیں کہ: علم کی تقسیم مسلم ہی نہیں، علم تو صرف ایک ہے اور وہ علم دین ہے، کیوں کہ وہ آخرت کی فکر پیدا کرتا ہے؛ لہذا قرآن وحدیث میں جو فضیلت وارد ہے وہ صرف اسی کی ہے، کسی اور کی نہیں اور دنیوی علوم علم کے زمرے میں داخل ہی نہیں، وہ توفن، ہنر اور کارگیری ہے، وہ علم کہے جانے کے قابل ہی نہیں، اگر علم کو لغتاً معلومات کے معنی میں لیا جائے تب بھی تو تقسیم کے سوا چارہ کار نہیں، آخرت کی فکر پیدا کرنے والا علم دین اور دنیا اور معاش کا مسئلہ حل کرنے والا علم دنیا، اسی کو ”علم معاش و علم معاد“ بھی کہتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب پاکستانی تلمیذ رشید حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کشف الباری میں تحریر فرماتے ہیں:

”یہاں علم سے مراد علم دین ہے، جس کی تعلیم کے لئے حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے، اور اس علم دین کی طلب ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے“ (بحوالہ فتح الباری) تفصیل یہ ہے کہ ایسے تمام امور جن کی ادائیگی کو انسان پر فرض قرار دیا گیا ہے، ان کا علم حاصل کرنا بھی فرض ہے، لیکن امور واجبہ کا علم حاصل کرنا واجب ہے، اور علوم مسنونہ و مندوبہ کا علم حاصل کرنا مسنون اور مستحب ہے، اور قرآن وحدیث کے جملہ علوم کی تحصیل اور ان میں کمال حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، فرض عین نہیں ہے“

آج کل اسکولوں اور کالجوں میں جو دنیوی فنون سکھائے جاتے ہیں وہ مطلوب علم نہیں، یعنی اسکوفرض عین نہیں کہا جائے گا، بعض ان میں فرض کفایہ کے درجے میں آتے ہیں، اگر وہ مخلوق خدا کے فائدے کے لئے درکار ہوں اور خلاف شرع امور پر مشتمل نہ ہوں، یا ان کو صرف جواز کا درجہ دیا جائے گا؛ لیکن جو ایسے امور پر مشتمل ہو، جس کی شریعت میں کوئی گنجائش ہی نہیں، تو ان کا حاصل کرنا ناجائز ہوگا“ (۱)

علم کے حقیقی مصداق کے متعلق متقدمین کے کچھ اقوال

ابوداؤد اور ابن ماجہ شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: دین کے ضروری علم تین ہیں، (۱) قرآن کا علم، (۲) احادیث شریفہ کا علم (۳) اور ان احکام کا علم جو اجماع اور قیاس کے ذریعہ قرآن وحدیث سے مستنبط کئے جائیں، اس کے علاوہ سب علوم زائد علوم ہیں، خواہ وہ کسی بھی طرح کا علم ہو۔

اس حدیث شریف میں شارع علیہ السلام کا مقصد اس بات کو بیان کرنا ہے کہ علوم شرعیہ انہی تین علوم میں منحصر ہیں، تاکہ امت ان تین علوم کے علاوہ کی طرف سے توجہ ہٹا کر ضروری علوم کی طرف توجہ مبذول کر سکے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ باقی علوم کو زائد علوم کہا جائے۔ (۲)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”إِنَّ الْعِلْمَ عِلْمَانِ، عِلْمُ الدِّينِ وَعِلْمُ الدُّنْيَا، فَالْعِلْمُ الَّذِي لِلدِّينِ فَهُوَ الْفِقْهُ، وَالْعِلْمُ الَّذِي لِلدُّنْيَا فَهُوَ الطِّبُّ، وَمَا سِوَى ذَلِكَ مِنَ الشَّعْرِ وَنَحْوِهِ فَهُوَ سَفَهٌ أَوْ عَبَثٌ“ (۳)

(۱) کشف الباری پاکستان: ۳/۴۴

(۲) مرقاة المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح: ۱/۵۶۱

(۳) تاریخ دمشق: محمد بن إدريس بن العباس: ۵۱، ۴۱۰، دار الفکر۔ بیروت

”علم دو طرح کے ہیں، علم دین اور علم دنیا، علم دین فقہ ہے، اور علم دنیا طب اور ڈاکٹری ہے، اس کے علاوہ علوم میں مشغول ہونا بے وقوفی یا بے کار ہے“

حضرت حسن بن ربیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

”میں نے حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ ارشاد نبوی: ”طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ“ کا مطلب کیا ہے؟ تو حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: اس سے وہ دنیوی علوم مراد نہیں جو تم حاصل کرتے ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی دینی معاملہ میں مبتلا ہو تو اس کے بارے میں پہلے جانکار لوگوں سے علم حاصل کرے ”يَسْأَلُ عَنْهُ حَتَّى يَعْلَمَهُ“ (۱)

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

”الْعِلْمُ عِلْمَانِ: النَّافِعُ هُوَ مَا يَتَعَلَّقُ بِالْآخِرَةِ وَعِلْمُ أَحْوَالِ الْقُلُوبِ وَأَخْلَاقِهِ الْمَذْمُومَةِ وَالْمَحْمُودَةِ وَهُوَ مَرْضِيٌّ عِنْدَ اللَّهِ“ (۲)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے کسی شاگرد کو وصیت فرماتے ہوئے تحریر فرمایا:

”اجماع الخیر أن يستعين بالله سبحانه في تلقي العلم الموروث عن النبي ﷺ فإنه هو الذي يستحق أن يسبى علماً وما سوى ذلك إنما أن يكون علماً فلا يكون نافعاً واما أن لا يكون علماً فان سمى به ولئن كان علماً نافعاً فلا بد أن يكون في ميراث محمد ما يغني عنه مما هو مثله وخير منه“ (۳)

(۱) الفقيه والمتفقه: وجوب التفقه في الدين: ۱/۱۷۱، دار ابن الجوزي، السعودية

(۲) فيض القدير: حرف السين: ۱۰۸/۴، المكتبة التجارية، مصر

(۳) مجموع فتاوى ابن تیمیہ: ملازمة الذكر وأفضله ”لا إله إلا الله“: ۱۰/۶۶۴، دار الوفاء، بيروت

حضور ﷺ سے موروث علم کے حصول میں اللہ عزوجل سے مدد طلب کرے، چونکہ یہی علم کہلانے کے مستحق ہے، اور اس کے علاوہ دیگر علوم علم تو ہیں؛ لیکن نافع نہیں ہیں، یا تو وہ علم ہی نہیں ہیں، اگر ان کو علم کہا بھی جاتا ہے تو گرچہ نافع بھی ہو تو ضروری ہے کہ محمد ﷺ کی میراث میں ایسی چیز موجود ہو جو اس سے بے نیاز کرتی ہو جو اسی کے مثل ہو یا اس سے بہتر ہو۔

بخاری شریف کی کتاب التفسیر میں جہاں آیت ”وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا“ مذکور ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا:

”والمراد بالعلم العلم الشرعي الذي يفيد معرفة ما يجب على المكلف من أمر عباداته ومعاملاته والعلم بالله وصفاته وما يجب من قيام أمره وتنزيهه ومدار ذلك على التفسير والحديث والفقه“

”علم سے مراد وہ علم شرعی ہے جو مکلف پر واجب چیزوں کی معرفت عطا کرتا ہو عبادات، معاملات، اللہ عزوجل کی ذات و صفات اور اس کے اوامر و نواہی وغیرہ اور ان تمام علوم کا مدار تفسیر، حدیث اور فقہ پر ہے“

ترمذی شریف وابن ماجہ شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ یوں فرماتے تھے:

”اللَّهُمَّ أَنْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي وَزِدْنِي عِلْمًا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ، وَأَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ حَالِ أَهْلِ النَّارِ“

اس حدیث میں ”عَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي“ کی شرح میں ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: علم سے مراد شریعت محمدیہ کا علم ہے، اور اس میں تفسیر حدیث فقہ اور اصول فقہ کا علم بھی داخل ہے۔

قرآن کریم کی آیت ”يَزِدْكَ اللَّهُ الْإِيمَانَ الْأَمْنُ مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا

الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ“ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہاں ”الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ“ سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں، اولی یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کیا جائے، یہ ہر اس مومن اور ہر دین کا علم حاصل کرنے والا اس آیت میں شامل ہے۔ ”حمل الآية على العموم في كل مؤمن وصاحب علم من علوم الدين من جميع أهل هذه الآية“ (۱)

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

”والذين اوتوا العلم أى الشرعى“ اسی طرح قرآن کریم کی آیت ”وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا“ کی تفسیر میں علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے معالم التنزيل میں، نسفی نے ”مدارك التنزيل“ میں، ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے ”بحر العلوم“ میں، شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”فتح القدير“ میں علم سے مراد قرآن کا علم اور اس کا فہم ہی مراد لیا ہے، اور قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ”وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا“ وہاں علم سے مراد یہ بات مسلم ہے کہ وہ تشریعی علم نہیں، بلکہ وہ کنوینی علم ہے، اسلئے قرآن کریم میں ”إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ“ میں وحی کا سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام تک بیان کیا گیا ہے، حضرات مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے اس میں یہی مذکورہ نقطہ بیان فرمایا ہے“

اور حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ”عَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ“ فرمایا گیا ہے، تو وہاں علم شرعی مراد نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق کسب و پیشہ سے ہے، احادیث میں اس کے لئے صراحۃ کسب یا عمل بالید کا لفظ استعمال ہوا ہے: ”كَانَ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا يَأْكُلُ إِلَّا مِنْ كَسْبِ يَدِهِ“ (۲)

(۱) فتح القدير: سورة الجمعة: ۲۲۶/۵ (۲) طبرانی: قطعة من المفقود، حدیث: ۹۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد علم شرعی کی دعوت و اشاعت ہے، دنیوی علوم کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہیں کئے گئے، مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ:

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کے پاس سے گذرے، جو شیخ کرتے تھے (یعنی اچھے اور زیادہ پھل حاصل کرنے کی غرض سے زدرخت کا خوشہ مادہ درخت کے خوشہ میں رکھ دیتے تھے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو اچھا ہے، ”لَوْلَمْ تَفْعَلُوا الصَّلَحَ“ ان لوگوں نے اس عمل کو ترک کر دیا، راوی کہتے ہیں کہ: اس مرتبہ ردی کھجوریں پیدا ہوئیں، اور آپ کا ان پر دوبارہ گذر ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کہ تمہارے کھجوروں کا کیا حال ہے؟ انہوں نے جواباً کہا کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کہا تھا، ہم نے ویسا ہی کیا اور ردی کھجوریں پیدا ہوئیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم لوگ اپنے دنیاوی کاموں سے زیادہ واقف ہو ”أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ“ (۲)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی علوم اگر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد میں داخل ہوتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم سے ”أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ“ (۳) نہ فرماتے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ علم کے صحیح مصداق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”علم کا شرف معلوم کے شرف پر موقوف ہے اور معلوم اس کو کہتے ہیں جس کے حالات اس علم میں بیان کئے جائیں۔“

(۱) مسلم: باب وجوب امتثال ما قاله، حدیث: ۶۷۷۷

(۲) مسلم: باب وجوب امتثال ما قاله، حدیث: ۶۷۷۷

علم دین کا معلوم حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے اور تمام علم دین کا حاصل بھی یہی ہے اور دیگر تمام علوم ماسوی اللہ ہے، پس جو نسبت دنیا یا ماسوی اللہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ ہے، وہی نسبت علوم دینیہ کو علم دین کے ساتھ ہوگی اور اس کی نسبت بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک
حق تعالیٰ کی ذات و صفات تو کسی چیز کے ساتھ کچھ نسبت نہیں رکھتے، وہ باقی اور سب فانی، وہ زندہ اور سب مردہ، وہ غنی اور سب محتاج، وہ موجود اور سب معدوم (کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ)۔

غرض دونوں چیزوں میں کوئی نسبت نہیں قرار دی جاسکتی ہے، سوائے اس کے علم دین پر موجود کا اطلاق کیا جائے اور علم دنیا پر معدوم، اب میرا دعویٰ قریب المفہوم ہو گیا ہے کہ علم دین کے سامنے دیگر علوم کہلانے کے مستحق ہی نہیں؛ تو مقابلہ کیا کیا جائے؟ علوم دنیا کو علوم مت کہو، فن کہو، پیشہ کہو، حرفت کہو (انفاس عیسیٰ)

شیخ الاسلام ترجمان اہل سنت والجماعت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہؒ تو ”جدید دور میں علم اور اس کا استعمال، فتنہ الفاظ کا جائزہ“ کے تحت فرماتے ہیں:

”موجودہ دور کے علمی و ذہنی فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ ”غریب الفاظ“ کا بھی ہے، ایک لفظ جسے ہم بولتے ہیں، وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایسے حقائق پر مشتمل ہوتا ہے، جو بالکل صحیح و صادق، مقدس و متبرک، اور نہایت معقول و محمود ہے، مگر اسی لفظ کے عام لغوی معنی کی وسعت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے بہ طور تلبیس و تلمیح، ایک ایسے معنی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو بجائے مقبول ہونے کے مردود اور مذموم ہوتا ہے، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مخاطب کو مغالطہ دے کر، محض خوش نما اور دل فریب الفاظ سے مسحور کر دیں۔“

آزادی، مساوات، تہذیب، ترقی اور اسی طرح کے اور الفاظ ہیں، جو اگر اپنے اصلی حقیقی معانی میں مستعمل ہوں، نہایت محمود، مستحسن اور قابل تعریف ہیں، لیکن جب

کسی زشت و شنیع مفہوم کو خوبصورت ظاہر کرنے کے لیے یہی الفاظ بہ بطور نقاب استعمال ہونے لگیں، تو یہ خالص تلبیس و خداع ہے۔ ٹھیک یہی صورت آج کل، لفظ ”علم“ کے متعلق واقع ہوئی ہے۔

کسی مسلم اسکول کا افتتاح ہو، کسی کالج کی بنیاد رکھی جائے، کسی یونیورسٹی کی تقسیم اسناد کا جلسہ ہو، آپ دیکھتے ہیں کہ حضرات مقررین کس شد و مد سے ”علم“ کے فضائل میں، قرآن پاک کی بہت سی آیات اور رسول کریم ﷺ کی بے شمار احادیث پڑھتے رہتے ہیں، گویا اپنے اس طرز عمل سے مخاطبین پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جدید علم کے ایسے ایسے فضائل قرآن پاک میں موجود ہیں، حالاں کہ قرآن کریم کو ایک سرسری نظر سے پڑھ جائیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ خود علم کی دو قسمیں قرار دیتا ہے:

ایک علم نافع مطلوب و محبوب؛ دوسرا مضر و مردود۔۔۔۔۔ اس کے نزدیک ایک علم زہر ہے، دوسرا تریاق، ایک پاک شراب ہے، دوسرا محض سراب۔ ایک سبب ہلاکت ہے، دوسرا سامان نجات۔ ایک آسمان کی بلندیوں پر اٹھانے والا ہے، دوسرا اسفل السافلین کی پستیوں میں پہنچانے والا۔

جو علم اپنے اثرات کے اعتبار سے آخر کار خشیت الہی اور رغبتِ آخرت پر منتج نہ ہو، جو علم انسان کو خدا سے نڈراور زندگی کے آخری انجام سے بالکل غافل کر دے، جو علم ایسی مادی دنیا کی لذت و انبساط و شہوات حیوانیہ کو (خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ شکل میں ہوں) انسان کا معبود ٹھہرائے، کیا ایسا علم بارگاہ رب العزت میں درخور اعتنا یا لائق التفات ٹھہر سکتا ہے؟ یا قرآن حکیم اس کے اکتساب کی ایک لمحہ کے لیے بھی ترغیب دے سکتا ہے؟

قرآن تو ایسے علم کی نسبت صاف طور پر یہ حکم دیتا ہے:

فَاعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ

الدُّنْيَا ۝ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (۱)

”تو منہ پھیر لے اس کی طرف سے، جس نے ہماری بات سے منہ پھیر لیا اور جس کا مقصد اس دنیوی زندگی سے آگے کچھ نہیں، ان کے علم کی رسائی اور پرواز یہیں تک ہے“

اس کے بالمقابل ایک وہ لوگ ہیں، جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اس کی مخلوق پر رحم کھاتے ہیں اور ادب و تہذیب کے قاعدوں پر عمل کرتے ہیں۔ اخلاقی پاکیزگی ان کا جوہر ہے، ایمان کے نور سے ان کے دل روشن ہیں۔ غرض کہ علم ان کے اندر انابت الی اللہ، رحمت علی الخلائق کے اوصاف پیدا کرتا ہے، تو اسی طرح کے اولوا العلم کے حق میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”يَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ“ (۱)

قرآن پاک نے ایک شخص (قارون) کا ذکر کیا ہے، جس کی دنیوی دولت اب تک ضرب المثل ہے۔ جس کے خزان کی کثرت کا اندازہ ”ان مفتاحہ“ کے الفاظ سے ہو سکتا ہے، جس کا سامان دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں، حتیٰ کہ بہت سے تمنا کرتے تھے کہ ”يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ“ اس نے ترقی کی اس معراج پر پہنچ کر ایک علم کا دعویٰ کیا تھا، جس کے ذریعہ اس کو یہ عروج حاصل ہوا ”قَالَ إِنَّمَا أُوتِيْتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي“۔

بہر حال وہ علم تھا، اس کے بالمقابل دوسرا گروہ تھا، جس کا ذکر حق تعالیٰ اس طرح فرماتا ہے: ”وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيَلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنِ آمَنَ وَكَوَيْلٌ صَالِحًا“ یہ ”الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ“ (۲) اُس علم والے تھے جو قارون کے اُس تمام ترقیات اور علم و ہنر کو حقیر سمجھ رہے تھے اور اُدھار کو نقد پر ترجیح دے رہے تھے۔ قرآن کریم نے تو ایک آیت میں مسئلہ کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا ہے: ”إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ“۔ (۳)

اس ”انما“ کے لفظ پر غور کیجئے۔ گویا جو علم قلب میں خشیت الہی پیدا نہ کرے، وہ

علم ہی نہیں۔ ایسے اصطلاحی علم سے جہل ہزار درجے بہتر ہے۔ حدیث صحیح میں نبی کریم ﷺ نے اس علم سے پناہ مانگی ہے، جو نفع سے خالی ہو، قرآن کریم میں بھی ہے: ”وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ“ (۱) معلوم ہوا کہ علم نافع بھی ہوتا ہے اور مضر بھی۔

پس ایسے علوم جو انسان کو شیطان یا درندہ بنادیں یا اسے ترقی یافتہ بہائم کے زمرہ میں داخل کر دیں۔ ان کی طرف ترغیب دلانے کے موقع پر مطلق علم کے فضائل قرآن و حدیث سے پیش کرنا، انتہائی تلبیس اور گمراہی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ علوم و فنون حاصل نہ کیے جائیں، لیکن درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر علم و فن کی ترقی کا ما حاصل یہی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں تو فی الحقیقت ایسے علم سے جہل بہتر ہے، اگر علم و فن کی چکا چوند کرنے والی ترقیات مذہبی اور دینی علم و تہذیب کے ماتحت رہیں تو دنیا کو ایسے بھیا نک نتائج ہرگز نہ دیکھنے پڑتے۔ (۲)

حقیقت علم

انگریزوں نے بھی علم کی تعریف محض مادہ اور معدہ کی پرورش نہیں قرار یا؛ بلکہ انہوں نے بھی زندگی کے حقیقی مقصد بناتے والے علم پر علم کا اطلاق کیا ہے: جان اسٹورٹ مل مغرب کے ان مشاہیر میں سے ہے جنہوں نے تعلیم کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے:

تعلیم صرف ان باتوں ہی کا احاطہ نہیں کرتی جو ہم اپنی فطرت کے کمال سے قریب تر ہونے کی بناء پر وضع مقصد کی خاطر اپنے لئے کرتے ہیں یا دوسرے ہمارے لئے کرتے ہیں، اپنے وسیع تر مفہوم میں اس کی حدود بہت زیادہ ہیں، انسانی کردار اور صلاحیت پر پڑنے والے ان چیزوں کے بالواسطہ اثرات بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہیں، جن کے فوری مقاصد بالکل ہی دوسرے ہوتے ہیں۔

جان ملٹن تعلیم کی تعریف یوں کرتے ہیں:

”میرے نزدیک مکمل اور شریفانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو بحالت جنگ وامن اپنی اجتماعی و نجی زندگی کے فرائض و دیانت و مہارت اور عظمت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے تیار کرتی ہے“

بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب و روح میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے، اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات سے ہوتا ہے، روح کے مطالبات سے یہ بے گانہ وار ہی گذر جاتی ہے، دونوں کی نشوونما دو متضاد سمتوں میں ہوتی ہے، جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی شکل میں نکلتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور رہنما کا کام کر سکتا ہے جب اس کا محور دل ہو ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لئے سانپ جیسا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر ایڈیلوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے:

”مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے مطالعے کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے۔“

مشہور اہل قلم والٹر لپ میں، نے اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کیفیت کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا:

”اسکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیجتے رہے ہیں جو اس معاشرے کے تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے، جس میں انہیں رہنا ہے، اپنی ثقافتی روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے ذہن و جذبات میں مغربی تہذیب کے تصورات، اصول اور بنیادوں کا اور اس کے منطق و استدلال کا کوئی احساس و شعور نہیں رکھتے، اگر یہی نہج رہی تو موجودہ تعلیم آخر کار مغربی تہذیب کو تباہ کر دے گی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ کر رہی ہے۔“

امریکی تعلیم پر راک فیلر کی رپورٹ بھی اسی خامی کی نشاندہی کرتی ہے:

”طلبہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد و مفہوم چاہتے ہیں، اگر ان کا زمانہ ان کی ثقافت اور جب ان کے رہنما انہیں کوئی عظیم مفہوم، مقاصد و تصورات نہ

دیں تو پھر وہ اپنے لئے حقیر اور فرد مایہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں“
تعلیم کے پس منظر کے مکمل جائزے کے بعد پروفیسر ہیرلڈ ایچ ٹیٹس لکھتے ہیں:
”تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثے سے الگ کر لیا ہے، مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے، نتیجتاً پڑھے لکھے افراد بھی ایقان و ایمان سے، نئی زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے اور دنیا کے بارے میں کسی ناقابل شکست ہمہ گیر نقطہ نظر سے عاری ہیں“
مقصد تعلیم:

تعلیم بجائے خود منزل نہیں، منزل کے حصول کے لئے ایک ذریعہ ہے، حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریہ حیات اور تمدن و ثقافت ہے جن کی خدمت اسے کرنی ہے، اے این وایٹ ہیڈ نے یہ کہہ کر زور دیا ہے کہ:

”تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو“

علامہ اقبال کا بھی خیال یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہئے، انہوں نے خواجہ غلام السیدین کو اکی خط میں لکھا ہے:

”علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہو، عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہیں معنی میں استعمال کیا ہے اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئے، اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے، مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔“

بولہب را حیدر کرار کن

”اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لئے سراپا رحمت ہے“

ترے صوفی ہیں افرا نگی ترے قالین ہیں ایرانی

لہو مجھ کو رلائی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل

نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمان
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پائی میں نے استغناء میں معراجِ مسلمانی (۱)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک علم دین اور دنیا کے اعتبار سے۔ اور دوسرا نفع اور نقصان کے اعتبار سے۔ تحصیل علم دین تو خیر الناس والا عمل یعنی انسانوں کے کاموں میں سے ایک بہترین کام ہے، البتہ علم دنیا کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے، ہاں اگر اچھی نیت ہو مثلاً کسبِ حلال کی نیت سے دینی تمام احکام کی رعایت کرتے ہوئے اسے حاصل کیا جائے تو ہو سکتا ہے کارِ ثواب ہو جائے، جب کہ کوئی حلال چیز کا کسبِ حلال طریقے سے ہو، اور اگر محض ”علم دنیا“ ہی مقصود ہو، تب تو ہلاکت اور ضرر کے علاوہ کچھ بھی نہیں، جتنی احادیث اور آیات فضیلتِ علم میں وارد ہوئی ہیں وہ سب علم دین کے بارے میں ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تو فرماتے ہیں:

”علم نام ہی علم نافع کا ہے، ورنہ اگر عمل نہ ہو تو علم نہیں معلومات ہے، چاہے علم دین ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ ایسا علم دین جس پر عمل نہیں بندہ پر حجت اور دلیل بن جاتا ہے، جواز دیا و عذاب کا سبب ہوگا، اسی لیے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں، کہ علم کا ثمرہ اور اس کی حقیقی علامت اللہ تعالیٰ کی خشیت ہے۔“ (۲)

علم ”اقراء“ کا پیغام

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کریم کی آیت ”اقراء باسم ربك الذی خلق“ کے تحت مفید اور غیر مفید اور تخریبی علم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱) اسلام کانظر یہ تعلیم: پروفیسر خورشید احمد: ۱۳-۱۴، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی

(۲) مقالہ مولانا حذیفہ و ستانوی: ”تعلیم اور سماجی خرابیاں“، پیش کردہ بر موقع سمینار، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کو، زیر نگرانی: مولانا آزاد نیشنل اردو، یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۲، جنوری تا ۲۱ جنوری ۲۰۱۰ء

”حضور اکرم ﷺ نے نہ کبھی پڑھا اور نہ کبھی لکھا اور کہا گیا پڑھو، ”اقراء“، یعنی اب جوامت پیدا ہوگی، وہ قرأت والی امت ہوگی اور اس کا رشتہ علم کے دامن سے باندھ دیا جائے گا؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی کی جارہی ہے جس کو اکثر قوموں نے نظر انداز کر دیا اور ترقی یافتہ مغرب میں جب سے وہاں بیداری شروع ہوئی، ”اقراء“ پڑھو؛ لیکن صرف پڑھنا کام نہیں آئے گا؛ بلکہ وہ علم تخریبی بن جائے گا، وہ تخریبی ذہن پیدا کرے گا اور انسانوں میں خود پرستی پیدا کرے، دوست پرستی پیدا کرے گا اور شہوانیت کی طرف لے جائے گا، ”اقراء“ پڑھو؛ لیکن خالی ”اقراء“ پڑھنا کام نہیں آئے گا، ”اقراء باسم ربك الذی خلق“ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو، دنیا میں اب اگر تاریخ منصفانہ طریقہ پر حقیقت پسندانہ طریقہ پر لکھی جائے اور دیکھا جائے کہ دنیا میں انسانیت کا زوال کب سے شروع ہوا تو یہ عنوان قرار دینا ہوگا جب سے علم اور اسم کا رشتہ ٹوٹا، جب علم اسم سے آزاد ہوا اور انسان نے اسم کو بھلاتے ہوئے، فراموش کرتے ہوئے انکار کرتے ہوئے؛ بلکہ بغاوت کرتے ہوئے کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے، اگر اس کائنات کا کوئی خالق ہے بھی تو اس کا مالک نہیں ہے، وہ اس کا منتظم نہیں ہے..... ضرورت اس بات کی ہے کہ علم کو اسم کے ساتھ لے کر چلا جائے، علم اسم کی رہنمائی میں اسم کے سایہ میں اس کی سرپرستی میں آگے بڑھے اور اسم کی برکت بھی اس کے ساتھ ہو، تب جا کر ہماری ٹکنالوجی اور سائنس کی جتنی شاخیں اور جتنے تعمیری کام ہیں اور تعمیری ادارے ہیں اور ہماری دانش گاہیں ہیں، ہمارے تحقیقی مراکز ہی ہیں وہ سب اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں کہ جب اسم کے سایہ میں ہوں“ (۱)

(۱) ماخوذ از: انسانیت کے زوال کا سبب، علم سے اللہ کے نام کا جدا ہونا، حضرت مولانا ابوالحسن الندوی

غور کرنا چاہئے کہ پڑھنے کے حکم دینے کے بعد تیس پاروں میں قرآن نے کیا پڑھایا ہے، اس کے فوراً بعد نازل ہونے والی آیتوں میں ”يَا أَيُّهَا الْمَدَنِيُّ“ اور ”يَا أَيُّهَا الْمَدَنِيُّ“ والی آیتوں میں کیا پیغام دیا گیا ہے۔ خود نبی رحمت ﷺ نے دار ارقم وصفہ میں کونسے علوم پڑھائے؟ کلام کو مستطعم کی زندگی کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔

”أَطْلَبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّينِ“ کی تحقیق:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی توضیح اور اس کے صحیح

مصدق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”جبتنے فضائل احادیث میں علم کے لئے وارد ہیں، انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں ”أَطْلَبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّينِ“ یعنی علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں بھی ہو، وہ کہتے ہیں کہ: دیکھئے! حضور ﷺ نے چین سے طلب علم کی ترغیب دی ہے، حالانکہ اس وقت چین میں دین کا علم نہ تھا، بلکہ محض دنیاوی علم تھا، معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں، خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا، پس انگریزی بھی علم ہے اور اس حدیث کے تحت میں داخل ہے، ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہئے، ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔

”قُلْتُ ذِكْرُ لَهُ فِي الْمَقَاصِدِ طَرِيقَيْنِ، وَقَالَ: هُوَ ضَعِيفٌ مِنَ الْوَجْهَيْنِ، وَقَالَ ابْنُ حَبَّانٍ: أَنَّهُ بَاطِلٌ لَا أَصْلَ لَهُ، وَأَخْرَجَهُ ابْنُ الْجَوْزِيِّ فِي الْمَوْضُوعَاتِ، قَالَ وَأَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الشَّعْبِ، قُلْتُ، قَدْ التَزَمَ أَنْ يُخْرِجَ مَوْضُوعًا فَلَا شُبَهَةَ الْحُكْمِ عَلَيْهِ بِالضَّعِيفِ، وَالضَّعِيفُ لَا يُجْتَنَبُ بِهِ فِي الْأَحْكَامِ“ (الجامع)

میں کہتا ہوں کہ: مقاصد میں اس کے دوسندیں ذکر کی گئیں ہیں، اور فرمایا ہے، یہ روایت ان دونوں سندوں سے ضعیف ہے، ابن حبان کہتے ہیں: یہ روایت باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں، ابن الجوزی نے اس کو موضوعات میں ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں کہ: اس کی بیہقی نے شعب الایمان میں تخریج کی ہے، میں کہتا ہوں: انہوں نے موضوعات کے ذکر کا بھی التزام کیا ہے، زیادہ بہتر اس پر ضعف کے حکم لگانے کا ہے اور ضعیف روایت سے احکام میں استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی ان لوگوں کا مدعا اس سے حاصل نہیں ہوتا؛ کیوں کہ انہوں نے لفظ ”ولو“ پر نظر نہیں کی، یہ لفظ فرض کے لئے آتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنا چاہئے اور فرض اس چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم و مستبعد ہو، موجود کو فرض نہیں کیا جاسکتا، معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی مراد اس حدیث سے وہی علم ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا، اس لئے بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور یہ وہ علم دین ہی ہے، ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو گیا تو ایک بھنگی اور چماری کو بھی عالم کہنا چاہئے؛ کیوں کہ اس کو بھی علم حاصل ہے جو وہ کام کرتا ہے، اس کو خوب جانتا ہے اور اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کر لیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کریں گے اور خیر جانے دیجئے! ہم لفظ ”ولو“ سے بھی استدلال نہیں کرتے، مگر ہم کہتے ہیں: ”أَطْلَبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّينِ“ میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کون سا علم مراد ہے؟ اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جائے، بس علم وہ ہے جس کو شریعت علم کہتی ہے جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں:

علمی کہ راہ بحق تمناید جہالت است

اور حدیث میں ہے:

«الْذُّنُيَا مَلْعُونَةٌ وَمَا فِيهَا مَلْعُونٌ إِلَّا ذِكْرُ اللَّهِ وَمَا وَالَاهُ» (۱)

معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے، وہ دنیا ملعونہ ہے، اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں، اب میں آپ سے ہی پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے کوئی خدا کے قریب ہوتا ہے؟ وصل ہوتا ہے یا فصل؟ قرب ہوتا ہے یا بعد؟ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی بڑھتا ہے، گو چاہئے تو یہ تھا کہ سائنس سے خدا کی طرف قرب بڑھتا؛ کیوں کہ اس سے قدرت مانع کا انکشاف ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہد ہوتا ہے؛ کیوں کہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں، اس لئے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوئے، زمانہ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے، بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں، جو اکثر پورے ہو جاتے ہیں، مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں، ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی، مگر یہ لوگ باوجود مشاہدہ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر سمجھتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے، بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہوگئی، اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کر لی؟ ڈلے پتھر، اگر ایجاد تمہارے ہاتھ میں تھی تو پہلے ہی کیوں نہ ایجاد کر لی؟ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو، باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریقہ آ جانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے، یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے، مگر عادت الہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور و فکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتا ہے، مگر عادت الہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور و فکر کے بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے؛ چنانچہ اب تک کسی کو نہیں معلوم کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے؟ اور ایسی نظائر بکثرت موجود ہیں، اگر غور و فکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار

(۱) ترمذی: باب منہ، حدیث: ۲۳۲۲، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے

میں ہے تو ان چیزوں کا انکشاف کیوں نہ کر لیا؟“ (۱)
ڈگری کا مقصد روٹی نہیں

رزاق حقیقی اللہ ہے، رزق کا انسان کی عقل، انسان کی ڈگری سے، یا اس کی محنت سے کوئی تعلق نہیں «اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ» (۲) (اللہ جس جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کرتا ہے اور جس پر چاہے تنگ کرتا ہے) «وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ» (۳) (جو شخص علم رزق ہی کے لئے حاصل کر رہا ہے وہ ناکامی کا منہ دیکھے گا؛ کیوں کہ ملے گا اتنا ہی جتنا اللہ چاہے گا، اگر ڈگری حاصل کرنے کا نشانہ یہ ہے کہ اچھے خاندان میں نکاح ہو جائے، اونچے محل تعمیر ہو جائیں، ترقی یافتہ ممالک کی شہریت مل جائے، اونچے مواقع رزق حاصل ہو جائیں تو دنیا دیکھتی رہتی ہے کہ ان مقاصد کے ملنے سے پہلے ہی وہ شخص دنیا سے رخصت ہو گیا، یا ملنے کے بعد چند ہی دن میں موت کا بلاوا آ گیا، یا یہ ساری چیزیں ملیں مگر بے برکتی، خدا سے دوری اور آخرت سے محرومی کے ساتھ ملی، اس لئے عصری علوم کے طلبہ کو بالخصوص چاہئے کہ وہ اللہ کی معرفت اور انسانوں کی خدمت ہی کے ارادہ سے ان فنون کو حاصل کریں، پڑھنے کے بعد ان ہی نیتوں سے ان فنون کا استعمال کریں، کچھ نہ بھی ملا تو اللہ مل جائے گا، مقدر کی روزی کے ساتھ محتاجوں کی دعائیں نسلوں کی قسمت کو بدل دیں گی، برکتوں کے دہانے کھل جائیں گے، پھر موت بھی آئے تو یہ نیت کرنے والا کامیاب ہی مرے گا۔

انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک یہ اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے، ہر دور میں اللہ کے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں نے خدمت خلق کی تعلیم دی ہے، سب سے آخری کتاب قرآن مجید اور رسول خدا ﷺ نے بھی اس کی طرف بطور خاص توجہ دی ہے، اس کی سخت تاکید کی ہے، لوگوں میں دوسروں کے تعلق سے ہمدردی کے جذبات ابھارے اور اسے خدا کی رضا اور خوشنودی کا ذریعہ قرار دیا۔

(۱) اشرف الجواب: حصہ چہارم: ۵۰۰، مکتبہ عمر فاروق، کراچی

(۲) الرعد: ۲۶ (۳) النحل: ۷۱

قرآن کریم نے اپنے آغاز نزول کے بعد ہی سے دو باتوں پر خصوصی زور دیا ہے، اول یہ کہ انسان کا خدا سے تعلق مضبوط ہو، وہ صرف اسی کی عبادت کرے اور اس کے سوا کسی کے سامنے اپنا سر نہ جھکائے، دوسرے یہ کہ انسانوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے اور حق داروں کا حق ادا کرے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے، قربت داروں، ہمسایوں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی جو ضرورتیں پوری کر سکتا ہے پوری کرے، کوئی بھی شخص جو اس کی خدمت کا مستحق ہو اور جس کی خدمت کرنا اس کے امکان میں ہو، وہ اس کی خدمت سے محروم نہ رہے، وہ طاقت ور ہے تو کمزوروں پر دست درازی نہ کرے، بلکہ ان کو سہارا دے اور ان کی تقویت کا ذریعہ بنے، لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کی طرح حفاظت کرے، کسی کے ساتھ دھوکے اور فریب کا معاملہ نہ کرے، بلکہ ہر حال میں عدل و انصاف اور دیانت و امانت پر قائم رہے، اس کا وجود معاشرہ کے لئے کلفت و آزار کا باعث نہ ہو اور اس سے کسی کو ضرر اٹھانا نہ پڑے، قرآن مجید ان باتوں کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ قرآن کریم میں کئی کئی بار کہیں تفصیل سے اور کہیں اختصار مختلف مواقع سے ان باتوں کو اجاگر کیا ہے، اس کا ایک بہترین نقشہ اور تصویر سورہ اسراء کی آیت ۲۳ سے آگے تک موجود ہے۔

”اللہ کا فیصلہ ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو، وہ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو خصوصیت سے ان کا خیال رکھو، ان کے سامنے تواضع اور خاک ساری کے ساتھ جھک جاؤ، درشتی اور سختی سے نہ پیش آؤ اور ان کے لئے دعائیں کرتے رہو، قربت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو، اگر اپنی غربت اور افلاس کی وجہ سے ان کی مدد نہ کر سکو تو نرمی سے معذرت کر دو، اپنی اولاد کو اس خطرے سے نہ مار ڈالو کہ تم ان کو کچھ کھلا نہ سکو گے، اللہ تعالیٰ تمہیں بھی کھلائے گا اور انہیں بھی کھلائے گا، قتل اور وہ بھی اپنی اولاد کا قتل بہت بڑا سنگین گناہ ہے، زنا کے قریب نہ پھٹکو، یہ بے حیائی کا کام اور زندگی کا غلط

راستہ ہے، اللہ نے انسان کی جان کو باعزت اور محترم ٹھہرایا ہے، اس لئے جب تک حق و انصاف کا تقاضا نہ ہو، اس کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرو، یتیم کو بے آسرا سمجھ کر اس کا مال نہ کھاؤ، جب وہ جوان ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالے کر دو، عہد و پیمان کو پورا کرو، خدا کے ہاں اس کے بارے میں باز پرس ہوگی، ناپ و تول میں کمی نہ کرو، جس بات کا تمہیں علم نہیں ہے اس کے بارے میں زبان نہ کھولو، یاد رکھو! کان، آنکھ، دل اور دماغ ہر ایک کے بارے میں خدا کے یہاں سوال ہوگا، تکبر اور غرور کی چال نہ چلو، تم نہ ٹھوکر مار کر زمین کا سینہ چاک کر سکتے ہو اور نہ سراٹھا کر پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو، یہ باتیں تمہارے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ (۱)

بندگانِ خدا کی خدمتِ خدا کی خدمت ہے:

اسلام نے مخلوق کی خدمت کو خدا کی خدمت قرار دیا ہے، اس نے یہ تعلیم دی ہے کہ خدا کے بندوں کی معاونت و مدد دراصل خدا کی خدمت ہے، کیوں یہ بندہ خدا کی قدرت اور اس کی بناوٹ کا شاہکار ہے، یہ خدا کی مصنوعات میں سے ہے، اگر کوئی بندہ خدا کے آپ کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور آپ نے اس کے ہاتھ کو رد کر دیا تو گویا کہ اللہ عز و جل کے ہاتھ کو خالی لوٹایا، اگر بیمار مریض علاج کا محتاج ہو اور آپ نے اس کی مدد سے انکار کیا تو دراصل خدا کی مدد و نصرت سے اعراض کیا، خدا کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لئے بندگانِ خدا کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کیا جائے، ”أَرْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ“ روئے زمین پر بسنے والوں سے رحم و کرم اور اچھے برتاؤ اور سلوک کا معاملہ کرو آسمان والا تم پر رحم و کرم کرے گا۔ (۲)

اور ایک حدیث قدسی میں ہے:

(۱) سورة الاسراء: ۲۳=۳۸

(۲) ترمذی: رحمة المسلمين، حدیث: ۱۹۳۴، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا اے ابن آدم میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہیں کی وہ کہے گا اے پروردگار میں تیری عیادت کیسے کرتا حالانکہ تو رب العالمین ہے؟ اللہ فرمائے گا کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا؛ لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا وہ کہے گا اے پروردگار میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا حالانکہ تو رب العالمین ہے؟ تو اللہ فرمائے گا کیا تو نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا؛ لیکن تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا تھا کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا؛ لیکن تو نے مجھے پانی نہیں پلایا وہ کہے گا اے پروردگار میں تجھے کیسے پانی پلاتا حالانکہ تو رب العالمین ہے؟ اللہ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا؛ لیکن تو نے اس کو پانی نہیں پلایا تھا اگر تو اسے پانی پلاتا تو تو اسے میرے پاس پاتا: ”أَمَّا أَتَاكَ لَوْ سَقَيْتَهُ وَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي“ (۱)

خدمت بھی عبادت ہے:

نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے، نماز بندے کی طرف سے خدا کی عظمت و بزرگی اور اپنی عبدیت کا اعلان کیا ہے اور زکوٰۃ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان کے دل میں ہم دردی اور غم خواری کا جذبہ موجود ہے اور وہ دوسروں کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے، قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا بالعموم ایک ساتھ ذکر کیا ہے، دونوں پر یکساں زور دیا ہے، گویا خدا کو خوش کرنے کے لئے جس طرح بدنی عبادت کو ضروری سمجھتا ہے، اسی طرح مالی عبادت کو بھی لازم قرار دیتا ہے:

”وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ

وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ“ (۱)

ان کو بس اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے یکسو ہو کر، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، یہی مضبوط دین ہے، اور ایک آیت فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ
وَفَعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۱)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، رکوع کرو، سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور خیر پر عمل کرو اس امید سے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

شریعت نے بتلایا کہ بعض اوقات مالی عبادت بدنی عبادت کا بدل بن جاتی ہے اور اس میں جو نقص اور کمی رہ جائے اس کی بھی اس سے تلافی ہو جاتی ہے چنانچہ جو لوگ بڑھاپے کی وجہ یا کسی سخت مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں، ان کے لئے فدیہ کا حکم دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ وہ ایک روزہ کے عوض ایک مسکین کو دونوں وقت کا کھانا کھلا دیں (۲) رمضان کے روزوں کے بعد صدقہ فطر رکھا گیا اس کی وجہ اور حکمت یہ بتلائی گئی کہ روزوں میں اتفاق سے یا غیر شعوری طور پر کبھی لغو اور بے ہودہ حرکت ہو جائے تو صدقہ فطر جس کے ذریعہ مسکینوں کی جو تھوڑی مدد ہوتی ہے، اس سے یہ کمی اور نقص جاتا رہتا ہے ”زَكَاةُ الْفِطْرِ طَهْرَةٌ لِلصِّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالزَّفَثِ وَطَعْمَةٌ لِلْمَسْكِينِ“ (۳) اسی طرح حج کو جو مالی اور جانی عبادت کا حسین امتزاج ہے اس میں حالت احرام میں بال مونڈھوانا منع ہے اگر کسی تکلیف سے بال منڈوانے کی ضرورت درپیش ہو تو آدمی روزے یا قربانی یا صدقے کی شکل میں اس کا فدیہ ادا کرے، اس میں قربانی کے گوشت اور فدیہ کے ذریعہ غریبوں کی خدمت ہو جاتی ہے، اسی طرح

ظہار جس میں عرب ناراضگی کی صورت میں بیوی کو ماں کے مثل قرار دیتے تھے، اللہ عزوجل نے ان کی بے ہودگی پر تنقید کی اور اس سے رجوع کی کیفیت یہ بیان کی کہ پہلے بہ طور کفار غلام آزاد کیا جائے، اس کی استطاعت نہ ہو تو لگاتار ساٹھ روزے رکھے اور یہ بھی نہ ہو سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، اس کے بغیر بیوی سے تعلقات درست نہیں (۱) اسی طرح اگر اسلامی مملکت میں کوئی مسلمان کسی مسلمان کا قتل کر دے تو اسے ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کی دیت بھی اس پر واجب ہوگی۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے مسلسل روزے رکھے (۲) اسی طرح اگر آدمی کسی بات کو مستحکم کرنے کے لئے قسم کھائے پھر اس کو توڑ دے تو اس کا کفارہ یہ بتلایا گیا کہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلائے یا ان کو کپڑا پہنائے یا غلام آزاد کرے، جس شخص کو ان میں سے کسی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن روزہ رکھے۔

یہاں پر قرآن مجید اور احادیث نبویہ نے بعض مواقع حسن سلوک اور خدمت خلق کو بعض عبادات کا بدل قرار دے کر اور اس کے ذریعے ان کی کمی کو دور کر کے اس کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا۔

خدمت سب کی کی جائے

بعض لول وہ ہوتے ہیں جنہیں صرف اپنی ذات سے غرض ہوتی ہے، وہ صرف اپنا مفاد سوچتے ہیں، انہیں دوسروں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، بعض لوگوں میں خدمت کا جذبہ ضرور ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے اہل و عیال سے ہٹ کر نہیں سوچتے، اسلام نہ تو فرد کی اہمیت کو کم کرنا ہے، نہ خاندان اور قبیلہ کی اہمیت کو گھٹاتا ہے، بلکہ وہ تو رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کی اختلاف کے بغیر ساری امت کو جسد واحد قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر اسلام انسان کو امت کا ہم درد بنانے کے ساتھ ساتھ تمام نوع انسانی کا ہم درد بناتا ہے تعصب آدمی کو نفرت اور عداوت سکھاتا ہے، جو شخص قومی تعصب میں گرفتار ہو وہ اپنی قوم کے سوا کسی دوسری قوم کے ساتھ ہم دردی اور محبت کا روادار نہیں ہوتا، اسلام اس کے

سراسر خلاف ہے، اس کے نزدیک خدا کی مخلوق اس کا کنبہ ہے، جو ان کی جتنی خدمت کرے وہ اس کا اتنا محبوب ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”أَخْلَقْتُ كُلَّهُمْ عِيَالٌ، اللَّهُ، أَحَبُّهُمْ إِلَيْهِ أَنْفَعُهُمْ لِعِيَالِهِ“ (۱) مخلوق ساری کی ساری اللہ کا کنبہ ہے، اس میں وہ شخص اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کو زیادہ نفع پہنچائے۔

قرآن مجید نے مسکینوں، محتاجوں، معذوروں، یتیموں اور وسائل سے محروم انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا عام حکم دیا ہے، کہیں بھی اس نے یہ ہدایت نہیں کی کہ صرف مسلمانوں یا انسانوں کے کسی خاص گروہ اور جماعت کی خدمت کی جائے اور دوسروں کی نہ کی جائے، وہ چاہتا ہے کہ خدمت پوری نوع انسانی کی ہو، اپنوں کی بھی اور غیروں کی بھی، ہم خیال اور ہم عقیدہ افراد کی بھی اور ان لوگوں کی بھی جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں، وہ بھی اس کے مستحق ہیں، جو ہماری زبان بولتے ہیں اور وہ بھی جن کے اظہار خیال کا ذریعہ دوسری زبان ہے، نوع انسانی کا ہر فرد اس بات کا حق رکھتا ہے کہ آلام و مصائب میں اسے تنہا تڑپنے نہ چھوڑ دیا جائے؛ بلکہ اس کے درد و کرب کو محسوس کیا جائے اور امکان کی حد تک اسے دور کرنے کی سعی کی جائے، اس لئے رنگ و نسل قوم و وطن کے فرق کے باوجود احادیث میں خدمت خلق کے تعلق سے عمومی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”لَا يَزِيحُ اللَّهُ مَنْ لَا يَزِيحُ النَّاسُ“ (۲)

”اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں:

(۱) المعجم الکبیر، عبد اللہ بن مسعود: حدیث: ۱۰۵۳، علامہ بیہقی فرماتے ہیں: اس کو طبرانی نے کبیر اور اوسط میں روایت کیا ہے اور اس میں عمیر، وہ ابو ہارون القرظی ہیں اور وہ متروک ہیں۔

(۲) بخاری: کتاب التوحید، باب قل أعوذ بالله، حدیث: ۶۹۳۱

”الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ ، اِرْحَمُوا مَنْ فِي الْاَرْضِ
يَرْحَمَكُمُ مَنْ فِي السَّمَاءِ“ (۱)

رحم کرنے والوں پر اللہ رحم فرماتا ہے (لہذا) زمین والوں پر رحم کرو،
آسمان والے تم پر رحم کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم ہرگز ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم رحم نہ کرو، فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر شخص رحم کرتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس سے وہ رحم اور ہمدردی مراد نہیں ہے جو تم میں سے کوئی اپنے قریب کے آدمی کے ساتھ کرتا ہے، یہاں اس رحمت عامہ کا ذکر ہے جو تمام انسانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ ”وَلَكِنَّ رَحْمَةَ النَّاسِ عَامَّةً“ (۲)

خدمت خلق کے مختلف طریقے

ایک غریب اور نادار شخص کی خدمت تو روپیے پیسے کی ذریعہ کی جاسکتی ہے؛ لیکن جس کے پاس خود دولت ہو اسے ہمارے پیسے کی کوئی حاجت نہیں ہے؛ البتہ ہم دردی اور محبت اور اخلاقی رویہ کا محتاج ہر شخص ہے، نہ اس سے کوئی امیر بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ کوئی فقیر، بعض اوقات ہم دردی کا ایک لفظ، محبت بھری ایک بات اور ایک کلمہ خیر کی مادی تعاون سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے، قرآن نے شیریں کلامی اور حسن تخاطب کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک جگہ نماز اور زکاة سے پہلے اس کا ذکر کیا ہے:

”وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ“ (۳)

اور لوگوں سے اچھے طریقے سے بات کرو، نماز قائم کرو اور زکوة دو۔

(۱) ترمذی: کتاب البر والصلة: باب فی ما جاء فی رحمة الناس، حدیث: ۱۹۲۴، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے

(۲) مجمع الزوائد: باب رحمة الناس، حدیث: ۱۳۶۷۱، علامہ بیہقی فرماتے ہیں: اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

(۳) البقرة: ۸۳

اس سے پتہ چلا کہ خدمت صرف روپیوں اور پیسوں کے ذریعے نہیں ہوتی؛ بلکہ کسی معذور کی مدد کرنا، کسی اندھے کو راستہ دکھانا، راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا دور کرنا، کسی کو پانی بھر کے دینا، حتیٰ کہ کسی سے خندہ پیشانی سے ملنا اور تہذیب و شرافت سے پیش آنا بھی ان کی خدمت ہے اور مالی خدمت کی طرح یہ بھی صدقہ ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یا ہر مسلمان پر صدقہ لازم ہے عرض کیا گیا اگر یہ نہ ہو سکے تو کیا حکم ہے؟ فرمایا اپنے ہاتھوں سے کمائے اور اپنے آپ کو نفع پہنچائے اور صدقہ کرے، عرض کیا اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو کیا حکم ہے؟ فرمایا ضرورت مند مصیبت زدہ کی مدد کرے، ”فَيُعِينُ ذَا الْحَاجَةِ الْمَلْهُوفِ“ آپ سے عرض کیا گیا اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو آپ ﷺ نے فرمایا نیکی کا حکم کرے اور یہ بھی نہ کر سکے تو آپ ﷺ کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا برائی سے رک جائے اس کے لئے یہ بھی صدقہ ہے۔ (۱)

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے متعدد ارشادات میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ نوع انسانی کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی جو خدمت بھی کی جاسکتی ہے کی جانی چاہئے، ہر خدمت صدقہ اور احسان ہے اور انسان پر اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے بدن کے جوڑ پر طلوع آفتاب کے ساتھ ایک صدقہ واجب ہو جاتا ہے دو آدمیوں میں انصاف و عدل کر دینا صدقہ، کسی آدمی کو اس کے سوار ہونے میں مدد دینا یا اس کی سواری پر اس کا مال و اسباب لا دینا صدقہ ہے، کسی سے اچھی بات کہنا صدقہ ہے اور ہر وہ قدم جو نماز کے لئے اٹھے صدقہ ہے اور تکلیف دینے والی چیز کو راستہ سے ہٹا دینا صدقہ ہے۔ ”وَيُمِيطُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ“ (۲)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) مسلم: باب بیان أن اسم الصدقة يقع على كل، حدیث: ۱۰۰۸

(۲) بخاری: کتاب الجہاد، باب أخذ الزكاة ونحوه، حدیث: ۲۸۲۷

رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ اپنے مسلمان بھائی کے سامنے مسکرا کر کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا صدقہ ہے نیک کام کے لیے حکم کرنا صدقہ ہے۔ بری بات سے روکنا صدقہ ہے۔ بے نشان زمین میں کسی کو راستہ بتانا صدقہ ہے، وہاں کسی راستہ بھولے ہوئے مسافر کو اس کا راستہ بتا دینے سے صدقہ جیسا ثواب ملتا ہے کسی اندھے یا کمزور نظر شخص کی مدد کرنا صدقہ ہے، راستے سے پتھر، کانٹا اور ہڈی ہٹا دینا صدقہ ہے اور اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی بھر دینا صدقہ ہے۔ ”وَإِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِي دَلْوِ أَخِيكَ صَدَقَةٌ“ (۱)

ان حدیثوں میں انسانوں کی خدمت اور ان کی بھلائی کی بہت سی صورتیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے بعض تو وہ ہیں کہ خدمت کا جذبہ ہو تو بڑی آسانی سے ان پر عمل ہو سکتا ہے۔

ایک روایت میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ“ (۲) بھلائی کا ہر کام صدقہ ہے، یہ ایک جامع حدیث ہے جو خدمت خلق کی سب ہی شکلوں کی جامع ہے، بنی نوع انسانی کی جس شکل میں بھی خدمت کی جائے وہ اس پر صدقہ و احسان ہے اور خدمت کرنے والا اس کے اجر و ثواب کا مستحق ہے۔

اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

”لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا وَلَوْ أَنَّ تَلَقَّ أَخَاكَ بِوَجْهِ طَلِيقٍ“ (۳)

بھلائی کے کسی کام کو حقیر ہرگز نہ سمجھو اگرچہ وہ اپنے بھائی سے مسکرا کر تمہارا ملنا ہی کیوں نہ ہو۔

(۱) ترمذی: ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف، حدیث: ۱۹۵۶، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے۔

(۲) بخاری: کتاب الادب، باب کل معروف صدقة، حدیث: ۵۶۷۵

(۳) مسلم: باب استحباب طلاقه الوجه، حدیث: ۲۲۲۶

صنعت و حرفت میں تعاون کی اہمیت

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے اپنی ایک گفتگو میں نقل فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کون سا غلام آزاد کرنا سب سے افضل ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو اس کے مالک کے نزدیک سب سے نفیس اور گراں قیمت ہو عرض کیا کہ اگر مجھے ایسا غلام نہ ملے تو؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی ضرورت مند کی مدد کر دیا کسی محتاج کے لئے محنت مزدوری کر لو عرض کیا کہ اگر میں یہ بھی نہ کر سکوں تو؟ فرمایا لوگوں کو اپنی تکلیف سے محفوظ رکھو کیونکہ یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنی طرف سے دیتے ہو۔ ”صَدَقَةٌ تُصَدِّقُ بِهَا عَلَى نَفْسِكَ“ (۱)

اس حدیث میں پہلے ایمان باللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تُعِينُ ضَائِعًا أَوْ تَصْنَعُ لَأَخْرَقَ“ اسی کی یہاں تھوڑی سی تشریح کی جائے گی، ”تُعِينُ ضَائِعًا“ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص غربت میں مبتلا ہو اور جس کے بیوی بچوں کے گذر بسر کی کوئی صورت نہ ہو، اس کی مدد کرو، اسے ضائع ہونے سے بچاؤ۔

ایک روایت میں ”ضائعاً“ کی جگہ ”صانعاً“ کا لفظ آیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی ایسے شخص کی مدد کرو جس کے ہاتھ میں کوئی صنعت یا پیشہ ہے، اس کی مدد رو پیئے، فنی تعاون، اوزار اور مشینوں کی فراہمی اور پیداوار کے لئے بازار اور مارکیٹ پیدا کر کے کی جاسکتی ہے، صاحب حرفت کی مدد کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا گیا کہ اس کی مشکلات کا بالعموم احساس نہیں ہوتا اور اس کی مدد کی طرف ذہن نہیں جاتا۔

اس کے بعد فرمایا: ”أَوْ تَصْنَعُ لَأَخْرَقَ“ اخرج بے ہنگر گویا ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو کوئی کام اچھی طرح نہ کر سکے، گویا پہلے ہنرمند کی مدد کا حکم دیا پھر بے ہنر کی مدد کی

(۱) بخاری: کتاب العتق، باب أى الرقاب أفضل، حدیث: ۲۳۸۲

طرف توجہ دلائی گئی، مطلب یہ ہے کہ جو شخص بے ہنر ہے یا اپنا کام ٹھیک سے انجام نہیں دے پارہا ہے، اس کی مدد کی جائے، اگر معاشرہ میں اس کا احساس عام ہو اور اس طرح کے ادارے کام کرنے لگیں جہاں صنعت و حرفت کی تعلیم دی جائے، بے ہنر افراد کو ہنر مند بنایا جائے اور ان کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں تو یہ خدمت خلق کی ایک عملی شکل ہو سکتی ہے اور اس سے کم زور طبقات کے معاشی مسائل بڑی حد تک حل ہو سکتے ہیں۔

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مسلمان درخت لگاتا ہے پھر اس میں سے جتنا حصہ کھالیا جائے وہ درخت لگانے والے کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے اور جو اس میں سے چرا لیا جائے وہ بھی صدقہ ہو جاتا ہے یعنی اس پر بھی مالک کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے اور جتنا حصہ اس میں سے چرند کھا لیتے ہیں وہ بھی اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے اور جتنا حصہ اس میں سے پرندے کھا لیتے ہیں وہ بھی اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے (غرض یہ کہ) جو کوئی اس درخت سے کچھ (بھی پھل وغیرہ) لے کر کم کر دیتا ہے تو وہ اس (درخت لگانے والے) کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے۔ ”وَلَا يَزْرَعُ أَحَدٌ إِلَّا كَانَ لَهُ صَدَقَةٌ“ (۱)

☆ حضرت قاسم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دمشق میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس سے ایک شخص گذرے، اس وقت حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کوئی پودا لگا رہے تھے، اس شخص نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا آپ بھی یہ (دنیاوی) کام کر رہے ہیں؛ حالانکہ آپ تو رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں؟ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے ملامت کرنے میں جلدی نہ کرو، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو شخص پودا لگاتا ہے اور اس میں سے کوئی انسان یا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی مخلوق کھاتی ہے تو وہ اس (پودا لگانے والے)

کے لئے صدقہ ہوتا ہے۔

مَنْ غَرَسَ غَرْسًا لَمْ يَأْكُلْ مِنْهُ أَحَدٌ وَلَا خَلَقٌ مِنْ خَلْقِ اللَّهِ
عَزَّوَجَلَّ إِلَّا كَانَ لَهُ صَدَقَةٌ (۱)

☆ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”مَا مِنْ رَجُلٍ يَغْرِسُ غَرْسًا إِلَّا كَتَبَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ لَهُ مِنْ
الْأَجْرِ قَدَرًا مَّا يَخْرُجُ مِنْ ثَمَرِ ذَلِكَ الْغَرْسِ“ (۲)

جو شخص پودا لگاتا ہے پھر اس درخت سے جتنا پھل پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ پھل کی پیداوار کے بقدر پودا لگانے والے کے لئے اجر لکھ دیتے ہیں۔

جب پودے کے لگانے کا یہ ثواب ہے تو پھر کسی ایسے انجکشن کا بنانا جس سے کسی مہلک مرض کا علاج ہو جاتا ہو، یا آپریشن کا آلہ، یا ایسے چیز کی ایجاد جس سے کسی لاعلاج سمجھے جانے والے مرض سے شفا حاصل ہو، جب تک وہ دوا یا آلہ یا انجکشن سے جتنے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے ثواب ملتا رہے گا۔

ترقی کے وسائل استعمال کرنے کے سلسلے میں یہ روایت بہت غیر معمولی ہے، اگر کوئی شخص پودا لگانے کے لئے بیٹھا ہو، اس کے ہاتھ میں اسکے بیج یا قلم ہو اور قیامت کا تصور پھونک دیا جائے تو حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: اگر ہو سکے تو اس پودے کو لگا کر پھر اٹھو پھر دیکھو کہ قیامت آئی ہے ”فَإِنْ اسْتَطَاعَ أَنْ يَغْرِسَ فَلْيَفْعَلْ“۔

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص بنجر زمین کو کاشت کے قابل بناتا ہے تو اسے اس کا اجر ملتا ہے ”مَنْ أَحْيَا

(۱) مسند احمد، ومن حدیث أبی الدرداء، حدیث: ۲۷۵۴۶، محقق شعیب الارنؤط نے اس روایت صحیح لغیرہ کہا ہے۔

(۲) مجمع الزوائد: باب فی اتخاذ الشجر وغیر ذلک، حدیث: ۶۲۶۶، علامہ بیہقی فرماتے ہیں: اس کو احمد نے روایت کیا ہے، اس میں عبد اللہ بن عبد العزیز اللیش ہیں، جن کی امام مالک اور منصور نے توثیق کی ہے اور ایک جماعت نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کے بقیہ رجال صحیح کے رجال ہیں۔

أَرْضًا مَيِّتَةً، فَلَهُ فِيهَا أَجْرٌ» (۱)

لہذا ہر وہ ٹکنا لو جس سے بنجر زمین کی بعض آباد کاری کی جاسکتی ہے، مسلمان اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس ٹکنا لوجی کو سیکھیں، فروغ دیں، اور اس کا استعمال کریں۔

قرآن کریم میں جا بجا فساد فی الارض (زمین میں تباہی مچانے) سے روکا گیا، زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے زمینی ذخائر کا استعمال کرنا ضروری ہے، انسانیت کے مقام کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا کو آباد کرنا اللہ کی نعمتوں میں ذکر کیا گیا ہے، «وَأَسْتَعْمَرَ كُمْ فِيهَا» (۲) اور آخرت کی منزل کو۔

فنون میں غیروں سے مشابہت ناجائز

یہ حقیقت ہے کہ ہر چیز کا وجود اس کی امتیازی خصوصیات، اسکے مخصوص نقشہ کی وجہ سے ہوتا ہے جو اوصاف اور نقشہ کسی دوسرے کو میسر نہیں، اگر زید عمر سے الگ دکھائی دیتا ہے یا ایک مکان دوسرے مکان سے علاحدہ نظر آتا ہے یا ایک کپڑا دوسرے کپڑے سے ممتاز معلوم ہوتا ہے تو وہ انہیں خصوصیات کے سبب جو ان میں مشترک نہیں، بلکہ آپس میں جداگانہ اور ممتاز ہیں، مکان کا ایک مخصوص نقشہ ہے جو دوسرے سے ممتاز ہے، کپڑے کو ہم اس کی رقت و غلظت، کپڑے کی چکناہٹ اور اس کے کرخت پن کے ذریعہ ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں، اسی طرح زید کے چہرے اور قد و قامت کی وہ مخصوص صفات و اعراض ہیں جو عمر و کے لئے نہیں۔

ان اعیان کو چھوڑ کر اعراض کو لیں تو یہاں پر بھی صورت کا اختلاف ان کے وجود اور ہستی کے بقا کی وجہ سے ہوتا ہے، نور کی شکل اور ہے ظلمت کی اور، ان کی حقیقت جب ظہور کرتی ہے تو اپنی نورانی شکل میں اور رات اپنی تاریک اور بھیانک شکل پر، الوان کو دیکھو تو سیاہ رنگ، وہ شکل نہیں جو سرخ کی ہے اور سرخ کی وہ شکل نہیں جو سبز و سیاہ کی ہے؛ بلکہ ہر ایک اپنی امتیازی صورت میں اپنے وجود کی نمائش کر رہا ہے۔

(۱) صحیح ابن جبان: ذکر إعطاء الله جل وعلا الأجر للمسلم، حدیث: ۵۲۰۴

(۲) ہود: ۶۱

اسی طرح جمادات کے نوعی دائرے میں جب ہم پتھر کی تلاش میں نکلتے ہیں تو کبھی پتھر کے دھوکے میں ریت اور لکڑی نہیں اٹھاتے، کیونکہ پتھر کی ایک قدرتی شکل متعین ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے، اس لئے نہ پتھر کو اینٹ کہہ سکتے ہیں، نہ اینٹ کو پتھر، نباتات میں آم کو دیکھ کر ہمیں کبھی سیب و انار ہونے کا دھوکہ نہیں ہوتا کہ ان کی صورتیں ممتاز ہیں۔

اسی طرح اگر ہم حیوانات میں انسانیت کے جو یا ہوں تو گھوڑے اور گدھے اور شیر کی شکلوں میں اس کو تلاش نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کو انسان ہی کی شکل میں تلاش کرنا ہوگا، جو اپنے قوی، قوت احساس و ادراک، ایجاد و اختراع کی طاقت، نفاست و نزاہت سے خوش آمد صفات کا حامل لباس، زینت کے خوش نما منظر، حالات اپنے اندر لئے ہوئے ہوتا ہے، پھر انسانوں کے آپسی حیوانی و نفسانی جذبات کے اتحاد کے باوجود ان میں صنفی اختلافات اور تفریق بھی ہے، جن میں ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت سے تعبیر کرتے ہیں، اس اختلاف کی وجہ سے ان کے احکام بدل گئے، حقوق الگ ہو گئے۔

بہر حال دنیا کی اشیاء کی ہمہ ہی اور رنگاری میں ہی ان کے وجود کا راز پنہاں ہے، کوئی دیوانہ بھی یہ نہیں چاہے گا کہ رات اور دن ایک ہو جائیں، نور و ظلمت میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے، سارا عالم ایک ہی شکل اور ایک ہی رنگ میں ہو، ایک ہی حجم میں اور سب سب نہ ہوں؛ بلکہ وہ سب ایک ہوں، جو انسان ہو وہی گدھا ہو، اور جو گدھا ہو وہی شیر اور بکری بھی ہو، آم کے درخت کو ببول بھی کہا جائے اور ببول کو گلاب و یاسمین بھی پکارا جائے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک اور یکتائی کے سوا دوسرے اور دوئی کا پتہ بھی نہ ہوگا، گویا سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہ ہوگا، پھر اس طرح اس عالم کا وجود بیکار ٹھہرے گا۔ اختلاف و التباس یہ کائنات کے وجود کو باطل کر دیتا ہے، اس کے بالمقابل امتیاز اور فصل ہی ہر چیز کے وجود کو نمایاں کرتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح انسانیت میں تکوینی خصوصیات کے اس اتحاد کے باوجود کچھ معنوی خصائص اور باطنی امتیازات بھی ہیں جن کی وجہ سے انسان کی جسمانی صورتوں

کے اتحاد کے باوجود ان کی معنوی صورتیں علاحدہ کر دی ہیں۔

اسی طرح انسانوں میں بے شمار معنوی جتنے وجود میں آگئے، مسلم قوم، آریں قوم، ہندو قوم، عیسائی اور یہودی اقوام، یہ تمام قومیں ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود مختلف اور متفاوت ہو گئیں، ان اقوام کے مابین اخلاق و عادات مختلف، ان کا تمدن و تہذیب مختلف، ان کے جذبات و احساسات مختلف، اگر ہم آج ایشیائی قوموں کو یورپین اقوام سے مختلف کہتے ہیں تو اس وجہ سے کہ جو خصوصیات تمدن و معاشرت اور جذبات و احساسات ایک قوم کے ہیں ان کا دوسرے میں وجود نہیں، انہی معنوی اور روحانی خصوصیات کا نام دین اور مذہب ہے، جس طرح مادیات میں حیوانیت، نباتیت اور جمادیت کے ظہور کے لئے مخصوص شکلوں اور صورتوں کی ضرورت ہے، اسی طرح معنوی طور پر مختلف اقوام میں شرعی اور مذہبی حقائق کے اظہار کے لئے مخصوص ہیئتوں اور ممتاز شکلوں کی ضرورت ہے۔

بہر حال اسلام جیسے ہمہ گیر اور وسیع مذہب کی بھی اپنے عقائد و تصدیقات، اعمال و عبادات، معاملات و سیاسیات، آداب و معاشرت، سلوک، حالات و مقامات کے اعتبار سے ایک خاص شکل و صورت ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اسی طرح محاسن اخلاق، سخاوت و شجاعت، حلم و ایثار، معاملات، بیع و شراء، اور معاشرت، لباس، رہن سہن آپس کے حقوق متعین ہیں، اسلام اس مجموعی ہیئت اور صورت کا نام ہے۔

اس لئے اسلام یہ چاہتا ہے کہ علوم و فنون کے سلسلے میں ہمارا اپنا طریقہ کار اور ہماری اپنی ایجاد اور اختراع ہو، ہم اس بارے میں بھی اپنے امتیاز باقی رکھیں، غیروں پر تکیہ کئے نہ رہیں۔

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”لَا تَسْتَضِيْؤْا بِنَارِ اَهْلِ الْبَيْتِ“ (مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے ”لَا تَسْتَشِيْبُوْا الْمُشْرِکِيْنَ فِيْ شَيْءٍ مِنْ اُمُوْرِكُمْ“ یعنی مشرکین

سے اپنے امور میں مشورہ نہ لیا کرو، اور پھر مطلب یہ ہے کہ ان سے علم حاصل نہ کیا کرو، یعنی علوم و فنون کے سلسلے میں ان پر اعتماد اور تکیہ کرنا درست نہیں“ (۱)

☆ ایک موقع سے نبی اکرم ﷺ اپنے دست مبارک میں عربی کمان لئے ہوئے تھے کہ آپ نے کسی کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی تو ناخوشی سے فرمایا کہ: یہ کیا لئے ہو؟ اسے پھینک دو اور عربی کمان رکھو جس کے ذریعہ خدا نے تمہیں قوت و شوکت دی اور بلاد ارض کو مفتوح کیا۔ (۲)

چونکہ فارسی کمان کا بدل عربی کمان موجود تھی اس لئے غیرت دلا کر حضور اکرم ﷺ نے روک دیا، تاکہ غیر اقوام کے ساتھ ہر ممکن سے ممکن امتیاز پیدا ہو جائے اور چھوٹے سے چھوٹا اشتراک بھی منقطع ہو کر ایک مسلم اپنی ہی ہستی کے ساتھ نمایاں ہو، ہاں غیروں کی نئی نئی ایجادات، جدید اسلحہ وغیرہ استعمال بھی کئے جائیں، اگر ان کا بدل ہمارے یہاں موجود نہ ہو، تو بغیر مشابہت کی نیت کے استعمال کئے جائیں، اور اسی طرح کی جدید ٹکنالوجی، قوت حرب و سامان خود اپنے ملک میں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریقِ امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچِ غربی میں نام پیدا کر

☆ ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میں نے اپنے یہاں ایک نصرانی کا تب ملازم رکھا ہوا ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے کیا ہوا خدا تجھے عارت کرے کیا تو نے اللہ کا یہ حکم نہیں سنا کہ یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ؛ کیونکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ”أَتَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ“ کیوں نہ تو نے کسی مسلمان کو ملازم رکھا۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: اے امیر المؤمنین! میرے لئے اس کی کتابت ہے اور اس کے لئے اس کا دین ہے (مجھے اس کے دین سے کیا تعلق؟) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں ان کی تکریم نہیں کروں گا جن کی اللہ نے توہین کی اور میں ان کو عزت نہ دوں گا جن کو اللہ نے ذلیل کیا اور میں انہیں مقرب نہ بناؤں گا جن کو اللہ نے دور کیا۔ (۱)

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو

مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

☆ حضرت حکیم الاسلام قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس مکالمہ کی وضاحت نکات کی

شکل میں یوں فرماتے ہیں:

۱۔ جب تک کوئی مضطر ارانہ ضرورت داعی نہ ہو اصل یہی ہے کہ غیر مسلمین سے

استغاثہ اور وہ بھی ایسے کہ اس میں ان کی تکریم ہوتی ہو، قرین عقل و دین نہیں۔

۲۔ یہ عذر کسی طرح قابل سماعت نہیں کہ ہمیں صرف خدمت درکار ہے، نہ کہ ان کا

مذہب؛ کیونکہ اس تحصیل خدمات کے ذیل میں ان کے ساتھ معیت اس شدت

اور تغلیظ کو کم یا محو کر دے گی، جو ایک مسلمان کا اسلامی شعار بتلایا گیا ہے۔

۳۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے بعد کوئی شخص ان جیسا تدبیر نہیں لاسکتا،

لیکن اگر بالفرض لے بھی آئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ تو کفار کی خدمات

حاصل کرنے سے روک دیئے جائیں اور اسے نہ روکا جائے۔

۴۔ جس مخلوق کی اس کے خالق نے تکریم نہ کی ہو اور ان کے لئے عزت کا کوئی شتمہ

گوارا نہیں کیا ہو، اس خالق کے پرستاروں کی غیرت و حمیت کے خلاف ہے کہ وہ

علوم و فنون میں ان سے استفادہ کے ذریعہ اس کے دشمنوں کی تکریم کریں، وہ جسے

پھٹکارے یہ اسے پیارا کریں۔ (۱)

☆ نعلِ سندی مجوسیوں کا مخصوص جوتا تھا، مروزی کہتے ہیں کہ: میں نے نعلِ سندی

کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ ان کا پہننا کیسا ہے؟ تو فرمایا:

”أَمَّا أَنَا فَلَا أَسْتَعْمِلُهَا لِكِنْ إِذَا كَانَ لِلْكَنِيفِ أَوْ الْوَضُوءِ“ لیکن سو

میں تو استعمال نہ کروں گا، البتہ جب کہ کیچڑ گارے کے لئے یا بیت الخلاء کے

لئے (ایک روایت میں) اگر بیت الخلاء یا وضو کے لئے تو مناسب ہے اور جو

زینت کا ارادہ نہیں، اور فرمایا کہ عجمیوں کی بیعت ہے، علامہ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے

ہیں کہ: گویا امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے گلی کوچوں میں انہیں پہن کر چلنے کو مکروہ نہیں سمجھا

ہے۔

☆ امام ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے نعلِ کرمانی (کرمانی جوتا) کے متعلق پوچھا گیا تو

انہوں نے اسے ناپسند فرمایا اور کہا کہ یہ (اسلامی جوتا) اس کے مقابلے میں تمہیں

کافی ہے۔

☆ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اس پر بڑا افسوس اور قلق کا اظہار کیا

کرتے تھے کہ مسلمان ممالک صنعت و حرفت اور اپنی ضرورت کو اپنے ملک میں

ہی پیدا کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے، اور ان کی زیادہ تر دولت باہر سے

ضروریات زندگی کے درآمد کرنے پر صرف ہوتی ہے، حضرت مولانا ابوالحسن

ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شعبان ۱۳۸۱ھ جنوری ۱۹۶۲ھ میں راقم نے اپنے

چند رفقاء کے ساتھ کویت و قطر کا سفر کیا، جب اجازت اور رخصت کے لئے رائے

پور حاضر ہوا تو بڑی عنایت اور محبت سے رخصت فرمایا: چلتے وقت خصوصیت سے

فرمایا: ”ان بھلے مانسوں سے کہنا کہ اپنی دولت کا صحیح استعمال کریں، کارخانے بنائیں اور صنعتوں کو رواج دیں“ (۱)

حضرت، اسلامی ممالک کے لئے مادی ترقی، نئے علوم کا اکتساب، جدید صنعتیں، سائنس میں ترقی، مالی استحکام اور خود کفالتی کو بہت ضروری سمجھتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا:

”نیک نیتی سے ملک کی طاقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی جائے سب دین ہی ہے“ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَظَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ ” اگر ریاءِ مینیت فاسد سے نماز بھی پڑھی جائے تو بھی قبول نہیں ہوتی اور رد ہے، اور اگر مینیت صالح سے پڑھی جائے تو وہ عبادت ہے، اسی طرح مینیت صالح سے حکومت کی ترقی کا جو بھی کام کیا جائے سارا کا سارا دین ہی ہے، ایسا نہ ہو کہ ”تا تریاق از عراق آورده شود مارگزیدہ مردہ شود“ (تریاق کے عراق سے آنے تک سانپ کا کاٹا مر جائے) افراد کی اصلاح بھی ضروری ہے؛ لیکن ملک کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اور ایک موقع سے فرمایا:

”اسلامی نظام خالی باتوں سے نہیں قائم ہو سکتا، اگر دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم و فنون سیکھنے ہوں گے، مگر مشکل یہ ہے ان کے علوم کو سیکھتے سیکھتے اپنے دین و مذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں، جب تک کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو تو اس زمانہ میں دین و دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتا“۔ (۲)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

(۱) سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ: از مولانا ابوالحسن علی الندوی: ۲۸۰، مکتبۃ الاسلام، گوئن روڈ لکھنؤ

(۲) سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، از مولانا ابوالحسن علی الندوی: ۲۷۹

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں
اور کھلے ہیں سب کے لئے غربتوں کے میخانے
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مشہور زمانہ کتاب ”مسلمانوں کا عروج و زوال“ کتاب میں مادی اسباب کی تیاری کی اہمیت و افادیت کو بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

عالم اسلام کا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا، اگر اس کو اسلام کے پیغام کی اشاعت کی خواہش ہے اور وہ دنیا کی قیادت و رہنمائی کا فرض انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو اس کے لئے ممتاز قوت اور تربیت، صنعت و علوم، تجارت اور فن حرب میں مکمل کی ضرورت ہوگی، اس کو زندگی کے ہر شعبہ اور اپنی ہر ضرورت میں مغرب سے مستغنی اور بے نیاز ہونا پڑے گا، وہ اس سطح پر ہو کہ اپنے لئے پہننے اور کھانے کا سامان کر سکے، اپنے لئے ہتھیار تیار کر سکے، اپنی زندگی کے معاملات کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو، اپنی زمین کے خزانے وہ خود برآمد کر سکے اور اس سے فائدہ اٹھا سکے اپنی حکومتوں کو اپنی دولت اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ چلائے، اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندروں میں بحری بیڑے اور جہاز شور کر رہے ہوں، وہ دشمن کا مقابلہ اپنے یہاں کے جنگی جہازوں، توپوں اور ہتھیاروں سے کریں، اس کی برآمد اس کے درآمد سے زیادہ ہو اور اس کو مغربی ممالک سے قرض لینے کی ضرورت پیش نہ آئے، اس کو اس کے کسی جھنڈے کے نیچے نہ آنا پڑے اور وہ کسی کیمپ میں شامل ہونے پر مجبور نہ ہو۔

جب تک عالم اسلام علم و سیاست، صنعت و حرفت و تجارت میں مغرب

کا محتاج رہے گا، مغرب اس کا خون چوستا رہے گا، اسی کی زمین کا آبِ حیات نکالے گا، اس کا سامان تجارت اور مصنوعات ہر روز اس کی منڈیوں، بازاروں اور جیبوں پر چھاپہ مارا کریں گے اور اس کی ہر چیز پر ہاتھ صاف کرتی رہیں گی، جب تک عالم اسلامی مغرب سے قرض لیتا رہے گا اور اپنی حکومت کا انتظام کرنے، اہم کلیدی عہدوں کو پُر کرنے، اپنی فوج کو ٹریننگ دینے کے لئے مغرب کے آدمیوں کا رہین منت رہے گا، وہاں کا سامان تجارت و صنعت منگائے گا اور اس کو اپنا اتالیق اور استاذ، مربی اور سرپرست، حاکم اور سردار سمجھے گا، اس کے حکم اور اس کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا، اس وقت تک وہ مغرب سے مقابلہ کرنا تو درکنار اس سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتا۔

یہ علمی و صنعتی زندگی کا وہ شعبہ تھا جس کے بارہ میں عالم اسلامی نے عہدِ ماضی میں کوتاہی سے کام لیا اور جس کی تعزیر اس کو طویل اور ذلیل زندگی کا مزہ چکھنا پڑا اور اس پر مغربی قیادت اور سرداری مسلط کی گئی، جس نے دنیا میں تباہی و غارت گری، قتل و خون ریزی اور خودکشی برپا کی، اب اگر اس موقع پر بھی عالم اسلامی نے علمی و صنعتی تیاری اور اپنی زندگی کے معاملات میں آزادی کے بارہ میں غفلت برتی اور اس مرتبہ بھی اس سے یہ چوک ہوگئی تو دنیا کی تقدیر میں بد نصیبی اور شقاوت لکھ دی جائے گی اور انسانیت کے ابتلاء کی مدت اور طویل ہو جائے گی“ (۱)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی ماہنامہ ”البینات“ کے ادارہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”عالمِ اسلام بالخصوص عرب کے صحراؤں میں قدرتی وسائل، خام ذخائر اور مال و دولت کی کمی نہیں، بلکہ فراوانی ہے، مگر یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ان

کے مال و دولت کا بڑا حصہ یا تو غیر ملکی بینکوں میں جمع ہونے کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کے کام آتا ہے، بادشاہ خرچی، عیش پرستی، عافیت کوشی اور آسائش پسندی کے لئے ضائع کیا جاتا ہے، لیکن فوجی استحکام، عسکری تربیت اور اسلحہ سازی تقریباً صفر ہے، دشمنانِ اسلام جگہ جگہ ہوائی اڈے، بحری بیڑے، فوجی چھاؤنیاں اور اسلحہ سازی کے بڑے بڑے کارخانے قائم کر رہے ہیں؛ مگر مسلمان خدا فراموشی کے ساتھ ظاہری تدبیر سے بھی مجرمانہ غفلت میں مست ہیں۔“

عصری علوم میں غیروں کے محتاج نہ بنیں

موجودہ عصری تعلیم کا جو نظام اس وقت ہم پر لا دیا گیا ہے، اس کا بانی لارڈ میکالے تھا اور اس نے اپنی جو تاریخی یادداشت ۱۸۴۲ء میں مقبوضہ ہندوستان کے گورنر جنرل کو پیش کی تھی، بلکہ ڈھٹائی سے کھول کھول کر بیان کر دیا تھا، اس کا سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں شدید احساسِ کمتری کا شکار بنا کر ان کے دلوں پر مغرب کی ہمہ گیر بالادستی کا سکہ بٹھا دیا جائے اور نئی نسل کو ہر ممکن طریقہ سے یہ یقین کر لینے پر مجبور کیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سر بلندی چاہتے ہو تو اپنی فکر اپنے فلسفے، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنے سارے ماضی پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے نقوش قدم میں تلاش کرو، گویا اس تعلیمی نظام کی ساری مشینری سر سے لے کر پاؤں تک وہی ہے جو میکالے نے سرکاری ملازم یا زیادہ صحیح لفظوں میں اپنے ذہنی غلام پیدا کرنے کے لئے بنائی تھی۔

انگریزی اقتدار کے عہد میں ہم پر جو نظام مسلط کیا گیا تھا اس میں دوسری خرابیوں کے علاوہ ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ اس میں اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں سے کاٹ کر عبادتوں اور نجی زندگی کے چند معاملات تک محدود کر دیا تھا، یہ بات محتاجِ بیان نہیں ہے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور وہ حکومت سے سیاست سے لے کر تجارت و معیشت

تک زندگی کے ہر شعبے کے لئے اپنی مخصوص تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے؛ لہذا جس وقت دنیا میں یہ دین عملاً نافذ تھا، اس وقت نظام تعلیم کا حال بھی یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم صرف اسلامیات کے مضمون کی حد تک محدود نہ تھی، بلکہ ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلام رچا بسا نظر آتا تھا، طالب علم فلسفہ پڑھ رہا ہو یا منطق، سائنس کی تعلیم حاصل کر رہا ہو یا حساب اور ریاضی کی، طب کی تعلیم میں مشغول ہو یا صنعت و حرفت کی تعلیم میں، غرض ہر علم و فن کی تعلیم کے رگ و ریشہ میں اسے اسلامی نظریات اور مفکرین اسلام کے افکار یا کم از کم اسلامی طرز فکر سمایا ہوا ملتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ علم و فن کے خواہ کسی گوشے کو اپنی زندگی کا محور بنا لے، وہ ذہنی اور عملی طور پر سچا اور پکا مسلمان ہوتا تھا، اس کے دل و دماغ میں اسلام کے مقابلے میں دوسرے افکار سے مرعوبیت پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی، یہ نظام تعلیم اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر دیتا تھا کہ وہ ہر نئی تحقیق اور نئے فلسفے سے اس کے صالح اجزاء کو اپنالے اور غیر صالح کو چھوڑ دے۔

اس لئے موجودہ عصری تعلیمی نظام کو بجائے اس کے یہ غیروں کا نصاب ہم پر مسلط رہے، اس نظام کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے، اسلئے کہ موجودہ نظام تعلیم میں اسلام کی اس ہمہ گیر حیثیت کو سرے سے ختم کر دیا گیا ہے، اسلام کو صرف ”اسلامیات“ کے ایک گھنٹے تک محدود کر دیا گیا ہے، اور اس ایک گھنٹے میں بھی نصاب اور طرز تعلیم کے معیار کو اس قدر پست کر دیا گیا ہے کہ اس سے اسلام کی صحیح تعلیم کا ہزارواں حصہ بھی طالب علم کے سامنے نہیں آ سکتا۔

یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو سکے گی:

☆ آج کل ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو فلسفہ پڑھایا جا رہا ہے اس میں یونانی یا نوافلاطونی فلاسفے کے بعد طالب علم سیدھا یورپ کے ذہن پر قائم ہو جاتا ہے کہ بعد کے فلسفے تک پہنچ جاتا ہے، اور اس کے ذہن پر یہ تاثر قائم ہو جاتا ہے کہ نوافلاطونی فلاسفر سے کرڈیکارٹ تک پورا زمانہ فکر اور فلسفے میں جمود کا زمانہ ہے، علم و فن کی تاریخ میں بھی اس زمانہ کو تاریک زمانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ حالانکہ یہ

دور صرف غیر مسلم یورپ کے لئے تاریک تھا، ورنہ یہی وہ دور ہے جس میں مسلمانوں نے آدھی سے زائد دنیا میں علم و فن کے چراغ روشن کئے ہوئے تھے، اور خود یورپ کا خطہ اندلس ان کی روشنی سے جگمگا رہا تھا، اس دور میں مسلمان فلاسفہ اور متکلمین نے فکر اور فلسفہ کے میدان میں جوئی راہیں کھولی ہیں اور اپنی تحقیقات کا جو بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے، موجودہ نظام تعلیم میں سرے سے ان کا کوئی ذکر ہی نہیں ملتا۔

جدید اسلامی نظام میں یہ ضروری ہے کہ اس وسیع علمی خلا کو پر کیا جائے جو مغرب کی تنگ نظری اور تعصب نے مصنوعی طور پر پیدا کیا ہے، اور فلسفے کی تعلیم میں مسلمان فلاسفر اور متکلمین کے افکار کو ان کا صحیح مقام عطا کیا جائے۔

☆ سائنس کے بارے میں یہ حقیقت آج پوری دنیا میں مان لی گئی ہے کہ سائنس کی موجودہ ترقی میں اس استقرائی طریقہ جس میں صرف قیاس و تخمین کے بجائے مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ تحقیقات کی جاتی ہیں، لیکن ساتھ ہی مغربی نظام تعلیم نے ہر کس و ناکس کے ذہن پر یہ تاثر قائم کر دیا ہے کہ استقرائی طریقہ، استدلال کی بنیاد پر مسلمانوں نے ڈالی تھی، انہوں نے ہی سائنس کا رخ موڑ کر اسے اس راستہ پر ڈالا تھا جس پر آج وہ برق رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی ہے، اس کے باوجود ہمارا سائنس کا طالب علم خالد بن یزید، زکریا رازی، ابن سینا، خوارزمی، ابوریحان، بیرونی، فارابی، ابن مسکویہ، ابن رشد، کندی، جابر بن حیان اور موسیٰ بن شاکر جیسے عظیم سائنس دانوں سے یکسر ناواقف ہے۔

☆ معاشیات کی تعلیم میں طالب علم آج صرف یہ جانتا ہے کہ بنیادی طور پر معاشیات کے دو مکتب فکر ہیں، سرمایہ داری اور اشتراکیت، اسلام کے معاشی اصول اور قوانین اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل رہتے ہیں، اور اس کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسلام نے بھی معیشت کے بارے میں ایسا نظام بنایا ہے جو مذکورہ دونوں مکاتب فکر سے الگ ہے، اسی طرح اس کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ علم معاشیات کی

بنیاد آدم اسمتھ نے رکھی تھی، اور اس سے بہت پہلے کے تمام فقہاء سے لے کر ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے مفکرین نے علم معاش کی جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو فہرست سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے۔

☆ علم سیاست میں بھی نوافلاطونی فلاسفر اور جدید مغربی فلسفہ کے درمیان ایک وسیع خلاء ہے جو صرف مغرب کے تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار ہے، سیاست کے بارے میں اسلام کے اصول و تعلیمات اور مسلمان مفکرین کی کاوشوں کا کوئی ادنیٰ سا عکس بھی موجودہ نصاب میں نہیں ملتا۔

☆ یہی حال عمرانیات کا بھی ہے، شاید ہی کوئی منصف مزاج اس بات سے انکار کر سکے کہ اس علم کے مدون اول ابن خلدون ہیں؛ لیکن عمرانیات کے موجودہ نصاب سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلام یا مسلمانوں نے بھی اس علم پر کوئی کام کیا ہے۔

☆ نفسیات کی تعلیم اب بڑے پیمانے پر ہونے لگی ہے؛ لیکن اس سلسلے میں مسلمانوں کے علماء تصوف نے جو نئی نئی راہیں اور نفس انسانی کے عوارض پر مفید ترین بحثیں کی ہیں، موجودہ نظام تعلیم میں اس کی کوئی پرچھائیں بھی موجود نہیں ہیں۔

☆ قانون اور اصول قانون کے بارے میں بھی ہمارا نصاب تعلیم سراسر مغربی افکار و نظریات ہی سے بھرا ہوا ہے، اصول قانون کی دقیق بحثوں کو جس بے نظیر انداز میں فقہائے اسلام نے اصول فقہ میں مدون کیا ہے اس سے استفادہ کا کوئی موقع طالب علم کو نہیں ملتا۔

☆ اسی طرح بعض علوم میں خالص اسلامی احکام کے اجزاء کی ضرورت ہے، مثلاً حساب میں سود اور سود در سود کے مسائل تو باقاعدہ پڑھائے جاتے ہیں، لیکن میراث اور زکوٰۃ نکالنے کے طریقوں سے طالب علم ناواقف رہتا ہے، اسی طرح جغرافیہ کی تعلیم میں سمت، قبلہ، اوقات نماز اور مواقیات احرام معلوم کرنے کا طریقہ اس کی نظر سے نہیں گذرتے، نصاب کی نئی تدوین میں اس قسم کی چیزیں شامل ہونی چاہیئے، غرض وہ علوم جنہیں آج جدید علوم یا مغربی علوم کا نام دیا گیا

ہے، ہمارے نظام تعلیم میں ٹھیک اسی ترتیب اور اسی ڈھانچے کے ساتھ لئے گئے ہیں جو مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتتے ہوئے اسلام کا نام لئے بغیر بنایا تھا، اب اگر اپنے نظام تعلیم کو اسلامی بنانا اور اس کے ذریعہ صحیح اسلامی قومی شعور پیدا کرنا مقصود ہے تو یہ بات خواہ کتنی منت طلب کیوں نہ ہو، لیکن ناگزیر اہمیت رکھتی ہے کہ ان علوم کے سلیبس کو اپنے قومی تقاضوں کے تحت اس طرح مرتب و مدوّن کیا جائے کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے افکار اور کارنامے پوری طرح رچے بسے ہوں (نمونہ کے طور پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”قانون بین الممالک“ ملاحظہ ہو جس میں بین الاقوامی قانون کو اس طرح مدون کیا گیا ہے)۔ (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) مسلمان قوم کی ترقی دین دار مسلمان، ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان سے ہے نہ کہ ملحد، غلامانہ ذہنیت والے افراد اور حقیقت یہ ہے کہ دوسری قسم ہی ہمیشہ نفاذ شریعت میں رکاوٹ بنی، اور اعداء اسلام کا آلہ کار ہوئی ہے

(۲) دینی ضروری علم پر عصری علوم کو اتنی اہمیت نہ دی جائے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے تئیں احساس برتری، دینی تشخص کی حفاظت، داعیانہ کردار سے یکسر خالی ہو جائے، اہل علم اور اہل اللہ کی صحبتوں سے اسے مربوط کیا جائے۔

(۳) نصاب و نظام میں جرأت مندانہ اور انقلابی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے، یہ کام وہ ادارے بخوبی انجام دے سکتے ہیں جسے خود مسلمان چلا رہے ہیں۔

(۴) اللہ کی مدد کے بغیر کوئی کام نہ ہوا اور نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہو رہا ہے، نصرت الہی، ایمانی صفات سے متوجہ ہوتی ہے، ایمانی صفات سے خالی نظام بھی انسانیت اور مسلمانوں کے لئے بھلائی کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، غلبہ کا فیصلہ نہیں کر سکتا، اقوام عالم پر تفوق نہیں دلا سکتا۔

(۵) تعلیم کو محض برائے امتحانات، برائے تجارت، برائے دولت نہ چلایا جائے؛ بلکہ برائے خدمت کا تصور پرورش کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

اگر عصری علوم کی دینی علوم سے زیادہ اہمیت ہوتی تو رسول اللہ ﷺ نے کبھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو موجودہ زمانے میں جن خبیث اعمال کو فنون لطیفہ کہا جاتا ہے، اس کے سیکھنے کے لئے بھیجا ہوتا، کیا وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نہایت متمدن اقوام کے سامنے داعیانہ اور قاتلانہ احساس برتری کے ساتھ دینے والا ہاتھ لے جا رہے ہیں، نہ کہ لینے والا، اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا؛ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دینی مزاج کے پختگی کے بعد تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم جب فارسی ممالک میں گئے تو زبان سیکھنے سے پہلے اہل زبان پر اتنے مؤثر ثابت ہوئے کہ فارسی زبان کے رگ و پے میں اسلامی خون دوڑا دیا، یہ بات صحیح ہے کہ اسلام ہر علم نافع کی ہمت افزائی کرتا ہے؛ لیکن علم نافع میں فرض عین و فرض کفایہ کی تفریق بہت ضروری ہے، لیکن ایسا نہ ہو کہ فرض کفایہ کی ادائیگی کی فکر میں اور امت کو آنکھ، ناک کا ڈاکٹر دینے کے جذبہ میں خود کی اذکار نماز درست نہ ہو، فرائض اسلام سے دوری ہو یہ بہت تکلیف دہ اور غیر معتدل صورت حال ہے کہ عصری علوم کی اہمیت پر بولنے اور لکھنے والے نافع اور غیر نافع کی تقسیم پر چھوڑ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے قرآن وحدیث والے علم کی تحقیق محسوس ہوتی ہے۔

عالم اسلام میں کرنے کا پہلا کام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ موجودہ انگریز اور یورپین قوموں کے نصاب تعلیم کے امت اسلامیہ میں رواج پا جانے کی وجہ سے مسلمانوں میں جو مختلف ذہنی کشمکش جاری ہے، اور مختلف نظریات کی حامل مسلمان نسل وجود میں آرہی ہے، جو میدان کار میں آنے کے بعد مختلف طبقات کی شکل میں بٹ کر امت میں تفریق اور پھوٹ کا باعث بن رہی ہے، اس کی وجہ طرز تعلیم کو قرار دیتے ہوئے نصاب ونظام کی تبدیلی کی پرزور وکالت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”مغرب کی فکری و تہذیبی یلغار کے دور شروع ہونے اور اس کے مشرق کو

اپنے ارادہ یا بلا ارادہ مغربی طرز تربیت، نظام تعلیم، دبستان فکر، زندگی اور انسان کے مغربی تصور اور علوم وفنون کے مغربی زاویہ نگاہ میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس کی گود میں اس طرح آجاتا ہے کہ وہ اس کے پورے نظام تعلیم یا مختصر الفاظ میں اس کے نظریہ تعلیم کو ساری خرابیوں اور خامیوں کے باوجود جوں کا توں قبول کر لیتا ہے جو ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوا اور نافذ کیا گیا جس کے عقائد، بنیادی اصول، اخلاقی قدریں، اسلامی معاشرہ کی قدروں اور بنیادی مسلمہ اصولوں سے ہر جگہ اور ہر سطح پر مختلف ہیں جن پر وہ پورا ایمان رکھتا ہے یا ان پر ایمان لانا، ان کے لئے جدوجہد کرنا ان کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی دینا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے؛ بلکہ مغرب کی اخلاقی قدروں کی تردید اور ان کی بیخ کنی اور تحقیر ہی پر اس کی بنیاد ہے، ایسی حالت میں اس کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہوتی ہے جو آب حیات کے شوق میں زہر کا پیالہ پینا چاہے، یا کھاری اور نمکین پانی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرے۔

انہوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور علمی اداروں کی تشکیل میں بیرونی ملکوں کے تعلیمی مشیروں کو پورا اختیار دے رکھا ہے اور ان ملکوں سے صرف درسی کتابیں نہیں درآمد کر رہے ہیں، وہ ان ملکوں میں اپنے تعلیمی وفد بھیجتے ہیں؛ تاکہ وہ مغربی ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں نشوونما حاصل کریں، پھر ان کو ممالک اسلامیہ کے تعلیمی منصوبوں اور پالیسیوں کی تشکیل و تربیت کی پوری آزادی بھی دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کا نقشہ بنائیں اور ان کا جو رخ چاہیں متعین کریں۔

اس کے نتیجے میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے عقائد و افکار اور اپنے اخلاق و سیرت سب میں ذہنی انتشار کا شکار ہے، فکر مغربی اور فکر اسلامی کے درمیان تذبذب کی حالت بھی بسا غنیمت تھی، لیکن اس نے اکثر

اوقات اپنے ملک و ملت اور اپنے معاشرہ کے سارے معتقدات و مسلمات اور اصول و اقدار سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

تعلیم کی یکسانیت کی وجہ سے آج مغرب میں عوام اور قیادت یا جمہور اور حکومت میں کسی گہری اور وسیع نظریاتی، ذہنی و فکری خلیج کا سراغ نہیں ملتا، وہاں صرف ایک طرز اور ایک آئیڈیل اور ایک قسم کے اصول و نظریات اور مقاصد و نصب العین پائے جاتے ہیں، وہاں مختلف طبقات اور سوسائٹی کے افراد کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور نفسیاتی رسہ کشی نہیں اور اسی وجہ سے یہ ممالک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے محفوظ ہیں۔

مغرب کے بعد ان مشرقی ممالک کا نمبر آتا ہے جو مدت دراز سے اپنا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور ان کو حقائق پر یقین نہیں جن کی ایمان بالغیب اور انبیاء علیہ السلام کی تعلیمات و ہدایات پر بنیاد ہے، ان کے پاس متعین آسمانی تعلیمات یا محفوظ آسمانی صحیفے بھی نہیں ہیں، وہ صرف ان قومی روایات اور جماعتی و شخصی مفادات کی حامل ہیں جن کو یہ تعلیمی نظام اور پروگرام چیلنج نہیں کرتے اور کسی جگہ ان دونوں کا کراس نہیں ہوتا، چنانچہ یہ ممالک بھی اسی طرح اس تضاد سے محفوظ ہیں جو مغربی نظام تعلیم پیدا کرتا ہے؛ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اس نظام تعلیم سے صلح و صفائی کر لی ہے اور دونوں میں پوری مفاہمت پائی جاتی ہے، یا انہوں نے اپنے آپ کو ان تعلیمی و تربیتی نظریات کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اسی لئے انقلابات اور سازشوں کا تناسب یہاں بہت کم اور تضاد بھی بہت کم یا اتنا کمزور ہے کہ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، ملک سے غداری اور قومی خیانت کے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں اور یہاں بھی عوام اور رہنما طبقہ میں وہ وسیع خلیج حائل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی ملکوں میں نظر آتی ہے، ان ممالک کے امراض اور ان کے عیوب

دوسری نوع کے ہیں اور اس کے اسباب و عوامل بھی بالکل دوسرے ہیں جن کا تعلق ان کی تاریخ، ان کے قومی مزاج، مخصوص عقائد دینی حاسہ کی کمزوری، شعور کی کمی اور نظام تعلیم و تربیت کے فساد سے ہے۔

جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے، وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد بڑے وسیع پیمانہ اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے، وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے، دوسری طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسہ کشی ہے، تیسری طرف دیندار اور آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست و گریباں ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جا رہا ہے یا مغربی ذہن اور نظام تعلیم کے خطوط پر خود ان ملکوں میں تیار کیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی نسل پیدا ہو رہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کر پاتی، جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے، اس لئے کہ یہ نظام تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل و دماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لئے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کرتی ہے تو لازماً اس کے نتیجہ میں یہ نظام تعلیم ضرور کمزور پڑتا اور دبتا ہے؛ لیکن بہت شاذ و نادر ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کے آغوش میں تربیت پا کر نکلتا ہے تو قوم کے عقیدہ، خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے، اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے ملبہ کو (جیسا کہ اس طبقہ کے معین افراد یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں) راستہ سے ہٹا کر اپنی قوم و ملک کو ماضی کے بارگراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے، اس موقع پر ایک ایسی طویل کشمکش برپا ہوتی ہے جس پر ملت کی ساری توانائیاں

اور صلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو بیرونی جنگوں سے بڑھ جاتی ہے، یہ ان ممالک کا قصہ ہے جہاں ایسی قیادتیں برسرِ اقتدار تھیں جو انقلابی، قوم پرستانہ اور لادینی فلسفوں اور دعوتوں پر یقین رکھتی تھیں۔

اگر اس طبقہ کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اور وہ طاقتور شخصیت سے محروم ہوتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے اندر ان عقائد اور مقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جاتی ہے، وہ آئے دن اس کے برخلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے، غیر ملکوں اور بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر لیتا ہے اور عوام کے قومی جذبہ اور دباؤ اور علماء و دعوت دین کے علمبرداروں کے اثر و رسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجے میں غداری کے واقعات بار بار پیش آتے ہیں اور یہ ممالک مستقل طور پر بے یقینی، خوف و دہشت، ذہنی انتشار اور شبہ و بے اعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

اس غیر فطری اور غیر ضروری صورت حال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظام تعلیم تیار کیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد و قامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی و دنیاوی ضروریات پورا کر سکتا ہو۔

یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ، اس کی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آواز اور اسلامیانِ عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

اس مسئلہ کا حل خواہ وہ کتنا ہی دشوار گزار نظر آ رہا ہو اور صبر آزما اور دقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات

کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادیت، خدا سے سرکشی، اخلاقی و روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم و خواہشات کی پرستش کی روح اور اسپرٹ کو ختم کیا جائے اور اس کے بجائے تقویٰ، انابت الی اللہ، آخرت کی اہمیت اور فکر اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری کر دی جائے، اس مقصد کے لئے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات و معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنی ہوگی، مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا، اس کی قیادت و امامت کا انکار کرنا پڑے گا، اس کے علوم و نظریات پر علمی تحلیل و تجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانیت اور تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے، اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہو سکتے ہیں؛ لیکن یہ تجدید پسندی، آزاد خیالی اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا واحد طریقہ ہے جس نے عالم اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے اور اسلام کے فکری و اجتماعی ڈھانچہ اور ملت ابراہیمی کے شیرازہ کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے اور جس کے نتیجے میں مسلم اقوام کے پر جوش اسلامی جذبات، ان کی سادہ دلی اور گرمجوشی، ان کی قربانیاں اور سرفروشاں اور اخلاص و وفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہ راست دخل ہے) افرنگیت اور مغربیت کے تصور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے، سادہ لوح، بے زبان، سچے مخلص مسلم عوام، خاموشی اور سکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح کسی نامعلوم منزل کی طرف ہنکائے جارہے ہیں اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے“ (۱)

عصری مدارس اور عصری علوم محتاج اصلاح

اسلامی نظریہ تعلیم

شخصیت کی تعمیر، فطری صلاحیتوں کے ابھار و استعمال کی ترغیب، اور جذبہ خدمتِ خلق کی تحصیل۔

نصاب

متعلقہ علوم و فنون کے اتنے مواد کی فراہمی جو ہر مضمون کی ضرورت پوری کر سکے، اس کی تسہیل، پھر درجہ بدرجہ تدوین اس طور پر کہ ہر مضمون میں اخلاقِ اسلامی کا عنصر اور اس کی روح کا رفرما ہو۔

نظام

باحیاء اور پاکیزہ ماحول، بلند کردار، ہمدرد و ملنسار، خوش عقیدہ و متبع سنت، اساتذہ، اور سہولت و وسائل کی فراہمی

نتیجہ

خدا ترس، پاکباز، انسانیت نواز ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ، ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے والے منظم و متحد معاشرہ اور مہذب و روبہ ترقی سماج کی تشکیل، یعنی انسانیت کی تکمیل۔

مغربی نظریہ تعلیم

عیسائی عقیدہ، تہذیب کا فروغ، پریش زندگی کی تحریک، اور ڈگری کے ذریعہ شہرت و ناموری کا فریب، اور تہذیبِ اسلامی کے تشخص و امتیاز کی پامالی

نصاب

ہر مضمون میں یورپ کا محض تقلیدی مواد جواز دیا و معلومات کا کام کرتا ہو، مگر تخلیقی صلاحیتوں کو ابھار کر تحقیقی میدان میں سرگرم کرینکی صلاحیت نہ رکھتا ہو، جس کے ذریعہ بس کسی سند کا حصول اور چند ٹکڑوں کا وصول ہو سکے۔

نظام

لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط، صلیبی کلچر اور مسیحی ماحول اور مخالف اسلام ذہن سازی وہ بھی کمرشیل بنیادوں پر۔

نتیجہ

خدا فراموش، دین بیزار، بد اخلاق، حیاء و حجاب سے عاری، نہایت خود غرض، اور آخرت سے یکسر غافل و بے پرواہ سوسائٹی کا وجود، جس کا عقیدہ و عمل مسیحیت سے قریب اور اسلام

سے دور ہو، جس میں ایمان و یقین شکوک و شبہات سے مبدل اور اخلاق و اعمال ایثار و قربانی سے عاری ہوں۔

ثبوت کے لئے

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کا حال دیکھ لیا جائے جو تکلف و تصنع کو اخلاق اور اخلاقِ اسلامی کو تشدد سے تعبیر کرتے ہیں، جن کی نظر میں یورپین اقوام ہی خوش نصیبی اور ترقی کی ضامن ہیں، ان کی تقلید جامد کے بغیر زمانہ میں پنپنا اور رفتارِ ترقی کا ساتھ دینا ناممکن ہے، بہت سوں کی مغربی غلامی کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام کی تعریف بدلنے اور قرآن کی نئی تعبیریں و تشریح کے حق میں نظر آتے ہیں، یورپ کا ہر اعتراض ان کو اپنے مذہب پر ایسا داغ نظر آتا ہے کہ اس کو مٹانے کے لئے وہ اس حکم کو حذف کر دینے پر آمادہ ہیں، اور اس کی حفاظت کرنے والے ملاؤں سے سخت چڑھے۔ ان لوگوں کو اولاً دینداری دقینوسی محسوس ہوتی ہے، اور اگر ادھر کچھ رغبت بھی ہوتی ہے تو وہ اسلام کو علماء اسلام سے سمجھنے اور حاصل

ثبوت کے لئے

اسلامی نظامِ تعلیم کے رد میں پیدا شدہ دینی و عصری علوم کے ماہرین پر نظر ڈالی جائے کہ وہ اپنے اپنے فنون میں یکتائے زمانہ اور نادر روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ، صورت و شکل، کردار و عمل اور خدمتِ خلق کے اعتبار سے کیسے کامل و مکمل اور مخلص و بے لوث تھے۔ اس کے ساتھ علم و ہنر میں حقائق میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ کائناتی حقائق جو معلومات کی تنگی اور مشاہدہ کے محدود وسائل کی وجہ سے انسانی عقل سے بالاتر تھے اور جن کے بارے میں موجودہ معلومات کی تنگی اور مشاہدہ کے محدود وسائل کی وجہ سے انسانی عقل سے بالاتر تھے اور جن کے بارے میں موجودہ معلومات و مزعمومات کو عقائد کا درجہ اور توہمات کا ٹیکہ دیکر اسی پر اکتفاء کر لیا گیا تھا، انہیں توہمات کی جگہ سے آزاد کر کے

تحقیقات و انکشافات کا ایسا سلسلہ قائم فرمایا جو آج تک پورے کروفر کے ساتھ رواں دواں ہے، یورپ کی سائنسی ترقی اور تخلیقی دوڑ اگرچہ بہت آگے بڑھ گئی، اور بڑھتی جا رہی ہے، مگر تاریخ اقوام ناطق اور چشمِ فلک گواہ ہے کہ خود یورپ نے یہ دولت مسلمان سائنسدانوں کی شاگردی میں حاصل کی ہے، آٹھویں صدی ہجری تک جدھر دیکھو مسلم سائنسدانوں ہی کا غلغلہ اور شور مچا ہوا تھا؛ لیکن شامتِ اعمال سے اس کے بعد مسلمانوں کا یہ علمی ورثہ یورپ کی میراث بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی نظروں سے اس حقیقت کو چھپا دیا گیا۔

تعلیم اور اسلاف

چنانچہ جس دور میں یہ تمام علوم و فنون اہل اسلام کے ہاتھوں پروان چڑھ رہے تھے، ان علوم و فنون سے انسان کو انسانیت کا سبق، شرافت کا درس، اخلاقِ فاضلہ میں رسوخ، حق و باطل میں تمیز و پہچان کی صلاحیت، بھرپور طریقے پر حاصل ہوتی رہی اور انسان ہدایت کی شاہراہ پر گامزن اور صراطِ مستقیم پر قائم تھا، سائنس کا ہر سبق اس کے لیے وجود خداوندی اور توحید باری کا سبق تھا، ٹکنالوجی کے فنون اس کے لئے قدرتِ خداوندی پر یقین کا باعث بن جاتے تھے، تاریخ کے واقعات اور قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں اس کے لئے عبرت و موعظت کے اسباق قرار پاتے تھے،

اور وہ ان سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا: غرض یہ کہ تمام علوم و فنون اس کی رہنمائی کرتے تھے اور وہ رضائے الہی و قرب خداوندی کی دولت سے مالا مال ہو جاتا تھا۔ (۱)

زوالِ اسپین کے بعد

مگر اسپین کے زوال کے بعد جب یہ تمام علوم و فنون (جس کو ہمارے اسلاف نے ایمانی فراست اور روحانی حرارت کے ذریعہ پروان چڑھایا تھا اور ان علوم و فنون سے انسانیت کی خدمت لیتے رہے) الحاد و دہریت کے شکار لوگوں، خدا و رسول کے باغیوں، انسانیت و شرافت سے محروم لوگوں، حرص و ہوس کے پچاریوں کے ظالمانہ و مجرمانہ پنچے اور قبضے میں چلے گئے، تو ان علوم و فنون کو ان کے اصل مقصد و منشاء کے خلاف استعمال کیا جانے لگا اور اپنے ذاتی مفادات کے لیے ان کا کھلے طور پر استحصال کیا جانے لگا۔ اور یہ ملحد و زندیق اور اہل حرص و ہوا لوگ اپنی مکاری و عیاری، چالاکی و چالبازی سے شعبہ تعلیم پر چھاتے ہی چلے گئے، یہاں تک کہ ان علوم و فنون کو انہوں نے خدا اور رسولوں سے بغاوت، مذہب و ایمان سے عداوت، انسانیت و تہذیب سے تلعب و استہزاء اور اخلاقی اقدار کی تحقیر و توہین کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

خلافت عثمانیہ کے زوال کے اسباب

علامہ ابوالحسن ندوی خلافتِ عثمانیہ کے زوال کی تاریخ اور وجوہات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا اور جمود بھی دونوں طرح کا علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنونِ جنگ اور عسکری تنظیم و ترقی میں بھی..... علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی، واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا، دماغ تھکے

تھکے سے اور طبیعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں اور ایک عالمگیر جمود اور افسردگی چھائی ہوئی تھی، اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتداء نہ کریں تو اس میں شبہ نہیں کہ نویں صدی وہ آخری صدی تھی، جب جدت فکر، قوت اجتہاد اور ادب و شاعری، حکمت و فن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں، یہی وہ صدی ہے جس میں مقدمہ ابن خلدون جیسی مفکرانہ تصنیف عالم اسلام کو حاصل ہوئی، دسویں صدی سے بہت واضح طور پر افسردگی، شدت تقلید اور نقالی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، یہ افسردگی اور اضمحلال کسی خاص شعبہ اور کسی خاص فن کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، دینی علوم، شعر و ادب، انشاء و تاریخ تعلیمی نصاب و نظام سب کے سب کم و بیش اس سے متاثر نظر آتے ہیں، پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھئے، سینکڑوں ناموں میں ایک ایسے شخص کا ملنا مشکل ہوگا جس پر عبقری (genius) کے لقب کا اطلاق درست ہو یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو، یا کسی خاص علم میں اس نے کوئی گرانقدر اضافہ کیا ہو..... سوائے مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی حجتہ اللہ البالغۃ، شاہ رفیع الدین کی تکمیل الاذہان، شاہ اسماعیل شہید کی چند ایک تصانیف..... صرف علم دین پر منحصر نہیں، ادب و شاعری بھی اپنی زندگی اور تازگی کھو چکی تھی اور ان پر بھی تقلید و تتبع کا غلبہ تھا، نثر و انشا پر دازی کو تکلف و تصنع و قافیہ پیمائی، لفظی صنایع اور عبارت آرائی نے بے رونق اور بے روح بنا رکھا تھا، دوستوں کے خطوط، تاریخ کی کتابیں اور دفتریں تحریریں اور فرامین سے بھی اس عیب پاک نہیں تھے، کہیں کہیں ادب و انشاء کا کوئی ایسا نمونہ آجاتا ہے جو اس زمانے کے مذاق عام سے الگ اور پست سطح سے بلند نظر آتا ہے“

پھر آگے فرماتے ہیں کہ:

”سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی ہی سے ترک تنزل و انحطاط، علمی پسماندگی اور جمود کا شکار ہو چکے تھے، تاریخ انسانی کا یہ وہ اہم ترین عہد ہے جس کا اثر بعد کی صدیوں پر نقش ہے، یورپ اس میں اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا اور ایک جوش و جنوں کی حالت میں اٹھ کر غفلت اور جہالت کے اس طویل زمانہ کی تلافی کرنا چاہتا تھا، وہ ہر شعبہ حیات میں گریز ترقی کر رہا تھا، طبعی قوتوں کو مسخر، کائنات کے اثرات کو منکشف اور نامعلوم سمندروں اور اقلیموں کی دریافت کر رہا تھا، ہر علم و فن میں اس کی فتوحات اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے اکتشافات جاری تھے، اس مختصر سی مدت میں اس کے یہاں ہر علم میں بڑے بڑے محقق، موجد اور مجتہد فن پیدا ہوئے، کوپرنیکس copernicus گلیلو galilio کپلر kepler اور نیوٹن newton وہ عالم اور محقق تھے، جنہوں نے بینات و طبیعیات کا ایک جدید نظام پیدا کر دیا، سیاحوں اور جہازرانوں میں کولمبس columbus و اسکوڈی گاما vascoda اور میگن manglin جیسے عالی ہمت، اولوالعزم پیدا ہوئے، جنہوں نے نئی دنیا اور نامعلوم ممالک دریافت کئے۔

علم و صنعت کے میدان میں ترکوں کی پسماندگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سولہویں صدی مسیحی سے پہلے ترکی میں جہاز سازی کی صنعت شروع نہیں ہوئی تھی، اٹھارہویں صدی عیسوی میں ترکی پریس و مطابع حفظانِ صحت کے مراکز اور فوجی تعلیم طرز کے مدارس سے روشناس ہوئے، اٹھارویں صدی کے آخر تک ترکی کی نئی ایجادات اور ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے دارالسلطنت پر ایک غبارہ baloon کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تو

اس کو سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھے، نہ صرف یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ترکی سے اس میدان میں بازی لے جا چکی تھیں؛ بلکہ مصر بھی بعض مفید نئی چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں پیش قدمی کر چکا تھا، ترکی سے چار سال پہلے مصر میں ریلوے کا نظام قائم ہو چکا تھا، ڈاک ٹکٹ بھی چند مہینے پہلے مصر میں رائج ہو چکا تھا۔

جب ترکی کا یہ حال تھا جو عالم اسلام کا قائد تھا تو دوسرے عرب ممالک کا جو ترکی کے زیر اثر یا دست نگر تھے جو کچھ حال ہوگا، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، چھوٹی چھوٹی نئی صنعتیں بھی ابھی ان ملکوں میں رواج پذیر نہیں ہوئی تھیں، ایک فرانسیسی سیاح موسیو والنی volney (جس نے اٹھارویں صدی میں مصر کی سیر کی ہے اور شام میں چار سال تک مقیم رہا ہے) اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ ”یہ ملک صنعت میں اس قدر پیچھے ہے کہ اگر تمہاری گھڑی خراب ہو جائے تو غیر ملکی کے علاوہ کوئی درست کرنے والا نہیں ملے گا“ (۱)

پھر مسلمانوں کا تنزل صرف حکمت و علوم نظر یہ اور صنعت و حرفت ہی میں نہ تھا؛ بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اور عمومی انحطاط تھا جو مسلمانوں پر پورے طور پر محیط تھا، حتیٰ کہ وہ اپنے جنگ میں بھی یورپ سے پیچھے رہ گئے ہیں جن میں ترکوں کو درجہ امامت و اجتہاد حاصل تھا اور ان میں ان کی فوقیت کا دنیا کو اعتراف تھا؛ لیکن یورپ اپنی ایجاد و اجتہاد اور تنظیم کی بدولت فنون حربیہ میں بھی ترکوں سے بہت آگے بڑھ گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوجوں نے ۱۷۷۴ء میں عثمانی افواج کو شرمناک شکست دی اور دنیا پر ظاہر کر دیا کہ ترک جنگی طاقت میں عیسائی قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں“ (۲)

اور آج کے دور میں علم و تعلیم نام ہی اس بات کا ہے کہ مذہب و ایمان کو فضول

(۱) زعماء الإصلاح فی العصر الحدیث، الدكتور أحمد امین

(۲) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر: ۱۹۰۰-۱۹۳۰

اور بیکار چیز سمجھا جائے، اخلاقی اقدار جیسے شرم و حیا، تواضع و انکساری، احسان و سلوک وغیرہ کو عجز و کمزوری پر محمول کیا جائے اور انسانی اقدار کو دقیا نوسی ٹھہرایا جائے اور اس کے برعکس ہر بے حیائی اور بے شرمی کو تعلیم کا لازمہ اور ہر بے ایمانی اور بد اعتقادی کو عقل و شعور کا نتیجہ اور ہر بد اخلاقی و بد تہذیبی کوروش خیالی کا اثر قرار دیا جائے۔ (۱)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

”(میکالے کا) سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار بنا کر ان کے دلوں پر مغرب کی ہمہ گیر بالادستی کا سکہ بٹھا دیا جائے، اور نئی نسل کو ہر ممکن طریقہ سے یہ یقین کر لینے پر مجبور کر دیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سر بلندی چاہتے ہو تو اپنی فکر، اپنے فلسفے، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنے ماضی پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے آؤ اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے نقوش قدم میں تلاش کرو“ (۲)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یہ مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی کے مرادف تھا، عقلائے مغرب نے پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کی فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کیلئے جا بجا مراکز قائم کئے، جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا“ (۳)

مریم جمیلہ فرماتی ہیں:

”مسلمان ماں کو کسی بھی قیمت پر اپنے بچوں کو عیسائی مشینری اسکول، یا

(۱) جواہر شریعت: ۱۹

(۲) مسلم ممالک میں مغربیت اور اسلامیت کی کشمکش: ۲۴۷

(۳) ہمارا نظام تعلیم جس: ۲۸

کا نوٹ کو بھیجنے راضی نہ ہونا چاہیے، جہاں ان بچوں کو پوری طرح اپنے مذہبی و معاشرتی ورثا سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی یقین کرنا چاہیے کہ سرکاری اسکول بھی کچھ زیادہ تسلی بخش سامان مہیا نہیں کرتے“ (۱)

نوسلم مغربی مصنف محمد اسد فرماتے ہیں:

”مسلم نو جوانوں کی مغربی تعلیم ان کو رسول اللہ ﷺ کے پیغام پر ایمان و یقین رکھنے اور اپنے آپ کو اس مخصوص الہی تمدن و تہذیب کا نمائندہ سمجھنے کے قابل نہ رکھے گی جو اسلام لے کر آیا ہے“

اس کے بعد پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

”یعنی جو کچھ بھی ہو، اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ ”ان روشن خیالوں“ کے اندر دینی عقائد بڑی تیزی کے ساتھ کمزور ہوتے جا رہے ہیں، جن کی تعلیم مغربی بنیادوں پر ہوئی ہے)۔“

پھر آگے ایک عجیب بات فرماتے ہیں کہ:

”ہماری (مسلمانوں کی) پوری تعلیمی پسماندگی اور بے بضاعتی ان مہلک اثرات کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو دینی بنیادوں پر مغربی تعلیم کی اندھی تقلید کی وجہ سے مرتب ہوں گے“ (۲)

بعض بلکہ اکثر لوگ آج مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا رونا روتے ہیں اور ان کو مشورہ دیتے ہیں کہ جو کچھ بھی اور جیسا بھی بن پڑے وہ عصری علوم حاصل کریں ایسے لوگ محترم محمد اسد صاحب کی اس عبارت کو بار بار پڑھیں اور غور کریں کہ انہوں نے کیا فرمایا ہے؟

بلاشبہ پسماندگی بری چیز ہے مگر مغربی تعلیم پر اندھا دھند فریفتہ ہونا اور اس کو جوں کا توں از اول تا آخر لے کر خوش ہو جانا، ایمان اور دینی بنیادوں پر کیا مہلک اثرات مرتب

کرتا ہے؟ اس کا موازنہ تعلیمی پسماندگی سے کیا جائے تو اس پسماندگی کی کوئی حیثیت نہ ہوگی بشرطیکہ ایمان و اسلام کی قدر دل میں ہو۔

مغرب نے تعلیم کو کاروبار بنا دیا ہے، اسلام میں تعلیم خدمت اور مشن ہے، تعلیم کا مقصد ملازمت قرار دیا گیا، راتوں و رات امیر بننے کی خواہش پیدا کی، عزت کا معیار دولت کو قرار دیا، سیکولرزم یعنی اسلامی مذہبی احکام سے بے اعتنائی اور دین کو محض چند رسوم و رواج کا مجموعہ سمجھا جانے لگا، اور عقائد، تجارت، معاشرت، اور معیشت سیاست سے دین کو نکالا، اس کی جگہ انسان پرستی humanism اور موجودیت یعنی خدا کی جگہ انسان کو خود مختار بنا کر اس کی خدائی کا اعلان آخرت کے مقابلہ دنیوی زندگی پر اصرار، اور العیاذ باللہ خدا کے اقتدار کا خاتمہ سیکولرزم کے روپ میں مذہبی اور اخلاق کے بجائے مادہ اور جسم کو ترجیح دینے کے لئے مادہ پرستی (Materialism) کو فروغ دیا اور وحی اور عقل کو چھوڑ کر تجربیت (Empiricism) نتائجیت ایجابیت اور افادیت پسندی کو عام کیا، اسلام میں تجدید کی کوشش کرنا دین کو دنیوی ترقی کا ذریعہ نہ سمجھنا، مغربی نظریات کو عین اسلامی قرار دینا، یہ سمجھنا کہ سود کے بغیر معیشت نہیں چل سکتی، سگریٹ و نسوار پینا، فحش فلموں، گندے ڈراموں، اور گانوں کو گناہ نہ سمجھنا، مغربی لباس کو تقاخر کے طور پر پہننا، کھیل کود کو پیشہ اور مقصد حیات بنانا وغیرہ۔ (۱)

عالمی سطح پر wto اور gatt کے ذریعہ اقوام عالم کو ایک ایسی لادین اور سیکولرزم تعلیمی پالیسی میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا ہے جو محض معاشی حیوان پیدا کر سکتی ہے۔

زندگی کے چند اہم شعبوں میں اسلامی و مغربی عقائد و نظریات کا موازنہ پیش خدمت ہے:

ش	اسلامی فکر	ش	مغربی فکر
(۱)	انسان اللہ کو راضی کرنے کے لیے اپنا	(۱)	انسان اپنی مرضی کے مطابق جو کرنا
	سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہر		ہو بلا روک ٹوک کرے۔

عصری علوم	۱۴۳	عصری تعلیم اسلامی نقطہ نظر
وقت تیار رہے۔		
(۲) اخروی کامیابی کو اپنا ہدف بنائے	(۲) دنیوی ترقی کے لیے جو چاہے کرے۔	
(۳) دنیا کی طرف بقدر ضرورت شریعت کے حدود و قیود میں رہ کر التفات کرے۔	(۳) دنیا کی محبت ہی سے ترقی حاصل ہوگی۔	
(۴) عفت، عصمت، حیا، نکاح، معاشرت و معیشت، اخلاق ہر چیز میں شریعت کا پابند رہے۔	(۴) مرد اور عورت کو بالکل آزادی حیا کو بیماری کا نام دیا گیا؛ نکاح کی کوئی ضرورت نہیں۔	
(۵) عورت اور مرد کے الگ میدان عمل اور اسلامی معاشرے میں متقی اور فاجر میں فرق۔	(۵) مساوات مرد و زن اور فاجر اور متقی کا کوئی فرق نہیں۔	
(۶) انسان کے ظاہری و باطنی ہر قول عمل میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت لازم، حلال و حرام کا معیار قرآن و حدیث اور صحیح اجتہاد۔	(۶) انسان پر نہ اللہ کی اطاعت لازم، نہ رسول کی بلکہ حلت و حرمت کا اختیار فرد اور ارکان پارلیمنٹ کو حاصل۔	
(۷) معیشت اور معاشرت میں سادگی، قناعت، انفاق اور صلہ رحمی عبادت اور کارِ ثواب۔	(۷) ذاتی منافع کا محرک انسان خود ہے، لہذا صرف اپنے فائدے کو پیش نظر رکھنا اور ہر ممکن سرمایہ میں اضافہ کرنا چاہیے۔ سود سے ہو، چاہے رشوت سے ہو، چاہے سٹے سے ہو، اور ٹھاٹھ باٹ طرزِ زندگی۔	

عصری علوم	۱۴۴	عصری تعلیم اسلامی نقطہ نظر
(۸) مآخذ علم قرآن، حدیث، اجماع	(۸) مآخذ علم، انسانی عقل اور مشاہدہ	
(۹) مقصد علم: حقوق اللہ اور حقوق العباد کی معرفت کے بعد اس پر عمل درآمد۔	(۹) انسانی صلاحیتوں کی نشوونما، تاکہ دنیوی زندگی کامیابی سے گذر سکے۔	
(۱۰) غایت علم: دنیا میں اللہ اور رسول کی اطاعت تاکہ آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہو جائے۔	(۱۰) غایت علم: دنیا کی تسخیر تاکہ العیاذ باللہ، اللہ اور قدرت کا مقابلہ کر سکے۔	
(۱۱) سیاست اور مذہب ساتھ ساتھ اسی لیے خلافت کا قیام تاکہ دنیا دین و آخرت دونوں میں فرد اور معاشرہ کامیابی اور سلامتی سے گذر جائے۔	(۱۱) جمہوریت: یعنی سیاست اور دین میں تفریق صرف دنیا کی کامیابی اور کسی پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ (۱)	

اکابرین امت کا عصری تعلیم کے تعلق سے اظہارِ خیال

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہٴ صدارت کے یہ تاریخی فقرے ہمارے کانوں میں ابھی بھی گونج رہے ہیں:

”اے نونہالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار، جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف سے بڑھایا اور اس طرح ہم نے

(۱) مقالہ مولانا حذیفہ دستاویزی، تعلیم اور سماجی خرابیاں، پیش کردہ بر موقع سمینار، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، زیر نگرانی: مولانا آزاد نیشنل اردو، یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۲، جنوری تا ۲۱ جنوری ۲۰۱۰ء

ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا“

باوجود یہ کہ دیوبند کی خالص دینی تعلیمی درسگاہ کے بالمقابل علی گڑھ پر خالص دنیوی تعلیم کا غلط لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے، لیکن کیا ہم بھول جائیں کہ سرسید نے جس درسگاہ کا خواب دیکھا تھا اس کے متعلق انہوں نے خود کہا تھا: ”فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر“

لدھیانہ مشن اسکول کو خطاب کرتے ہوئے سرسید فرماتے ہیں:

”یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے، اس کو قائم کرنے سے ہماری قوم قوم ہے، اے عزیز بچے! اگر کوئی آسمان کا ستارہ ہو جائے، مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا وہ ہماری قوم میں نہ رہا“

دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد جدید تعلیم کے علم برداروں کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ انہیں جدید تعلیم سے کوئی خلاف تھا، بلکہ اسلامی نقوش کے مٹنے کا درد تھا جو ان الفاظ میں ظاہر ہوا

”میں جو نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ہمیشہ شاکی رہتا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہر گزشتہ خوبی کو ان سے دور پاتا ہوں اور ان کی جگہ کوئی نئی خوبی مجھے نظر نہیں آتی، ہماری گزشتہ مشرقی معاشرت، اوضاع و اطوار، اخلاق و عادات، طریق و بود و ماند، یہ سب کے سب انہوں نے ضائع کر دیئے، اخلاق و تمدن کے بعد مذہب کا نمبر آیا اور جدید تعلیم و تہذیب کے مندر پر مذہب کی قربانی چڑھائی گئی“ مانا کہ مذہب کی قربانی کے خلاف اس پر جو احتجاج کا نشانہ نئے تعلیم یافتہ حضرات بنائے گئے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ علماء کا طبقہ عصری تعلیم کا مخالف تھا محض جواب ترکی بہ ترکی ہے، جدید تعلیم سے متعلق علمائے دیوبند کی فکر کا محور مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کا تحفظ و بقاء تھا اور آج کے

حالات نے اس کی حقانیت پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، جامعہ ملیہ کی تاسیس کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ کی اپنے نظریہ تعلیم کی وضاحت دور رس فکر کا ایسا نمونہ ہے جو اسی سال کے بعد کہنہ اور بوسیدہ نہیں ہوا، اسے دہراتے ہوئے ایسا نہیں لگتا کہ کوئی پرانی بات دہرائی جا رہی ہو؛ بلکہ یہ کل بھی سچ تھا اور آج بھی سچ ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

”آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی بھی وقت کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا، ہاں یہ بیشک کہا کہ: انگریزی تعلیم کا آخر اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے“

چنانچہ ۱۹۲۰ میں شیخ الہند نے جس جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا وہ ”عصری علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ایسی آزاد درسگاہ تھی جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی احساسات پر مبنی ہو“۔

مسلم لیگی اخبار ”منشور“ (دہلی) کے مدیر مسٹر حسن ریاض ۹ جون ۱۹۴۰ء کے ادارہ میں لکھتے ہیں کہ:

”گزشتہ تیس برس سے مسلمان بچے بالعموم صرف انگریزی اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے جتنے تعلیم یافتہ ہیں وہ اسلامی کلچر، اخلاق اور اسلامی تصورات سے بالکل نااہل ہیں“

ڈاکٹر ہنر کا قول ہے:

”ہمارے انگریزی اسکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان،

ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو“ (۱)

ہاتف نے کہا فردوس میں ایک روز حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدی شیرازی کچھ کیفیت مسلم ہندی کی تو بیاں کر درماندہ منزل ہے کہ مصروفش تگ و تاز مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کے رگوں میں تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمی آواز باتوں سے ہوا شیخ کی حالی ماثثر رورو کے لگا کہنے کہ اے صاحب اعزاز جب پیر فلک نے ورق ایام کا پلٹا آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز آیا مگر اس سے عقیدہ میں تزلزل دنیا تو ملی طائر دین کر گیا پرواز دین ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی فطرت ہے جو انوں کی زمین گیر زمین تاز بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا آغاز پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز یہ ذکر حضور شہہ یثرب نہ کرنا سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

خدا نتوان یافت ازاں خار کہ کشتیم

دینا نتواں یافت ازاں پشیم کے رشتیم

اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”آج کل تعلیم جدید کے متعلق علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ جدید تعلیم سے روکتے ہیں اور اس کو ناجائز بتلاتے ہیں؛ حالانکہ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ اگر تعلیم جدید کے یہ آثار نہ ہوتے جو علی العموم اس وقت اس پر مرتب ہو رہے ہیں، تو علماء اس سے ہرگز منع نہ کرتے، لیکن اب دیکھ لیجئے کہ کیا حالت ہو رہی ہے، جس قدر جدید تعلیم یافتہ ہیں، بہ استثناء شاذ و نادر نہ ان کو نماز سے غرض ہے، نہ روزے سے، نہ شریعت کے کسی دوسرے حکم سے، بلکہ ہر بات میں شریعت کے خلاف چلتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ: اس سے اسلام کی ترقی ہوگی“ (۱)

اور فرماتے ہیں کہ:

”مدارس اسلامیہ میں بیکار ہو کر رہنا لاکھوں کروڑوں درجہ انگریزی تعلیم میں مشغول رہنے سے بہتر ہے، اس لئے کہ گویا وقت اور کمال نہ ہو؛ لیکن کم از کم عقائد تو فاسد نہ ہوں گے، اہل علم سے محبت تو ہوگی، اگرچہ کسی مسجد کی جاروب کشی ہی میسر ہو، یہ جاروب کشی انگریزی میں کمال حاصل کرنے اور وکیل، بیرسٹر وغیرہ بننے کے جس سے اپنے عقائد فاسد ہوں اور ایمان میں تزلزل ہو اور اللہ اور رسول اور صحابہ و بزرگان دین کی شان میں بے ادبی ہو کر جو اس زمانے میں انگریزی کا اکثری بلکہ لازمی نتیجہ ہے اور یہ ترجیح ایک محب دین کے نزدیک تو بالکل واضح ہے، ہاں جس کو دین کے جانے کا غم ہی نہ ہو وہ جو چاہے کہے“ (۲)

سر سید مرحوم لکھتے ہیں کہ:

”اسی طرح لڑکیوں کے اسکول بھی قائم کئے گئے جن کے ناگوار طرز نے یقین دلایا کہ عورتوں کو بدچلن اور بے پردہ کرنے کیلئے یہ طریقہ نکالا گیا ہے“ (۱)
آرنبیل مسٹر فضل حق وزیر اعظم صوبہ بنگال نے ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل منعقدہ پٹنہ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا:

”جس قسم کی تعلیم (کالج اور اسکولوں میں ان کو دی گئی ہے، دراصل اُس نے اُن کو نہ دنیا کا رکھا ہے، نہ دین کا، اگر ایک مسلمان بچہ نے اونچی سے اونچی تعلیم کی ڈگری حاصل کر بھی لی؛ لیکن اس کوشش میں مذہب کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو اس کا ڈگریاں حاصل کرنا قوم کیلئے کیا مفید ہو سکتا ہے؟ مفید اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب مسلمان رہ کر ترقی کریں، کیا خوب کہا اکبر الہ آبادی نے

فلسفی کہتا ہے کیا پروا ہے گر مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں، بھائی یہ گیا تو سب گیا (۲)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

”انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں، یا لحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے“ (۳)

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کی آیت کریمہ ”قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْجِبَارَةُ“ (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو،

(۱) اسباب بغاوت ہند

(۲) ”مدینہ“ (سہ روزہ) بجپور، ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء

(۳) خطبہ صدارت جلسہ افتتاحیہ مسلم نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۰ء

اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو ایسی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں)، اس آیت کے تحت ان طلباء کے تعلق سے فرماتے ہیں جنہیں دینی تعلیم سے دور رکھ کر صرف اسکول کی غیر اسلامی ماحول میں تعلیم دی جاتی ہے:

”کیا اس آیت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنے گھروالوں کو ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک لے جانے والی ہیں جن کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ دوزخ میں جائیں، ورنہ وہ کونسے انسان ہیں جو اپنے بچوں کو آگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھیں اور ان کو نہ روک لیں؟ اب صورتحال اس وقت یہی ہے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام نہ کرنا بچوں کو اس ماحول کے بالکل حوالہ کر دینا اور ان کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا جو اس بات کا نہ مکلف ہے نہ اس بات کا مدعی، نہ اس بات کا اہل کہ بچوں کو وہ تعلیم دے گا جس پر نجات موقوف ہے، پیغمبروں کی لائی ہوئی وہ تعلیم جس سے ناواقفیت کے نتیجہ میں ایمان کا خطرہ ہے، آخرت کی ہلاکت ہے تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس بات کو بچے کے لئے کیسے گوارا کیا جا رہا ہے؟ موجودہ تعلیمی نظام صرف لادینی (secular) ہی نہیں وہ ایک مثبت و معین نظام تعلیم (System of education)

(Hindu mythology) ہے، ہندون مالا اس میں شامل ہے، انگریزوں کے زمانے کی تعلیم سیکولر تھی، بلی، کتے کے قصے ہوتے تھے اور ہم میں سے بہت سے لوگوں نے انگریزوں کے عہد حکومت میں انگریزی پڑھی ہے، اس وقت زبان سکھانے والی ابتدائی کتابوں میں کسی کے عقیدہ پر اثر نہ پڑتا تھا، نہ کسی مخلوق کا تقدس پیدا ہوتا تھا اور نہ اس کائنات میں کسی مخلوق کا تصرف و اختیار معلوم ہوتا تھا، اس وقت

بھیڑیئے، چیتے، بندر اور لومڑی اور بلی، کتے کے قصے بچے پڑھتے تھے، ویسے کے ویسے ہی گھر آتے تھے جیسے جاتے تھے، لیکن اب صورتحال حال یہ نہیں ہے، سرکاری نصابی کتابوں میں عقیدہ پر اثر ڈالنے والے اسباب، قصے کہانیاں اور مضامین ہوتے ہیں اور جو کسر کتابوں میں باقی رہ جاتی ہے، وہ ماسٹر صاحبان پوری کرتے ہیں، بچوں کو کچھ اجتماعی کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو اسلام کے عقیدہ توحید کے منافی ہیں؛ لہذا موجودہ تعلیمی نظام سے بچے کا ایمان کیسے سلامت رہے گا؟ اگر خارجی و اضافی دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے کہ اسکول میں جو کچھ پڑھ کر آتا ہے، اس کی اصلاح کی جاتی ہے اور اگر اس کو کوئی ایمانی توحیدی (dose) دیا جاتا ہے، صباحی یا شبینہ کتب ہیں، تعلیمی حلقے ہیں، کوئی دینی کتاب سنائی جاتی ہے ایسا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ..... آج یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک بڑے طبیبہ کالج کے جس کی ایک تاریخ ہے، ایک طالب علم سے کوئی مضمون لکھوانا تھا یا خط لکھوانا تھا، تو سوچا کہ یہ صاحب تو طب کی کتابیں پڑھتے ہیں جو عام طور پر عربی فارسی میں ہیں، بہت نیچے اتر آئیں تو اردو میں ہیں، ان سے کہا: آپ لکھئے، وہ لکھتے رہے، لوگ سمجھتے رہے کہ لکھ لیا، دیکھا تو وہ ہندی میں تھا، ان سے کہا گیا کہ آپ یونانی طب پڑھتے ہیں اور اردو نہیں لکھ سکتے؟ انہوں نے کہا کہ: ہمیں تو یہی پڑھایا گیا ہے، تو ایک ایسی نسل تیار ہونے کا محض اندیشہ نہیں، مشاہدہ میں آرہا ہے، دین کی بنیادی چیزوں سے ناواقف، بنیادی عقائد سے ناواقف، اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا ہمارے دل میں جو عقیدہ بسا ہوا ہے اس سے ناواقف..... آنکھوں سے دیکھا گیا ہے کہ سیرت پر تقریر کرنی ہے، اسلامیہ اسکول ہے، کالج ہے، جامعہ ہے اور ایک مسلمان نوجوان طالب علم کو کسی نے سیرت کا مضمون دیا، وہ ہندی میں لکھ

کر لایا اور اردو میں پڑھا، الفاظ توار دو اور رسم الخط ہندی اور رسم الخط تو وہ چیز ہے کہ آرئلڈ ٹوائن بی (Arnold Toynbee) جو اس زمانہ کا بڑا فلسفی (Philosopher)، مؤرخ (Historian) ہے، اس نے لکھا ہے کہ اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں، رسم الخط بدل دینا کافی ہے، اس سے اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے بالکل ٹوٹ جائے گا اور اس کی پوری تہذیب اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور پھر جس طرف چاہے لے جاؤ، جو چیز چاہے کسی ملت کو اس کے ماضی سے، اس کے مذہب سے، اس کی تہذیب سے، اس کے کلچر سے ملاتی ہے، وہ رسم الخط ہے، رسم الخط بدلنا نسل بدل گئی۔

آج سے ساٹھ برس پہلے اکبر مرحوم نے کہا تھا:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے (۱)

لڑکیوں کے لئے عصری تعلیم

خدا کے بندوں کو دیئے گئے زندگی گزارنے کے نورانی طریقے میں مرد و زن میں فرق مسلم ہے، ان کی ذمہ داریاں اور ان کا دائرہ کار مکمل واضح ہے، اسلام ہی دین فطرت ہے اور اسلام ہی مرد و عورت کی جسمانی ساخت، جذبات کو اعتدال کے ساتھ پورا کرنے والا ہے، معاش کی ذمہ داری اسلامی نقطہ نظر سے عورت پر عمومی حالات میں نہیں ہے، عورت کا اصل کام کام میاب بیوی، سلیقہ مند ماں، فرماں بردار بیٹی، پاک دامن بہن بننا ہے، انسانی معاشرہ کو خدا ترس خادم دین و ملت دینا ہے، اگر عورت اس فرض منصبی کو پورا کرتے ہوئے اور اس سے ہٹے بغیر کچھ ضروری عصری فنون کی طرف حد و شرع میں وقت دیتی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

نسوانی ذمہ داریاں پورا کرنے کے لئے اللہ پر توکل ہو، قناعت، صبر، تواضع، حسن

(۱) ماخوذ از: دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی

انتظام، تربیت کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، اگر عفت و پاک دامنی نہ ہو تو گھر کی چہار دیواری میں رہنا بوجھ محسوس ہوتا ہے، خاندانوں کو نبھانا طبیعت بالکل نہ چاہتی ہو ایسی عورتیں انسانی معاشرہ کو بکھیرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں، تعمیر و تشکیل کا سبب نہیں بن سکتیں، حالات حاضرہ میں عورت کو وہ حقیقی علم دیا ہی نہیں جا رہا ہے جس سے وہ کسی ولی کی مان بن جاتی، یا کسی عالم دین کو ختم دیتی، قوت دعا، انابت الی اللہ کا کچھ سرمایہ اس کے پاس ہوتا، وہ فاطمہ ؓ و عائشہ ؓ کی حیاء کو اپنا نمونہ بناتیں، بشرحانی کی بہن یا حضرت ملفوسہ والی قناعت، رضا و تسلیم کا اسے کوئی حصہ مل جاتا، حضرت خنساء ؓ، اسماء بنت ابی بکر ؓ جیسی جان فروشی اور اولاد کو اعلیٰ کلمۃ اللہ پر ابھارنے کے جذبات دیئے جاتے۔

اگر پندے ز درویشے گیری
ہزار امت بہ میرد، تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے گیری

علامہ اقبال کی نگاہ میں ایسی تعلیم سراسر موت ہے جس کی وجہ سے عورت اپنی نسوانیت کے جوہر کو کھودے اور ایک مسلمان ماں کی خوبیوں سے محروم ہو جائے اور اس کا دینی کردار ختم ہو جائے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انسان کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نہ نازن
کہتے ہیں اس علم کو ارباب نظر موت

اس کے برخلاف علم کے نام پر پائی جانے والی جہالت سے بیٹیاں ماؤں پر جری ہو گئیں ہیں، علم بغیر دینی تربیت کے ناخواندہ باپ پر انہیں جری کر دیا، مسلمان بہن کو اس جہالت کی ضرورت نہیں ہے، جہاں ڈگری کے ہاتھ میں آنے سے پہلے دامن عفت ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہو، ڈگریوں کے انبار کے ساتھ طلاق و خلع کا بازار بھی گرم ہو جاتا ہے،

بچوں کی تربیت کو بوجھ سمجھا جا رہا ہو، یہ تہذیب نہیں ہے، ایر ہو سٹس پچاس سو مسافروں کی خدمت بخوشی بجالائے اور ان کی ناز برداری کرے اور ایک شوہر کا محل ناقابل برداشت ہے، یہ اخلاقی اور عقلی دیوالیہ پن نہیں ہے تو اور کیا ہے، یا کسی کمپنی کا عورت کو منیجر بنا کر، یا پرنسپل ٹھہرا کر دسیوں معاملات کو درست کر رہی ہوں؛ لیکن اپنے خاندان کی ناہموار طبیعتوں کو نبھانے سے، ناموافق مزاجوں کو لے کر چلنے سے کنارہ کشی اختیار کر رہی ہوں، انانیت اس قدر بڑھ چکی ہو کہ اپنی ساس کے ساتھ کچھ نبھاؤ نہ کر سکے۔ عورتوں کو کالج کے ماحول میں جو تعلیم دی جا رہی ہے، اس سے عورت کی نسوانیت تار تار ہو رہی ہے۔

جج کے لئے جانے والا کوئی بدکاری کے ارادہ سے نہیں جاتا، تب بھی وہاں دوران طواف پردہ معاف نہیں، مسجد میں بھی آنے والیوں کو حکم تھا کہ لباس سادہ قسم کا ہو، خوشبو لگی ہوئی نہ ہو، مردوں سے پہلے مسجد سے نکل جائیں تو مسجد کے اندر کعبہ کے سائے میں بے محابا اختلاط خیر القرون میں درست نہیں تھا تو دورِ فتن میں کیسے درست ہوگا؟ وہ بھی بازاروں اور کالجوں میں۔

ہمیں یہ یقین کرنا ہے کہ مریم بنت عمران اور یحییٰ بن زکریا ؑ بھی تنہا جمع ہوں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے (۱) اور بقول جنید بغدادی ؒ اگر پڑھانے والا اللہ کا ولی حسن بصری ہو اور پڑھنے والی رابعہ بصریہ ؒ ہو اور یہ دونوں تنہا بیت اللہ میں کلام اللہ پڑھیں تو تیسرا شیطان ہوتا ہے؛ لہذا ہمیں بہر صورت مخلوط تعلیم کو ختم کرنا ہے، اسٹاف میں بھی غیر محرموں سے اختلاط نہ ہونے پائے، چہرے، ہاتھوں، پیروں کی پردہ ہمیں بطریقہ ترغیب پورا اہتمام کرانا ہے، کھیل صرف تفریح طبع کے لئے اور بچوں کی نشوونما کے لئے، لڑکے اور لڑکیوں کے مزاج کا لحاظ کر کے کھلانا ہے، جوان بچیاں نامحرم کوچ سے بے تکلف کرائے، فٹ بال، ٹینس سیکھیں، پھر بھی دل پاک رہیں ہیں، نہیں ہو سکتا، بہت عجیب بات ہے کہ غیروں کے اسکول تو اپنے مذہبی مزاج کی دعوت دے رہے ہیں اور مسلمان اپنے آسمانی مذہب کو حصول علم میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔

اس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دین سے اگر مدرسہ نسواں
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

اور ایک جگہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کے ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اگر کالج صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص ہے تو پڑھانے والے غیر مسلم یا بے حیاء
ہوں تو ضرور اپنے استاذ کے اوصاف سے غیر شعوری طور پر انجذب کرتا ہی ہے، ٹنکی کا پانی
ہی نلوں میں منتقل ہوتا ہے، استاذ طالب علم کی نگاہ میں مثالی شخصیت بن جاتا ہے، ان کی
فیشن پرستی، خدا بیزاری، اخلاقی بے راہ روی، ان کے دلی رجحانات کا پرتو ہماری بہو،
بیٹیوں پر پڑ کر رہے گا، صبح سے شام تک پانچ، دس، پندرہ، بیس، پچیس سال کی صحبت کیا
ان میں اثر انداز نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی، اور ہو رہی ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ غیر
مسلم لڑکیوں سے پردہ ایسا ہے جیسے کہ اجنبی مسلمان سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) عورت کو سب سے پہلے امور خانہ داری، حسن انتظام، حسن معاشرت، عبادت
و اطاعت والی مومناتی صفات سے آراستہ کرنا ہماری اولین ترجیح ہے۔

(۲) کم سے کم جماعت سوم سے زیادہ سے زیادہ جماعت پنجم سے مخلوط تعلیم کا

سد باب ہو جانا چاہئے۔

(۳) انتظامیہ میں، معلمین میں کوئی مرد انہیں جماعت پنجم میں پڑھانے والا نہ ہو، مگر
یہ کہ پردہ کا پورا اہتمام ہو۔

(۴) یہ بات خوب ذہن نشیں کر لینا چاہئے کہ پردہ دینی یا عصری اعلیٰ تعلیم کے لئے مانع
نہیں ہے، چنانچہ اسلام میں سینکڑوں نمونے احکام الہی کی مکمل پابندی کے ساتھ
پیدا کر کے دکھائے ہیں، جس کا تذکرہ مختلف کتابوں میں ہے۔

(۵) کوئی خاتون اگر ماہر امراض نسواں یا خواتین اسلام کو بالخصوص نفع پہنچانے
والے کوئی فن کو سیکھ رہی ہے تب بھی اسے اصل اور اہم کام شوہر کی اطاعت، اولاد
کی تربیت اور دینی گھرانے کی بنیاد ڈالنے کو ہی اپنا نصب العین اور مقصد بنانا
چاہئے۔

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرۃ کا کمال
مرد بے کار زن تہی آغوش

موجودہ صورت حال

حدیث و سیرت کے بعد اگر فقہی عبارتوں کا جائزہ لیا جائے تو متعدد جگہوں پر فقہاء
نے عصری فنون حاصل کرنے کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہئے
کہ اسلام کی نظر میں عصری فنون کی اتنی اہمیت نہیں ہے کہ دینی علوم سے صرف نظر کر لیا
جائے، ہمارے انجمنیں س اور ڈاکٹرس کو اپنی مذہبی بنیادی معلومات بھی نہ ہوں، ضروریات
دین سے ناواقف اور اس کے حاصل کرنے والوں کو بندہ شکم اور بندہ شہوت بنا کر چھوڑ دیا
جائے، والدین کے رشتہ کا تقدس اور بے داغ جوانی سے وہ بے بہرہ ہوں، دیانت داری،
انسانیت نوازی کا کوئی جذبہ ان کے تحقیق و ملازمت میں دخل نہ رکھتا ہو۔

علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ مغربی نظام تعلیم کو بھی اپنی تنقید کا

نشانہ بنایا اور اس کے نقائص کو یوں بے نقاب کیا، فرماتے ہیں:

ہم سمجھتے ہیں کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر کے پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشہ فرہاد بھی ساتھ

اور ایک مقام پر فرمایا:

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم سے حاصل ہے جہاں میں دو کف جو

عصر حاضر میں ڈاکٹرس، انجینیرس اور سائنسدانوں کی کمی کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ دیانت دار، قوم و ملت کے خادم، احساس ذمہ داری، زندہ ضمیر و باشعور افراد کی کمی سب سے بڑا مسئلہ ہے، ان اوصاف کے فقدان اور مذہبی تعلیمات سے دوری ہی کی وجہ سے جو جتنا پڑھا لکھا ہوتا ہے وہ اس زمانہ میں ڈاکہ زنی، چوری، رشوت ستانی کے بڑے بڑے واقعات میں ملوث ہوتا ہے، وہ انگریزی زبان سے واقف تو کم ہے؛ لیکن انگریزوں کا غلام زیادہ ہے، بالوں میں تراش خراش، لباس و پوشاک میں تہذیب و تمدن پوری قوم میں غلامی کو تسلیم کر لیا گیا ہے، وہ کامیاب شہری تو کیا حکومت اور قوم کے لئے نقصاندہ ہو رہا ہے، نہ ہی یہ اسلام کا نقطہ نظر ہے، نہ ہی گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد کا نظریہ تعلیم، مغربی مواد تعلیم کے ساتھ مغربی نظام تعلیم کو بھی جوں کا توں نافذ کر دیا گیا ہے، نہ ہی نظام تعلیم میں عمل جراحی کر کے غیر اسلامی اثرات کو پاک کیا گیا اور نہ اسلامی مواد کو داخل کیا گیا، مسلمان خود ہی نظام تعلیم میں مخلوط تعلیم کو گناہ ہی نہیں سمجھتا؛ بلکہ بہت سے دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کو پڑھانے کا خوشنام لگانے والے بھی جماعت پنجم کے بعد مردوزن کے اختلاط کو ختم کرنا ہی نہیں چاہتے، جب کہ طلباء بالغ ہو جاتے ہیں اور زمانہ آئے دن اسکولوں، کالجوں میں پیش آنے والے واقعات سے نالاں ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا:

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تنزل
دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز
دین ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمین گیر، زمین تاز
مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی
دین زخمہ ہے جمعیت ملت ہے اگر ساز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
اور ایک موقع سے فرمایا:

یہ مدرسہ، یہ جواں، یہ سرور و رعنائی
انہی کے دم سے مے خانہ فرنگ آباد

یہ تو باطنی اثرات تھے، ظاہری نظام کے اعتبار سے اگر نظر ڈالئے تو بچوں کے لئے یونیفارم میں نہایت چھوٹے شلوار رکھے گئے اور بچیوں کے لئے ایسا فراک کہ جس سے ان کا ستر کھلتا رہتا ہے اور رگ و پینے سے حیاء کرید لی جاتی ہے، دسویں جماعت تک بھی اسی لباس میں لڑکیوں کو دیکھا جا رہا ہے، سر کو ننگا رکھنے، کمر پر بیلٹ بندھوانے کا مقصد سوائے بے حیائی ظاہر کرنے کے کچھ نہیں ہو سکتا، سیکھنے سکھانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں، کھیل تو کھیل ہے، ناچ کیا ہنر ہو سکتا ہے، اس زمانے میں کھیل اور ناچ ایک مقصد زندگی، ذریعہ معاش، شہرت کا آسان سبب بن چکا ہے، سائنسدانوں، اعلیٰ تعلیم یافتہ، قوم و ملت کے خادم افراد کی وہ قدر نہیں رہی جو رقا صاؤں اور کھلاڑیوں کو ہو چکی ہے، انہیں کو پوری قوم کا نمائندہ اور مثالی شخصیت شمار کیا جا رہا ہے، کھیل اور ناچ مغربی تہذیب کی تشہیر کے لئے نہایت مؤثر ذریعہ ہو چکے ہیں، یہودی تجارت کے فروغ کے لئے جادوئی ہتھیار بن چکے

ہیں، اسی سے متاثر ہو کر اسکولوں میں بھی رقص و سرور، ڈانس، سوسنگ، پکنک، فلم بینی، تاریخی مقامات کی سیر، سالانہ تعلیمی مظاہروں کا سلسلہ جاری کیا گیا، ان سے وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو ہونا نہ چاہئے، پھل وقت سے پہلے پک رہے ہیں، نابالغی میں جنسی تشدد کے واقعات پیش آرہے ہیں، خود تعلیمی نظام مضحک ہو رہا ہے، اس تعلیمی نظام سے گذر کر بچہ جب بیرونی ممالک کا سفر کرتا ہے تو قدیم زمانے میں مانیں اپنے بچوں کہتی تھیں بیٹے ہم نے تمہارے لئے خاندانی لڑکی دیکھ رکھی ہے وہاں نکاح نہ کرنا، کچھ عرصہ پہلے یہ کہہ رہیں تھیں اگر وہاں نکاح کرنا ہو تو مسلمان عورت سے کرنا کسی عیسائی لڑکی سے نہ کرنا، آج کل یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ بیٹے یورپ جا رہے ہو اگر نکاح کی ضرورت محسوس ہو تو عورت سے نکاح کرنا مرد سے نکاح ہرگز نہ کرنا، ڈگریوں کی اہمیت اتنی اختیار کر گئی کہ ڈگریوں کی تکمیل کے لئے بچوں کے اچھے رشتوں کو ٹھکرایا جا رہا ہے اور اس دور فتن میں اور اس بے حیاء نظام تعلیم میں رکھ کر بچوں کو نکاح میں غیر معمولی تاخیر کی جا رہی ہے، اگر اعلیٰ ڈگریاں مل جائیں تو بچوں کے اس تناظر سے رشتوں کی تلاش میں مزید تاخیر ہو رہی ہے اور اس معیار کے نکاح کا تقاضا بھی ہو رہا ہے۔

یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ لڑکیوں کی تصاویر ان کے اونچے رینک آنے پر برسرعام سڑکوں پر اور اخباروں میں شائع کیا جائے، اس تعلیمی سال کے ابتداء میں نئے داخلہ شدہ لڑکیوں میں حسیناؤں کا درجہ طے کیا جائے یا رینگنگ کے ذریعہ سے اخلاق سوز حرکتیں کی جائیں بالکل جائز نہیں ہے کہ اولاد کو اعلیٰ تعلیم کے عنوان پر اس حال میں یورپ و امریکہ بھیجا جائے کہ اس کا ایمان اور تقویٰ ہی درست نہ ہو، اسلامی شناخت کے تحفظ و بقا کا امکان نہ ہو، بلکہ مغربی ماحول میں رل مل جانے کا قوی اندیشہ ہو اور عملی تجربے ہو رہے ہیں، اس کے لئے سودی قرضے گوارا کئے جا رہے ہیں۔

انتظامیہ کی خدمت میں کچھ اہم گزارشات:

(۱) چاہے وحدت تعلیم کا نقطہ نظر ہو، یا عصری ماحول میں دینی تعلیم کے اسکولس ہوں یا دینی اقامت گاہوں یعنی مسلم ہاسٹلس کا قیام، جیسے انتظامیہ یہ چاہتی ہے کہ طلبہ کو

شریعت کا پابند بنایا جائے اور اللہ کے احکام کو ان میں زندہ کیا جائے، اسی طرح وہ خود بھی ملازموں کے ساتھ برتاؤ میں، ماتحتوں کے ساتھ لین دین کے مسائل میں اور پارٹنرس اپنے معاملات میں حلال و حرام کا لحاظ رکھیں، طے ہونے والے معاہدات کو اہل علم کی نگاہ سے گذاریں، خود اسٹاف و عملہ سے پودہ کا اہتمام کریں، اس کے بغیر اسلام کے نام پر چلائے جانے والے ادارے اسلام کی بدنامی اور غلط نمائندگی کا ذریعہ بنیں گے۔

(۲) اہل علم یا دین دار حضرات کی نگرانی میں چلائے جانے والے ان اداروں کا مذہبی مزاج سیکھنا بھی ضرور ہے، اسی طرح عصری تعلیم کا معیار باقی رکھنا بھی ضروری ہے، چاہے دینیات کا نظام جتنا بھی مستحکم اور بڑے بڑے علماء کے بیانات ہو رہے ہوں، لیکن عصری تعلیم معیاری نہیں ہے تو اس قسم کے ادارے ہرگز مغرب زدہ طبقہ کو قریب کرنے کا ذریعہ تکرار نہیں بن سکتے۔

آخری بات یہ ہے کہ ساری مسلمان تنظیمیں، مسالک سے بالاتر ہو کر عصری اسکولوں کے چلانے میں ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں، باہمی ارتباط کے ذریعے سے نصاب و نظام کی خوبیوں کا لین دین کریں، ہر آدمی اپنی جگہ پر تجربات کو دہرا کر اپنا اور طلبہ کا مال وقت ضائع نہ کرے۔





اپنی کتاب ”خواص کبیر“ میں کہتا ہے:

”إِنَّمَا نَذْكُرُ فِي هَذِهِ الْكُتُبِ خَوَاصَّ مَا رَأَيْنَاهُ فَقَطْ دُونَ مَا سَمِعْنَاهُ ، أَوْ قِيلَ لَنَا ، وَقَرَأْنَاهُ بَعْدَ أَنْ إِمْتَحَنَاهُ وَجَرَّبْنَاهُ ، فَمَا صَحَّ أَوْ رَدَّنَاهُ ، وَمَا بَطَلَ رَفَضْنَاهُ ، وَمَا اسْتَخَرَجْنَاهُ نَحْنُ أَيْضًا قَاسَيْنَاهُ عَلَى أَحْوَالِ هَؤُلَاءِ الْقَوْمِ“ (۱)

”ہم نے ان کتابوں میں صرف ان چیزوں کے خواص کا تذکرہ کیا ہے جن کو ہم نے دیکھا ہے، نہ کہ صرف سنا ہے، یا ہم کو بتلایا گیا ہے یا ہم نے جس کو پڑھا ہے اس کے جانچ پڑتال کرنے اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد، اس میں جو صحیح ہے اس کو ہم نے ذکر کیا ہے، اور جو غلط اور باطل ہے اس کو ہم نے ٹھکرا دیا ہے، جس کو ہم نے استنباط کیا ہے اس کو بھی اس قوم کے احوال پر قیاس کیا ہے۔“

اس لئے جابر بن حیان وہ پہلا شخص شمار ہوتا ہے جس نے علمی طریقہ کار میں تجربہ کو شامل کیا۔

اور ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ:

”فَمَنْ كَانَ دَرْبًا كَانَ عَالِمًا حَقًّا ، وَمَنْ لَمْ يَكُنْ دَرْبًا لَمْ يَكُنْ عَالِمًا ، وَحَسْبُكَ بِالْدَّرْبَةِ فِي جَمِيعِ الصَّنَائِعِ أَنَّ الصَّانِعَ الدَّرْبَ يَحْذُقُ ، وَغَيْرُ الدَّرْبِ يُعْطِلُ“

”جو شخص تجربہ کرتا ہے وہ حقیقی عالم ہے اور جو شخص تجربہ نہیں کرتا وہ عالم ہی نہیں۔ تمام صناعات اور ایجادات میں یہ بات مسلم ہے کہ تجربہ کرنے والا حاذق ہوتا ہے اور غیر مشاق بے کار ہوتا ہے۔“

رازی دنیا کا پہلا طبیب ہے جس نے اس تجرباتی طریقہ کار کو اختیار کیا، چنانچہ اس

(۱) تجرباتی طریقہ کار:

کسی بھی علمی تحقیق، ایجاد، اکتشاف کے تعلق سے مسلمانوں نے اس پر بحث و نظر پر ہی اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ انہوں نے تجربات بھی کئے، یونانی اور ہندی تو بیشتر نظریات قائم کرنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ (اس کو عملی جامہ نہیں پہناتے تھے، اس کو عملی جامہ نہ پہنانے کی وجہ سے بہت سارے نظریات علمی تحقیق سے متعلق یکجا ہوئے، جس میں صحیح اور غلط کے درمیان فرق اور خط فاصل قائم کرنا مشکل ہو گیا، پھر) مسلمانوں نے ان تمام نظریات کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھا (چنانچہ مسلمان سائنسدان ہر نظریہ قائم کرنے کے بعد اس پر سرچ، تحقیق اور تجربہ بھی کرتے تھے، جس سے صحیح اور غلط نظریہ واضح ہو جاتا تھا، یہ تجرباتی) یہ طریقہ مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔

چنانچہ مسلمانوں نے سابقہ تمام نظریات کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھا ہے، انہوں نے سابقہ نظریہ قائم کرنے والے کی شہادت پر نظر نہیں کی؛ بلکہ ہر نظریہ کو عملی کسوٹی پر پرکھا ہے، اس طرح سابقہ نظریات کی اغلاط کی اصلاح کی گئی، یہ لوگ نہ صرف سابقہ نظریات کو جانچتے اور پرکھتے تھے؛ بلکہ خود نظریہ قائم کرتے اور اس کو تجربہ اور تحقیق کی کسوٹی پر رکھ کر اس کی حقانیت اور صداقت کو اجاگر کرتے۔

جن مسلمان سائنسدانوں کو اس فن میں مہارت تھی، ان میں جابر بن حیان، خوارزمی، رازی، حسن بن بیثم، ابن النفیس سرفہرست ہیں۔

جابر بن حیان کہتا ہے: ”وَمَلَأْتُ كَمَالِ هَذِهِ الصَّنْعَةِ الْعَمَلُ وَالتَّجَرِبَةُ، فَمَنْ لَمْ يُجَرِّبْ لَمْ يَطْفَرْ بِشَيْءٍ أَبَدًا“ (۱) اس صنعت کا کمال عمل اور تجربہ ہے، جو شخص تجربہ نہیں کرتا، وہ کچھ نہیں پاتا۔

(۱) کتاب التجربة: لابن حیان، ضمن مجموعة مصنفات فی علم الکیمیاء للحکیم جابر بن حیان،

نے دواؤں کو انسان پر استعمال کرنے سے پہلے جانوروں پر اس کا تجربہ کیا خصوصاً بندروں پر، یہ طریقہ کار (بہت کم مدت سے) پوری دنیا میں اس وقت رائج ہے، چنانچہ وہ اس حوالہ سے کہتا ہے:

”عِنْدَمَا تَكُونُ الْوَاقِعَةُ الَّتِي تُوَاجِهْنَاهَا مُتَعَارِضَةً مَعَ النَّظَرِيَّةِ السَّائِدَةِ يَجِبُ قُبُولُ الْوَاقِعَةِ ، حَتَّى وَإِنْ أَخَذَ الْجَمِيعُ بِالنَّظَرِيَّاتِ السَّائِدَةِ تَأْيِيدًا لِمَشَاهِيرِ الْعُلَمَاءِ“ (۱)
 ”جب کوئی واقعہ یا حادثہ جس سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے اور یہ لوگوں میں رائج نظریہ سے متعارض ہوتا ہے تو ہم اس واقعہ کو قبول کرتے ہیں، چاہے تمام لوگ مشاہیر علماء کی تائید میں اس نظریہ کی تائید نہ کریں۔“

اس سے پتہ چلا کہ بسا اوقات تمام لوگ بڑے اور مشہور علماء کے آراء سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے نظریات پر تکیہ کئے رہتے ہیں، کبھی تجربہ کسی نظریہ سے متعارض ہوتا ہے تو اس وقت نظریہ کو رد کرنا پڑتا ہے۔ اسی تجرباتی طریقہ کار کی وجہ سے ابن الہیثم، اقلیدس، بطلموس کے نظریات کی علمی قدر و منزلت کے باوجود ان کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسی تجرباتی طریقہ کار کے ذریعہ انسان کو یہ پتہ چلتا ہے کہ حقیقت تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے، صحیح اور درست حقیقتِ حال کیسے دریافت کی جاتی ہے؟

(۲) عملی طریقہ کار

کسی بھی نظریہ کو عملی جامہ پہنانا اور اس کو عملی شکل دینا یہ بھی مسلمانوں کا ہی عظیم کارنامہ ہے۔

گذشتہ سائنسدان نئے نظریات قائم کرتے، اکثر و بیشتر یہ نظریات بالکل صحیح ہوتے؛ بلکہ ان کی صحت اور قوت کے باوجود یہ نظریات صرف کاغذی حد تک ہوتے، لیکن ان نظریات کی عملی تطبیق اور تنفیذ نہ ہوتی، اسی کو عملی طریقہ کار کہتے ہیں، ان مختلف نظریات کو عملی جامہ پہنا کر اس کو انسان کے آرام و سہولت کے لئے مفید بنانا ضروری ہے۔

جب مسلمان بحیثیت دنیا کے معمار اور مصلح کے منظر عام پر آئے تو اس طرح مسلمان ہر پرانے نظریہ کو عملی جامہ پہنا کر اس کو لوگوں کے لئے مفید ذریعہ بنانے لگے۔ اس کی مثال موسیٰ بن شاكر کی اولاد کا سیرابی کے آلات اور پہاڑوں کی بلندیوں پر پہنچانے والے آلات کی ایجاد ہے، اسی طرح باریک اور نازک گھڑیوں کی ایجاد یہ ساری چیزیں قدیم نظریات کی اساس پر ہوئی ہیں، ہاں البتہ اسی میں انہوں نے کچھ اپنے نظریات کو بھی شامل کر کے مفید آلات کی ایجاد کی اور اس کے ذریعے لوگوں کو نفع پہنچایا۔

اسی طرح زہراوی نے کئی ایک آلاتِ جراحی ایجاد کی، مثلاً اسے نظریاتی طور پر پتہ چلا کہ جب دواء براہ راست خون سے لگتی ہے تو اس کا بجلد اثر ہوتا ہے، تو اس نظریہ کی وجہ سے اس نے حقنہ کی ایجاد کی، اس سے دواء بجلد خون تک پہنچائی جاتی ہے“ (۱)
 اسی طرح ابن بیطار نے اسی (۸۰) سے زیادہ دوائیں معرض وجود میں لائیں، ایسے ہی جابر بن حیان نے کیمیائی اشیاء کو ایسی چھتری کی ایجاد کے لئے استعمال کیا جو پانی سے متاثر نہیں ہوتی اور ایسے کاغذ بنائے جو اہم معلومات لکھنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور اس پر آگ اثر نہیں کرتی۔ (۲)

(۳) علمی امانت داری

علمی امانت داری کا اصول بھی ایک نیا اصول تھا جو اسلام کی آمد کے بعد ہی ظاہر ہوا ہے، دین اور اخلاق کے نہ ہونے کی وجہ سے صرف شہرت اور نفع کے حصول کے لئے مختلف ایجادات کو لوگوں نے اپنی جانب منسوب کیا۔

گرچہ علمی امانت داری کا تقاضا تو یہ تھا کہ کسی کے بھی فکری اور علمی حقوق کا تحفظ کا احترام کیا جاتا اور کسی بھی محنت اور جدوجہد اور ایجاد کو اسی کی جانب منسوب کیا جاتا ہے؛ لیکن مسلمان سائنسدانوں کی تحقیقات اور ایجادات کا بکثرت سرقہ کیا گیا اور اس کی نسبت

ان کے بہت بعد آنے والے یورپین سائنسدانوں کی طرف کردی گئی۔

اور یہ بات بھی کسی پر مخفی نہیں ہے کہ خون کی چھوٹی دوران (pulmonar circulation) کے محقق اور مفتش ابن النفیس کی اس تحقیق کو جس نے اسے نہایت باریک بینی کے ساتھ اپنی کتاب (شرح تشریح القانون) میں نوٹ کی تھی اور یہ بات بہت زمانے سے مخفی تھی، اس کو بعد کے زمانے میں غلطی سے ایک انگریز ڈاکٹر ”ولیم ہارنی“ کی جانب منسوب کیا گیا، جس نے خون کی دوران کی ابن النفیس کی وفات کے بعد تین صدیوں سے بھی زائد مدت گزرنے کے بعد دریافت کیا اور لوگوں کو دوران خون کی حقیقت معلوم کرنے والے کی حیثیت سے ابن النفیس کا نام معلوم نہ ہوا، پھر ڈاکٹر محی الدین التطاوی نے اس کا اکتشاف کیا۔

اسی طرح ایٹالی ڈاکٹر الباجو نے ۹۵۴ھ = ۱۵۴۷ء میں ابن النفیس کی (شرح تشریح القانون) کے کئی اقسام کا لاطینی ترجمہ کئے، ان اباحت میں سے ایک بحث خون کی آنتوں سے متعلق تھی، ایک اسپین ڈاکٹر جس کا نام ”سرفیتوس“ تھا، یہ پیرس یونیورسٹی کا لکچرر تھا، اس کو الباجو کا ابن النفیس کی کتاب کا ترجمہ مل گیا، اس پروفیسر کو اس کے عقائد میں خلط ملط کی وجہ سے یونیورسٹی سے نکال دیا، اس کو اور اس کی کتابوں کو جلادیا گیا، اس کی بعض کتابیں بغیر جلی ہوئی محفوظ رہیں، جن میں خون کی دوران کے متعلق ابن النفیس کی کتاب کا الباجو کا کیا ہوا ترجمہ بھی تھا، بعد کے لوگوں نے اس کتاب کے اس کے پاس موجود ہونے کی وجہ اس کتاب کی نسبت اس کی طرف کردی۔ کہ اس کا سہرا اس کے سر جاتا ہے پھر ہارنی کے سر، یہ خیال ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء تک قائم تھا یہاں تک کہ مصری طبیب ڈاکٹر محی الدی التطاوی نے اس وہم کو ختم کیا، انہوں نے شرح تشریح القانون پر برلن کے کتب خانہ میں ایک نسخہ پایا، اور اس سلسلے میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل۔ (۱)

سماجی علم اور سوشل کی نسبت فرانسیسی یہودی ”دور کاظم“ کی جانب کی گئی ہے، حالانکہ اس علم کے بانی اور موجد علامہ ابن خلدون ہیں۔

اسی طرح ”روجر بیکن“ کی کتاب ”cepus majus“ کی فصل خامس یہ صرف اور صرف ابن الہیثم کی کتاب المناظر کا حرف بحرف ترجمہ ہے، اس نے بغیر اس کو اس کے مؤلف کی جانب منسوب کئے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہ علمی خیانت بہت زیادہ ہوئی، لیکن مسلمانوں نے کبھی اس علمی خیانت کا ارتکاب نہیں کیا؛ بلکہ ہر تحقیق اور ایجاد کو اس کے حقیقی بانی اور موجد کی جانب ہی منسوب کیا۔ بلکہ مسلمان علماء اور سائنسدانوں اور محققین کی کتب گذشتہ فلسفیوں کے ناموں سے بھری پڑی ہیں،، جیسے بقراط، جالینوس، سقراط، ارسطو وغیرہ۔





جس طرح مسلمان علماء اور اہل علم نے دیگر علوم و فنون کی آبیاری کی اور ان کو بامِ عروج تک پہنچایا، نت نئے ایجادات کے ذریعہ موجودہ سائنس کو ترقی کی راہ دکھائی، وہیں علم طب کے حوالے سے بھی ان کے کارنامے کچھ کم نہیں ہیں، اس علم و فن کے اس گوشہ، خدمتِ خلق کے اس پیشہ کو بھی انہوں نے اپنے تجربات، اپنی قلمی جولانیوں اور فکری توانائیوں کی آماجگاہ بنایا، خود مغربی مفکرین اور اطباء کو مسلمان اطباء کی عظیم خدمات اور اس فن کے بامِ عروج تک پہنچانے میں اس کے رول اور کردار کا اقرار اور اعتراف ہے۔

آج کل علم طب کی ہیئت و صورت کے مکمل طور پر بدل جانے کے باوجود اس علم طب کی اصل بنیاد گذشتہ مسلمان اطباء کی دوا سازی اور علم طب سے متعلق وضع کردہ قواعد و ضوابط پر ہی ہے۔ پیچیدہ اور دشوار گزار امراض کے لئے وہی گذشتہ اصول آج بھی نسخہ کیسیا اور حرفِ آخر ہیں۔

خود مغربی علماء اور مفکرین کو مسلمانوں کے طب اور دوا سازی کے میدان میں مسلمان علماء اور حکماء کے بلندی مرتبت اور اس فن میں ان کے مقامِ بلند کا اعتراف ہے کہ اس فن کے ابتدائے بانی اور اس کی داغ بیل رکھنے والے مسلمان علماء ہی ہیں۔

برطانیہ انسائیکلو پیڈیا میں ہے جس کی عربی عبارت براہِ راست لکھی جا رہی ہے:

”وَالْحَقُّ أَنَّ كَثِيرًا مِّنْ أَسْمَاءِ الْأَدَوِيَّةِ وَكَثِيرًا مِّنْ مُّركَّبَاتِهَا المعروفِ حَتَّى يَوْمَنَا هَذَا، وَفِي الْحَقِيقَةِ الْمَبْنِيَةِ الْعَامِ لِلصَّيْدَلَةِ الْحَدِيثَةِ، قَبْلًا عَدَا التَّعْدِيلَاتِ

الکیمیاء وَیَّةُ الْحَدِيثَةِ الْحَالِ، قَدْ بَدَأَ الْعَرَبُ“ (۱)

”حق تو یہ ہے کہ بہت ساری دواؤں کے نام اور اس کے بہت سے مشہور و معروف مرکبات آج تک جس پر طب جدید کا اعتماد ہے سوائے چند کیمیائی مشمولات کے، اس کی ابتداء عربوں نے ہی کی ہے“

اس تحریر کے اور مسلمان اطباء کے کارناموں اور ان کی طبی خدمات کے ذکر کے ذریعہ ایک تو مسلمانوں کی اس فن میں ان کی خدمات اور اس کو ترقی کی راہ دکھانے میں ان کے کردار کو اجاگر کرنا ہے اور دوسرے خود مسلمانوں کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ وہ مغرب کی مادی ترقیات اور نت نئے ایجادات اور طبی اور علمی میدان میں ان کی ترقی سے مرعوب اور حیران و ششدر نہ ہوں؛ کیونکہ اس ساری ترقی کی بنیاد اور اس قافلہ کے سالار اول اور اس فن کے سرخیل مسلمان ہی رہے اور اس کی عمارت کی پہلی بنیاد اور داغ بیل مسلمانوں ہی نے رکھی ہے، ہاں اس کے ساتھ یہ پیش نظر رہے کہ ان علماء اور اطباء نے جہاں اس فن طب کی خدمت کو اپنا پیشہ بنایا اور اس میں کامل مہارت اور حذاقت کے ذریعہ تاریخ کے صفحات میں اپنے نام درج کروائے ہیں، وہیں اس کے ساتھ ان کا خاص وصف یہ بھی رہا ہے کہ انہوں نے اپنے دین و ایمان کے ساتھ سودا کبھی گوارا نہیں کیا، اور اپنے دین و مذہب کے ساتھ ان کا لگاؤ اور تعلق ہر قدم پر قائم رہا۔

مسلمانوں میں یونانی طب کا رواج حکمائے یونان کی ان کتابوں سے ہوا جو یونانی یا سریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئی، مترجمین عیسائی، یہودی یا صابی تھے، ان میں ”یوحنا بن ماسویہ“ (المتوفی ۸۵۷ء) حنین بن اسحاق (المتوفی ۸۷۷ء) اور قسطا بن لوقا (المتوفی ۹۰۰ء) خاص طور پر مشہور ہیں، حنین بن اسحاق کے اہل خاندان اور ان کے رفقاء تلامذہ نے طب یونانی کو عربی جامہ پہنانے میں اہم رول ادا کیا، ان کے نوے شاگرد بغداد کے بیت الحکمة میں ترجمے کا کام کرتے تھے، حنین نے فلسفہ اور طب سے متعلق جالینوس کی کتابوں کے ایک سو سریانی اور انتالیس عربی ترجمے کئے، ان کے فرزند

اسحاق (المتونی: ۹۱۰ء) اور یحییٰ حبیش نے ساٹھ کتابوں کو عربی اور تیرہ کوسریانی میں منتقل کیا، یوحنا ابن ماسویہ نے متعدد کتابوں کے ترجمے کئے، نویں صدی کے آغاز میں سائنسی موضوعات میں سریانی زبان عربی کے مقابلے میں مالا مال تھی، مگر ترجمے کا کام اس سرعت سے جاری رہا کہ صدی کے اختتام تک عربی زبان سریانی کو پیچھے چھوڑ گئی۔

(۱) خالد بن یزید (۸۵ھ)

علوم وفنون کا شیداء خالد بن یزید حضرت امیر معاویہ کا پوتا تھا، جس کو دیگر علوم وفنون کے ساتھ علم طب سے خصوصی دلچسپی اور لگاؤ تھا، اس کے علوم وفنون کے ساتھ لگاؤ کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ شاہی خاندان کے فرد ہونے اور جس دور میں بنی امیہ میں خلافت اور حکمرانی کے لئے رسہ کشی اور خلفشار برپا تھا، تمام شاہی کروفر اور تصنع سے دور علوم وفنون کی آبیاری اور خدمت کے لئے وقف ہو گیا تھا۔

علمی کارنامے

اس کے علمی کارناموں میں سب سے برتر اور بلند تر کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نئے علوم و ایجادات، طب، سائنس سمیت مختلف علوم کے ماہرین کو اپنے یہاں جمع کیا، قدیم یونانی اور قطبی زبانوں کی مشہور زمانہ کتابوں کے عربی میں ترجمہ کرائے، گرچہ اس کی شہرت بحیثیت کیمیادان زیادہ ہوئی، حالانکہ ابن ندیم (۱) اور ابن خلکان (۲/۲۲۴) دونوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ خالد کی طب کے تعلق سے معلومات بھی کافی وسیع تھیں۔

بہر حال اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ہی قدیم علمی کتابوں کے ترجموں کا آغاز کیا، اس کی نگرانی میں طب سے متعلق جن کتابوں کا ترجمہ ہوا ان میں ”کتاب الحرات“، ”کتاب الصحیفة الکبیر“، ”کتاب الصحیفة الصغیر“ وغیرہ شامل ہیں (۲)

مذہبی رنگ اور دین سے وابستگی

اس نے نہایت نیک طینت اور صالح طبیعت پائی تھی، شاہی خاندان کا فرد اور رکن رکین ہونے کے باوجود شاہی تکلفات سے ہمیشہ دور رہی رہا، فن طب اور کیمیاء میں کامل مہارت کے ساتھ دینی علوم میں بھی کمال حاصل کیا۔

(۲) جابر بن حیان (۱۹۸ھ = ۸۱۷ء)

جابر بن حیان فن کیمیاء کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے، اسے سونا بنانے کی عجیب دھن تھی، جس نے اسے علم کیمیاء پر تجربات کروائے۔ اس کی پیدائش ۱۲۰ھ مطابق ۷۳۷ء میں ہوئی، یہ ایک غریب گھرانے کا فرد تھا، باپ عطار (دوائی فروخت کرنے والا) تھا، تربیت کا سارا بوجھ ماں پر آن پڑا، بچپن میں کوفہ اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیج دیا گیا، سن شعور کو پہنچا تو کوفہ کے علمی ماحول سے متاثر ہوا، اور مدرسہ کی مروجہ تعلیم حاصل کی، اس کی کھوجی طبیعت نے اسے کیمیادان بنادیا۔

(CHEMISTRY)

علمی خدمات اور کارنامے

- ۱۔ عمل تصعید یعنی دوا کا جوہر اٹانا (SUBLIMATION) اس طریقہ کو سب سے پہلے اسی جابر نے اختیار کیا، تاکہ لطیف اجزاء کو حاصل کر کے دواؤں کو مزید مؤثر بنایا جاسکے۔
- ۲۔ جابر نے قلمائے کرنے (CRYSTALLISTION) کا طریقہ دریافت کیا اور اس نئے طریقہ سے دواؤں کو قلمایا۔
- ۳۔ جابر نے دھات کو بھسم کر کے کشتہ بنانے (OXIDISATION) کا نازک طریقہ دریافت کیا، کسی دھات کو جڑی بوٹیوں کے ساتھ کس طرح آنچ دے کر بھسم کرتے ہیں، اس میں صحیح اندازے اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔
- ۴۔ جابر کی ایک بڑی اور مفید ایجاد قلع انبیک ہے (DISTILLATION)

(APPARATUS)

(۳) ابوالحسن علی بن سہل ربن طبری (۲۵۱ھ = ۸۷۰ھ)

یہ فن طب کا ماہر تھا، اس نے اس فن کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر بغداد کے جملہ اسپتالوں کا نگران مقرر ہوا، یہ مرو کا باشندہ تھا، اسکے والد قابل طبیب تھے، وہ بغداد آکر مقیم ہو گیا، اس نے بغداد کے دستور کے مطابق درس دینا شروع کیا، چونکہ وہ کامل مہارت رکھتا تھا، اس لئے اس کے یہاں فن طب کے طلبہ کا ہجوم ہو گیا، علی بن سہل کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ فن طب کا مشہور دنیا طبیب زکریا رازی کا استاذ ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

علی بن سہل ایک روشن دماغ اور باکمال طبیب تھا، اس کی اس طبی مہارت کی وجہ سے سرکاری اسپتالوں کا نگران مقرر کیا گیا، اس طرح اسے بے شمار مریضوں کے علاج و معالجہ کا موقع ملا اور اس نے خوب تجربات حاصل کئے، اور علاج کے نئے طریقے ایجاد کئے اور اپنے ان تجربات اور مجربات کو ڈائری میں نوٹ کرتا رہا، پھر اس کو مرتب کر کے کتابی شکل دی اور اس کا نام ”فردوس الحکمت“ رکھا۔

یہ کتاب ابجد کے اصولوں پر مرتب کی گئی ہے جیسا کہ آج کل انسائیکلو پیڈیا کا طرز ہے، عربی زبان میں اس قدر محیط اور جامع کتاب نہیں لکھی گئی، اس کتاب میں بیشتر طبی مباحث کا ذکر ہے۔

اس میں اس نے دماغ، درد سر، دوران سر (vertigo) نسیان (Amnesia) ڈراؤنا خواب (Nightmare) کزاز (Tetanus) تشنج (Spasm) فالج، دمہ، امراض صدر، ناک، کان اور حلق کے امراض، پھیپھڑوں کے بیماریاں، جنسی امراض، سرطان، نفرس (Gout) عرق النساء (Sciatica) گھٹیا (Rheumatism) جذام، گنگرین (Gangrene) امراض چشم، امراض معدہ، ہچکی (Hiccough) استسقاء (Dropsy) طحال اور پتے کی بیماریاں، ذات الجنب

(Pleurisy) چیچک، فیل یا (Elephantiasis) طاعون (Plague)

آکھ (lupus) سرخبادہ (Erysipelas) وغیرہ

اور ایک کتاب ”دین و دولت“ اس قابل مصنف نے مرتب کی جو اخلاقی تعلیم اور معلومات کا قابل قدر ذخیرہ ہے۔

مذہبی رنگ و مزاج

حقیقت یہ ہے کہ علی بن ربن سہل انسائیکلو پیڈیا کا موجد، حفظ صحت کے اصول اور احتیاط کے قاعدے بتانے والا طبیب حاذق، علم الاخلاق کا مالک، سماجی زندگی کو عمدہ طریقہ سے فروغ دینے والا اور دین و دولت کو توازن کے ساتھ لے کر چلنے والا معلم اور عظیم شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا بڑا کارنامہ طبی انسائیکلو پیڈیا ہے۔

(۴) ابوحنیفہ دینوری (م ۱۸۹۴ ۸۹۵ء)

یعقوب الکندی (م ۸۷۳ء) اور ابن ربن طبری (م ۸۵۰ء) کے زمانہ حیات میں ہی ایک اور کوہ قامت علمی شخصیت پیدا ہوئی جو الکندی ہی طرح ہمہ جہت تھی، وہ شخصیت ابوحنیفہ دینوری کی تھی، وہ مورخ بھی تھی، ریاضی داں بھی، ماہر فلکیات بھی اور جغرافیہ داں بھی، وہ مفسر قرآن بھی تھے، قرآن کی تفسیر انہوں نے تیرہ جلدوں میں لکھی، ان سب علوم کے ساتھ ساتھ وہ ماہر نباتات بھی تھے، ہم ان صفحات میں صرف ان کی ماہر نباتیات کی حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے کیوں کہ نباتات کا علم الادویۃ کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہے۔

ابوحنیفہ دینوری کا پورا نام ابوحنیفہ احمد بن داؤد بن الدینوری تھا، وہ فارسی الاصل تھا، جارج سارٹن کے مطابق وہ ۵۱۵ تا ۵۳۵ عیسوی بمطابق ۲۰۰ تا ۲۱۰ ہجری عراق کے قصبہ دینور میں پیدا ہوئے اور ۸۹۵ء مطابق ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔

دینوری کی ایک کتاب ”کتاب النبات“ کی اہمیت مسلم ہے، اس میں ۱۱۲۰ پودوں کی خاصیات کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے اوراق جگہ جگہ سے دستیاب ہوئے، ڈاکٹر حمید اللہ کو اس کے چالیس صفحات ۱۹۷۴ء میں مدینہ منورہ میں دستیاب ہوئے، ڈاکٹر برن ہارڈیون کو اس کا ایک زیادہ ضخیم مگر بھی نامکمل نسخہ ۱۹۴۸ء میں استنبول میں دستیاب ہوا، ان دونوں کو جوڑ کر اور مزید اوراق کو اور جگہوں سے دستیاب ہوئے ہوں گے، ”کتاب النبات“ کا نسخہ مکمل ہوا، ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے جدید طرز پر مرتب کیا جو عربی زبان میں ہے، اس کا تعارف انہوں نے انگریزی میں لکھا ہے۔

کتاب النبات میں پودوں کے بیان کو حروف تہجی کے ترتیب کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اور ہر پودے کے بارے میں اس زمانے تک جتنی معلومات دستیاب تھیں وہ سب بیان کر دی گئی ہیں کہ کوئی پودا اپنی نشوونما کے آغاز سے اپنی طبعی عمر کے اختتام تک کن کن مرحلوں سے گذرتا ہے، اس میں پھول کب کھلتے ہیں، اس کے پھل کس قسم کے ہوتے ہیں۔

معروف پودوں میں گند، جو، انگور، کھجور، آٹے والے اناج، چڑارنگنے والے پودے، خضاب کے کام آنے والے پودے، چقماق (Flint) کے طور پر استعمال ہونے والے درخت، مسواک والے درخت، ریشہ دار چھال والے درخت جن سے رسیاں بنائی جاتی ہیں اور دیگر اقسام کے پودوں کے بارے میں مختلف النوع معلومات یکجا کرنے کے علاوہ معلومات کی ایک اور قسم جو دینوری نے یکجا کر دی ہے اور علم الادویہ کیساتھ اس تعلق کو قائم کرتی ہے، وہ ادویاتی اہمیت کے پودوں کے بارے میں ادویاتی معلومات ہیں۔ (۱)

(۵) علی بن عباس مجوسی (م ۳۸۴ھ)

طب یونانی جب اپنے عربی و اسلامی دور میں نقل و ترجمہ سے آگے بڑھ کر تصنیف و تالیف کے مرحلے میں داخل ہوئی، تو اسکو جن اطباء نے اسے پروان چڑھایا اور اپنی

(۱) دنیائے اسلام میں سائنس و طب کا عروج: ۱۲۶، ڈاکٹر حفیظ الرحمن الصدیقی، اریب پبلیکیشنز، دہلی

گراں قدر تصنیفات کے ذریعہ تاریخ میں گہرے نقوش چھوڑے، ان میں ایک نمایاں نام ”الکتاب الملکی کامل الصناعة الطبية“ کے مصنف علی بن عباس کا بھی ہے، بعض مؤرخین نے اسے عظیم اسلامی اطباء میں شمار کیا ہے اور اسکی تصنیف کو ”طبی انسائیکلو پیڈیا“ قرار دیتے ہوئے اسے محمد بن زکریا رازی کی کتاب ”کتاب الحاوی“ اور بوعلی سینا کی کتاب ”القانون فی الطب“ سے بعض اعتبارات سے بہتر قرار دیا ہے۔

علی بن عباس المجوسی کے حسب و نسب، تاریخ پیدائش اور ابتدائی حالات زندگی پر کوئی روشنی نہیں ملی، حاجی خلیفہ نے وفات ہجری ۳۸۴ھ اور جارج سارٹن نے عیسوی ۹۹۴ء تحریر کیا ہے۔

پروفیسر براؤن نے ان کو مسلمان کہا ہے، مجوسی اس کی نسبت اسی سے ظاہر ہے کہ اس کا باپ یا دادا ان کے قدیم زرتشتی مذہب کا پیرو تھا، واندیک امریکائی نے اپنی کتاب ”اكتفاء القنوع بما هو المطبوع“ میں علی بن عباس کا لقب علاء الدین بیان کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے القاب مخصوص بالاسلام ہیں۔

علمی خدمات اور کارنامے

علی بن عباس نے اپنے استاذ ابو ماہر موسیٰ بن سیار سے کسب فیض کرنے کے علاوہ خود بھی تحصیل علم میں محنت کی اور فن طب میں مہارت اور درک پیدا کر لیا، ابن ابی صبیحہ نے تحریر کیا ہے کہ ”وہ ماہر طبیب تھا، فن طب میں اسے امتیازی حیثیت حاصل تھی، تاریخ طب میں متعدد باتوں کی تحقیق و ایجاد کا سہرا علی بن عباس عباسی کے سر جاتا ہے۔

۱۔ وہ پہلا طبیب ہے جس نے شرائین و اوردہ کے درمیان عروقی شریہ کا جال ہونے کا تصور دیا۔

۲۔ پہلا طبیب ہے جس نے ریوی سل کو عسیر العلاج مرض قرار دیا اور اس کا سبب پھیپڑے کی مسلسل حرکت بتلایا۔

۳۔ اس نے احتباس بول کی صورت میں قاتلایہ CATHAER کے ذریعہ

پیشاب جاری کرنے کا طریقہ بتلایا۔

۴۔ اس نے سب سے پہلے یہ بتلایا کہ وضع حمل کے دوران بچہ خود باہر نہیں آتا، بلکہ رحم اپنی حرکت کے ذریعہ اسے باہر ڈھکیلتا ہے۔

۵۔ اس نے اپنی کتاب میں بہت سے دلچسپ سریریاتی مشاہدات بیان کئے ہیں۔

۶۔ اس نے اطباء پر برابر اسپتالوں میں حاضری دینے اور وہاں داخل مریضوں کا معائنہ کرنے اور ان کے ذریعے تجربہ حاصل کرنے پر زور دیا۔

اس کی مذکورہ بالا تصنیف کی حیثیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ابن سینا نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ ”اگر ”کامل الصناعة“ پہلے میری نظر سے گزری ہوتی تو مجھے ”القانون“ لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

کتاب الملکی میں طب عملی، علم تشریح، علم جراحات وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، نیز مصنف نے اس میں یونانی، شامی اور مسلم اطباء پر نقد و تبصرہ کیا ہے، کتاب میں بیس مقالے ہیں اور تقریباً چار لاکھ الفاظ ہیں، کتاب لاطینی میں دو مرتبہ ترجمہ ہوا، پہلا ترجمہ لاطینی میں اسٹیفن انطاکی نے ۱۱۲۷ء میں کیا تھا۔

سارٹن نے علی بن عباس کو ممبر اسلام کے عظیم ترین اطباء میں شماری کیا ہے:

Ali ibn abbas (Haly abbas) who flourished a little later, was one of the greatest physicians of Islam(۱)

”علی بن عباس جو ذرا بعد میں مشہور ہوئے ہیں اسلام کے عظیم ترین اطباء میں سے ایک تھے۔“

موصوف نے ان کو مشرقی خلافت کے تین عظیم ترین اطباء میں سے ایک مانا ہے

اور باقی دورازی اور ابن سینا ہیں۔

المجوسی نے ۹۹۴ء میں شیراز میں وفات پائی۔

علی بن اسحاق مجوسی کی حذاقت اور مہارت

علی بن اسحاق المجوسی کے پاس ایک مزدور آیا جس کو درِ دسر کی شکایت رہتی تھی، مجوسی نے اس مریض کا عجیب علاج کیا، اس نے مریض کے سر پر کئی مرتبہ چوٹ پہنچائی جس سے نکسیر کی شکل میں خون جاری ہو گیا اور مادہ فاسدہ جو اس مرض کا سبب تھا خون کے ساتھ خارج ہو گیا، اس عمل سے مریض کو بہت سکون ہوا اور اس کا درِ دسر ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا۔

(۶) ابو یوسف یعقوب بن اسحاق کندی (۲۵۴ھ / ۸۷۳ء)

یعقوب کندی علم ہیئت اور نجوم کا ماہر، علم الاعداد اور اسکی خاصیتوں پر تحقیق کرنے والا پہلا محقق، ماہر ریاضی اور روشنی پر تحقیق کرنے والا عظیم دانشور تھا۔

یعقوب کندی کے والد خلیفہ مہدی اور ہارون رشید کے عہد میں کوفہ کے امیر تھے، یعقوب کے آباء و اجداد اگرچہ طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے اور یعقوب کی پرورش اور تربیت بھی شاہانہ ماحول میں ہوئی تھی، مگر اسے علم فن سے فطری لگاؤ اور کمالِ شغف تھا، وہ دولت و ثروت اور سیاسی زندگی کے طمع طراک کے بالکل قریب نہیں گیا۔

وہ شاہانہ زندگی کو چھوڑ کر علمی زندگی کو اختیار کیا اور علمی و فنی کتابوں کے مطالعہ میں

مصروف ہو گیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

یعقوب علم ہیئت کا ماہر اور علم نجوم کا قابل تھا اس نے اپنے کمالات فن کا بار بار ثبوت دیا، وہ باکمال طبیب بھی تھا، علم ادویہ کے موضوع پر اس نے گہرا مطالعہ کیا، نئی نئی جڑی بوٹیوں کو تلاش کر کے اس پر تجربہ کئے، ان کی خاصیتوں اور اثرات کو صحیح معلوم کیا اور پھر ان کی درجہ بندی کی، پھر دواؤں کے استعمال میں وزن کا تعین یہ یعقوب کے زبردست کارنامے سمجھے جاتے ہیں۔

جارج فارٹن بھی اس خیال سے متفق ہے کہ مسلمانوں میں وہ پہلا فلسفی تھا، یونانی

فلسفے اور سائنس کا گہرا علم رکھتا تھا، فلسفہ میں وہ نوافلاطونیت کا مقلد تھا، اس کے زمانے میں کیمیا گری یعنی سونا بنانے کی کوشش سے دلچسپی عام تھی، مگر الکندی اسے سعی لا حاصل سمجھتا تھا۔

اس نے علم طب کے سلسلے میں بے شمار کتابیں لکھیں، اس کے شاگرد اس کی کتابوں کے نقل کرنے اور مسودات کے صاف کرنے پر مشغول رہتے تھے، ”کتاب الطب البقر اطمی“، ”کتاب فی الغذاء والدواء“، ”کتاب تدبیر الاصحاء“، ”کتاب فی القربا دین“، ”کتاب الادویہ“، ”فساد الاخلاط“، ”کتاب فی الباہ“ یہ اس کی طب سے متعلق کتابیں ہیں، ان میں بعض کتابوں ”قربا دین“ اور ”کتاب فی الباہ“ کے خطوط آج بھی صوفیا لائبریری میں موجود ہیں۔

(۷) ثابت بن قرہ حُرّانی (۲۷۳ھ/۹۰۱ء)

ثابت حران کا باشندہ تھا، حران شمالی عراق میں ایک مردم خیز علاقہ تھا، ولادت مقام حران میں ۲۱۱ھ میں ہوئی۔

اس کا آبائی پیشہ صرافہ تھا، ثابت نے تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی اور ذہانت سے اپنی قابلیت میں اضافہ کیا، یہ فن طب میں علم تشریح الابدان میں باکمال فلسفی اور طبیب تھا، ساتھ ہی ساتھ علم ہیئت کا ماہر بھی تھا۔

علمی خدمات، مہارت اور کارنامے

بغداد میں ثابت بن قرہ نے محمد بن موسیٰ شاکر کے قائم کردہ علمی ادارے میں کئی بیش قیمت کام کئے، کئی زبانیں جانتا تھا، اعلیٰ درجہ کا مترجم تھا۔

ثابت کے لئے بے شمار طبی علاج سے متعلق واقعات مشہور تھے، ایک واقعہ ہے کہ دربار خلافت جارہا تھا، بازار سے شوراٹھا کہ قصاب اچانک فوت ہو گیا، ثابت بن قرہ نے کہا: مرا نہیں، لوگ حیرت زدہ ہو گئے، ادھر اس کی نعش کو غسل دینے کی تیاری ہو رہی تھی، ثابت نے نبض دیکھی اور ملازم سے قصاب کے پیروں پر ضرب مارنے کو کہا، پانی منگا

کر کوئی دوا ڈالی اور حریرہ تیار کر کے اس کو پلایا، قصاب نے آنکھیں کھول دیں، خلیفہ نے اس واقعہ کا طبی پہلو دریافت کیا تو ثابت نے بتایا کہ روزانہ میں جب راستہ سے گذرتا تھا تو دیکھتا تھا کہ قصاب کلجی کے پارچے پر نمک چھڑک کر کھایا کرتا تھا، اس کی یہ نازیبا حرکت مجھے ناپسند تھی، اور یہ یقین ہو گیا کہ ایک دن سکتہ کا مرض اس کو لاحق ہوگا، چنانچہ خبر پاتے ہی میں نے سمجھ لیا اور قصاب کا علاج سکتے کے مرض کا کیا۔ اب وہ کل سے حسب دستور اپنا کام کرے گا۔

ثابت نے ۷۷ سال کی عمر پا کر ۲۸۸ھ میں وفات پائی۔

ثابت کے حکیمانہ اقوال

ثابت کے درج ذیل حکیمانہ اقوال بھی اس کی فنی مہارت اور دینی مزاج کا پتہ دیتے ہیں۔

بوڑھے آدمی کے پاس اچھا باورچی اور خوبصورت کنیز مت رکھو، کیوں کہ اچھا کھانا زیادہ کھا کر بیمار ہوگا اور کنیز اچھی ہوگی تو کمزوری زیادہ ہوگی۔

بغداد کے مشہور ریاضی دان ثابت ابن قرہ (متوفی ۹۰۱ء) amicable numbers تلاش کرنے کے لئے ایک منفرد فارمولا دریافت کیا تھا، عجیب بات یہ ہے کہ سات سو سال بعد فرانس کے ممتاز ریاضی داں پیر فیرمٹ (۱۶۰۱-۶۵) نے ثابت ابن قرہ کے عین فارمولے سے ملتے جلتے کو استعمال کر کے second pair of amicable number دریافت کئے، مگر آف کورس اس کا کریڈٹ کسی اور کو نہ دیا۔

(۸) ابوبکر محمد زکریا رازی (۳۰۸ھ=۹۳۲ء)

بقراط زماں، جالینوس العرب ابوبکر محمد بن زکریا رازی ایران کے بے حد مردم خیز شہر ”رے“ میں ۱۷ اگست ۸۶۰ء میں پیدا ہوا، یہ شہر ایران کے موجودہ پایہ تخت طہران سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے، اسی نسبت سے اسے عربی میں رازی اور لاطینی زبان میں ریزر rhazar کے نام سے اس کی شہرت ہوتی ہے۔

لڑکپن لا ابالی اور عود کا بچانا وغیرہ جیسے مشاغل میں گذرا، جب شادی ہوئی اور فکر معاش پیدا ہوئی تو کیمیا گری کی طرف متوجہ ہوا، کیمیا گری میں بھٹی کے کاموں سے آشوب چشم کا شکار ہوا پھر اڑتیس سال کی عمر میں وطن سے نکل کر تلاش علم کی جستجو میں بغداد پہنچا، وہاں علی بن سہل وغیرہ کے حلقہ درس میں شامل ہوا، اسپتالوں کا نگراں مقرر ہوا، مریضوں کو بڑی توجہ سے دیکھتا، بڑا سخی اور غریبوں کا ہمدرد واقع ہوا تھا، اکثر دوائیں، پرہیزی کھانے اپنی جانب سے مہیا کرتا، قیام کا نظم کرتا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوبکر محمد بن رازی نے فن طب کو نہایت بام عروج تک پہنچایا، اس نے سرکاری اسپتالوں کے نظام میں اصول اور ضابطے قائم کئے، اور مختلف شعبوں میں باقاعدہ طبی سہولیات کو رائج کیا، دواؤں پر تحقیق مشاہدہ کے لئے باقاعدہ شعبہ جات قائم کیا، شفا خانوں میں ابتدائی طبی امداد (first aid) کا طریقہ پہلی مرتبہ ایجاد کیا۔

حکومت وقت ایک شہر میں نیا اسپتال قائم کرنا چاہتی تھی، چنانچہ رازی نے گوشت کے بڑے بڑے مختلف مقامات پر مناسب جگہوں پر آویزاں کروائے، اطباء کی ایک جماعت نے ان گوشت کے ٹکڑوں کا کئی روز مشاہدہ کر کے ان پر ہونے والے اثرات کی رپورٹ تیار کیا، جس مقام کا گوشت بہتر حالت پر باقی تھا وہیں اسپتال قائم کیا گیا۔

رازی نے دواؤں کے صحیح وزن کے لئے ”میزان طبی“ ایجاد کیا، میزان طبی (hydrostatic -balance) سے چھوٹی چھوٹی شئی کا وزن صحیح معلوم کیا جاتا ہے، یہ ترازو آج کل سائنس روم میں استعمال ہوتا ہے۔

رازی کا سب سے بڑا کارنامہ چیچک پر تحقیق ہے، یہ موذی مرض انتہائی خطرناک اور لاعلاج تھا، چیچک کے اسباب، احتیاط اور علاج دریافت کر کے تفصیل سے اس مرض پر کتاب تصنیف کی جو اس موضوع پر پہلی کتاب تھی، اور یورپ میں صدیوں پڑھائی جاتی رہی۔ اس کتاب کا نام ”کتاب الجدری والحصبۃ“ تھا، یو برگر کے الفاظ میں یہ رسالہ عربوں کے طبی لٹریچر میں ایک زیور کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے

اس کا بہت بڑا درجہ ہے، موصوف کے بقول وبائی امراض کی تاریخ میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے، جو ہمیں بتاتی ہے کہ رازی بڑے روشن ضمیر اور ذی ہوش طبیب تھے، سارٹن نے اس رسالے کو مسلم طب کا شاہکار مانا ہے، ول دوران اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

His treatise on small pox and measles was a master piece of direct observation and clinical analysis it was the first accurate study of infectious disease, the effort to distinguish the two ailments. we may judge its influence and repute by forty English editions between 1498 and 1866 (1)

”چیچک اور خسرے کے موضوع پر ان کا رسالہ براہ راست معائنے اور کلینکل تجزیے کا ایک شاہکار ہے، یہ لگنے والی بیماریوں کا پہلا باقاعدہ مطالعہ اور دو بیماریوں میں فرق کرنے کی پہلی کوشش ہے، ہم اس کے اثرات اور شہرت کا اندازہ ان چالیس انگریزی ایڈیشنوں سے کر سکتے ہیں جو ۱۴۹۸ء اور ۱۸۶۶ء کے درمیان نکلے“

رازی نے عمل جراحی میں ایک کارآمد آلہ بنایا جس کو نشتر setion کہتے ہیں، رازی الکحل کا موجد تھا۔ ایک کتاب اس نے گردے اور مثانے کی پتھری پر تصنیف کی، جو یورپ میں مقبول ہوئی اور عربی متن کے ساتھ فرانسیسی ترجمہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ پیچیدہ امراض کے علاج کا صحیح طریقہ تجویز کرنا اس کے علم کا کمال تھا۔ ایک بار ایک رئیس زادے کو تھوک کے ساتھ خون آنے کا مرض لاحق ہوا، متعدد

اطباء کا علاج کارگر نہ ہوا، تو رازی کو رجوع کیا، نبض وقار و ردیکھ کر حیران ہوا کہ سل دق یا کسی ایسے مرض کی علامت نہیں، رئیس زادے کے حالات سفر اور پانی پینے کے متعلق معلومات سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ پانی کے ساتھ جونک پی لیا تھا، جو آنتوں کو زخمی کر رہی ہے، علاج کیا اور رئیس زادہ شفا یاب ہوا۔

رازی علاج بالغذاء کا حامی تھا، اس کا قول تھا کہ جب تک علاج غذاؤں سے ممکن ہو دو اؤں کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

فن طب پر اس کی کتابیں تقریباً سو ہیں۔

اس عظیم طبیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ”فن طب مردہ ہو گیا تھا جالینوس نے اسے زندہ کیا، وہ منتشر اور پراگندہ تھا رازی نے اس کو مرتب کر کے ایک شیرازے میں منسلک کر دیا، وہ ناقص تھا، اسے کامل کیا۔

رازی کی مشہور ترین کتاب ”الحاوی“ ہے، جو اس کے تجربات، خیالات اور نظریات کا نچوڑ ہے، دوسری کتاب اس کی ”المنصوری“ ہے، بہت سی کتابیں مختلف موضوعات پر ہیں، اکثر کتابوں کا ترجمہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

رازی نے مختلف موضوعات پر تقریباً دو سو پچاس سے زائد کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں آدھی کتابیں طب پر ہیں، طبی تصانیف ”الحاوی“، کتاب الطب المنصوری، کتاب الجدری والحصبۃ بہت مشہور ہیں۔

رازی کی مشہور زمانہ کتاب ”الحاوی“ جو فن طب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، اس کا لاطینی ترجمہ صدیوں تک یورپ میں داخل نصاب رہا، لاطینی ترجمہ چارلس اول انجو کے عہد میں ایک یہودی عالم فرج بن سالم جیسے یورپ میں (Farragut) کہتے ہیں، نے کیا، اس کا ترجمہ ۱۲۷۹ء میں مکمل ہو گیا، لاطینی میں الحاوی کا نام (liber continents)۔

ول دوران لکھتے ہیں:

Translated into latin liber continents, it

was probably most highly respected and frequently used medical textbook in the world for centuries, it was one of the main book that composed the whole library of the medical at the university of paris in 1395) (۱)

”اس کا لاطینی ترجمہ (liber continents) کے عنوان سے شائع ہوا یہ غالباً سفید دنیا میں صدیوں تک سب سے محترم اور سب سے زیادہ مطالعہ کی جانے والی نصابی کتاب بنی رہی، ۱۳۹۵ء میوپیرس کی یونیورسٹی کی میڈیکل فیکلٹی ساری لائبریری میں کل نو کتابیں تھیں، جن میں ایک کتاب یہ تھی“

الحاوی کا لاطینی ترجمہ پچیس جلدوں پر مشتمل ہے، یہ کتاب پہلی بار ۱۴۸۶ء میں شائع ہوئی، کتاب ضخیم اور دام زیادہ تھے، مگر اس کی مقبولیت کا عالم یہ رہا کہ ۱۵۴۲ء میں اس کا پندرھواں ایڈیشن نکلا، کتاب کے مختلف حصوں کے جو ترجمے مختلف وقتوں میں ہوئے وہ ان میں شامل نہیں۔

رازی کی ایک بلند پایہ ضخیم کتاب ”المنصوری“ ہے جو دس جلدوں میں ہے، یہ کتاب انہوں نے امیر خراسان منصور بن اسحاق کے لئے لکھی تھی اور یہی وجہ تسمیہ ہوئی، رازی کی یہ کتاب بھی بہت مشہور ہوئی۔ ول دوران کہتے ہیں کہ:

The most famous of al- razi works was a ten volume survey of medicine, the kitab al - mansuri (book for al- mansoor.) dedicated to the prince of khurasan

Gerar of cremona translated it into latin.

the ninth volume of this translation the almansori was a popular text in Europe till the sixteenth century (۱)

”رازی کی سب سے مشہور تصنیف ”کتاب المنصوری“ دس جلدوں پر مشتمل ہے، جسے انہوں نے امیر خراسان المنصور کے نام کیا تھا، اس کا ترجمہ جرار القرمونی نے لاطینی میں کیا، ترجمے کی نویں جلد جس کا نام ”نور المنصوریس“ تھا، سولہویں صدی تک یورپ کی مقبول نصابی کتاب تھی“

رازی کی بلندی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ: بین الاقوامی طبی کانگریس کا اجلاس ۱۹۳۳ میں لندن میں ہوا تو اس میں رازی اور فن طب پر اس کی تحقیقات، کام اور نظریات پر خاص طور پر مضامین پڑھے گئے اور اسے فن طب کا امام تسلیم کیا گیا۔ دوسری مرتبہ رازی کی ہزار سالہ برسی فرانس کے شہر پیرس میں بڑی شان سے منائی گئی، یہ جشن ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔

زکریا رازی کے فن طب میں مہارت اور حذاقت کے واقعات

بغداد کے ایک رئیس زادے کو دوران سفر خونی قئی (قئ الدم) کا مرض لاحق ہو گیا، جب کسی طبیب کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا تو وہ شہر رے آیا، اور وہاں کے مشہور طبیب محمد بن زکریا رازی کو دکھایا، زکریا رازی نے نبض اور قارورہ دیکھا تو اسے سل دق اور پیٹ کے کسی مرض کی کوئی علامت نظر نہیں آئی، جس سے وہ مایوس ہوا مگر مرض کے بارے میں مسلسل غور کرتا رہا، اس نے مریض سے مسلسل سوالات کئے، اور پوچھا کہ دوران سفر کس قسم کا پانی پیا ہے، رازی فوراً سمجھ گیا کہ ضرور اس نے پانی کے ساتھ کوئی جونک اپنی حلق میں اتار لی ہے، اور یہی جونک معدہ میں پہنچ کر خون چوس رہی ہے اور یہی خون بذریعہ قئ خارج ہو رہا ہے۔

دوسرے دن رازی بغرض علاج کائی سے بھرے ہوئے دو برتن منگائے اور مریض سے کھانے کے لئے کہا: مریض کو پہلے تو کراہیت محسوس ہوئی، لیکن معالج کے حکم سے اس نے تھوڑی سی کائی کھانے شروع کی اور پھر بعد میں انکار کر دیا، مجبوراً رازی نے حکم دیا کہ اس کو لٹا کر اور ہاتھ پیر باندھ کر اس کے منہ میں زبردستی کائی ٹھونسی جائے، اس طرح ایک برتن ختم ہو گیا، اور دوسرے کی باری آئی تو مریض چلایا اور التجا کی کہ اب میں مزید نہیں کھا سکتا، مجھے قئی ہو رہی ہے، یہ سن کر رازی کو اس کی صحت کے کچھ آثار نظر آئے، اس نے مریض کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے تھوڑی سی کائی اور کھلا دی، اچانک مریض کو زور سے قئی ہوئی اور بہت سی کائی خون و بلغم کے ساتھ باہر نکل آئی، رازی کو اس کائی میں ایک جونک نظر آئی اور پھر مریض کو دکھا کر یوں کہا کہ: تیرے مرض کا سبب یہی جونک ہے، اب یہ مرض تجھے کبھی نہ ہوگا۔ (۱)

زکریا رازی کے مطب کا عجیب انداز

زکریا رازی کے مطب کا بھی عجیب انداز تھا، وہ اپنے مطب میں سب سے پیچھے بیٹھتا تھا، اس کے آگے اس کے شاگرد بیٹھتے تھے، اور اس کے بعد اس کے شاگردوں کے شاگرد بیٹھتے تھے، اور پھر ان کے شاگرد بیٹھتے تھے، جب کوئی مریض آتا تو وہ سب سے پہلے آگے بیٹھنے والے لوگوں کے پاس بھیج دیتے تھے، اگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تو وہ اپنے سے پچھلے قابل کے پاس بھیجتے تھے، سب سے آخر میں زکریا رازی کا نمبر آتا تھا، یعنی جس کا کوئی علاج نہیں کر پاتا تو ہو رازی کے زیر علاج ہوتا۔

بلند اخلاقی اور مذہبی رنگ

رازی بہت ہی بلند اخلاق شخصیت کا مالک تھا، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا، فقراء اور بیماروں کا خوب خیال اور اہتمام کرتا۔

(۹) سنان بن ثابت حرانی (۳۲۰ھ = ۹۴۳ء)

سنان بن ثابت حرانی ماہر طبیب، ریاضی داں اور اچھا منتظم تھا، اس نے فن طب میں بہت سی اصلاحات کیں، اور ترقی دی، اس نے تقریباً ایک درجن بادشاہوں کا دور دیکھا اور ہر بادشاہ کے دور میں وزیر رہا

یہ عظیم طبیب حران میں پیدا ہوا، ثابت بن قرہ نے بنو موسیٰ شاکر کے ایماء پر ترک وطن کر کے پورے خاندان کے ساتھ بغداد میں سکونت اختیار کی، پیرانہ سالی میں جب ثابت بن قرہ مسلمان ہوا تو بیٹا سنان بن ثابت بھی بعمر چالیس سال حلقہٴ بگوش اسلام ہوا، اس نے شہر بغداد میں نامور اساتذہ سے اکتساب فیض کیا۔

۸۹۲ء میں خلیفہ معتضد کے دورِ خلافت میں ثابت بن قرہ جو افسر الاطباء کے اعلیٰ افسر منصب پر فائز تھا، اپنی پیرانہ سالی کے باعث اپنی جگہ لائق بیٹے سنان بن ثابت کو مقرر کیا، بعد ازاں اپنی لیاقت اور خوش انتظامی کے باعث آنے والے ایام میں ہر خلیفہ نے اپنے دور میں سنان کو ترقی دی اور وہ اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتا گیا اور بغداد کے جملہ شفا خانوں کا مہتمم رہا۔

طبی خدمات اور کارنامے

ملک میں شفا خانوں کا جال بچھا تھا، اسی دور میں مملکت میں غلط علاج سے ایک حادثہ ہوا، واقعہ ہے کہ ۹۳۱ء میں بغداد کے ایک عطائی طبیب کے غلط علاج سے ایک مریض کی جان چلی گئی۔

اطباء کا امتحان اور رجسٹری

سنان بن ثابت نے غور کے بعد کئی اصلاحات کیں، اس نے حکم دیا کہ جملہ اطباء کو شمار کیا جائے اور ان کا امتحان لیا جائے، چنانچہ جملہ اطباء کو شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اطباء کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے، اب اطباء کا باقاعدہ تحریری اور تقریری امتحان لیا گیا، ایک ہزار سات سو اطباء کامیاب ہوئے اور تین سو نام کامر ہے، جو کامیاب ہوئے تھے ان

کو حکومت نے رجسٹرڈ کر لیا، ان کو سرکاری سند دی گئی، مطب کرنے کا اجازت نامہ دیا اور ان کا کام کو مطب کرنے سے منع کر دیا گیا۔
گشتی شفا خانہ

سنان نے ہر ایک کو فائدہ پہنچانے کے لئے گشتی شفا خانہ کا طریقہ نکالا، اطباء کی ایک تعداد دواؤں اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ محلے محلے گھومتی تھی اور مریضوں کا علاج کرتی تھی، لوگوں کو گھر بیٹھے علاج کی سہولتیں ہو جاتی تھیں۔

قیدیوں کا طبی معائنہ اور علاج

سنان نے علاج کے اس طریقہ کو بھی وسعت دی، اس نے قیدیوں کا جیل خانوں میں جا کر معائنہ کا طریقہ جاری کیا، وہاں ان کا علاج ہوتا تھا۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

ایک بادشاہ کے اس کو نصیحت اور خیر خواہی کے مطالبہ پر اس نے اس کو جو غیظ و غضب کو قابو میں رکھنے کی نصیحت کی ہے اور اس کو قرآنی آیت کے بموجب ”وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ اور ارشاد خداوندی ”وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى“ اس سے اس کے مذہبی اور دینی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ (۱)
اس نے یکم ذی القعدہ ۳۳۱ھ مطابق ۷ جولائی ۹۴۳ء کو وفات پائی۔

(۱۰) ابن الجزّار: ۹۰۵ء تا ۹۸۴ء

دسویں صدی میں دنیائے اسلام میں ایک اور نامور طبیب اور ماہر علم ادویہ پیدا ہوئے، ان کی جائے ولادت تیونس کا نوآباد شہر قیروان تھی، طب و دوا سازی ابن الجزّار کو ورثے میں ملی تھی، ان کے والد ابراہیم اور چچا ابو بکر دونوں طبیب تھے۔

ابن الجزّار کی کتابیں لاطینی، یونانی اور عبرانی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں اور ان کے مرتب کردہ بہت سے نسخے فرانس وغیرہ کے فارکوپیا میں شامل ہوئے اور درجنوں نسخے

آج بھی زیر استعمال ہیں۔

ابن الجزار کے بارے میں سامی ہمارا کا تبصرہ یہ ہے کہ فاطمی میں عہد حکومت میں طب و دوا سازی اپنے نقطہ کمال کو ابن الجزار کے ہاتھوں پہنچی..... طب کی تعلیم اور اس کی ترقی میں اسے پیشوا کی حیثیت حاصل رہی، فاطمی حکمران المعز کے عہد حکومت (۹۵۲ء تا ۹۷۵ء) وہ سب سے ممتاز طبیب تھا۔

مگر ابن الجزار کی عظمت اور امتیاز کا اندازہ بہت تاخیر سے ہوا، اس لئے طب کی کتابوں میں اس کا تذکرہ بہت شاذ ہے، تاہم ابھی حال میں تونس کے ڈاکٹر سلیم عمار نے ابن الجزار پر ایک کتاب بعنوان: (ibn Al jazar and the medical School of Kairouan) لکھی ہے، اس میں ابن الجزار کی طبابت، دوا سازی اور تصانیف کا تذکرہ کافی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

۱۹۸۰ء میں اس کی وفات کا پہلا ہزارہ مکمل ہوا تو تیونس میں اس کی یاد منانے کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں مصر، انگلستان، فرانس، اطالیہ، سوئٹزرلینڈ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، شام اور لبنان سے مندوبین شریک ہوئے، ستمبر ۱۹۹۸ء میں بھی تیونس کے شہر کا تھج میں تاریخ طب کی چھتیسویں بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تو اس میں ابن الجزار کے کام کو خصوصی اہمیت دی گئی۔

ابن الجزار کی تصانیف

ابن الجزار کی باقی رہ جانوالی چیزیں اس کی تصانیف ہیں، اس نے متعدد کتابیں لکھیں، چھوٹی بڑی کتابوں کو ملا کر ان کل تعداد ۴۳ بنتی ہے، ان میں سے ایک کتاب زاد المسافر نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، یہ کتاب مسافروں کے لئے لکھی گئی تھی؛ تاکہ سفر کے دوران جہاں طبیب دستیاب نہیں ہوتے، مسافر مریض اس کتاب کی مدد سے اپنی دوا خود تیار کرے، اس کتاب کے بہت سے نسخے آج بھی رائج ہیں، اس میں بہت سے امراض کے نسخے ہیں۔

زاد المسافر دنیا کے عرب سے باہر بھی بہت مقبول ہوئی، اس کے ترجمے لاطینی، یونانی اور عبرانی زبانوں میں ہوئے، لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ مشہور مترجم constantinus

Africanus (م ۱۰۸۷ء): یا اور اسی نے اس کا لاطینی نام Viaticum رکھا؛ مگر اس نے اس کتاب کی تصنیف سرقہ کرنے کی کوشش کی، اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے خود کو اس کا مترجم نہیں؛ بلکہ مصنف ظاہر کیا، یونانی زبان میں اس کے ترجمے کا نام Ephode رکھا گیا، زاد المسافر کے تراجم کے نسخے آکسفورڈ کی Bodleian Library، برٹش میوزیم، وائنا (vienna) فلورنس، پیرس، تولوس Toulouse اور لایون (lyon) کے کتب خانوں میں موجود ہیں، اس کا ایک نسخہ نیولین بھی اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔

اس کی اور ایک کتاب ”کتاب الاعتماد فی الادویۃ المفردۃ“ ہے، جس کو اس نے فاطمی خلیفہ قائم بامر اللہ کے لئے لکھی تھی، واضح رہے کہ ابن الجزار کے زمانے میں فاطمیوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی، اس کی داغ بیل تیونس میں پڑی تھی، مگر بعد میں مصر میں یہ منتقل ہو گئی تھی، فاطمی حکمرانوں نے طب اور اطباء کی سرپرستی جاری رکھی، علم الادویہ میں اس کتاب کا مرتبہ ایک تیونی طبیب ڈاکٹر رازی جازی کے بقول (Dicorides) کی قرا بادین کے قریب قریب ہے، اس میں ۲۸۰ مفرد ادویہ کو بیان کیا گیا ہے، اور ان ادویات کی خصوصیات کو بتایا گیا ہے، اس کے علاوہ تیس مرکب ادویات بھی بیان کی ہیں۔ یہ کتاب بھی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔

ابن الجزار کی ایک اور تصنیف امراض اطفال پر ہے جس کا نام ”سیاسة الأطفال و تدبیرہم“ ہے، اس کا دعوی تھا کہ امراض اطفال پر یہ پہلی کتاب ہے۔ تصنیفات تو ابن الجزار کے اور بھی ہیں، مگر ان کے تذکرے کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ علاج و معالجہ میں اس نے ادویات استعمال کرنے کے علاوہ فصد کھلوانے، داغنے اور خوشبوئیات استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے، اس نے ۲۵ خوشبودار پودوں کے نام تجویز کئے ہیں، ان میں دارچینی، لوگ، جائفل، الاچھی، بالچھر، کباب چینی وغیرہ شامل ہیں۔

ابن الجزار کی غرباء پروری

ابن الجزار نہایت غریب پرور طبیب تھا، وہ امیر و غریب مریضوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں برتتا تھا، سلیم عمار نے ابن الجبل کے حوالے سے مریضوں کے ساتھ ابن الجزار

کے مساویہ سلوک کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار قیروان کے قاضی کا بھتیجا تھا، جس کا نام نعمان تھا، قاضی کے بیٹے کا علاج کرانے ابن الجزار کے مطب میں پہنچا، مطب مریضوں سے بھرا ہوا تھا، قاضی کے بھتیجے کو وہاں بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی، اس لئے وہ کھڑا رہا، ابن الجزار نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پہچان لیا، پھر بھی اسے جگہ دینے لئے کسی مریض کو اٹھانا مناسب نہیں سمجھا، باری آنے پر ابن الجزار نے قاضی کے بیٹے کے قارورہ کا معائنہ کیا اور نسخہ تجویز کیا، اس کے علاج سے قاضی کا بیٹا شفا یاب ہو گیا، مریضوں کے ساتھ ابن الجزار کے مساویہ سلوک کا سن کے اور اپنے بیٹے کو شفا یاب دیکھ کر قاضی بہت خوش ہوا اور اس نے ایک بیش قیمت قبا اور تین سو مثقال (تقریباً سو اکلو گرام) سونا تحفے میں بھیجا، مگر ابن الجزار نے یہ دونوں چیزیں لینے سے شائستگی کے ساتھ معذرت کر دی۔

ابن الجزار کی ایک کتاب ایسے غریب لوگوں کے لئے جو زاد المسافر میں تجویز کردہ دوائیں مہنگی ہونے کی وجہ سے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے، لہذا اس میں سستی دواؤں کے نسخے ہیں اس وجہ سے ابن الجزار نے اس کا نام ”کتاب الفقراء والمساکین“ رکھا ہے، اس کتاب کے دو نسخے پیرس اور اسکوریل (اسپین) میں موجود ہیں۔

(۱۱) ابو منصور موفق بن علی ہروی (۳۴۰ھ = ۹۶۱ء)

موفق بن علی ہروی اپنے دور کا عظیم طبیب، علم الادویہ کا زبردست ماہر اور اچھا سائنس داں تھا، ہرات (ایران) کا باشندہ تھا، اس شہر میں تعلیم حاصل کی اور پھر مطالعہ اور تجربہ میں مصروف ہو گیا، اس نے دواؤں کی طرف توجہ کی اور جڑی بوٹیوں پر تجربہ کئے، اس فن میں کمال پیدا کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

موفق بن علی کو طبی سائنس سے گہرا لگاؤ تھا، وہ علم نباتات (botany) کا محقق، علم الادویہ پر نئے نئے تجربہ کرنے والا، اپنے فن کا ماہر اور باکمال طبیب تھا، اس نے ہر جڑی بوٹی پر خود تجربہ کئے، ان کے خواص اور اثرات معلوم کئے، نیز نئے پودوں کی تلاش

میں دور دور کا سفر کیا، ناموں کی تحقیق کی، خواص اور اثرات کی بناء پر دواؤں کی درجہ بندی کی، اس نے معدنی ادویہ کی بھی تحقیق کی۔

موفق کی مشہور کتاب ”حقائق الادویہ“ ہے، دور اول کی یہ پہلی اور مستند جامع کتاب ہے، کتاب بڑے سلیقے سے مرتب کی گئی ہے، اس میں آیور ویدک دواؤں کے نام اور خواص بھی درج ہیں۔

حقائق الادویہ: یہ کتاب ”حقائق الادویہ“ یہ جامع کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ جملہ ادویہ کو پہلے دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: ۱۔ معدنی دوائیں ۲۔ نباتاتی اور حیوانی دوائیں

آج کل کی اصطلاح میں جن کو نامیاتی اور غیر نامیاتی (Organic inorganic) کہتے ہیں، نامیاتی ادویہ کی مزید قسمیں کی گئی ہیں۔

اس ضخیم اور مستند کتاب میں پہلے کل پانچ سو پچاسی دواؤں کے نام اور ان کی صحیح پہچان بتائی گئی ہے، پھر ان سب کی خاصیت اور اثرات کے لحاظ سے ان کے چار درجے قائم کئے گئے ہیں: (۱) گرم وتر دوائیں (۲) گرم اور خشک دوائیں (۳) سرد اور تر دوائیں (۴) سرد اور خشک دوائیں، اس درجہ بندی کے بعد ان کے فائدے اور نقصانات بتائے گئے ہیں۔

معدنی ادویہ

معدنی ادویہ میں موفق نے کئی نئی دوائیں دریافت کیں، مثلاً سوڈیم کاربونیٹ (sodium carbonate) اور پوٹاشیم کاربونیٹ (potassium carbonate) مشہور دوائیں ہیں، وہ ان کے فرق کو بتاتا ہے اور اثرات بیان کرتا ہے۔

موفق معدنی مرکبات بھی بتاتا ہے، ان میں ارسینک آکسائیڈ اور اینٹی مونی آکسائیڈ (antimony oxide) نیز سلیسیک آکسائیڈ (silicil oxid) ان سب معدنی مرکبات کی اصلیت، خواص، اثرات اور فائدے اور نقصانات ہروی نے یہ سب باتیں بیان کی ہیں۔

(۱۲) عریب بن سعید الکاتب قرطبی (۳۵۶ء = ۹۷۶ء)

اندلس کے دانشوروں میں عریب بن کاتب قرطبی ایک خاص اہمیت کا مالک تھا، یہ الحکم ثانی ۹۷۶ء کے عہد میں گذرا ہے، عریب قرطبیہ میں پیدا ہوا، یہیں پرورش پائی، تعلیم کی تکمیل کے بعد مطالعہ کتب میں مصروف ہو گیا اور علم طب کو خدمتِ خلق کے لئے اپنا پیشہ بنایا، اس نے طبی تحقیقات کا ایک خاص میدان اپنے لئے منتخب کیا، خلق اللہ کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، عبدالرحمن جس کا زمانہ حکومت طویل ترین ۹۱۲ء تا ۹۴۱ء تقریباً پچاس سال رہا ہے، اس نے عریب کی فنی قابلیت دیکھ کر اسے اپنا طبیب خاص مقرر کیا، اس وقت سے عریب زندگی بھر دربار سے منسلک رہا۔

علمی خدمات اور کارنامے

عریب ایک عالی دماغ طبیب اور مستقل مزاج مفکر تھا، اس نے عورتوں کے امراض پر ریسرچ کیا، چنانچہ حمل سے متعلق تمام کیفیتوں کے سلسلے میں بڑی تحقیق و جستجو سے کام لیا، مشاہدے اور تجربے کئے، اور نتائج کو ڈائری میں قلم بند کرتا رہا، اس کے خاص مضامین تھے:

(۱) حمل کا قیام جنین اور اس کی ساخت (۲) زچہ اور بچہ (۳) دایہ گری۔ اس سے پہلے اس موضوع پر کبھی توجہ نہیں دی گئی تھی، اس نے تربیت یافتہ دایہ کا نصاب مرتب کر کے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔

عریب نے اپنے جملہ تجربات اور نظریات تفصیل سے قلم بند کئے، ان کو کتابی صورت میں الگ الگ مرتب کیا، علم طب کے اس خاص موضوع پر اس طبیب کی یہ تینوں کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور اس علم سے متعلق یہ تینوں کتابیں سب سے پہلی تصنیف کہی جاتی ہیں۔

عریب علم نباتات (botany) کا بھی ماہر تھا، اس نے اس اہم موضوع پر بھی ایک کتاب مرتب کی جس میں پودوں اور جڑی بوٹیوں سے متعلق اپنے تجربات بیان کئے ہیں۔

(۱۳) ابوالقاسم عمار موصلی (۸۸۳ھ = ۱۰۵۵ء)

عمار موصلی امراض چشم، موتیا بند کا ماہر تھا (eye surgeon) اس نے موتیا بند کے سلسلے میں تحقیق کی اور اس کا علاج آپریشن کے ذریعہ ثابت کیا، مرض موتیا بند (cataract) تکلیف دہ مرض ہے، اور انسان آنکھیں رکھتے ہوئے مجبور ہو جاتا ہے، یہ مشہور طبیب الحکم ۹۹۶ء کی عہد میں پیدا ہوا اور اس کے بیٹے کے عہد میں کام کیا۔ انہیں یورپ میں (canamusali) کہا جاتا ہے۔ جارج سارٹن نے انہیں امراض چشم کے مسلم ماہرین میں سب سے خلاق سائنسداں کہا ہے، انہوں نے ”کتاب المندخب فی علاج العین“ تصنیف کی، جس میں آنکھ کی بیماریوں اور ان کے علاج کے علاوہ موتیا بند کے لئے چھ آپریشنوں کا بیان ہے، ان میں خاص طور پر وہ آپریشن قابل ذکر ہے جس میں مصنف نے غیر متحر موتیا بند کا پانی دھات کی ایک نلکی سے جو خود ان کی اپنی ایجاد تھی کھینچ لینے کی وضاحت کی ہے۔

علمی اور طبی خدمات اور کارنامے

موصلی نے امراض چشم کے علاج سے متعلق ایک نیا طریقہ اختیار کیا اور بہت کامیاب رہا، اور یہ طریقہ آپریشن کا تھا، آنکھوں کے بعض امراض میں آپریشن کے ذریعہ علاج بہت کامیاب اور اطمینان بخش ثابت ہوا، موصلی آنکھوں کا پہلا سرجن تھا (eye surgen)۔

امراض چشم میں موتیا بند (cataract) ایک عام مرض ہے جس میں آنکھوں کی پتلی پر ایک باریک پردہ آ جاتا ہے، موتیا بند کے لئے آپریشن کا طریقہ اسی مشہور ماہر امراض چشم کا ایجاد کردہ ہے، موصلی نے سرکاری اسپتال میں بے شمار مریضوں کی آنکھوں کا آپریشن کیا۔

عمار موصلی نے آپریشن کے لئے ایک خاص قسم کا نازک آلہ ایجاد کیا، اس نے آپریشن کے اصول و قواعد مقرر کئے، احتیاط اور علاج کا طریقہ بتایا، حفظِ ماتقدم کے

اصول بیان کئے، اور اپنی یہ تمام باتیں اور تجربے قلم بند کئے، موصلی نے اپنی اس ڈائری کو کتاب کی صورت مرتب کر کے اس کا نام ”علاج العین“ رکھا، ”علاج العین“ امراض چشم اور علاج واحتیاط کے بارے میں مکمل اور جامع کتاب ہے، یہ کتاب یورپ میں بہت مقبول ہوئی، اور اس کا ترجمہ یورپین زبان میں کیا گیا۔

(۱۴) ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی (۳۹۵ھ = ۱۰۰۹ء)

ابوالقاسم الزہراوی یورپین اسے ابوالکیس اور البوکیس کہتے ہیں، قرطبہ کے قریب زہرنامی شہر جسے اندلس کا مشہور حکمران عبدالرحمن الناصر نے قرطبہ سے چار میل دور آباد کیا تھا، وہاں پیدا ہوا، اس کی پیدائش ۹۳۶ھ کو ہوئی، ابوالقاسم نے ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد قرطبہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علم طب کے شعبہ جراحات (surgen) کی طرف خصوصی توجہ اور اس فن میں کمال پیدا کیا، زہراوی دنیا کا پہلا سرجن (surgen) تھا، تعلیم ختم کرنے کے بعد مطالعہ سے قابلیت بڑھائی، فن طب میں تجربہ حاصل کئے، اور شہرت کے بعد شاہی اسپتال میں اسے شعبہ جراحات کا ذمہ دار بنایا گیا۔ وہ خلیفہ کے شاہی معالج بھی تھے، ان کا انتقال قرطبہ میں ہوا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوالقاسم الزہراوی نے غور و فکر اور تجربہ کے بعد علاج کے دو طریقے مستقل ایجاد کئے: (۱) علاج دوا کے ذریعہ (۲) علاج آپریشن کے ذریعہ۔

ابوالقاسم نے سرجری (آپریشن) کے ذریعہ علاج کے طریقے کو مرتب کیا اور اسے ایک مستقل فن بنادیا، اس نے بتایا کہ کون کون سے امراض میں آپریشن ضروری ہے، سر سے پاؤں تک کے امراض کو اس نے بتایا، مثلاً حلق میں غدود کا بڑھ جانا (ٹونسل) بدگوشت، آنکھ میں موتیا بند کا مرض، پھوڑے، پھنسیاں وغیرہ۔

زہراوی نے آپریشن کے ذریعہ علاج کے طریقہ کو بہت ترقی دی، اس نے آپریشن کرنے کے لئے بہت سے آلات ایجاد کئے، یہ آلات مختلف مواقع پر استعمال

کئے جاتے ہیں، اس طبیب نے سر سے پاؤں تک ایسے امراض جن میں آپریشن کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے مطابق آلات بنائے، اس طرح اس عظیم طبیب نے جو آلات ایجاد کئے ان کی تعداد ۱۰۰ سے اوپر ہے، زہراوی نے آپریشن کے آلات میں صفائی پیدا کی اور ان کو سبک بنانے کی کوشش کی، تاکہ وہ اور زیادہ کارآمد ہوں، اس کے لئے اعلیٰ قسم کا فولاد استعمال کیا، زہراوی کے ایجاد کردہ آلات آج بھی مستعمل ہیں۔

زہراوی نے اندرون جسم آپریشن کرنے کے نہایت نازک طریقے دریافت کئے، حلق، دماغ، سر، گردے کا آپریشن، پیٹ کا آپریشن، آنتوں کا آپریشن، ان سب کے طریقے اور اصول اس نے بتائے، زہراوی کی جراحیات کی وجہ سے ایسے بہت سے امراض جن کا علاج صرف آپریشن کے ذریعہ ہی ممکن تھا قابل علاج مرض بن گئے اور اس قسم کے بیمار انسان موت کا لقمہ بن جانے کے بجائے شفا یابی حاصل کرنے لگے۔

مرض کینسر (سرطان) پر بھی اس نے تحقیق کی، اس نے آگاہ کیا کہ مرض کینسر کے پھوڑے یا زخم کو ہرگز چھیڑنا نہیں چاہیے، وہ خطرناک بن جاتا ہے۔

اس نے ہڈیوں کے کاٹنے کا طریقہ، آلات اور احتیاط کو بتلایا، اس نے یہ بھی بتایا کہ مریض کو بے ہوش کس طرح کرنا چاہیے، کیا دوائیں اس کے لئے مناسب ہیں، اس نے اپنے تمام تجربات اور نظریات اپنی مشہور کتاب ”التصریف لمن عجز عن التالیف“ میں بیان کر دیئے ہیں۔ اس کا وہ حصہ خاص طور پر قابل توجہ ہے جو آپریشن سے متعلق ہے، ایک دفعہ انہوں نے ایک آنکھ والے آدمی کے موتیا بند کا آپریشن کیا۔

زہراوی نے آلات جراحی کی ساخت پر بھی توجہ دی اور وہ جراحی میں درکار آلات قرطبہ کے کاری گروں سے اپنی نگرانی میں تیار کروائے، یہ آلات اعلیٰ قسم کے فولاد سے بنائے جاتے تھے، انہوں نے اپنی کتاب میں تقریباً دو سو ایسے آلات کی تصاویر دی ہیں جو عمل جراحی میں درکار ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر آلات انہوں نے خود ایجاد کئے ہیں، سرجری میں آج بھی انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔

ابوالقاسم الزہراوی نے جراحی کے اصول و قواعد وضع کر کے اسے فن کی شکل دی،

یہی وجہ ہے کہ انہیں سرجری کا موجد مانا جاتا ہے، مغرب کے اہل قلم اکثر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرون وسطی کے اس مسلم سائنس دان نے سرجری کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔

زہراوی کی خدمات کی اہل یورپ نے بھی کھلے دل سے قدر کی اور اپنی کتابوں میں اچھے سے اچھے الفاظ میں ستائش کی، چودھویں صدی عیسوی کا ایک مشہور یورپی سرجن Guy De The Restorer of Surgery جو Chauliac کے لقب سے مشہور ہوا، زہراوی کو بقراط اور جالینوس کے پائے طبیب قرار دیتا ہے، اس نے اپنی کتاب میں زہراوی کا حوالہ دو سو مرتبہ دیا ہے، دیگر یورپی اطباء راجر آف پارما Roger of parma لائن فرانک Lan Franc اور سیلی سیٹ Salicet نے بھی انصاف کی پرزور تعریف کی ہے اور اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے، رالف ایم میجر Ralph M. Major اپنی تصنیف A History of Medicine Vol.1 میں لکھتا ہے کہ قرون وسطی میں یورپی اطباء جالینوس سے زیادہ حوالے زہراوی کے دیا کرتے تھے، جارج سارٹن لکھتا ہے کہ تیرہویں صدی میں پیڈواؤ نیورٹی کے ماہر طب برونوڈ لونگو برگو Bruno Da Longo Burgo کی تصنیف Magna Chirugia مغرب میں عربی طب کی ترسیل کے لئے ایک نئی منزل کا نشان راہ بنی، اس تصنیف میں ابوالقاسم زہراوی برونوڈ لونگو کا ذریعہ استناد تھا۔ یہ کتاب اسی صدی کے اندر عبرانی میں ترجمہ ہوئی، اس طرح سے عربی طب عیسائی طب اور یہودی دونوں پر اثر انداز ہوئی۔

زہراوی سرجن ہونے کے علاوہ طبیب اور ماہر دوا ساز بھی تھا، انصاف میں صرف جراحی نہیں؛ بلکہ دایہ گری Mid Wifery، ادویہ سازی، قراہ دین، طبانی، علم تغذیہ (Dietetics) علاجیات (Therapeutics) اور نفسیاتی علاج بھی موجود ہے، ان مصنفین کے مطابق زہراوی کو طب و جراحہ کی بہت سی باتوں میں اولیت بھی حاصل تھی، وہ پہلا سرجن تھا جس نے گھٹنے کی ہڈی (Patella) کی شکستگی پر اسے آپریشن

کر کے نکال باہر کرنے کا طریقہ تجویز کیا، اس نے خواتین کے گردوں کی پتھری نکالنے کا طریقہ بھی تجویز کیا، اس نے زچگی کرانے کے لئے خاص قسم کے چپے (Forceps) متعارف کرائے جراحی کے لئے نئے قسم کے چاقو، نشتر (Scalpels) اور جدا جدا جسامتوں کے آنکڑے (Hooks) ڈیزائن کئے، اس نے کئی قسم کی قینچیاں ایجاد کیں، جن کے پھل نمیدہ یا مدور تھے، اس نے آنکھ کے ناسور (lacrymal Fistula) کو بیان اور اس کے آپریشن کا طریقہ بتایا اور یہ بھی تجویز کیا کہ اس آپریشن کے لئے نوکدار پتیاں (pointed Biades)، پرتوافکن (Speculums) اور آنکڑے استعمال کئے جائیں، دانت کی میل رہائی (scaling) کا طریقہ بھی تجویز کیا، کان کے ناسور (Aural poly) کو پہلی بار بیان کیا۔

پیٹ میں ہڈیاں

ابوالقاسم خلف بن عباس الزہراوی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب میں واقعہ درج کیا ہے کہ اس نے ایک حاملہ عورت کو دیکھا جس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا، اس کے بعد وہ دوسری مرتبہ حاملہ ہوئی، وہ بچہ بھی مر گیا جس کی وجہ سے کچھ زمانے کے بعد پیٹ میں ورم ہو گیا اور پھول گیا پھر اس میں مواد بھی آ گیا، ابوالقاسم زہراوی کو علاج کے لئے بلایا گیا، اس نے کافی روز علاج کیا، جب کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اس نے طاقتور مراہم استعمال کروائے، کچھ عرصہ کے بعد عورت کی شرمگاہ سے ایک ہڈی خارج ہوئی، کافی دن گزرنے کے بعد پھر دوسری ہڈی نکلی، اسے بہت تعجب ہوا کہ پیٹ ایسی جگہ ہے جہاں ہڈی نہیں ہوسکتی، اس نے اسی سے اندازہ لگایا کہ پیٹ میں مردہ بچہ کی ہڈیاں موجود ہیں، پھر زہراوی نے آپریشن کیا اور بقیہ ہڈیاں عورت کے پیٹ سے نکال لیں، اس کے بعد وہ عورت صحت مند ہو گئی اور کافی لمبے عرصہ تک زندہ رہی۔

(۱۵) علی بن عیسیٰ (۴۴۱ھ = ۱۰۳۱ء)

امراض چشم کا ماہر خصوصی (EYE SPECIALIST) تجربہ اور تحقیق کے

بعد قوت بصارت کو قائم رکھنے، نیز آنکھوں کے مفید ترین دوائیں، مناسب غذائیں و پرہیز تجویز کر کے ان کی مکمل فہرست پیش کرنے والا، آنکھوں کے امراض، اسباب و علامات پر بحث کرنے والا۔

وطن غالباً بغداد، یہ شخص خلیفہ عیسیٰ عباسی کے عہد حکومت میں گزرا ہے۔ اسے مغرب والے (jesu Haly) کہتے ہیں،

علمی خدمات اور کارنامے

یہ ان قابل ترین و باصلاحیت اطباء میں سے ہے جنہوں نے خاموشی کے ساتھ علمی و فنی کام کئے، اس نے شہر بغداد میں گوشہ گمنامی میں زندگی گزاری۔

اس نے اجزائے جسم میں سے صرف آنکھ کا انتخاب کیا اور جسم کے اس اہم ترین اور نازک ترین حصہ پر تحقیقی کام کیا، اس نے آنکھ کے امراض پر زبردست تحقیقات اور پھر اپنے جملہ ذاتی تجربات، مشاہدات اور نظریات کو اپنی صحیح اور میعاری کتاب تذکرۃ الکحلین میں جمع کر دیں۔

تذکرۃ الکحلین

یہ کتاب نہایت مفصل اور ضخیم ہے، گویا یہ انسانی آنکھ کی انسائیکلو پیڈیا ہے، کتاب کا بڑا حصہ امراض چشم کے اس ماہر ڈاکٹر (EYE SURGEON) کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے، کتاب کی پہلی جلد میں اس نے آنکھ کے مفصل حصوں کی تشریح اور منافع اعضاء یعنی ہر ہر جزء اور حصہ کو بیان کیا ہے اور اس کے فوائد بتائے ہیں جس کو انگریزی میں ”ٹائومی اور فریالوجی“ (ANATOMY PHYIOLOGY) کہتے ہیں۔

دوسری جلد میں آنکھ کی ان بیماریوں کا علاج ہے جو ظاہری طور پر نظر آتی ہیں، علی بن عیسیٰ نے آنکھ کے جملہ ظاہری بیماریوں کو بتایا اور اس کے اسباب و علامات تفصیل سے لکھے اور مکمل بحث کی۔

تیسری جلد نہایت اہم ہے، اس میں آنکھ کے ان بیماریوں کا علاج تفصیل سے

بیان کیا گیا ہے جو آنکھ کے اندرونی حصوں میں کہیں پیدا ہوتے ہیں جو آنکھوں کے لئے مفید ہیں، اور ان کو آنکھ کے امراض اور شکایتوں کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کتاب میں ایک سو تینتالیس / ۱۳۳ ایسی مفرد دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے نام، ان کی پہچان ان کے خواص و اثرات اور فوائد بیان کئے ہیں، جو آنکھوں کے لئے مفید ہیں اور ان کو آنکھ کے امراض اور شکایتوں کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کتاب کے ایک حصہ میں احتیاط اور پرہیزی غذاؤں کا بھی مفصل بیان ہے، آنکھ کے مریضوں کے لئے جو غذائیں مفید اور اچھی ہیں ان کو بتایا گیا ہے اور جن غذاؤں سے نقصان ہوتا ہے یا نقصان اور تکلیف کا اندیشہ ہے ان کو لکھ دیا گیا ہے۔

آنکھ کے سلسلے میں یہ کتاب مفصل، معیاری اور مستند تسلیم کی گئی ہے، اس فن میں یہ دوسری قابل ذکر کتاب ہے، ازمنہ وسطیٰ میں اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ۱۴۹۹ء میں شائع ہوا اور یورپ کے ڈاکٹروں نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور دور جدید کے دانشوروں نے اسے جب غور سے پڑھا تو اس کی افادیت کا احساس ہوا اور اس کا ترجمہ ۱۹۰۳ء میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوا، پھر اس مفید کتاب کو ۱۹۰۴ء میں جرمن زبان کے قالب میں ڈھالا گیا۔

(۱۶) شیخ حسین عبداللہ بن علی سینا

دنیا کی باکمال اور جامع شخصیت، علم طبعیات (PHYSICS) اور حیاتیات کا ماہر خصوصی، علم تشریح الأعضاء (BIOLOGY) منافع الأعضاء (PGYSIOLOGY) نیز علم الاصلاح اور علم الامراض پر گہری نظر رکھنے والا ماہر، نئے نئے نکتے بیان کرنے والا عظیم محقق، علم الادویہ کا ماہر، دواؤں اور جڑی بوٹیوں پر نئے نئے تجربہ کرنے والا، مشاہدے اور تحقیق سے کام لینے والا طبیب حاذق۔

بخارا کے ایک شہر خرمین کے قریب واقع مقام افشنہ میں ۳ صفر ۵۷۳ھ مطابق ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اور وفات ہمدان میں ۴۲۸ھ / ۱۰۳۸ء میں ہوئی۔

والد کا نام اسماعیل تھا، پانچ سال کی عمر میں شہر بخارا میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا، وقت کے مشہور فقیہ اسماعیل زاہد سے علم فقہ اور ایک نامور ہندسہ داں، سبزی فروش محمود مساح سے علم ہندسہ، اور مساحت و ریاضت کا درس لیا، کمال ذہانت کی وجہ سے قلیل مدت میں ان پر مہارت حاصل کر لی، اسی طرح ایک نامور عالم اور فلسفی عبداللہ ناکلی وارد بخارا ہوا، چنانچہ شیخ کے والد نے فرزند کی تعلیم کے لئے ان کو مہمان کیا، چنانچہ جوہر قابل کی ذہانت دیکھ کر ایک عظیم عالم ہونے کی پیشن گوئی کی اور علم منطق پڑھائی۔

شیخ کو علم نحو کا شوق ہوا تو امیر نوح بن منصور سلمان بخارا کے درباری طبیب حسن نوح القمری کے حلقہ درس میں شریک ہو کر اس فن میں کمال حاصل کیا، سولہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم سے فراغت حاصل کر لی، پھر مجلس درس کو رونق بخشی، ان کے اطراف شاگردوں کا ہجوم ہوتا تھا۔

علمی خدمات اور کارنامے

انہیں دنوں حاکم وقت نوح بن منصور سخت بیمار ہوا، درباری اطباء کا علاج کارگر نہ ہوا تو شیخ کو طلب کیا گیا، جن کے علاج سے صحت یاب ہو گیا، اس طرح شیخ کی دربار میں رسائی ہوئی، شوق مطالعہ، ذوق علم کو دیکھتے ہوئے شیخ کے لئے شاہی کتب خانے کے دروازے کھول دیئے گئے۔

بوعلی سینا وہ پہلا طبیب ہے جس نے فن طب میں علم النفس (psychology) کو داخل کیا، اس نے بتایا کہ تمام نفسیاتی کیفیات، یعنی خوشی، غم، غصہ، فکر و تردد وغیرہ کا تعلق قلب سے ہوتا ہے۔

اس نے کم عمری ہی سے تصنیف و تالیف کو شغل بنایا، بے شمار تصانیف مختلف موضوعات پر یادگار چھوڑیں، شیخ کی یوں تو بے شمار تصنیفات ہیں، لیکن دو کتابیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جنہوں نے اسے سائنسدانوں کی صفِ اول میں لاکھڑا کیا، ”القانون“ اور ”کتاب الشفاء“۔

”کتاب الشفاء“ میں اس نے فلسفہ اور حکمت پر سیر حاصل بحث کی۔
شیخ فن طب اور علم تشریح الاعضاء اور منافع الاعضاء (PGYSIOLOGY) نیز علم العلاج (METRAMEDICA) میں اس کے انکشافات اور نظریات آج بھی مستند سمجھے جاتے ہیں۔

”شفاء“ کے بعد ”القانون“ شیخ کی یہ مشہور زمانہ تصنیف ہے، اس میں دس لاکھ الفاظ ہیں، اور پانچ جلدوں میں ہے، یہ عظیم ترین اور قابل فخر تصنیف صحیح معنوں میں علم تشریح الاعضاء، منافع الاعضاء اور علم العلاج کا ایک مکمل ترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔

”القانون“ کی پہلی جلد میں شیخ نے انسانی جسم کے جملہ اعضا اور نازک سے نازک حصوں کی مکمل تفصیل و تشریح بیان کی ہے، ان کے کام اور فوائد بیان کئے ہیں، اس لحاظ سے یہ جلد تشریح الاعضاء اور منافع الاعضاء پر مشتمل ہے۔

”القانون“ کی دوسری جلد میں تمام مفرد ادویہ اور جڑی بوٹیوں کو ترتیب سے لکھا ہے، ان کے خواص و اثرات بیان کئے ہیں، شیخ نے اپنے مشاہدات اور تجربات بتائے ہیں، گویا یہ جلد کتاب المفردات ہے۔

تیسری اور چوتھی جلدوں میں انسانی امراض پر بحث ہے، مختلف بیماریوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اسباب و علامات بتائے گئے ہیں، نظری اور عملی علم العلاج (theory and practice of medicine) کے سلسلے میں یہ جلد نہایت وسیع اور مستند معلومات پر مکمل حاوی ہے۔

القانون کی پانچویں جلد القربادین ہے جو مختلف بیماریوں کے لئے مجرب دواؤں اور نسخوں کا مستند مجموعہ (prescription book) ہے
شیخ سینا کی مشہور کتاب ”القانون“ یورپ کے میڈیکل کالجوں میں داخلِ نصاب رہی ہے۔

اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پندرھویں صدی میں کتاب سولہ مرتبہ اور سولہویں صدی میں بیس مرتبہ چھپی، اور لاطینی زبان میں اس

کتاب کے کئی ترجمے شائع ہوئے۔

القانون کا وہ حصہ جو آنکھ کے امراض اور علاج میں ہے، اس کا ترجمہ ڈاکٹر نپھرے نے جرمن زبان میں کر کے شائع کیا ہے۔

فرنجی زبان میں بھی اس کتاب کے ترجمے شائع ہوئے۔

مشہور فرانسیسی فاضل گستاوی بان کا بیان ہے کہ فرانس اور اطالیہ کے دارالعلوموں میں طبی تعلیم بنیادان ہی (یعنی ابن سینا کی کتابوں) پر رہی، اٹھارہویں صدی تک یہ تصنیفات دوبارہ طبع ہوتی رہیں اور ان کو فرانس میں متروک ہوئے پچاس سال سے زیادہ کا زمانہ نہیں گذرا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں مذکور ہے:

The canon of medicine (al-anun fi-at- tibb) is the most bible for a longer period than any other work).

”القانون فی الطب مشرق و مغرب کی تاریخ طب میں واحد مشہور ترین کتاب ہے“

القانون کا ترجمہ ۱۳۷۳ء میں شائع ہوا، صرف ستائیس برسوں کے اندر ۱۵۰۰ء تک اس کتاب کے سولہ ایڈیشن نکلے، جن میں ۱۵ لاطینی اور ایک عبرانی تھا، سولہویں صدی میں اس کے بیس ایڈیشن شائع ہوئے اور سترہویں صدی میں بھی اس کے بہت سے ایڈیشن نکلے۔

بہر حال شیخ بوعلی سینا اپنے زمانے کا بہت بڑا محقق، مفکر اور مصنف گذرا ہے، اسکی زندگی ابتلاء و آزمائش کی زندگی تھی، کبھی تو وہ وزارتِ عظمیٰ کے بلند ترین عہدے پر متمکن نظر آتا ہے، اور کبھی غربت میں جان کے خوف سے بلاد و امصار اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

بوعلی سینا نہایت بلند اخلاق و عادات کے مالک تھے، طبیعت میں بے نفسی

اور فقیری غالب تھی، حرص و ہوس اور عیش و عشرت کے عادی نہ تھے۔

یہ ابتداء ہی سے راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کے باپ اور بھائی دونوں اسماعیلی تھے اور شیخ کو بھی اس کی دعوت دیتے تھے، انہوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی، تعلیم کے ابتدائی زمانہ میں جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو شیخ سیدھا جامع مسجد جاتے، نماز پڑھتے جس کے نتیجے میں وہ پیچیدہ مسئلہ حل ہو جاتا۔

ان کے یہ اقوال بھی ان کے دینی مزاج کے غماز ہیں۔

”اے میرے عزیز دوست! یہ میری وصیت ہے اسے یاد رکھو، تم کو اول و آخر اپنے ذہن و خیال میں اللہ جل شانہ کو رکھنا چاہیے، اور اسکے دیدار کا سرمہ اپنی آنکھوں میں لگانا چاہیے، نماز میں اللہ تعالیٰ کے سامنے نہایت ادب سے کھڑا رہنا چاہیے۔

تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے بہتر کرامت ”نماز“ ہے اور سب سے زیادہ سکون اور اطمینان بخشنے والا عمل روزہ ہے، سب سے فائدہ بخش نیکی صدقہ اور سب سے زیادہ رائیگاں کوشش ”ریا کاری“ ہے۔

(۱۷) ہبۃ اللہ ابو البرکات بغدادی

ہبۃ اللہ ابو البرکات بغدادی محمد بن ملک شاہ کے دور میں بغداد میں ایک نامور طبیب گذرا ہے، ہبۃ اللہ بچپن میں بغداد آ گیا، اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علم طب کو پسند کیا اور علم طب کے حصول کی طرف توجہ کی، یہ عراق میں پیدا ہوا، اور عمر ۹۰ سال میں انتقال کیا۔

ابو البرکات نے ابو الحسن سعید بن ہبۃ اللہ ایک مشہور طبیب سے علم طب حاصل کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ہبۃ اللہ ابو البرکات بغدادی نامور طبیب، فلسفی، جغرافیہ کا ماہر (geologist)

اور علم اخلاقیات (moral philosophy) اور روحانیت (spiritual) میں کامل تھا۔

ابو البرکات کا شمار بغداد کے نامور اساتذہ میں ہوتا ہے، خصوصاً علم طب میں باکمال شخصیت کا وہ مالک تھا، اور طبابت میں اس نے بڑا نام پیدا کیا، بڑے بڑے شاہان وقت اور امراء نے اس سے علاج کرایا اور شفا یاب ہوئے، ہر جگہ خلعت و انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

یہ شروع میں یہودی تھا اور ایک مشہور یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، مگر مسلمان ہو گیا۔

وہم کا علاج وہم سے

بغداد میں ایک شخص کو مایخولیا ہو گیا، اسے وہم تھا کہ اس کے سر پر مٹی کا مٹکا رکھا ہے، اس خیال سے وہ کسی دروازے میں بغیر جھکے ہوئے داخل نہیں ہوتا تھا، راستہ میں مٹکے کے گرنے کے اندیشہ سے لوگوں سے ہٹ کر چلتا تھا، یہ مرض اس کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا، اس کا علاج بھی ممکن نہ تھا، اوحدا الزمان ابو البرکات ہبۃ اللہ البغدادی کے پاس اسے لایا گیا، حکیم سمجھ گیا کہ وہم کا علاج وہم سے ممکن ہے، اس نے اپنے دو غلاموں کو سمجھا دیا کہ ان میں سے ایک مکان کی چھت پر مٹی کا مٹکا لے کر جا کر بیٹھے، اور دوسرا لکڑی لئے ہوئے تیار رہے، وہ مریض کو بلا کر صحن میں ایسی جگہ بٹھائے گا جو چھت سے قریب ہو، جب اشارہ کرے تو لٹھ بند غلام اس طرح لکڑی گھما کر مارے کہ مریض پر تو نہ لگے مگر کچھ فاصلہ سے ہو کر اس کے سر پر سے گزر جائے اور اس کی چھت پر جو غلام ہے وہ مٹی کے مٹکے کو یوں پھینکے کہ مریض کے پاس آ کر گرے اور ٹوٹ جائے۔

یہ انتظام کر کے حکیم اوحدا الزماں ہبۃ اللہ نے مریض کو اپنے پاس بلایا، دیوان خانے کے باہر سائبان کے نیچے بٹھا دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگا، جس وقت دیکھا کہ مریض محو گفتگو ہے، چپکے سے ہاتھ سے اشارہ کر دیا، ساتھ ہی نیچے کے غلام نے لکڑی گھمائی اور وہ مریض کے سر پر سے اس کی لاٹھی زناٹا بھرتے ہوئے نکل گئی، اور چھت پر جو غلام تھا اس نے مٹکا نیچے گرا دیا، یہ کام ایسی صفائی سے ہوا کہ مریض کو بالکل یقین ہو گیا کہ جو مٹکا ٹوٹا ہے وہی ہے جو اس کے سر پر رکھا ہوا تھا، اس طرح سے اس کو وہم

سے گلو خلاصی ہوئی۔ (۱)

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

اس کے دینی مزاج کا اندازہ اس کے ان اقوال سے لگایا جاسکتا ہے ”اعمال کی بنیاد مکافاتِ عمل ہے، جیسی کرنی ویسی بھرنی، جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے نیکی ملے گی، جو ذرہ برابر بدی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا، خدا جو خالق اور مالک ہے وہ منصف ہے، انسان کی نیکیوں پر وہ خوش ہوتا ہے اور ثواب دیتا ہے، اور برائیوں پر ناراض ہو کر عذاب دیتا ہے۔

اور ایک جگہ کہتا ہے:

”روحانی معاملات اور ہیں اور ہماری آنکھوں سے بالاتر ہیں، مادیات میں غلطی کا امکان ہے، آنکھ غلط بھی دیکھ سکتی ہے، عقل غلط بھی سمجھ سکتی ہے، مگر روحانی امور ذوق و وجدان سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں چشمہ بصیرت چاہئے۔“

پیغمبرِ مخرصادق ہے، حق ہے، سچا ہے، اس کا دل اور سینہ صحیفہ کائنات ہے، وہ حق دیکھتا ہے، حق کہتا ہے اور حق باتوں کی خبر اس کے ذریعہ دی گئی ہے، وہ قطعی اور یقینی ہے۔

(۱۸) علاء الدین ابوالحسن ابن النفیس القرشی

علاء الدین ابوالحسن ابن النفیس القرشی دمشق میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم کے بعد ابن الدخوار جو علم حدیث اور فن طب میں باکمال سمجھا جاتا تھا، اس کے حلقہ درس میں شامل ہو کر تعلیم مکمل کی، یہ فن طب میں علم تشریح الاجسام کا ماہر، امراض چشم کا باکمال طبیب، جسم میں خون کے بارے میں تحقیق کرنے والا، دوران خون کو ثابت کرنے والا۔

علمی خدمات اور کارنامے

علم طب میں ابن النفیس کا نام دنیا کے ممتاز طبیبوں کی فہرست میں ذکر کیا جاتا ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد ابن النفیس مصر پہنچا اور قاهرہ کے ایک بڑے شفا خانے میں افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے بہت دنوں تک خدمات انجام دیتا رہا۔

امراض چشم پر اس نے بڑی تحقیق اور تجربے کئے، اور فن کے اس خاص شعبہ میں کمال پیدا کیا، ابن النفیس ایک محقق تھا، اس نے شیخ بوعلی سینا کی مشہور کتاب القانون پر اچھی بحث کی، وہ بعض مقامات پر شیخ سے اختلاف بھی کرتا ہے۔ انہوں نے ابن سینا کی کتابوں کی شرحیں لکھیں، ”ابن سینا“ ثانی کہلائے، نیز انہوں نے بقراط کی کتاب کی شرح ”شرح ابیذیمیا البقرط“ کے عنوان سے تصنیف کی اور جنین بن اسحاق کی تصنیف ”مسائل فی الطب“ کی شرح لکھی، جس کا عنوان ”شرح مسائل جنین“ ہے، امراض چشم پر ابن النفیس کی کتاب ”المہذب فی الکحل“ کے نام سے مشہور ہے، حکماء کے حوالے کے لئے انہوں نے ”بغیۃ الطالبین وحجۃ المطہین“ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو اطباء کے لئے بڑی کارآمد ہے، ابن النفیس طب کے موضوع پر ”کتاب الشامل فی الصناعات الطبیۃ“ کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی، جو تین سو جلدوں پر محیط ہوئی مگر وہ صرف اس کی اسی جلدیں مرتب کر سکے، انہوں نے ”شرح تشریح القانون“ کے نام ”القانون“ کی شرح لکھی جو بیسویں صدی میں ان کی شہرت کا باعث ہوئی۔

دوران خون (Circulation of blood) کی تحقیق کرنے والا پہلا شخص تھا۔ لیکن ابن النفیس کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اسے زندہ جاوید بنا دیا، یہ ہے کہ وہ انسانی جسم کے نظام پر ایک نئے زاویہ سے غور کرتا ہے، وہ تجربے کے بعد ثابت کرتا ہے کہ انسان کے جسم میں خون رواں دواں رہتا ہے، وہ پورے اعتماد سے کہتا ہے کہ خون وردیدی شریان (Veinous artery) سے ہو کر گزرتا ہے اور پھر پھیپھڑوں میں پہنچ کر تازہ ہوا سے ملتا ہے، اور پھر صاف ہو کر پورے جسم میں دورہ کرتا ہے، اس طرح خون پورے جسم کے ہر حصہ میں پہنچتا رہتا ہے۔

آج عام طور پر دوران خون کا نظریہ سرفتیس (Servetus) نامی ایک پرتگالی سائنسدان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یہ غلط ہے، امریکی پروفیسر فلپ نے اس خیال کی سخت تردید کی ہے، پروفیسر فلپ کہتا ہے:

Its dean Abu-al- Hassan Ali Ibn-al-nafis, who studied in damascus where he later died (1288-9) contributed in his sharh Tashrih al- Qanun a clear conception of the pgumony cerculation of the blood two and half centuries before the spanish servtus credited with this discocery (۱)

”سرفتیس سولہویں صدی کا سائنسدان ہے، اس سے کوئی تین سو برس پہلے دوران خون کے اس نظریے کو ایک مسلم طبیب اور سائنسدان نے دریافت کیا تھا، وہ ابن القرشی ہے، اس مسلم سائنسدان نے دوران خون کے نظریے کو واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا، ولیم ہاروے (Wilam harvey) کو بھی دوران خون کا محقق کہا جاتا ہے، لیکن ولیم ہاروے ۱۶۸۷ء کا دانشور ہے، ابن النفیس اس سے کئی برس پہلے (کوئی تین سو برس سے اوپر) دوران خون کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کر چکا تھا اور اپنی کتاب میں تفصیل سے بحث کر چکا تھا۔“

یورپ کے دانشور دوران خون کی دریافت کا سہرا ولیم ہاروے (۱۶۸۷ء) کے سر باندھنا چاہتے تھے، اس کے لئے طبی کانگریس کے اجلاس کے جلسے میں اعلان ہونے والا تھا، لیکن دس جون ۱۹۵۷ء کو دنیا کی مشہور خبر رساں ایجنسی (rellterlondon) کے ذریعہ یہ تحقیقی خبر ساری دنیا میں پہنچ گئی کہ دوران خون کے نظریہ کو دریافت کرنے والا ایک مسلم سائنسدان ابن النفیس القرشی تھا جو قاهرہ (مصر) کا ماہر طبیب تھا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برائیکا کے حالیہ ایڈیشن ان کی دریافت کا اعتراف کرتی ہے۔

اس کی ولادت ۱۲۰۱ء میں ہوئی اور وفات: ۱۲۸۹ء بمصر: ۸۸ سال۔

(۱۹) لسان الدین ابن الخطیب

لسان الدین ابن الخطیب اندلس کا مایہ ناز طبیب اور محقق گذرا ہے، پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ ہے، لسان الدین لقب تھا، ابی الخطیب یا ابن الخطیب سلمانی کے نام سے شہرت حاصل کی، ۲۵ رجب المرجب ۷۱۳ھ مطابق نومبر ۱۳۱۳ء غرناطہ کے پاس المرج کے مغربی سرے پر دریائے شنبیل کے قریب واقع مقام لوشنہ میں ولادت ہوئی۔

بڑے اہم خاندان بنو زبیر کے نام سے بڑی شہرت کا مالک تھا، پہلے شام سے ہجرت کر کے قرطبہ آیا، پھر طلیہ سے غرناطہ میں مقیم رہا۔ اس کے ابتدائی عہد کے حالات نہیں ملتے، اتنا ملتا ہے کہ جوانی کے دن اپنے والد کے ساتھ غرناطہ میں گزارے، یہاں اس کا باپ بنو نصر کے دربار میں نہایت جلیل القدر عہدہ پر فائز تھا، یہیں سے ابن الخطیب کو بڑے بڑے علماء اور فضلاء سے علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا

۱۳۴۰ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد وزیر علی بن حباب کے یہاں ملازمت کر لی، لیکن قسمت نے زیادہ دنوں تک ساتھ نہیں دیا، اور ۱۳۴۹ء میں علی بن حباب بھی دنیا سے چل بسے، اس کے بعد سلطان ابوالحجاج یوسف بن خطیب پر توجہ کی، یہ تو جب کچھ گراں ہوئی، چنانچہ یوسف کے قتل کے بعد اس پر عتاب کا دور شروع ہوا اور اسے مراکش جانا پڑا جہاں اس نے ۱۳۶۲ء تک گوشہ نشینی کی زندگی گذاری، اسی سال جب محمد خیمس دوبارہ تخت نشین ہوا اسی سال میں اس کے دشمنوں نے سازش کر کے اس کو قتل کر دیا۔ (۱)

علمی خدمات اور کارنامے

لسان الدین ابن الخطیب ایک جامع شخصیت کا مالک تھا، یہ ایک اچھا شاعر، مؤرخ، جغرافیہ داں، اور فلسفی تھا، لیکن وہ ایک طبیب اور محقق کی حیثیت سے زیادہ مشہور

ہوا، اس نے مختلف عنوانات کے تحت بہت سی کتابیں لکھی ہیں، مؤرخین اس کی کتابوں کی کل تعداد ساٹھ بتاتے ہیں، ان میں سے صرف ایک تہائی کتابیں محفوظ رہ گئی ہیں۔

عالی دماغ ابن الخطیب کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اس کو زندہ جاوید کر دیا، اس کا یہ پتہ لگانا ہے کہ بعض امراض پھیل جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو لگ جاتے ہیں اور بعض امراض نہیں پھیلتے، پھیلنے والے امراض وبائی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور گھر کے گھر صاف کر دیتے ہیں، ان امراض کو متعدی امراض کہتے ہیں۔

امراض متعدی کی دریافت کے بعد ابن الخطیب نے یہ پتہ چلایا کہ متعدی امراض پھیلتے کیوں ہیں، اس نے بڑے جدوجہد اور کاوش کے بعد یہ پتہ چلایا کہ یہ امراض باہر سے آکر لگ جاتے اور اس کے پھیلنے کے اسباب وہ نہایت باریک کیڑے ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے، مگر وہ مرض کے کیڑے ہیں، ان لگنے والے کیڑوں کا نام اس ہوش مند محقق نے جراثیم (germs) رکھا۔

جراثیم کی دریافت اس طبیب کا عظیم کارنامہ ہے، جس نے آئندہ چل کر طبی دنیا میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا، ابن الخطیب کی اس دریافت کو یورپ کے دانشوروں نے تسلیم کیا۔

(۲۰) اسحاق بن عمران بغدادی

اسحاق بن عمران بغدادی کا رہنے والا تھا، خلیفہ معتمد (۸۷۰-۸۹۲) کے عہد میں موجود تھا، ابن الجبل کا کہنا ہے کہ یہ شخص مسلمان تھا، یہ پہلا طبیب تھا جس نے سب سے پہلے یورپ میں جا کر طب کی اشاعت کے فرائض انجام دیئے، ابتدائی حالات کتابوں میں نہیں ملتے، زیادہ بن اغلب التیمی نے اسے قیروان بلایا تھا، اس نے تین شرطوں پر رضامندی کا اظہار کیا تھا کہ اول ایک ہزار دینار، دوم اس کی ذاتی سواری، سوم یہ کہ جب بغداد جانا چاہے تو وہ واپس چلا جائے۔

چنانچہ وہ یہاں لوگوں کو اپنی صلاحیتوں سے مستفید کرتا رہا، اسی دوران اس نے

رقادہ میں قائم شدہ بیت الحکمت میں بھی خدمات انجام دیں، اس کے بعد وہ ابراہیم ثانی کے بیٹے عبداللہ ثانی کے دربار سے وابستہ ہو گیا، آخر میں زیاد اللہ ثالث (۹۰۳-۹۰۹ء) کے دربار میں بھی رہا، اس دربار میں اس کے اچھے دن نہیں تھے، ابن ابی صبیحہ نے لکھا ہے کہ: چونکہ زیاد اللہ نے اسحاق کی جملہ شرائط پوری نہیں کی تھیں، اس لئے وہ اس سے بدظن تھا، دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ اسحاق اسے بہت سی چیزیں کھانے سے منع کرتا تھا، اس طرح کی باتوں سے غلط فہمی اتنی بڑھی کہ زیاد اللہ نے ۲۹۲ھ = ۹۰۷ء میں نہایت تکلیف دے کر اسے قتل کر دیا، اور اس کی نعش پھانسی کے پھندے پر لٹکا دی، اور خشک ہونے کے بعد اس میں شکرے نے گھونسلا بنایا۔ جس روز اس کو قتل کیا گیا، اس دن اس نے زیاد اللہ سے کہا کہ: تم اپنے آپ کو عرب کا سردار کہتے ہو، مگر تم میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے، میں نے بہت دن پہلے تم کو ایک زہر دیا ہے جو تمہیں جلد ہی بری موت مار ڈالے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جو وقت اسحاق نے بتایا تھا، اسی وقت زیاد اللہ نہایت بری موت سے مرالینی پہلے وہ پاگل ہوا، اور پھر کچھ دنوں کے بعد اسی عالم میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ (۱)

علمی خدمات اور کارنامے

قیروان کے دران قیام ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ دربار سے علاحدگی کے بعد کامیاب مطب کرتا رہا، علاج کے سلسلے میں متقدمین کے طرز پر اخلاط کو بڑی اہمیت دیتا تھا، تشخیص کے لئے نبض و بول و براز کا معائنہ اسکے مطب کی خاص شناخت تھی، وہ اپنے مطب میں طب کی تعلیم کا درس بھی دیتا تھا، چنانچہ علی بن اسحاق، زیاد بن خلفوان، اسحاق بن سلیمان اسراہیلی اور ابوبکر محمد بن جراح کے نام اس کے شاگرد کی حیثیت سے لئے جاتے ہیں۔

اس کی اہم طبی تصنیفات میں ”کتاب الأدوية المفردة“ کتاب

العنصر والتام في الطب“ شامل ہیں۔

طبی مہارت و حداقت کے واقعات

آفریقہ کا حاکم زیاد اللہ اعلیٰ (۹۰۳-۹۰۷ء) دمہ کا پرانا مریض تھا، ایک

دن اس نے خالص دہی پی لیا، اس کے پینے کے تھوڑی دیر بعد ہی زیاد اللہ کو سانس کی تنگی کا دورہ پڑا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ سانس اکھڑنے لگی، زیاد اللہ نے اپنے طبیب اسحاق بن عمران کے منع کرنے کے باوجود دہی پیا تھا، اور دربار میں ایک دوسرے طبیب نے جو جو یہودی تھا، دہی پینے کے لئے ترغیب دی تھی، دراصل یہ یہودی طبیب اسحاق بن عمران سے پیشہ وارانہ بغض رکھتا تھا۔

اس لئے اس نے اسحاق کو نچا دکھانے کے لئے اور اس کی عداوت میں زیاد اللہ کو دہی استعمال کرنے کی ہدایت دی تھی، لیکن جب حاکم کی یہ حالت دیکھی تو یہودی طبیب بھی گھبرا گیا۔

سب لوگ اسحاق بن عمران کی طرف رجوع ہوئے، اسحاق نے علاج کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ: اب تم اس یہودی طبیب سے ہی علاج کرواؤ جس نے دہی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن خوشامد کر کے اس کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا گیا، اسحاق نے علاج شروع کیا اور بہت سی برف منگوا کر زیاد اللہ کو کھلائی اور پھرتی کرائی، اس ترکیب سے تمام دہی جو برف کی ٹھنڈک پا کر بستہ ہو گیا تھا قتی کے ذریعہ باہر نکل آیا۔

(۲۱) ابن وافیہ

ابوالمطرف عبدالرحمن بن محمد بن عبدالکبیر یحییٰ بن وافیہ بن ہند الحمی اندلس کا نہایت مشہور طبیب تھا، شہر طلیہ میں ۳۸۷ھ = ۹۹۷ء میں پیدا ہوا، وہ بڑے علمی اور باعزت خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس سے زیادہ اس کے حالات زندگی نہیں ملتے، تعلیم کے سلسلے میں کتابوں میں مذکور ہے کہ اس نے ارسطو اور دیگر فلاسفر کی کتابوں سے پڑھنا شروع کیا، اس کے بعد اس نے جالینوس اور دیسقوریدس کی طبی کتابوں کا مطالعہ کیا، مفرد ادویہ اس کا خاص موضوع تھا، تمام مفردات کی کتابوں کا اس نے بالاستیعاب مطالعہ کر کے اس میں منفرد حیثیت حاصل کر لی۔

خاص طور سے دیسقوریدس کی ”کتاب الحشائش“ اور جالینوس کی

”الادویۃ المفردة“ کا عربی متن اسے زبانی یاد ہو گیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

عمر بھر مفردات کی تحقیق میں لگا رہا، ۲۰ رسال لگا تار محنت کے بعد علم الادویۃ پر نہایت شاندار کتاب تصنیف کی۔

ابن ابی صبیحہ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: اس کتاب کی ترتیب نہایت عمدہ تھی، اس میں ابن وفد نے ادویہ مفردہ کی تمام خاصیتوں اور ان کے درجات کو بہت خوبصورتی سے جمع کر لیا تھا، ۲۰ رسال کی محنت کے بعد یہ کتاب اس قدر جامع ہوئی تھی کہ کوئی بات ایسی نہیں تھی جو اس میں درج نہ ہو۔

علاج کے سلسلے میں اس کا اپنا منفرد انداز تھا، وہ ممکن حد تک مرض کا علاج غذا سے کرتا تھا، اگر وہ دوا کا استعمال ضروری ہو تو پہلے مفردات سے علاج کیا جائے اس کے بعد مرکب دواؤں کا استعمال کیا جائے اس نے درج ذیل کتابیں یادگار چھوڑیں۔

۱- کتاب الادویۃ المفردة: یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع کتاب ہے، ابن بیطار نے اپنی کتاب ”الجامع المفردات الادویۃ والأغذیۃ“ میں اس کے حوالے بکثرت لکھے ہیں، ادویہ کی ماہیت کے تضاد کے سلسلے میں اس کی رائے اکثر فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

۲- کتاب الوساد فی الطب۔

۳- مجربات فی الطب۔

۴- کتاب تدقیق النظر فی علل حاسۃ البصر۔

(۲۲) ابن زہر

پورا نام ابو مروان عبد الملک بن ابی العلاء زہر بن ابی العلاء زہر بن ابی مروان عبد الملک بن محمد بن مروان بن زہر ہے، یورپ میں avensor کے نام سے مشہور ہے،

اشبیلہ میں پیدا ہوا، اس کی تاریخ پیدائش مختلف فیہ ہے، زیادہ قریب قیاس یہی ہے کہ وہ ۱۰۹۱ء میں پیدا ہوا۔

ابن زہر کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں کئی ایک نام ملتے ہیں، یہ طبیب کتاب التیسیر کا مصنف تھا، یہ نہایت ذی علم خاندان کا شخص تھا، ابن زہر شروع عمر جوانی میں مغرب کے فرماں بردار خاندان رابطین کا شاہی طبیب اور ابراہیم بن یوسف بن تاشفین اس خاندان کے آخری بادشاہ کا طبیب خاص رہا، خلیفہ عبد المومن کے دربار میں بھی ابو مروان ابن زہر کو شاہی طبیب کی خدمات حاصل رہیں، بعد میں وزارت عظمیٰ کا قلم دان بھی اس کے سپرد کیا گیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابن ابی صبیحہ نے لکھا ہے کہ: عبد المومن اس پر بے حد اعتماد کرتا تھا، ابن زہر نے اس کے لئے تریاق سبعی کا مرکب تیار کیا تھا جو بعد میں سات دواؤں کے مرکب کی شکل میں تریاق اثنلہ کے نام سے مشہور ہوا۔

ابن زہر کا مرتبہ بحیثیت معالج بہت بلند تھا، اپنی حذاقت اور طبابت کی بدولت تمام عمر خلفاء کے دربار میں نہایت عزت و اکرام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔

منور جہاں رشید نول ڈیوراں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: ابن زہر جالینوس کے بعد سب سے بڑا طبیب تھا، طب کے علاوہ علم الجراحت میں دسترس رکھتا تھا، گردے کی پتھری، قصۃ الریہ کی جراحت اور نزول الماء کے علاوہ اور بہت سی حالتوں کی حاجت میں وہ زبردست مہارت رکھتا تھا۔

Ibn zuher's forte was clinical description, he left classical analysis of mediasternal tumors, pericarditis intetimal tuber culosis and pharyngeal paralysis tranlations of the tasir into Hebrew and latin

deeply influenced European medicine (the age of faith p.330)

اس کی معالجانہ مہارت اور تشخیصی مہارت کے سلسلہ میں درج ذیل واقعات دلچسپ معلومات فراہم کرتے ہیں۔

مشہور ہے کہ خلیفہ عبدالمومن مسہل دواؤں سے بہت گھبراتا تھا، چنانچہ ابن زاہر نے یہ تدابیر اختیار کی کہ شاہی باغ میں انگور کی بیل کو مسہل ادویہ کے خیسپاندہ سے سیراب کرنا شروع کیا، یہ سلسلہ چلتا رہا، جب پھل آئے تو عبدالمومن کو وہی انگور کھلائے، اس طرح اسے دوسرے مسہلات کے استعمال سے نجات مل گئی۔

دوسرا واقعہ یوں ہے کہ خلیفہ کے جانے کے راستہ میں ابن زہر کو ایک مریض دکھائی دیتا تھا، اس کا پیٹ پھول گیا تھا، اور اس کا بدن زرد پڑ گیا تھا، اس مریض نے جب ابن زہر سے علاج کرانا چاہا تو ابن زہر نے مریض سے اس کے سرہانے رکھے ہوئے گھڑے کو توڑنے کی ہدایت دی، چنانچہ جب گھڑا توڑا گیا تو اس سے ایک مینڈک نکلا، ابن زہر نے کہا: تیری بیماری کا یہی سبب تھا، بعد میں مریض تندرست ہو گیا

ابن زہر نے اپنی ”کتاب التیسیر“ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اشبیلہ کے حاکم کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ اسے موت آگئی ہے اور اس کے اندر قوت گویائی و قوت حرکت ختم ہوگئی ہے، میں نے اسکی نبض دیکھی، لیکن اس میں ان سب چیزوں کی علامت نہیں تھی، البتہ نبض سے مزاج کی گرمی یا معدہ میں کسی گرم خلط کی موجودگی کا پتہ چلتا تھا، میں نے بہت سی دوائیں دیں، مگر کسی سے بھی فائدہ نہیں ہوا، دوسرے اطباء نے بھی اس کا علاج کیا، مگر ان کی دوا نے بھی کوئی کام نہیں کیا، میں اسباب مرض پر برابر غور کرتا رہا، اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا سبب کوئی اندرونی شئی ہے جو باہر سے جسم میں داخل ہوئی ہے، میں نے مریض کے تیمارداروں سے اس کے پینے کے پانی کو منگوا لیا، جیسے ہی میں نے اس پانی کو منہ سے لگایا تو مجھ کو ایک ناگوار بو محسوس ہوئی، بعد میں میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پانی کے برتن میں غلیظ اور سڑا ہوا گوشت پڑا ہوا ہے، اور اس میں

کیڑے پیدا ہو گئے ہیں، اس متعفن گوشت سے بخارات پیدا ہو کر دماغ کی طرف چڑھ رہے تھے، جس سے وسوسہ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، میں نے مریض کے تیمارداروں سے بتایا کہ مریض جو پانی استعمال کر رہا ہے، یہی اس کے مرض کا سبب ہے جس کے دور کرنے پر مرض بھی ختم ہو گیا۔

”حیثیت مصنف ابن زہر نے مشرق و مغرب میں کافی شہرت حاصل کی ہے، خاص طور سے اس کی تصنیف ’کتاب التیسیر‘ نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں تیس رسالے ہیں، یہ کتاب انہوں نے ابن رشد کی فرمائش پر تحریر کی ہے، ابن زہر نے بعض ایسی بیماریوں کی تفصیل بیان کی جو اس سے پہلے اطباء کو معلوم نہیں تھیں، مثلاً ”التهاب حجاب“ پردہ شکم کے اوپر پھیپھڑوں کے درمیان خالی جگہ میں رسولی کا پیدا ہونا، دل کے بیرونی غلاف پر پھوڑوں کا نمودار ہونا، حلق کا فالج، خارش، کان کے درمیانی حصہ کے متورم ہونا اور انتڑیوں کا گلہنا وغیرہ، انہوں نے بعض ایسی رسولیوں کا ذکر سب سے پہلے کیا جن پر ان سے پہلے کسی نے بحث نہیں کی تھی، ابن زہر نے زخروں کے ذریعے مصنوعی طور پر غذا کی ترسیل کے عمل کی وضاحت کی اور طبیعت وآب و ہوا کی معالجاتی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، انہوں نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے اور اکھڑی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے طریقے ایجاد کئے، انکا کہنا تھا کہ شہد اور چینی کے ساتھ دوا لی جائے تو وہ جگر تک پہنچتی ہے؛ جہاں جگر ان چیزوں کے ساتھ عمل کرتا ہے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

ابن زہر امور شرعیہ کا سخت پابند اور دینی مزاج کا مکمل پرتو اور خیر و بھلائی کو پسند کرنے والا واقع ہوا تھا۔

(۲۳) صالح بن بہلہ

سرزمین عرب پر پہلا کامیاب ترین ہندوستانی طبیب صالح بن بہلہ کے نام کے سلسلے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے، کچھ نے صالح بن بہلہ اور کچھ نے ابن سہل

لکھا ہے، ڈاکٹر زبیر صدیقی کا خیال ہے کہ یہ لفظ صالے تھا، جو عربی زبان میں کثیر الاستعمال ہو کر صالح ہو گیا، موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا ہو، اور اس کے بعد اس کا نام صالح رکھا گیا ہو، یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے؛ کیونکہ قاضی اطہر مبارک پوری نے ہندوستانی اطباء کی فہرست میں ایک طبیب کا نام حسن بن صالح بن بہلہ لکھا ہے، قرین قیاس یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد اس کے لڑکے کا مسلمان نام رکھا گیا ہو۔ (۱)

علمی خدمات اور کارنامے

یہ شخص ویدک علاج کا بڑا ماہر تھا صحت اور ہلاکت کے متعلق پیشن گوئی میں مہارت رکھتا تھا، اس کی تصنیفی حیثیت مؤرخین تسلیم نہیں کرتے، البتہ ایک کامیاب معالج کی حیثیت سے ابن ابی صبیحہ کے حوالے سے درج ذیل واقعہ تقریباً تمام مصنفین نے لکھا ہے۔

ایک مرتبہ ہارون رشید کا چچا زاد بھائی بہت زیادہ بیمار ہو گیا، درباری اطباء کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا، معاملہ جندی نیشاپوری طبیب جبریل بن بخشوع کے بھی بس کا نہ رہا، مسئلہ خلیفہ وقت ہارون رشید کے پاس پہنچا، اس نے اپنے مشیر کاروں سے مشورہ طلب کیا تو جعفر بن یحییٰ برکی جو ہندوستانی اطباء کو بہت پسند کرتا تھا، اس نے کہا: جبریل رومی طب کا ماہر ہے، اس کی ناکامی کے بعد طبیب صالح بن بہلہ سے علاج کرایا جائے، ہارون رشید کے حکم سے صالح بن بہلہ نے علاج کیا، لیکن علاج کے کچھ دنوں کے بعد اس کی اطلاع ہارون رشید کو پہنچی تو اس صالح بن بہلہ کو سخت لعنت ملامت کی اس پر صالح بن بہلہ اپنی بات پراٹھل رہا اور اس نے دوسری دوائیں استعمال کرائیں بالآخر وہ اس مرض سے شفا یاب ہوا اور کافی دنوں زندہ رہا۔ (۲)

(۱) خلافت عباسیہ اور ہندوستان: ۳۸۴

(۲) عیون الانباء فی طبقات الاطباء: ۳۳/۲

(۲۴) ابن بیطار

اس کا پورا نام ابو محمد عبد اللہ بن احمد المالقی النبائی تھا، اسی نسبت سے اسے مالقی اور اندلسی بھی کہتے ہیں، لیکن ابن بیطار کے نام سے مشہور ہوا، ۱۱۹۷ء میں بمقام ملاگا پیدا ہوا، یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا نباتاتی طبیب تھا، اور ملک اکمل کا درباری طبیب تھا، اس نے ادویہ کی شکل و صورت، جائے پیدائش، افعال و خواص کا پتہ لگایا، ابن بیطار میں بچپن ہی سے نباتی پودوں سے دلچسپی تھی۔

علمی خدمات اور کارنامے: علم نباتات کے سلسلے میں ابن بیطار عمر بھر سفر کرتا رہا، چنانچہ تاریخی حوالوں میں مذکور ہے کہ ۲۰ سال کی عمر میں وہ مراکش، الجزائر کا سفر کرتے ہوئے ۱۲۲۴ء میں تونس وارد ہوا، اس سلسلہ میں مصر پہنچا، یہاں اس کی ملاقات ایوبی خاندان کے مشہور بادشاہ الملک اکمل سے ہوئی، ملک اکمل ابن بیطار کے نباتی ذوق و تجسس کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور اس کے کام دیکھ کر اپنے یہاں ”رئیس العشاب“ نباتات کا افسر اعلیٰ مقرر کیا، اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے ملک صالح نجم الدین کے دور میں بھی ابن بیطار کو عزت و اکرام سے نوازا جاتا رہا۔

ابن بیطار ساری عمر نباتات کی تحقیق کے لئے مشرق و مغرب کے ممالک کا سفر کرتا رہا، بالآخر ۱۲۴۸ء میں بہ مقام دمشق وفات پائی۔

ابن البیطار کی درج ذیل کتابوں کا تذکرہ حوالوں میں ملتا ہے (۱) کتاب الجامع لادویۃ المفردۃ والأغذیۃ (۲) الابانة والاعلام (۳) کتاب المعنی فی العلاج بالادویۃ المفردۃ ابن بیطار کی طبی حذاقت و مہارت

ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک بوٹی بادشاہ کو دی اور کہا کہ: ابن بیطار نے اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہے، اس کو یہ بوٹی سونگھنے کے لئے دیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس کے اندر کتنی قابلیت ہے، چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ابن بیطار نے بوٹی کو ایک طرف سے سونگھا،

سوگھتے ہی ناک سے خون جاری ہو گیا، یہ دیکھ کر سبھی لوگ حیرت زدہ ہو گئے، مگر فوراً ہی اس نے بوٹی کو دوسری طرف سے سوگھا تو ایک دم خون کا بہنا بند ہو گیا، ابن بيطار نے کہا کہ: اب یہ بوٹی کو خود وہ شخص بھی سوگھے جو اس کو لایا ہے، تاکہ اس کی قابلیت کا بھی اندازہ ہو سکے، ورنہ اس کو جاہل سمجھا جائے گا، بادشاہ کے حکم سے اس شخص نے بھی بوٹی کو ایک طرف سے سوگھا، سوگھتے ہی اس کی ناک سے بھی خون جاری ہو گیا، لیکن اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بوٹی کو دوسری طرف سوگھنے سے خون بند ہوتا ہے، چنانچہ وہ شخص خون بند کرنے میں ناکام رہا، اور اس کی ناک سے کافی خون بہہ گیا جس سے اس کی حالت خراب ہو گئی، اور خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے وہ قریب المرگ ہو گیا، بادشاہ کو تشویش ہوئی اس نے بوٹی کو دوسرے رخ سے سوگھنے کو کہا، جیسے ہی اس شخص نے سوگھا نکسیر فوراً بند ہو گئی۔

(۲۵) ابن جلیجل (م ۹۹۴ء)

ابن جلیجل کا پورا نام ابوداؤد سلیمان بن حسان ابن جلیجل تھا ان کی پیدائش ۹۴۴ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا، وہ طبیب بھی تھا، اور ماہر علم الادویہ بھی، اس کا شمار اپنے وقت کے عظیم اطباء میں ہوتا تھا، اسی وجہ سے وہ خلیفہ ہشام مؤید اللہ دور حکومت (۹۷۶-۱۰۰۹ء) کا ذاتی معالج بھی بنا، اس نے طب کی تعلیم نکولاس (Nicolas) نامی مشہور عیسائی طبیب کی سرپرستی اور ابن نشا پرست نامی ایک یہودی طبیب کی صدارت میں قام، دس اطباء کی مجلس کے ارکان سے حاصل کی، ابن جلیجل کے زمانے میں علم الادویہ پر دیوسقوریوس (Dioscorides) کی کتاب بہت معلوماتی، معتبر اور متداول مانی جاتی تھی، اس کے مطالعہ کے بغیر علم الادویہ کے بارے میں طبیب کا علم ناقص رہتا تھا، ابن جلیجل نے اس کتاب کا مطالعہ تو کیا ہی اور اس کی تشریح بھی لکھی جو تفسیر اسماء الادویہ المفردۃ نامی کتاب دیویقوریوس کہلاتی ہے، یہ کتاب ۹۸۲ء میں مکمل ہوئی۔

ابن جلیجل کی ایک اور تصنیف طبقات الاطباء والحکماء بہت مشہور ہوئی، اس میں اس نے ستاون (۵۷) عظیم اطباء کے حالات زندگی اور ان کی طبی خدمات کا احاطہ کیا ہے،

ان میں یونان اور اس کے مشرق میں واقع ممالک سے تعلق رکھنے والے اطباء بھی تھے اور یونان کے مغرب میں واقع ممالک کے اطباء بھی، اول الذکر علاقے کے اطباء و حکماء میں بقراط، دیوسقوریوس، افلاطون، ارسطو، جالینوس، بطلموس، اقلیدس، یعقوب الکندی، حنین ابن اسحاق اور زکریا رازی وغیرہ شامل ہیں، مغربی اطباء ان کے مقابلے میں کم معروف ہیں۔

اس کتاب میں ابن جلیجل نے حضرت عمر بن عبدالعزیز (دور حکومت ۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) کے بارے میں ایک بہت معلومات افزا بات لکھی ہے کہ گوکہ وہ ظہور اسلام کے بہت ابتدائی دور کے فرماں روا رہتے، پھر بھی انہیں یونانی حکماء کی کتابیں عربی میں منقل کرانے کا بہت شوق تھا، اس لئے انہوں نے اسکندریہ کے محقق اہرن بن اعین کی تصانیف کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کرانے کا حکم دیا تھا۔

ابن جلیجل نے ایک مقالہ تریاقوں پر بھی لکھا جس کا نام ”مقالہ فی أدویۃ التریاق“ ہے۔

ابن جلیجل پیدائشی اندلسی ہے، پھر بھی اس کی تصانیف عربی زبان میں ہیں، یہ صورت حال اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ عربی زبان اندلس تک سائنس کی زبان بن چکی تھی، ابن جلیجل نے ۹۹۴ء میں وفات پائی۔

(۲۶) تمیمی

ابن الجزار کے بعد شمالی افریقہ میں چند برسوں کے وقفے میں مزید تین عظیم اطباء پیدا ہوئے، وہ طب کی تاریخ میں تمیمی، موصلی اور ابن رضوان کے نام سے مشہور ہوئے۔ تمیمی کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ساعد تمیمی المقدسی تھا؛ کیوں کہ ان کی پیدائش فلسطین میں ہوئی تھی، ۹۷۰ء کے لگ بھگ وہ مصر منتقل ہوئے، شہرت انہوں نے مصر منتقل ہونے کے بعد ہی حاصل کی، ان کے مصر منتقل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں فاطمی حکمران معز باللہ بہت علم دوست انسان تھا، وہ علماء اطباء کو بہت پرکشش تھو ابیں دیا کرتا تھا،

اس لئے فاطمی حکومت کی حدود کے باہر سے بھی اہل اپنا مولد و مسکن چھوڑ کر چلے آتے تھے۔
تمیمی بہت اعلیٰ پائے کا طبیب بھی تھا اور بہت اعلیٰ پائے کا ماہر علم الادویہ یہ بھی،
جب وہ فلسطین سے مصر آیا تو اس نے مصر کے قدیم شہر فسطاط میں جہاں پر آج کل قاہرہ
واقع ہے، طبابت شروع کی۔

علم الادویہ میں اس کی مہارت کا ثبوت اس کی طبی تصنیفات اور اس کے نسخے
ہیں، تاریخ طب کے مسلم الثبوت منصف سامی حمارنا لکھتے ہیں کہ اس نے تریاق پر بھی
ایک کتاب لکھی جو اس موضوع پر لکھی جانے والی تمام کتابوں پر سبقت لے گئی، ہر خورانی
کے علاج پر وہ دنیا بھر میں لکھی جانے والی تمام کتابوں پر فائق تھی، وہ کتاب اس قدر
مقبول ہوئی کہ تمیمی نے اس کے مزید دو طرح کے نسخے تیار کئے تھے، ایک درمیانی درجہ کا
اور دوسرا مختصر قسم کا کیوں کہ اصل نسخہ بہت ضخیم تھا، اس نے ایک تریاق بھی تیار کیا تھا جو ہر
قسم کے زہر کا توڑ کرنے کا گر تھا، اس کا نام اس نے مخلص النفوس رکھا تھا۔

اس نے ایک نادر معجون بھی تیار کیا تھا جس کا نام اس نے مقاح السرور رکھا تھا،
اس معجون کی تاثیر یہ تھی کہ وہ انسان کو تفکرات اور درد سے نجات دیتا اور روح کو سرور بخشتا۔
تمیمی کے ان سب کاموں سے بھی بڑا کام سامی حمارنا کے بقول اس کی تصنیف
بعنوان المرشد إلى جواهر الأغذية وقوى المفردات من الأدوية ہے،
اس میں اس نے قدرتی پیداواروں کی خصوصیات اور ان کے استعمالات کو بیان کیا ہے، یہ
اتنی اعلیٰ پائے کی تصنیف تھی کہ اس نے علی بن رضوان (م ۱۰۶۸ء) سے بھی خراج تحسین
حاصل کیا۔

تمیمی کا قیام مصر میں ۳۷۰ھ/۹۸۰ء تک ضرور تھا، اس کی وفات کی تاریخ
قطیعت کے ساتھ معلوم نہیں۔

(۲۷) ابن رضوان (۱۰۰۷-۱۰۶۸ء)

عمار موصلی کے چند ہی برس بعد ۳۹۷ھ، ۱۰۰۷ء میں ایک اور مایہ ناز طبیب ابن

رضوان قاہرہ کے قریب واقع غزہ (Giza) نامی شہر میں پیدا ہوا، واضح رہے: ہ جارج
سارٹن نے اس کا سنہ ولادت ۹۹۸ء لکھا ہے، اس کا پورا نام ابوالحسن علی بن رضوان مصری
تھا، اس کا باپ ایک نانوائی کے یہاں ملازم تھا؛ مگر اس ملازم کے بیٹے نے اپنی محنت شاقہ
سے جیسا عروج حاصل کیا، ویسے عروج کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں، اوائل عمر میں ابن رضوان
ایک نجومی تھا اور قسمت کا حال بتانے کے لئے اپنے شہر کی ایک گلی کے کٹر پر بیٹھا کرتا تھا،
وہی شخص اپنی صلاحیتوں کے مناسب استعمال سے طب میں اتنے اعلیٰ مقام پر پہنچا کہ
اپنے عہد کے عظیم ترین اطباء میں شمار ہونے لگے۔

اس نے تعلیم تو کئی مضامین میں حاصل کی جن میں فطری علوم منطق، فلکیات، مابعد
الطبیعیات بھی شامل ہیں، مگر اسے زیادہ دلچسپی طب سے رہی، اسی وجہ سے اس نے اس
میں بڑا اعلیٰ مقام حاصل کیا، طبابت کے پیشے میں اسے پہلی ملازمت ۳۴ سال کی عمر میں
۱۰۴۱ء میں ایک اسپتال میں معاون طبیب کی ملی، اس پیشے میں داخل ہونے کے بعد اس
نے بہت تیزی سے ترقی کرنی شروع کی، وہ خود لکھتا ہے کہ صرف سات سال کے اندر
اندر اسے اس قدر اعزازات اور مادی فوائد حاصل ہوئے کہ انہیں اس نے خواب و خیال
بھی اپنے لئے ممکن الحصول نہیں سمجھا تھا، اپنی آمدنی سے اس نے بڑی جائداد بنائی
اور بہت سا سونا چاندی خریدا، ۱۰۶۶ء میں وہ مصر کے حکمران مستنصر کا شاہی طبیب بن
گیا۔

ابن رضوان نے طبی اخلاقیات کے سات زریں اصول وضع کئے تھے جن کا
تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جا رہا ہے، تاہم ابن صبیحہ کا کہنا ہے کہ یہ سات اصول بقراط
سے ماخوذ تھے۔

طب پر ابن رضوان کی گہری نظر تھی اور اس نے قدما میں سے تقریباً سب کی
تصانیف پڑھ رکھی تھیں، جن میں بقراط، دیوسقوریدوس (Dioscorides) جالینوس،
ایفے سس کارفوس (Rufus of Eph Ephesus)، ابن ربن طبری، زکریا
رازی، ابن الجزار اور ابن سینا وغیرہ شامل ہیں، اس نے جالینوس کی کتاب (Ars

(parva) کی شرح لکھی، اس کے علاوہ اس نے خود بھی کتابیں لکھیں، اس کی اہم تصانیف کے نام درج ذیل ہیں: فی شرف الطب، جالینوس کی الفراق کی تشریح، حل شکوک الرازی علی کتب جالینوس، الأصول فی الطب پر تبصرہ، المتطارق بالطب إلى الصاعدة، النافع فی کفائت تعلیم صناعة الطب، طبیب فاضل، صیدنات الطب، کفائت الطب۔

ابن رضوان مصری نے ۴۶۰ھ مطابق ۱۰۶۸ء میں قاہرہ میں وفات پائی، اس کی وفات کی ابن ابی صبیحہ کی دی ہوئی تاریخ ۴۵۳ھ مطابق ۱۰۶۱ء درست نظر نہیں آتی، کیوں کہ شاہی طبیب کے منصب پر اس کی تقرری سامی حمارنا کے مطابق ۴۵۹ھ مطابق ۱۰۶۶ء کو عمل میں آئی تھی۔

(۲۸) ابن عین زربی

ابن عین زربی ایک عربی النسل طبیب تھا، وہ ایشیائے کوچک میں پیدا ہوا، ابن رضوان کی ہی طرح سے اسے ابتداء میں طب سے زیادہ دلچسپی نجوم سے تھی اور اسی کی طرح وہ کسب معاش کے لئے بغداد کی ایک گلی کے نکر پر بیٹھا کرتا تھا، فاطمی حکمرانوں کی علم نوازی نے اسے بھی کھینچ کر قاہرہ پہنچا دیا جہاں اس کے ایک قدر شناس نے اس کا تعارف قاہرہ کے چند قدردانوں سے کرا دیا، اس وقت سے اس کی قسمت کا تارہ چمک اٹھا کیوں کہ پھر فاطمی حکمران خافر کے عہد حکومت میں (۱۱۴۹ء = ۱۱۵۴ء) اس کی رسائی دربار تک ہوئی۔

نجوم کا پیشہ ترک کر کے جب اس نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا تو اس نے بہت نام پیدا کیا، اس نے طب پر چھ عدد کتابیں بھی تصنیف کیں، ان میں طب کے بارے میں اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور نظریات پیش کئے، اپنی ایک تصنیف الکافی فی صناعة الطب میں اس نے صحت مند زندگی گزارنے کے لئے چند اصول پیش کئے تھے، صاف ستھری ہوا، کام کاج میں اور کھانے پینے میں اعتدال پسندی، جذبات میں

توازن اور جسمانی ورزش، بیماروں کے علاج میں اس نے اولاً غذا پھر دوا اور بالآخر آپریشن کی ترتیب مقرر کی۔

ابن عین زربی کے بارے میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس نے بیماریوں کے بارے میں پیش آگہی حاصل کرنے پر زور دیا؛ تاکہ ایسے احتیاطی اقدامات کئے جائیں کہ بیماری سے واسطہ ہی نہ پڑے، نجومی ہونے کی بناء پر پیش آگہی حاصل کرنے کے لئے اس نے علم نجوم کو استعمال کرنے کی سفارش کی۔

اس نے ۱۱۵۳ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔

(۲۹) حکیم علی گیلانی

حکیم علی گیلانی عہد اکبری کا نہایت نامور طبیب تھا، مشہور زمانہ علمی مرکز گیلان کا باشندہ تھا، ۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ء میں پیدا ہوا، اس کے اہم متعلقین میں اس کے ماموں حکیم الملک شمس الدین گیلانی اور حکیم فتح اللہ شیرازی کے نام خاص طور قابل ذکر ہیں۔

علوم عقلیہ کی تعلیم شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد گنگوہی سے حاصل کی، طب حکیم فتح اللہ شیرازی سے سیکھا، بے حد پریشان حال اور مفلسی کے حالات میں ہندوستان آیا، کچھ دن دکن میں قیام کر کے دہلی آنا ہوا جہاں خوش قسمی سے شاہی ملازمت ملنے سے حالات بہتر ہوئے، مذہب کے لحاظ سے شیعہ تھا، بے حد خلیق اور شریف انسان تھا، حالات سنبھلتے ہی اس نے اپنی جیب سے ۶۰ ہزار روپے سالانہ غریبوں کے لئے وقف کر دیا۔

طبیب اور مصنف ہونے کے علاوہ اسے تعمیرات سے بھی گہری دلچسپی تھی، لاہور کا عجیب و غریب حوض بھی اس کی فن تعمیر کا شاہکار ہے۔

حذاقت اور طبی مہارت

حکیم علی گیلانی نے ایک مرتبہ رمضان المبارک میں عین افطار کے وقت مچھلی کھالی، جس سے شدید پیاس لگی، اور اس کے ازالہ کے لئے انہوں نے بہت زیادہ پانی پی لیا، اور کئی کٹورے خالی کر دئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹ پھول گیا اور سانس لینے میں تنگی

ہونے لگی، پیٹ کا تناؤ اتنا بڑھ گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پیٹ پھٹ جائے گا، حکیم نے اپنے مرض پر غور کیا، اور نتیجہ یہ نکالا کہ یہ سب مچھلی کا فساد ہے، جس سے غلیظ رطوبت پیدا ہوگئی ہے، جب تک یہ جسم سے باہر نہیں نکلے گی تکلیف دور نہ ہوگی، چنانچہ انہوں نے دارچینی کو پانی میں جوش دے کر پی لیا جس سے فوراً قوی شروع ہوگئی اور مادہ غلیظ قے کے ذریعہ خارج ہو گیا، اور تمام شکایات رفع ہو گئیں۔ (۱)

مشہور ہے کہ ان کی حذاقت کے امتحان کے لئے شہنشاہ اکبر نے حکیم علی کے سامنے مریض، صحت مند گائے اور گدھے کے قارورے پیش کئے، حکیم علی نے تجربہ اور قیاس کی بناء پر فوراً تینوں کی علاحدہ شناخت کرادی، ان کی اس حذاقت سے اکبر بادشاہ (۱۶۹۶ء) میں بہت خوش ہوئے اور ان کو اپنے دربار میں نہایت اہم مقام عطا فرمایا۔ (۲)

(۳۰) حکیم محمد ہاشم علوی خاں

ان کا اصلی نام سید محمد ہاشم بن حکیم محمد ہادی بن مظفر الدین علوی تھا، رمضان ۱۰۸۰ھ = ۱۶۷۰ء میں دارالعلم شیراز میں پیدا ہوئے، ۱۶۹۹ء میں ہندوستان آئے اور عالمگیر بادشاہ کی خدمت میں خلعت و منصب سے سرفراز ہوئے، محمد اعظم شاہ کی خدمت پر بھی متعین ہوئے، شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد میں علوی خطاب ملا، اس کے علاوہ منصب میں بھی اضافہ ہوا اور جاگیر ملی، محمد شاہ بادشاہ کا بہت کامیاب علاج کیا، بادشاہ موصوف نے چاندی میں تلوا یا، شش ہزار منصب، تین ہزار روپیہ ماہوار ملا، اور معتمد الملک کے خطاب سے نوازا گیا، نادر شاہ بہت اعزاز کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا، وہاں سے حج بیت اللہ کو گئے، ۱۷۴۳ء میں دہلی واپس ہوئے، ان کی تصانیف میں ”جامع الجوامع“ قبادین، مطب حکیم علوی خاں، حاشیہ شرح اسباب و علامات، شرح موجز القانون، احوال اعضاء النفس اور خلاصہ اور قوانین علاج وغیرہ ہیں، ان میں سے سب سے مشہور ”جامع الجوامع“ ہے جو اسم باسمی ہے، ۱۵ رجب ۱۱۱۶ھ / ۱۷۷۹ء میں

مرض استسقاء میں وفات ہوئی اور وصیت کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ کے مزار کے قریب میں دفن کیا گیا۔ (۱)

(۳۱) حکیم محمد شریف خاں

حکیم محمد شریف خاں ۱۷۱۴ء میں بعہد محمد شاہ (م ۱۷۴۸ء) پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم دہلی کے مشہور محدث اور عالم حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے مدرسہ میں ہوئی، حکیم عابد سرہندی اور حکیم اچھے صاحب سے طب کی تعلیم حاصل کی، اپنے والد حکیم اجمل خان سے مطب سیکھا، بہت کامیاب مطب رہا، مغل بادشاہ کے درباری طبیب بھی رہے ہیں، آپ کو اشرف الحکماء کا لقب دیا گیا تھا۔

علی اور طبی خدمات

زبردست حذاقت کی بناء پر حکیم شریف خاں نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی، آپ کا مطب دہلی میں مرجع الخلاق تھا، صبح ہی سے بھیڑ لگ جاتی تھی، مطب کے بعد آپ کے اہم شاگردوں میں موری گیٹ کے مرزا محمد کامل عرف پنجنے نے بہت دنوں تک نمایاں خدمات انجام دیں، اسکے علاوہ بہت سے شاگرد ہندو پاک میں طبی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، طبی مہارت کی وجہ سے حکیم صاحب کو شاہی طبیب مقرر کیا گیا تھا اور ضلع پانی پت میں ۲۵ ہزار کی جاگیر عطا کی گئی تھی، دربار سے آپ کو اشرف الحکماء کا لقب بھی دیا گیا تھا۔

سر سید احمد خاں اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید میں حکیم شریف خاں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے عصر میں سرآمد حکماء اور سر حلقہ اطباء تھے، آج تک ان کے کمالات کا شہرہ از بس بلند ہے، جالینوس اور ارسطو کا فلسفہ ان کے سامنے ایسا ہی ہے جیسے طوطی کی آواز نقار خانے میں۔

ان کے تصانیف میں ”علاج الامراض“، ”بحالہ نافعہ“، ”میزان الطب“، ”حدود

الأمراض، ”قواعد شریفیہ“، ”حاشیہ کلیات نفیسی“، ”حاشیہ شرح اسباب“، ”تحفہ عالم شاہی“، ”شرح حمیات قانون“، ”دستور الفصد“، ”تالیف شریفی“، ”رسالہ خواص الجواهر“، ”رسالہ چوب چینی“ یہ سب شامل ہیں ۱۸۹۷ء میں دہلی میں وفات پائی تھی اور درگاہ قطب صاحب مہرولی میں دفن ہوئے۔

آپ نے مشکوٰۃ شریف کا فارسی ترجمہ ”کاشف المشکوٰۃ“ کے نام سے کیا ہے، اس کے علاوہ شاہ عالم ثانی کے حکم سے قرآن شریف کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔

(۳۲) حکیم مومن خان

حکیم مومن خان مومن بن حکیم غلام نبی خاں (۱۲۲۱ھ) بن حکیم نامدار خان کوچہ جیلان دہلی میں پیدا ہوئے، تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا، پھر ابتدائی تعلیم شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ کے مدرسہ میں شروع ہوئی، اس کے بعد شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور انہیں سے عربی، فارسی، حدیث، فقہ اور منطق وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، طب کی تعلیم اپنے چچا حکیم غلام حیدر خان اور والد حکیم نبی خان سے حاصل کی، آپ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے، اس کے علاوہ علم نجوم اور فن موسیقی میں بھی دسترس رکھتے تھے، آپ ایک اچھے عامل بھی تھے، ۱۸۵۱ء میں دہلی میں وفات پائی۔

طبی حذاقت اور کارنامے

ایک مرتبہ حکیم مومن خان مطب میں مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے اپنی نبض حکیم صاحب کی طرف بڑھائی، حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیا اور کہا کہ: ان دواؤں کو عطار سے خرید لیں، کچھ روز بعد وہ شخص حکیم صاحب کے پاس آیا، حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر اس سے نسخہ مانگا، اس پر مریض تعجب کے انداز میں کہنے لگا کہ: اس نسخہ کو تو میں برابر دودن سے ابال کر پی رہا ہوں اور مجھے کافی فائدہ ہے اور میرا مرض اب تقریباً ختم ہو گیا ہے، آپ وہی نسخہ پھر مجھے لکھ کر دیں، تاکہ رہا سہا مرض بھی ختم ہو جائے، حکیم صاحب نے بجائے ناراض ہونے یا تعجب کرنے کے مریض کی فرمائش پر

وہی نسخہ پھر لکھ دیا اور شاگردوں سے کہا کہ: مریض کو اس نسخہ پر اعتماد ہو گیا ہے، اسلئے اگر میں ٹوکتا اور اس کی غلطی بتاتا تو پھر اس کو مزید فائدہ نہیں ہو سکتا تھا، اسلئے میں نے مریض کے اعتقاد کو مجروح نہیں کیا۔ (۱)

(۳۳) حکیم شیر علی بن حکیم محی الدین

حکیم شیر علی بن حکیم محی الدین صدیقی نے علم طب کی درسی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، اس کے بعد لکھنؤ میں حکیم امام بخش کی سرپرستی میں مطب شروع کیا اور پھر طبیب حاذق ہو کر نواب آصف الدولہ بہادر کے دور حکومت میں تحصیل داری اور فوجداری کی؛ لیکن بڑھاپے میں گوشہ نشین ہو گئے، نہایت متقی و صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، ہر وقت ذکر و اذکار میں مشغول رہتے تھے، آپ کے نسخے میں دوا کے اجزاء بہت کم ہوتے تھے، مریض کو دیکھنے گھر نہیں جاتے تھے، مطب سے جو آمدنی ہوتی اسے غرباء میں تقسیم کر دیتے تھے۔

۱۸۴۰ء میں بخارا و اسہال کے عارضے میں چند روز مبتلا رہ کر ۵۷ سال کی عمر میں وفات پائی، سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں یادگار چھوڑیں، بیٹوں میں ہر ایک طبیب حاذق تھا۔

طبی خدمات اور حذاقت

ایک مرتبہ لوگ ایک بچے کو حکیم شیر علی احمد آبادی کے پاس لائے، یہ بچہ کان کے درد کی وجہ سے بے ہوش تھا اور جب ہوش آیا تو کہتا تھا کہ کوئی چیز میرے کان میں کاٹ رہی ہے، حکیم صاحب نے فرمایا کہ: حقہ کی نلکی لائی جائے تو اس کو انہوں نے اس کو قلم کی طرح چھری سے تراشا جو ان کے قلم دان میں تھی، اور اس بیمار بچہ میں لگادی، اور دوسری طرف جلتا ہوا ایک فٹیلہ رکھ دیا، ذرا دیر نہ ہوئی تھی کہ بچہ کا درد رفع ہو گیا، جب نلکی کو زمین پر مارا تو اس میں ایک ہزار پایہ جسے کھن کھجورہ کہتے ہیں باہر نکلا جسے دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔

(۳۴) حکیم کفایت اللہ (ولادت ۱۸۰۰ء)

حکیم کفایت اللہ ولد حکیم علیم اللہ امر وہ ضلع مراد آباد کے محلہ کوٹ میں ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے، عربی علوم و فنون مفتی شرف الدین رامپوری سے اور طب اپنے والد سے پڑھی، تشخیص میں گویا الہام ہوتا تھا، معالجہ میں یکتائے زمانہ تھے، نسخہ اکثر قلیل الاجزاء لکھتے اور غرباء کے لئے دوائیں مفت دیتے تھے، بعض کتب درسیہ پر حواشی بھی لکھے، مگر کوئی تصنیف طبع نہیں ہوئی، جملہ والیان ملک ان کی صحبت چاہتے تھے، اور رؤساء ضلع باادب گفتگو کرتے تھے، زیر علاج مریضوں کے قیام و طعام کا انتظام بھی کرتے تھے، ان کے والد حکیم علیم اللہ بھی طب میں امام وقت تھے اور انہوں نے حکیم جلال الدین امر وہوی سے طب کی تعلیم حاصل کی اور حکیم جلال الدین، حکیم علوی خان دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، حکیم علیم اللہ نوابین رامپور سے متعلق رہ کر زیادہ تر رامپور میں ہی رہے، اور بہت نیک نامی و شہرت پائی، حکیم اعظم خان ان کی علمی و عملی شخصیت سے بہت متاثر رہے، ”قربادین اعظم“ میں گیارہ مقامات پر ان کے معمولات کا بطور خاص ذکر کیا ہے، حکیم کفایت اللہ مرحوم نے دو فرزند حکیم حکمت اللہ اور حکیم رفعت اللہ یادگار کے طور پر چھوڑے۔ (۱)

طبی حذاقت و مہارت کے واقعات

رامپور میں عبد النبی ولد جنگی خان دق میں مبتلا ہو کر حکیم محمد کفایت اللہ خان (۱۸۰۰-۱۸۵۴ء) کے علاج میں آیا اور آپ کے علاج سے مکمل طور پر صحت یاب ہوا مگر حکیم صاحب نے ہدایت فرمائی کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جماع سے پرہیز ضروری ہے، ایک شب پیانہ صبر لبریز ہوا اور ہدایت پر عمل جاری نہ رہ سکا، رات ہی میں سخت طبیعت خراب ہوئی، صبح قارورہ لے کر حکیم صاحب کے پاس بھیجا گیا، آپ نے قارورہ دیکھا اور نسخہ لکھ دیا، نسخہ عطار کے پاس پہنچا، عطار حیران تھا کہ دوا کیا دے، اس میں تو کفن و دفن کا سامان لکھا ہے، اعزہ گھر آئے تو مریض سفر آخرت پر روانہ ہو چکا تھا۔ (۲)

(۳۵) حکیم محمود خان دہلوی

حکیم محمود خان بن حکیم صادق علی خان بن حکیم شریف خان ۱۸۱۶ء میں اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ء-۱۸۳۷ء) کے عہد میں دہلی میں پیدا ہوئے، طب کی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم غلام محمد اور اپنے والد حکیم صادق علی خان سے حاصل کی، آپ نہایت حاذق طبیب اور ماہر جنسیات تھے، آپ کا مطب مرجع خلألق تھا، دن رات مریضوں کا ہجوم رہتا ہے، باوضع بزرگ، اور غرباء پرور تھے، مطب میں امیر و غریب کی کوئی تفریق نہیں تھی، آپ کے مزاج میں کافی غصہ تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نہایت عابد و زاہد متقی و تہجد گزار بھی تھے، جنسی مسائل پر آپ نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس سلسلے میں آپ کی دو مشہور تصنیفات بھی ہیں، ”ضیاء الأبصار فی حدة الباقۃ“ اور کارنامہ ”عشرت“، حکیم محمود خان نے ۱۸۵۷ء کا پر آشوب زمانہ بھی دیکھا تھا، اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں، آپ نے ۱۳۰۹/۱۸۹۱ اور بقول بعض ۱۹۰۰ء میں دہلی میں وفات پائی، ان کی ایک کتاب ”مطب محمود خان“ کے نام سے بھی ہے۔

طبی حذاقت و مہارت کے واقعات

حکیم محمود خان صاحب کے پاس ایک مریض آیا، اس کے سر میں شیدید درد تھا، اور وہ کافی پرانا ہو چکا تھا، کسی بھی علاج سے دور نہیں ہوتا تھا، حکیم صاحب نے تشخیص مرض کے لئے مریض سے مختلف سوالات کئے، مریض نے بتایا کہ درس سے پہلے ناک سے خون آیا تھا، حکیم صاحب سمجھ گئے کہ سر کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے، اور اسی وجہ سے یہ شکایت ہے، آپ نے بہدانہ بھگو کر اور اس میں مصری ڈال کر بوقت صبح استعمال کرنے کو کہا، دو تین روز تک استعمال کرنے کے بعد مریض کی ناک سے خون کے جھے ہوئے لوتھرے خارج ہوئے، جب تمام خون خارج ہو گیا تو مریض کو کافی سکون محسوس ہوا اور اس کا برسوں کا درد دوسرے دور ہوا۔

(۳۶) حکیم عبدالولی بن حکیم عبدالعلی لکھنوی

یہ ۱۸۷۱ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد مولوی سید مقیم رائے بریلوی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اعلیٰ تعلیم مولوی افہام اللہ فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، اور طب کی تعلیم اپنے والد حکیم عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ اور چچا عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، اس کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، عام روش سے ہٹ کر حکیم صاحب نے اپنے درس میں عبارت کے بجائے مسائل طبیہ پر روشنی ڈالنے اور ان پر بحث و گفتگو کرنے کو اپنا شعار بنایا تھا، آپ کے شاگردوں میں بہت مشہور علماء بھی شامل تھے مثلاً: امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ، حکیم عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ، اور حکیم عبدالحسید دریابادی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، حکیم صاحب کے ساتھ بہت تعاون کیا، آپ انتہائی خلیق، ملنسار اور مہمان نواز تھے، کل ۴۱ سال عمر پائی اور ۱۹۱۴ء میں استسقاء میں مبتلا ہو کر وفات پائی اور لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ (۱)

طبی حذاقت و مہارت

حکیم عبدالولی صاحب کی طبی حذاقت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکیم عبدالولی کے مطب کے سامنے روزانہ ایک غیر مسلم بزرگ گذرتے، اسی راستہ سے گوشتی ندی میں اشنان کے لئے جاتے تھے، اور واپسی میں حکیم صاحب کو تعظیماً سلام ضرور کرتے تھے، ایک دن وہ اپنے بھائی کے ساتھ اسی طرح سلام کرتے ہوئے گذرے تو حکیم صاحب انہیں دیکھ کر چونک پڑے اور ارے..... کہہ کر ایک دم خاموش ہو گئے، گھر پہنچنے کے بعد ان صاحب کا انتقال ہو گیا، ان کے بعد ان صاحب کے بھائی حکیم صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ: جب اس دن ہم آپ کے سامنے گذرے تھے آپ چونک کیوں گئے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتے ہیں، اس کی کیا وجہ تھی؟ اور میرا بھائی کا اس وقت گھر جا کر انتقال بھی ہو گیا، حکیم صاحب نے فرمایا کہ:

آپ کے بھائی کے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگا تھا اور وہ بالکل گیلا تھا، حالانکہ ندی سے آنے میں اسے خشک ہونا چاہئے تھا، میرے دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ ان صاحب کی حرارت غزیریہ بالکل فنا ہو چکی ہے اور اس کے باوجود وہ زندہ ہیں، لیکن یہ بات ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا اور حرارت غزیریہ کے اس قدر گر جانے کے بعد اس کا علاج بھی ممکن نہیں، اسلئے میں خاموش رہا۔ (۱)

(۳۷) شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خان آخوندزادہ

شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خان آخوندزادہ ۲۳ مارچ ۱۸۸۱ء کو ڈھاکہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، صرف و نحو کی تعلیم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، زیادہ تر درسیات و تعلیم مولانا محمد اسحاق بردوانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احمد حسن کانپوری رحمۃ اللہ علیہ، اور مولانا عبدالوہاب بہاری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں، حدیث مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ سے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد سے پڑھی، طب کی تعلیم مدرسہ طبیہ دہلی میں حکیم عبد المجید خان دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۰۱ء) سے حاصل کی، آپ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے، ۱۹۳۰ء میں حبیبہ طبی کالج کے نام سے ایک کالج کراہی کی عمارت میں قائم کیا، حکومت ہند نے آپ کو اپنی خدمات کی بناء پر ۱۹۳۹ء میں شفاء الملک کا خطاب دیا ۱۹۴۷ء میں آپ کا وصال ہوا۔

طبی خدمات و مہارت

ایک مرتبہ ایک شخص نے شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خان آخوندزادہ کو دکھایا پھر وہ مریض دہلی گیا اور وہاں جا کر اپنے مرض کے سلسلے میں مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب سے رجوع کیا، حکیم صاحب نے اس مریض سے پوچھا کہ: آپ کہاں سے آئے ہیں، اس نے کہا کہ: ڈھاکہ سے، اس پر حکیم اجمل خان نے فرمایا کہ کیا وہاں حکیم حبیب

الرحمن خان نہیں ہیں، پھر آپ نے نسخہ لکھ دیا اس نسخہ اور حکیم صاحب حبیب الرحمن خان کے نسخہ میں ذرہ برابر فرق نہیں تھا۔ (۱)

اسی طرح ۱۹۴۴ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ علیل ہوئے، اور ان کی کیفیت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ حکیم حبیب الرحمن خان رحمۃ اللہ علیہ کو بتائی گئی، حکیم صاحب نے نسخہ لکھ دیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا مرض بہت بڑھ گیا ہے، حکیم صاحب نے سنکر فرمایا کہ: اب دوا بیکار ہے؛ کیونکہ وقت آخر آ پہنچا، چنانچہ حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق کچھ دنوں کے بعد مولانا کا انتقال ہو گیا۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) مصنف سیرۃ النبی نے ایک مرتبہ ریڈیو پر تقریر کی، حکیم حبیب الرحمن خان نے ڈھا کہ میں وہ تقریر سنی اور سید صاحب کے پاس خط لکھ کر بھیجا کہ میں نے آپ کی آواز سنی جس سے ضعفِ قلب کا اظہار ہو رہا تھا، آپ جلد ہی اس کی طرف توجہ کریں، چنانچہ چند روز کے بعد علامہ ندوی کو ضعفِ قلب کا عارضہ ہوا؛ لیکن اللہ عزوجل نے شفاء عطا فرمائی۔ (۲)

(۳۸) حکیم عبدالحمید خان

آپ حکیم محمود خان کے صاحبزادے اور حکیم اجمل خان کے بڑے بھائی تھے، اور دہلی کے مدرسہ طبیبہ کے بانی تھے، آپ کا انتقال ۱۹۰۱ء میں ہوا اور درگاہ حضرت سید حسن رسول نما کے احاطے میں دفن ہوئے، آپ اپنے وقت کے بڑے عالم و فاضل ہوئے ہیں، والد بزرگوار سے فن طب کی تعلیم حاصل کی، اور انہیں کے زیر نگرانی مطب بھی کیا، آپ ہر معاملہ میں اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلے، مطب میں کافی مریض جمع رہتے تھے، آپ دہلی والوں کا بہت خیال رکھتے تھے، آپ کی طبی خدمات کے صلہ میں حکومتِ برطانیہ نے حاذق الملک کے خطاب سے نوازا تھا، آپ نے ۱۸۸۲ء میں مدرسہ طبیبہ کی بنیاد ڈالی جو آج یونانی اینڈ آیور ویدک کالج کے نام سے مشہور ہے، آپ اس

مدرسہ طبیبہ میں قانون کا درس دیا کرتے تھے۔

طبی حذاقت و مہارت

حکیم عبدالحمید خان کے پاس ان کے امتحان کے لئے ایک بار بھینس کا پیشاب لایا گیا اور ان سے کہا گیا کہ: یہ ایک عورت کا قارورہ ہے جو دہلی سے باہر رہتی ہے، اور علاج کے لئے آپ کے پاس نہیں آسکتی، آپ براہ کرم قارورہ دیکھ کر کوئی مناسب نسخہ تجویز فرمادیں:

”کھلی دوسیر، بنولہ ایک سیر، بھوسا بقدرِ ضرورت ہمہ در آب آمیختہ حل کردہ

بخور اندہ، اس نسخہ کو دیکھ کر وہ شخص جو قارورہ لایا تھا، چونکا کہ یہ کیا نسخہ

ہے، حکیم صاحب نے بغیر کسی ناگواری کے فرمایا کہ: آپ نے مجھے

قارورہ دکھایا ہے، اس کے مزاج کے مطابق یہی نسخہ مناسب ہے، یہ سن

کر وہ شخص شرمندہ ہوا، اور واپس چلا گیا۔ (۱)

(۳۹) مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان

خاندان شریفی کے چشم و چراغ ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۴ء میں بمقام شریف منزل دہلی ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے، پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر فارسی اور عربی کی طرف مائل ہوئے، آپ کے اساتذہ میں صدیق احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، مولوی عبدالحق صاحب تفسیر حقانی رحمۃ اللہ علیہ، مولوی عبدالرشید رحمۃ اللہ علیہ، اور مرزا عبداللہ بیگ رحمۃ اللہ علیہ کے نام کتابوں میں ملتے ہیں، طب کی ابتدائی کتابیں اپنے والد حکیم محمود خان سے اور برادرِ معظم سے اونچی کتابیں پڑھیں، اور دونوں ہی سے مطب سیکھا، اپنے اخلاق، جذبہ خدمتِ خلق، وضع داری اور متحمل مزاجی کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے، پنڈت نہروا نہیں دلی کا بے تاج بادشاہ کہا کرتے تھے، اور لارڈ میگنٹ آف انڈیا کا خطاب دیا گیا تھا، انگریزوں کی طرف سے حاذق الملک اور قوم کی طرف مسیح الملک کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

حکیم شریف دہلوی (۱۱۳۹ھ-۱۲۲۲ء) سے لے کر مسیح الملک حکیم اجمل خان

تک اطباء کا ملین کا بے حد خوب صورت سلسلہ بن گیا ہے، یوں تو اس خاندان کے ہر فرد نے طبابت اور تصنیفی و تالیفی کام کے ذریعہ نمایاں خدمات پیش کی ہیں، لیکن محمد شریف خان کے بعد مدرسہ طبیبہ دہلی کے بانی حکیم عبدالجید دہلوی اور ان کے برادرِ معظم حاذق الملک کی طبی خدمات زیادہ اہم ہیں، ان کے بعد حکیم محمود خان اور حکیم واصل خان نے اپنے آباء کے ذریعہ ڈالی گئی طبی ارتقاء کی بنیاد کو عمارت کی شکل دینے میں بے نظیر کارنامے انجام دئے خاص طور سے حکیم محمود خان کا تعاون قابل ذکر ہے، مسیح الملک حکیم اجمل خان انہیں محمود خان کے ہونہار فرزند تھے۔

مطب

حکیم اجمل خان رحمۃ اللہ علیہ کا مطب اپنے دور کا بہت مشہور مطب تھا، سستی اور مفید دوائیں آپ کے نسخہ کا جزو ہوتی تھیں، اپنی مقبولیت کی وجہ سے حکیم صاحب کا مطب ہمیشہ مریضوں سے بھرا رہتا تھا، نبض اور قارورہ سے تمام امراض نہایت کامیابی سے تشخیص کرتے تھے۔ (۱)

طبی حذاقت کے واقعات

ایک مریضہ بلگرام سے دہلی آئیں، ان کے پتہ میں پتھری ہو گئی تھی، حالت یہ تھی کہ تمام بدن پر پھوڑے نکل آئے تھے، بدن کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا تھا، آنکھوں میں تیرگی تھی اور پیشاب بھی سیاہ ہوتا تھا، لکھنؤ میڈیکل کالج میں اور دوسرے ڈاکٹروں اور طبیعوں کا مدت تک علاج کرایا گیا، لیکن ذرا بھی فائدہ نہیں ہوا، ڈاکٹروں نے بالاتفاق آپریشن کی رائے دی اور کہا کہ: اس کے علاوہ علاج کی کوئی صورت نہیں ہے، لیکن مریضہ کمزور ہے اس کے لئے آپریشن خطرناک ہوگا، کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی، مریضہ سب طرف سے مایوس ہو کر دہلی چلی گئیں، اور ۲ ماہ تک مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے زیر علاج رہیں اور کامل تندرست ہو کر واپس گئیں، واپسی پر لکھنؤ میں سول سرجن کو دکھایا گیا تو ان کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا مرض بغیر آپریشن کے کیسے دور ہو گیا؟ (۲)

۱۹۲۴ء میں ایبٹ آباد کے قیام کے دوران وہاں کے فوجی اسپتال کے سرجن حکیم اجمل خان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، اور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کیا، حکیم صاحب کو ہسپتال کے تمام شعبوں کا معائنہ کروایا، سرجن صاحب نے تین مریضوں کو حکیم صاحب کے سامنے بغرض تشخیص پیش کیا، حکیم صاحب نے نبض دیکھی اور بغیر حال سننے کے بعد دیگرے ہر مریض کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی، ان میں ایک سلی کا مریض تھا، دوسرا کینسر کا اور تیسرا ٹائیفیڈ کا، پہلے دو مریضوں کے سلسلے میں کہا کہ: یہ لاعلاج ہیں اور تیسرے کے بابت صحت یابی کی امید ظاہر کی، سرجن نے حیرت و استعجاب سے حکیم صاحب کی آراء کو سنا، اور معلوم کیا کہ آپ نے یہ حالات کیسے دریافت کئے، چنانچہ حکیم صاحب دو گھنٹے تک نبض کے تمام اصول اور اپنے تجربات بیان کئے، جس پر سرجن مسرت اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ فرمانے لگے کہ طب یونانی کا یہ حصہ واقعی نہایت دلچسپ اور مفید ہے، ہم ڈاکٹروں کو بھی چاہئے کہ اس فن میں دسترس حاصل کریں۔ (۱)

آپ کی تشخیص میں مہارت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے جسے ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے تاریخ کی کتب میں لکھا ہے، یہ حیرت انگیز اسپتال لندن میں ہاؤس سرجن تھے تو حکیم صاحب نے اسپتال کا معائنہ کیا اور آپ کی ملاقات سینئر سرجن ڈاکٹر اسلیلی سے ہوئی، انہوں نے حکیم صاحب کو دوسرے دن اسپتال آنے کی دعوت دی، حکیم صاحب جب پہنچے تو ڈاکٹر صاحب طالب علموں کے سامنے ایک مریض کو لٹا کر اسے مراحہ کے درم کا مریض بنا کر درس دے رہے تھے، حکیم صاحب نے مریض کو دیکھ کر یہ تشخیص کی کہ اس کے آنتوں کے ابتدائی حصہ میں زخم ہیں۔

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا: کل آپریشن کے وقت آپ بھی آئیں گے، اسی وقت یونانی اور ایلوپتھیک کا مقابلہ ہو جائے گا، آپریشن کے بعد حکیم صاحب کی تشخیص درست نکلی، ڈاکٹر نے حکیم صاحب کو اس کامیابی پر بہت مبارک باد دی۔ (۲)

طبی و سیاسی خدمات

آپ نے طب کی فلاح و ارتقاء کے لئے بے حد کوششیں کیں، اور اسی مقصد سے یورپ کا سفر بھی کیا، حکیم صاحب نے مدرسہ طبیہ دہلی کو جس کو ان کے بڑے بھائی نے قائم کیا تھا، مزید ترقی عطا کی، نصاب تعلیم میں تجدیدی کی اور اس میں آیورویدک تعلیم بھی شروع کی، سیاسی رہنماؤں اور حکومت وقت کے تعاون سے قرولباغ دہلی میں کالج کے لئے وسیع و عریض عمارت تعمیر کی، حکیم صاحب ویدوں اور حکیموں کے اتحاد کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم قائم کرنا چاہتے تھے، یونانی ادویہ کی تیاری کے لئے آپ نے ایک یونانی دواخانہ قائم کیا تھا، حکیم صاحب نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اسی سلسلہ میں گاندھی جی، راج گوپال، آچاریہ، بی آر آئند، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور دوسری اہم شخصیتوں سے بھی تعلقات تھے۔

حکیم صاحب کو شعر و شاعری سے بھی کافی دلچسپی تھی، اور رشید تخلص تھا، آپ کا کلام بڑا جاندار اور ادبی معلومات سے بہت بلند ہوتا تھا، آپ کی تصانیف اردو، عربی اور فارسی میں متعدد تھیں اور ملک میں معیاری رسائل میں آپ کے مضامین شائع ہوتے تھے، ”دکن ہو ہو“ میں بوعلی سینا پر آپ کے مقالات شائع ہو چکے ہیں، آپ کے معالجانہ نسخوں پر مشتمل کئے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں ”افادات مسیح الملک“ اور ”حاذق“ کے نام سے کتاب کافی مقبول ہو چکی تھی۔ ۶۴ سال کی عمر میں دسمبر ۱۹۲۷ء میں آپ کی وفات ہوئی اور درگاہ حضرت رسول نمادہلی میں دفن ہوئے۔

(۴۰) حکیم عبدالوہاب انصاری عرف نابینا

حکیم نابینا مرحوم مشرقی یوپی کے ضلع غازی پور قصبہ یوسف پور میں ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے، آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، آپ کے والد حکیم عبدالرحمن انصاری رحمۃ اللہ علیہ بھی بہت مشہور اور صاحب کمال عالم تھے، حکیم نابینا بچپن سے ہی چچک نکل آنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو گئے تھے، دس سال کی عمر میں قرآن شریف

حفظ کیا، ابتدائی صرف و نحو کی تعلیم اپنے وطن میں پائی ۱۸۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت پائی، عربی ادب مولانا فیض الحسن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا اور طب کی تعلیم حکیم عبدالحمید خان دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۰۱) سے حاصل کی، حکیم عبدالرزاق اور ہندوستان کے مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری بھی آپ کے بھائی تھے، تعلیم سے فراغت پا کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۲۸ء-۱۹۰۵ء) کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی، آپ تینوں بھائیوں کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۲۰ء) سے بھی بہت تعلق تھا، آپ سابق نظام حیدرآباد کے معالج خصوصی رہے، حیدرآباد اور دہلی کے امراء و رؤساء کے آپ خاص معالج تھے، خواجہ حسن نظامی نے لقمان الملک کا خطاب دیا، ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ بمطابق ۱۹۱۴ء میں دہلی میں وفات پائی وصیت کے مطابق جنازہ دہلی سے گنگوہ لے جایا گیا اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔

حکیم نابینا صاحب کی نباضی میں مہارت

حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا باوجود نابینا ہونے کے نباضی میں بہت ماہر تھے، ایک صاحب کے چچا مرض استسقاء میں مبتلا تھے، اور مراد آباد میں رہتے تھے، حکیم صاحب نے بذریعہ خط مریض کی حالت اور وہاں کے اطباء کی تشخیص معلوم کی، اور ان کے بھتیجے جو دہلی میں رہتے تھے کی نبض دیکھ کر ان کے چچا کی مزاجی کیفیت معلوم کر لی اور اسی کے مطابق نسخہ بھی تجویز کر دیا، کچھ دنوں کے بعد یہ دوائیں استعمال کر کے ان کے چچا اس مرض سے چھٹکارا پا گئے۔ (۱)

علامہ اقبال حکیم نابینا کی معالجانہ سوجھ بوجھ کے بہت معتقد تھے، ایک مرتبہ ان کے گردے میں پتھری ہو گئی، ڈاکٹر نے آپریشن کی رائے دی اور کہا کہ یہ آپریشن اگر ویانا میں ہو تو زیادہ بہتر ہے، دوستوں کے مشورے سے حکیم نابینا صاحب کا علاج شروع کیا، حکیم صاحب نے پتھری کی مخصوص یونانی دوائیں علامہ اقبال کو استعمال کروائیں اور اپنے مخصوص دواؤں کے صندوقچہ سے کشتہ حجر الیہود نکال کر دیا اور اسے استعمال کرایا،

ان دواؤں کے استعمال سے علامہ کی تکلیف دور ہوگئی، اور دوبارہ اکسیرے کرانے پر پتھری کا نام و نشان بھی نہیں دکھائی دیا۔ (۱)

دینی رنگ اور مذہبی مزاج

حکیم نابینا مرحوم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اور انہوں نے مرشد کی صحبت میں رہ کر باطنی کمال بھی حاصل کیا ہوا تھا، ان کا بیان ہے:

”ایک مرتبہ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ: اگرچہ میں نے ذریعہ معاش کے لئے طب پڑھ لی ہے، لیکن اطباء نبض کے علاوہ مریض کا چہرہ، قارورہ اور دوسرے مشاہدات کی مدد سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور میں بوجہ عدم بصارت اس سے محروم ہوں، میرے لئے دعاء فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری اس مشکل کو آسان فرمادے“

اس پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ تمہیں نباضی کی مہارت عطا فرمائے گا جس سے تم مریض کے امراض پر مطلع ہو جاؤ گے جن کو دوسرے اطباء مشاہدات سے معلوم کرتے ہیں۔“

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ:

میں شیخ کی اس کرامت کا روزانہ مشاہدہ کرتا ہوں، نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھ کو مریض اور مرض کی تمام کیفیتیں منکشف ہو جاتی ہیں“ (۲)

حکیم نابینا صاحب کو اپنے پیر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے اتنا تعلق تھا کہ وہ دیوبند، گنگوہ، اور یوسف پور کے کسی بھی مریض سے چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، کبھی بھی قیمتی دواؤں کی قیمت نہیں لیتے تھے، اس طرح علماء و صوفیاء سے بھی آپ نے کبھی قیمت نہیں لی، مطب میں ہر وقت مریض ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے، (۳) دینداری اور عبادت

(۱) اطباء اور ان کی مسیحاتی: ۱۸۸-۱۸۹

(۲) تاریخ دارالعلوم: ۶۲۰

(۳) تاریخ دارالعلوم: ۶۲۰

گذاری کا یہ عالم تھا کہ اکثر چلہ میں بیٹھ جاتے اور تین تین دن یا سات دن مطب سے کنارہ کش ہو کر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتے، ان کی غیر موجودگی میں آپ کے صاحبزادگان مریضوں کو دیکھتے، جب حکیم صاحب عبادت سے فارغ ہو جاتے اور صاحبزادوں سے مریضوں کا حال پوچھتے اور جب معلوم ہوتا کہ کسی کو فائدہ نہیں ہوا ہے تو نسخہ اپنے ہاتھ میں لے کر فرماتے کہ: یہی نسخہ دوبارہ استعمال کرو اس سے فائدہ ہوگا، چنانچہ اسی نسخہ سے مریضوں کو فائدہ ہوتا۔ (۱)

سچ تو یہ ہے کہ جو زبان ہر وقت لا الہ الا اللہ کہتے کہتے سوکتی نہ ہو اس سے نکلا ہوا کوئی جملہ یا جن ہاتھوں سے روزانہ تسبیح پر درود شریف اور اللہ کا ذکر ہزاروں مرتبہ کیا جاتا ہو اس ہاتھ سے لکھا ہوا کوئی نسخہ اپنے اندر کیوں نہ اثر رکھے۔

(۴۱) حکیم عبدالعزیز

آپ لکھنؤ کے نامور اطباء میں سے تھے، ان کو شیخ الرئیس ہند بھی کہا جاتا ہے، یہ حکیم محمد اسماعیل کے بڑے صاحبزادے تھے، علم طب اپنے دادا حکیم محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور چچا حکیم محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا، ۱۹۰۲ء میں آپ نے مدرسہ تکمیل الطب کی بنیاد ڈالی جو آج تکمیل الطب کالج میں تبدیل ہو چکا ہے، زمانہ کے بدلتے تیور دیکھ کر حکیم عبد العزیز نے طب یونانی کو دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس مدرسہ کا قیام عمل میں لایا، حکیم صاحب اپنے دور طالب علمی ہی سے علم تشریح کے ساتھ سرجری کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے، اسی ضرورت کے پیش نظر آپ نے اپنے دونوں لڑکوں حکیم عبدالرشید اور حکیم عبدالمعید کو سرجری میں کمال حاصل کرایا، ظاہر ہے کہ دو چار اطباء سے اتنے بڑے ملک کی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی تھی، اسی خیال سے حکیم صاحب نے جولائی ۱۹۰۲ء میں جھوئی ٹولہ لکھنؤ کے اپنے آبائی مقام میں تکمیل الطب کے نام سے ایک طبی درسگاہ قائم کی، شروع میں صرف خاندان کے اطباء ہی اس کا نظم

(۱) محدث گنگوہی: ۳۴-۳۵

ونسق و تدریسی کام انجام دیتے رہے، بعد میں یہ سلسلہ وسیع ہو گیا، اور باہر کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں، آج کل یہ کالج حکومت اتر پردیش کی تحویل میں سرگرم عمل ہے۔ حکیم صاحب کا طبی درس بھی کافی مقبول تھا، ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک افغانستان، بخارا، اور حجاز کے اطباء بھی شریک ہوتے تھے، آپ کے درس کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا لطف اللہ علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالحق خیر آباد رحمۃ اللہ علیہ جیسی بڑی شخصیتیں پابندی سے درس میں شریک رہتی تھیں۔

طبی حذاقت و مہارت

آپ کے معالجانہ تجربات سے متعلق متعدد واقعات کتابوں میں ملتے ہیں، ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ لکھنؤ کے نواب زادہ کو چچک نکلے جس میں حالت بہت خراب ہوئی، اطباء اور ڈاکٹروں کا جگمگٹ تھا، کئی اطباء نے نسخے لکھے، حکیم عبدالعزیز نے نسخہ دے کر کافور کا اضافہ کر دیا، اطباء کو بڑی حیرت ہوئی، بعض نے مضر بتاتے ہوئے کافور کی سخت مخالفت کی، حکیم صاحب نے مدلل طور سے فرمایا کہ: بخار کی شدت کی وجہ سے سمیت پیدا ہو گئی ہے، لہذا اتر یاق کی حیثیت سے کافور کی ضرورت ہے، چنانچہ دوسرے ہی دن سے فائدہ شروع ہو گیا۔ (۱)

ایک دوسرا واقعہ یوں ہے کہ حکیم صاحب کے مطب میں ایک لڑکا آیا، ساتھ ہی لوگوں نے یہ بتایا کہ یہ بغیر دستہ کے چاقو نکل گیا ہے، ممکنہ علاج کے بعد ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا تھا، مگر لڑکے کے والدین آپریشن کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے، حکیم صاحب کی رائے لی گئی، آپ نے ایک چھٹانک پارہ دودھ میں پلویا اور آدھے گھٹنے تک اس سے چہل قدمی کروائی، تھوڑی دیر کے بعد اس نے ناف کے درد کی شکایت کی تو آپ نے حقنہ کرایا، تیسری دفعہ حقنہ کرانے کے بعد پہلے چاقو کا پھل نکل آیا، پھر پارہ نکل آیا۔

طبی مناقشہ

حکیم صاحب کے زمانے میں دہلی اور لکھنؤ دو اہم طبی اسکول تھے، جو اہم سمجھے جاتے تھے، ان دونوں میں اکثر فنی امور میں مناقشہ چلتے رہتے تھے، حکیم صاحب اور حکیم عبد المجید خان کے درمیان مٹّ دماغ کی جس کے متعلق کافی دنوں تک بحث چلتی رہی، دونوں طرف سے متعدد رسائل شائع ہوئے، اس کے علاوہ طب کی تعلیمی زبان، کشتوں کا جواز و عدم جواز، حکیموں کے ساتھ ویدوں کی شمولیت جیسے بہت سے معاملات میں اختلاف پایا جاتا تھا، لکھنؤ والے حکیموں کے ساتھ آیور ویدک واولس کی شمولیت کے مخالف تھے، چنانچہ طبی اینڈ آیور ویدک کانفرس کا اکثر بائیکاٹ کرتے تھے، اس طرح طب کے ساتھ طب جدید کی تعلیم کے تسلط کو بھی لکھنؤ کے اطباء کے لئے خطرہ سمجھتے تھے، مفردات کے وزن کے سلسلہ میں لکھنؤ اور دہلی میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔

(۴۲) ڈاکٹر مقبول علی حیدر آبادی (م: ۱۹۵۴ء)

انگلستان کے فارغ (ننگنڈہ میں سول سرجن رہے) بیوی (ویسٹ انڈیز) بھی سول سرجن، وظیفہ کے بعد مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ میں مطب کرتے، جہاں اس وقت کے دانشور روزانہ جمع ہوا کرتے، مغرب کا وقت ہوتا تو امام کے لئے مجھے آگے کر دیتے یہ کہہ کر طالب علم کا درجہ اونچا ہے، رمضان میں دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب نے صرف نمک سے روزہ کھولا، نماز پڑھی اور مطب میں آ بیٹھے، ایام بیض کے بھی روزے رکھتے تھے، (اگرچہ فل سوٹ پہنتے اور کلین شیور ہتے) ماتحتین کو بھی سلام میں خود پیش قدمی کرتے، غریب مریضوں کی رقمی امداد کرتے۔ (پروفیسر میر محفوظ علی صدیقی - ایران)

موسم سرما میں سخت سردی میں دونوں میاں بیوی فٹ پاتھ پر سونے والے فقیروں پر کبل اڑھا دیتے۔

(۴۳) ڈاکٹر عبدالمنان حیدر آبادی (م: ۱۹۷۱/۷/۲۰۰۹ء)

وہ غریبوں کی نہ صرف مفت تشخیص کرتے ہیں؛ بلکہ (اپنے گھر کے قریب کی)

میڈیکل شاپ کو اشارہ بھی دیتے ہیں کہ دوا کی قیمت میرے ذاتی حساب میں شامل کر دی جائے، ہم نے ان کی قیام گاہ پر یہ بھی دیکھا کہ پرانے شہر (حیدرآباد) سے کوئی مریض ان کے پاس آیا ہے اور وہ اس سے پوچھ رہے ہیں کہ دوا ہنگی ہے کیا خرید سکو گے؟ اور وہ مریض پچھٹی پچھٹی آنکھوں سے عرض حال کرتا ہے کہ میں آپ کے ہنگے تک ہی قرض لے کے آیا ہوں تو اس بات پر ڈاکٹر صاحب دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ میڈیکل شاپ کو اشارہ دیتے ہیں کہ، ہم نے بسا اوقات یہ بھی دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب مریض کو آمد و رفت کا خرچ بھی دے رہے ہیں (روزنامہ سیاست، جہاں دارا فرس)۔ (۱)

نامور طبیبات

علوم و فنون کی نشر و اشاعت اور ترویج و ارتقاء میں خواتین نے مردوں کے دوش بدوش گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، کوئی بھی میدان ہو، اس میں ان کے کارنامے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح علم طب بھی ان کی خدمات سے محروم نہیں ہے۔

تاریخ میں طبیبات کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے، لیکن اس کا سبب خواتین کی نااہلی نہیں بلکہ مواقع کا عدم حصول ہے، عورتوں کا دائرہ کار عام طور پر گھر کی چار دیواری ہوتی ہے، پہلے کے ادوار میں کہیں بھی تحصیل علم کے مواقع حاصل نہیں ہوتے تھے، اسلئے کہ تحصیل علم کے لئے دور دراز کے اسفار کرنے پڑتے تھے، اور اگر کسی ماہر فن کی صحبت نصیب بھی ہو جاتی تو اس کے بعد خدمت کے مواقع بہت کم ملتے تھے، لیکن اس کے باوجود تاریخ طب کے تقریباً ہر دور میں طبیبات کا تذکرہ ملتا ہے، اور طبی میدان میں ان کی خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔

تاریخ طب کی ابتداء اسعلیوس اول سے کی جاتی ہے، اسعلیوس کو شیروں (chiron) کا شاگرد بتایا گیا ہے، شیرون (۱۱۳۳ ق م) نے صحت کے کچھ اہم اصول بیان کئے تھے، اسی وجہ سے اہل یونان اسے صحت کا دیوتا پولوں کا بیٹا کہتے ہیں۔

(۱) سب کے لئے، مؤلف ابن غوری: ۹۶-۹۷، آئی جی، پبلیشرس، حیدرآباد

اسعلیوس کے ساتھ یونانیوں کے یہاں صحت کی دیویوں کے نام بھی ملتے ہیں، ایک ہانچیا اور دوسری پاناسا یہاں ایک بات قابل ذکر ہے اہل یونان بعض انسانوں کے کارناموں کی بنیاد پر انہیں دیوتا یا دیوتا کا بیٹا قرار دیتے تھے، اسلئے عین ممکن ہے کہ ان دونوں خواتین نے طب و صحت کے رہنما اصول دیئے ہوں، جس کی بنیاد پر انہیں صحت کے دیویاں قرار دیا گیا ہو۔

طب اسلامی کے فروغ میں مسلم خواتین کا کردار بھی تاریخ طب کا روشن ورق ہے، عہد رسالت میں صحابیات میدان جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کا فریضہ انجام دیتی تھیں، حضرت ام سلیم، ام متاع، ام عطیہ اور لیلیٰ کو مرہم پٹی کرنے میں خاص مہارت تھی، حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت اسماء علاج و معالجے میں مشہور تھیں، حضرت رفیدہ الانصاریہ جراحی میں ماہر تھیں، مسجد نبوی کے صحن میں ان کے لئے خیمہ نصب کیا گیا تھا، جس میں جراحی آلات اور سامان رکھے گئے تھے، خلافت بنی امیہ میں ایک خاتون طب بالخصوص امراض چشم کی ماہر تھیں، اندلس میں حفید ابوبکر کی ہمشیرہ اور بھانجی کو طب میں خاص کر معالجہ نسوانی میں کمال حاصل تھا، دونوں خلیفہ کے حرم میں علاج کیا کرتی تھیں، اندلس ہی میں قاضی ابوجعفر کی بیٹی ام الحسن بہت اچھی طبیبہ تھیں، مغل حکمران شاہجہاں کے عہد سلطنت میں سستی النساء کو علاج و معالجے میں ید طولی حاصل تھا، قرطبہ میں عورتیں باقاعدہ مطب کیا کرتی تھیں، قرون وسطی کے بعض مسلم شفا خانوں میں نرسوں کو بھی تعینات کیا جاتا تھا۔

طب میں مسلمانوں کے نمایاں اور امتیازی کارنامے:

(۱) طب قدیم میں مسلمانوں نے جو اضافے کئے ہیں، ان کی فہرست طویل ہے، حکمائے یونان کو بعض بیماریوں کے بارے میں کوئی علم نہ تھا، اطباء اسلام نے نہ صرف ان امراض کا پتہ چلایا؛ بلکہ ان پر سائنسی انداز میں بحث کی، چچک اور خسرہ کے بارے میں ابوبکر رازی نے سب سے پہلے بحث کا آغاز کیا، ان کے بعد قیروان کے مسلم طبیب ابن الجزار نے زاد المسافر میں اس مرض کی تفصیل

بیان کی، طاعون کے متعلق حکمائے یونان نے خاموشی اختیار کی تھی، لسان الدین ابن الخطیب (۷۶۷-۷۷۳/۱۳۱۳-۱۳۷۳ء) نے طاعون کے بارے میں وضاحت کی کہ اس مرض کے تعدیہ کا وجود تجربے، مطالعے اور حواس کی شہادت سے قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے، نیز معتبر اطلاعات سے ثابت ہے کہ یہ مرض بیماروں کے کپڑوں، برتنوں اور کانوں کی آویزوں کے استعمال اور ایک گھر کے آدمیوں سے دوسرے مقامات پر پھیل گیا، مزید برآں طاعون زدہ علاقے سے آئے لوگ جب غیر متاثرہ بندرگاہ پر پہنچے تو وہاں بھی بیماری پھیل گئی، اسپین کے ابن خاتمہ (المتوفی: ۷۷۱/۱۳۶۹ء) نے طاعون کے موضوع پر اپنے رسالے میں (جسے میکس میر ہاف نے یورپ کے ان تمام رسالوں سے حد درجہ فائق کہا ہے جو اس موضوع پر چودھویں اور سوٹھویں صدی کے درمیان تحریر کئے گئے) واضح الفاظ میں کہا کہ میرے طویل تجربے کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی طاعون زدہ مریض کے ساتھ ربط رکھے تو اسے فوراً طاعون لاحق ہو جاتا ہے اور اس میں بھی وہی علامات ظاہر ہو جاتی ہیں، جو پہلے مریض میں ہوتی ہیں۔

(۲) مسلمانوں نے تخمین و قیاس کو رد کر کے مشاہدے کی اہمیت کو واضح کیا، ابو بکر رازی نے جالینوس کی متعدد غلطیوں کی نشاندہی کی اور کہا کہ جالینوس کی غلطیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے تجربے کے بجائے ریاضی پر بھروسہ کیا ہے، جالینوس نے بیان کیا ہے کہ عظیم العجز چھ ہڈیوں سے مرکب ہے، عبد اللطیف بغدادی (۵۵۷-۶۱۳ء) نے انسانی ڈھانچوں کا معائنہ کیا تو کئی دفعہ پتہ چلا کہ عظیم العجز میں صرف ایک ہڈی ہوتی ہے، چنانچہ انہوں نے اپنی تصنیف ”کتاب الإفادة والاعتبار“ میں صاف صاف کہا کہ سنی ہوئی باتوں کے مقابلے میں مشاہدہ زیادہ قوی دلیل ہے، جالینوس کی فنی قابلیت مسلم مگر مشاہدہ زیادہ صحیح ہوتا ہے۔

(۳) علاج و معالجے میں مسلمانوں نے یونانی طبیوں کے برخلاف بعض نئے

اور کامیاب طریقے دریافت کئے، مثلاً ابن واند نے علاج بالغذاء کی اہمیت پر زور دیا، ”اوحّد الزمان ابو البرکات“ (۷۶۰-۷۷۷/۱۰۷۷-۱۱۲۵) نے ایک وبائی بیماری میں قطع انال کا علاج ایجاد کیا، ”ابو المنصور صاعد بن بشیر بن عبدوس“ نے یونانیوں کے برعکس امراض بارہ فاج، لقوہ اور استرخاء میں ادویہ بارہ، اور منع غذا کا علاج اختراع کیا، نیز یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے جراحی میں داغ دینے کا آغاز اور یرقان کا علاج دریافت کیا، جنون کے علاج میں سب سے پہلے افیون کا استعمال کیا اور سر پر ٹھنڈے پانی کے گرانے کی ابتداء کی، معدے سے ردی فضلات کے اخراج کے لئے سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی انبوب معدہ (stomach tube) سے کام لیا، جس کا آغاز بانس کی نالی سے کیا گیا، موتیابند کے لئے آپریشن کرنا بھی عربوں نے ایجاد کیا اور جراحات کے آپریشن بھی مسلمانوں نے ہی اختراع کیا، ول دوران کے مطابق ان دنوں یورپ والوں کے نزدیک جراحی آپریشنوں کے لئے قرطبہ پسندیدہ مقام تھا، سب سے پہلے چچک کا ٹیکہ مسلمانوں نے رائج کیا، ۱۶۲۹ء میں ترکی میں چچک کی تعلق کا طریقہ عام تھا، ڈرپہر کے مطابق ۱۷۱۲ء میں یورپ کی لیڈی میری وارٹلی کا ٹیکہ قسطنطنیہ آئی تو اس نے ٹیکہ لگانے کا طریقہ سیکھا، مگر جب وطن واپس گئی تو وہاں کے پادری برا فروختہ ہو گئے۔

(۴) حکمائے اسلام نے ادویات کی طرف بھی توجہ کی اور یونان کے ذخیرہ ادویات میں سینکڑوں نئی دواؤں کا اضافہ کیا، انہوں نے چین، جزائر شرق الہند، ملایا اور ہندوستان سے جڑی بوٹیوں حاصل کر کے یونانی علم ادویہ کا دامن وسیع کیا، بنج ریوند، کافور اور سنا کے افعال و خواص دریافت کئے اور علاج میں بھنگ کے استعمال کی ابتداء کی، کیمیاوی مرکبات تیار کر کے انہیں طب میں استعمال کرنے کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر جاتا ہے، علاوہ ازیں یہ مسلمان ہی تھے، جنہوں نے مرکب ادویہ کی تیاری میں سب سے پہلے شکر کا استعمال کیا، شکر سازی کے معمل

تیار کئے اور شکر بنائی۔ ول دوران طب میں مسلمانوں کے کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ادویات کے قدیم ذخیرے میں صحرائیں عربوں نے عنبر، کافور، تاج، لونگ، پارہ، سنا اور لوبان جیسی اشیاء کا اضافہ کیا، دواسازی میں نئے مرکبات شربت اور جلاب متعارف کرائے، مشرق قریب کے ساتھ اطالوی تجارت کی ایک اہم خصوصیت عربی ادویات کی درآمد تھی، سب سے پہلے مسلمانوں نے عطاریوں کی دکانیں اور دواخانے کھولے، عہد وسطیٰ میں دواسازی کا اولین مدرسہ قائم کیا گیا اور فن ادویہ سازی کے موضوع پر شاندار کتابیں لکھیں، مسلم اطباء غسل بالخصوص حمیات میں اور وہ بھی بھاپ کے غسل پر جوش و کیل تھے، چچک اور خسرے کے علاج کے لئے ان ہدایات میں لئے آج بھی اضافہ کرنا مشکل ہے، بعض جراحی آپریشنوں میں تنفس کے ذریعے بیہوش کرتے تھے، گہری نیند کے لئے حبشیش اور دوسری ادویات کا استعمال کیا جاتا۔ (۱)

طب میں اطباء اسلام کے چند امتیازات:

۱۔ نئی نئی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں بہت سے اطباء سرگرداں رہے، ان لوگوں نے دور دور کے سفر کئے اور نئی نئی جڑی بوٹیاں تلاش کیں، ایسے لوگوں میں سب سے زیادہ ممتاز ناضیاء الدین ابن بیطار (م ۱۲۴۸) کا ہے، وہ مسلم اسپین کا باشندہ تھا، نئی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں یہ اپنے وطن سے باہر نکلا اور مصر اور ایشیا کو چک بشمول ترکی اور شام کے دورے کر کے نئے نئے پودے جمع کئے جن کی تعداد چودہ تھی، اس زمانے میں جب کہ سفر بہت دشوار گزار ہوا کرتا تھا، یہ بہت مشقت آمیز اور بے مثل کام تھا، اسی وجہ سے ابن بیطار کو دنیا کے طب کا عظیم ترین ماہر الادویہ مانا جاتا ہے۔

نئے نئے ادویاتی عناصر جو دریافت کئے گئے اور دواسازی میں آج بھی مستعمل ہیں ان میں سے چند خاص اجزاء درج ذیل ہیں:

کافور، ریوند چینی، مشک، گوند، املتاس، جاکفل، سنا، بھنگ، میٹھا تیل، اور صندل کی لکڑی۔

۲۔ امراض کی تشخیص کے چار اہم ذرائع: نبض شناسی، قارورہ بینی، آنکھوں کی رنگت یونانی اطباء کے وضع کردہ تھے، نبض شناسی ہندوستان اور چین میں بھی رائج تھی، اس زمانے میں ان کے علاوہ مزید طریقے وضع کرنا ممکن نہیں تھا، اس لئے اطباء اسلام نے بھی ان ہی چاروں ذرائع پر تکیہ کیا، البتہ ان طریقوں میں طبیبانہ مہارت کو ان لوگوں نے درجہ کمال تک پہنچا دیا، ان کی مہارت کے بہت سے واقعات تاریخ طب کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں، ہم ان میں سے چند مثالوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

☆ قارورہ کی رنگت اور اس کا قوام دیکھ کر بعض اطباء یہاں تک بتا دیا کرتے تھے کہ وہ مرد کا ہے یا عورت کا، عورت کا ہے تو وہ عورت حاملہ ہے یا غیر حاملہ، حاملہ ہے تو اس کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ لڑکا ہے یا لڑکی، طبقات الاطباء کا مصنف ابن ابی صبیحہ لکھتا ہے کہ ایک بار عباسی خلیفہ مہدی کی کنیز خیزران نے اپنا قارورہ اپنے وقت کے طبیب عیسیٰ المعروف ابو قریش کو معائنہ کئے لئے بھیجا، ابو قریش نے قارورے کا معائنہ کر کے یہ تشخیص کی کہ خیزران حاملہ ہے، اور اس کے شکم میں نمونپانے والا بچہ لڑکا ہے، ولادت کے بعد طبیب کی تشخیص صحیح نکلی، بچہ مہدی کی معروف اولاد موسیٰ کہلایا۔

خیزران جب اگلی بار حاملہ ہوئی تو پھر اس نے اپنا قارورہ ابو قریش کے معائنہ کے لئے بھیجا، ابو قریش نے قارورہ دیکھ کر تشخیص کی کہ خیزران کے پیٹ میں نمونپانے والا بچہ لڑکا ہے، اس کی یہ تشخیص بھی صحیح نکلی، وہی بچہ ہارون الرشید کہلایا اور خلافت عباسیہ کا نامور خلیفہ ثابت ہوا۔

☆ قارورہ شناسی کا ایک واقعہ ساتویں صدی ہجری کے ایک مصری طبیب مہذب الدین عبدالرحیم بن علی کا ہے، وہ مصر کے سلطان ملک العادل کے شاہی طبیبوں میں سے تھا، ابن صبیحہ نے وہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ایک دن طبیب مہذب الدین عبدالرحیم بن علی سلطان الملک العادل کے دروازے پر موجود تھے کہ ایک خادم کسی کنیز کا قارورہ دکھانے آیا، کچھ درد کی شکایت تھی، اطباء نے قارورے کا معائنہ کر کے نسخہ لکھ دیا، مگر طبیب مہذب الدین نے قارورہ دیکھ کر کہا کہ کنیز کو جو درد ہو رہا ہے اس میں قارورہ کا یہ رنگ نہیں ہونا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ یہ رنگ مہندی کا ہو (یعنی مہندی کا رنگین پانی قارورہ میں ملا دیا گیا ہو) خادم نے بالآخر مہندی کے پانی کی ملاوٹ کا اعتراف کر لیا اور وہ طبیب مہذب الدین کی قارورہ شناسی پر بے حد متحیر ہوا، ملک العادل کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو طبیب پر اس کا اعتقاد اور بھی بڑھ گیا۔

ابن ابی صبیحہ نے ابن اصم نامی ایک اندلسی طبیب کی قارورہ شناسی کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ محض قارورہ دیکھ کر مریض کا حال، اس کی تکلیف اور اس نے کیا غذا لی ہے سب کچھ بتا دیا کرتا تھا۔

نبض شناسی کی اسی اہمیت کی بناء پر ابن سینا نے بھی نبض کی اقسام کو القانون میں بہت ہی شرح اور بسط سے بیان کیا ہے اور نبض شناسی پر اس کا بیان ۱۰۳ صفحات پر محیط ہے۔

☆ بہت سے سلاطین اپنے دربار میں طبیب مقرر کرنے سے پہلے اس کی مہارت کا امتحان اس کی نبض کے ذریعہ لیا کرتے تھے، اسی قسم کے ایک امتحان کا واقعہ یہ ہے کہ مصر کے سلطان ملک الکامل نے اپنے ایک طبیب رشید الدین ابو حلیقہ کی نبض شناسی کا امتحان لینے کا ارادہ کیا اور اس غرض سے وہ طبیب کے مطب میں مستورات کے پردے کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا، باری آنے پر سلطان نے اپنا ہاتھ پردے کی اوٹ سے باہر نکالا تو طبیب نے نبض دیکھ کر یہ بھی پہچان لیا کہ یہ

سلطان ملک الکامل کی نبض ہے، اور کہا کہ: ”سلطان بھگد اللہ تندرست ہیں“ یہ سن کر سلطان کو بہت حیرت ہوئی۔

اس سے پتہ چلا کہ نبض شناسی ایک ایسا علم ہے جس سے نہ صرف مرض کی بلکہ مریض کی شناخت بھی کی جاسکتی ہے۔

☆ نبض شناسی عوارض کے علاوہ نفسیاتی عوارض کی تشخیص میں بھی بہت کام آتی ہے، نفسیاتی عوارض میں اس کی افادیت کا اندازہ ایک اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ان حکیم رشید الدین ابو حلیقہ کے ہی مطب میں ایک عورت اپنے بیٹے کی لامعلوم بیماری کا علاج کرانے آئی، حکیم صاحب نے لڑکے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور دفعۃً اپنے ملازم کو آواز دی کہ ذرا میری فرجیہ دے، تاکہ میں پہن لوں فرجیہ ایک قسم کی قبا کو کہتے ہیں اور یہ نسوانی نام بھی ہے، حکیم صاحب نے دیکھا کہ فرجیہ کا لفظ سنتے ہی لڑکے کی نبض یکا یک بے حد متغیر ہو گئی اسے حکیم صاحب نے قیاس کر لیا کہ ہونہ یہ لڑکا فرجیہ ناک کی کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے، حکیم صاحب نے اپنی تشخیص سے لڑکے کی ماں کو آگاہ کیا تو اس نے تصدیق کی کہ یہ لڑکا فرجیہ نامی ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے۔

حکیم عبدالوہاب انصاری معروف بہ حکیم نانیا بھی نبض شناسی میں خوب مہارت رکھتے تھے، وہ دور کے رشتہ دار کی نبض دیکھ کر بھی مریض کے احوال اور بیماری کا پتہ دیتے تھے جیسا کہ ان کے احوال میں مذکور ہوا۔

نباضی نے مسلم طب میں اتنی ترقی کر لی تھی کہ مختلف اطباء نے اس پر کتابیں لکھیں، ان میں سے امام فخر الدین رازی کی کتاب ”فی النبض“ بہت مشہور ہے۔

☆ امراض کی تشخیص میں قارورہ شناسی یا نباضی کام نہ آتی تو ذہانت کو کام میں لانے کی کوشش کرتے تھے، ذہانت کے ذریعہ مرض کی تشخیص کے متعدد واقعات تاریخ طب کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

ابن اصرم نامی اندکی طبیب، اس کے مطب میں ایک مریض لایا گیا جس کے سوتے میں ایک سانپ پیٹ میں گھس گیا تھا اور دھڑکا کچھ حصہ باہر نکلا رہ گیا تھا، مریض ہول میں مبتلا تھا کہ سانپ نے اگر اسے ڈس لیا تو وہ ہلاک ہو جائے گا، تیمارداروں نے سانپ کے دھڑ میں رسی باندھ دی تھی تاکہ سانپ مریض کے پیٹ میں پورے کا پورا داخل نہ ہو جائے، ابن اصرم نے رسی کاٹ دی جس سے پورا سانپ مریض کے پیٹ میں داخل ہو گیا پھر اس نے کچھ جڑی بوٹیوں کو پانی میں ابالا اور گرم گرم مریض کو پلایا، اس کے پینے سے سانپ مر گیا، اس کے بعد ابن اصرم نے کچھ دوسری دوائیں ابال کر پلائیں اور کہا کہ ہضم معدہ کے ساتھ ان دواؤں سے سانپ پک جائے گا، دو گھنٹے تک وہ انتظار کرتا رہا، اس کے بعد قئے آور ادویہ پلائیں جس سے مریض کو قی ہوئی، سانپ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر باہر آ گیا اور مریض صحت یاب ہو گیا۔

☆ ۱۹۵۱ء میں مغربی بنگال کے گورنر کے یہاں ایک بڑی دعوت دی، گورنر کے جواں سال بیٹے مہمانوں سے گپ شپ کر رہے تھے کہ دفعتاً ان کی زبان منہ سے باہر نکل آئی اور پھر کسی طرح بھی اندر نہیں گئی، گورنر نے کلکتہ کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو بلوایا مگر وہ سب کے سب ناکام رہے، ناچار گورنر نے عام منادی کرادی کہ جو کوئی طبیب علاج کرانے کی تدبیر رکھتا ہو وہ فون پر اطلاع دے، اس کے لئے فوراً گاڑی بھیج دی جائے گی، یہ اعلان سن کر کلکتہ کے ایک ضعیف العمر مسلمان حکیم نے گورنر ہاؤس فون کر کے مریض کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، گورنر صاحب نے فوراً گاڑی بھیج دی، حکیم صاحب نے گورنر ہاؤس جاتے ہوئے راستے میں دو عدد لیموں خریدے، گورنر ہاؤس پہنچ کر انہوں نے مریض کے کمرے سے تمام لوگوں کو باہر بلایا، پھر ایک لیموں کی دو قاشیں کر کے ایک قاش گورنر کے لڑکے کی زبان پر نچوڑ دی، پھر دوسری قاش نچوڑ دی، پھر دوسرے لیموں کی قاشیں نچوڑیں، لڑکے نے لیموں کی ترشی کی شدت سے بے اختیار زبان اندر کھینچ لی، اس

کا میابی پر گورنر بہت خوش ہوئے اور انہیں ایک مکان تحفے میں دیا، اس واقعہ پر حکیم صاحب کی شہرت کی دھوم مچ گئی۔

☆ نبض شناسی سے بھی شاید بڑھ کے یہ امر ہے کہ اس عہد کے اطباء امراض کی پیش بینی کر لیا کرتے تھے، امراض کی پیش بینی یا پیش آگہی میں ایک نہیں متعدد اطباء نے شہرت حاصل کی۔

پیش آگہی کا ایک واقعہ ابن ابی صبیحہ نے بیان کیا ہے کہ بغداد میں قصر خلافت کے ایک افسر مہمانداری کو ایک بار بہت بڑی دعوت کا انتظام سپرد ہوا، دعوت دروز پہلے اس کا ایک بہت محنتی ملازم بیمار پڑ گیا، افسر مہمانداری نے بغداد کے مشہور طبیب ابو الحسن حرانی کو طلب کیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ دعوت سے پہلے پہلے ملازم شفا یاب ہو کے ڈیوٹی پر آجائے، اگر دو دن کے اندر وہ شفا یاب ہو گیا تو طبیب کو انعام و اکرام دیا جائے گا، طبیب نے یہ سن کر کہا کہ بہتر ہے کہ مریض کو بیماری کے ایام پورے کرنے دیئے جائیں، اگر وقت سے پہلے اسے شفا یاب کرانے کی کوشش کی گئی تو مریض سال بھر کے بعد پھر بیمار پڑ جائے گا، اس وقت کوئی دوا کام نہ کرے گی، یہ انتباہ سن کر بھی افسر مہمانداری کی اپنی فرمائش پر قائم رہا، ناچار طبیب نے ملازم کا علاج شروع کیا جس سے وہ دو دن کے اندر اندر شفا یاب ہو کر ڈیوٹی پر آ گیا، افسر مہمانداری بہت خوش ہوا اور طبیب کو خوب انعام و اکرام سے نوازا، مگر ٹھیک سال بھر بعد ملازم پھر بیمار پڑا، طبیب کی پیش آگہی کے عین مطابق کوئی دوا کام نہ آئی اور ملازم انتقال کر گیا، اس معجز نما آگہی کو دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

☆ پیش آگہی کا ایک اور واقعہ عباسی خلیفہ منصور کے طبیب خاص ابن الجلاج کے بارے میں مشہور ہے، اس نے خلیفہ کے مکہ معظمہ کے سفر کے دوران خلیفہ کے بارے میں ذمہ داروں کو مطلع کر دیا تھا کہ خلیفہ کی بیوست بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، وہ بہت جلد دماغ کی خشکی کے مرض میں مبتلا ہوگا، اس سفر کے دوران وہ

جب فہد کے مقام تک پہنچے گا تو حالت مرض میں مبتلا ہوگا اور مکہ معظمہ پہنچے گا تو اس کا انتقال ہو جائے گا حقیقتہً ایسا ہی ہوا۔

☆ پیش آگاہی کے سلسلہ میں یہ واقعہ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد کا ہے کہ اس کی ایک بہن بانو بیمار پڑی، اس نے عیسائی طبیب ماسویہ ابو یوحنا کو طلب کیا، اس نے مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد خلیفہ کو بتایا کہ مریضہ پرسوں، تین گھڑی سے نصب شب تک کے دوران انتقال کر جائے گی۔

دنیاۓ اسلام میں اور بھی بہت سے اطباء گزرے ہیں جو پیش آگاہی میں معروف ہوئے، ابن ابی صبیحہ نے اندلس کے طبیب ابن عبد ربہ، مصر کے ابن عین زربی، اور شام کے مہذب الدین عبد الرحیم بن علی کے تذکرے کئے ہیں۔

☆ پیش آگاہی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قارورہ شناسی کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ ایک بار موصل کے ایک امیر حسام الدین نے جبرئیل بن بخشوع کو اپنے علاج کے لئے طلب کیا اور جب شفایاب ہو گیا تو ایک خاتون کو علاج کے لئے دکھلایا جو کسی خطرناک مرض میں مبتلا تھی، جبرئیل نے مریضہ کا قارورہ دیکھ کر پیش گوئی کی کہ وہ تین دن میں صحت یاب ہو جائے گی، وہ حقیقتاً تین دن میں صحت یاب ہو گئی۔

جالینوس نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جو عربی میں ترجمہ ہوئی جس کا نام ”نوادیر تقدمة المعرفة“ تھا۔

۳۔ اطباء اسلام اس بات کا پوری طرح شعور رکھتے تھے کہ صحت مند رہنے کے لئے عمدہ آب و ہوا اور صفائی و ستھرائی بہت ضروری ہے، اسی وجہ سے شہروں میں بڑے بڑے حمام ہوا کرتے تھے تاکہ عوام الناس کو نہانے کی سہولت دستیاب ہو، اسپتال کی تعمیر کے لئے جگہ کا انتخاب کرنے میں عمدہ آب و ہوا کا خاص رکھا جاتا تھا، اس سلسلے میں عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانے کا بہت مشہور واقعہ ہے اور ابن ابی صبیحہ نے بیان کیا ہے

خلیفہ نے بغداد میں شفا خانے کی نئی عمارت تعمیر کرانے کا ارادہ کیا تو آب

وہو کے لحاظ سے موزوں جگہ کا انتخاب کرنے کے لئے رازی سے مشورہ طلب کیا، موزوں جگہ معلوم کرنے کے لئے رازی نے بغداد کے مختلف علاقوں میں تازہ گوشت کے ٹکڑے کھمبوں پر آویزاں کر دیئے، چند دنوں بعد یہ سب ٹکڑے اتارے گئے، جس علاقے کے گوشت میں سب سے کم سرانڈ پیدا ہوئی تھی اس جگہ کو زکریا رازی نے شفا خانے کی تعمیر کے لئے تجویز کیا، پھر اسی جگہ شفا خانے کی نئی عمارت تعمیر ہوئی۔

۴۔ اطباء اسلام نے طب اور دوا سازی کو ایک دوسرے سے علاحدہ کر دیا تھا، طبیب کا کام صرف امراض کی تشخیص اور نسخہ نویسی رہا، دوا تیار کرنا باقاعدہ طور پر ایک جداگانہ پیشہ بن گیا، اس کی شروعات بغداد سے ہوئیں، پھر دوسرے بڑے شہروں میں بھی وداخانے ہونے لگے۔

قیروان کے مشہور طبیب احمد ابن الجزار کے یہاں بھی طب و دوا سازی علاحدہ علاحدہ ہوا کرتی تھی، وہ صرف نسخہ تجویز کرتے، مریض کو دوا دینے کے لئے عطار سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔

۵۔ دوا سازوں کے اوپر محتسب (Inspectors) مقرر کئے گئے، وہ دوا سازی کی معیار بندی کیا کرتے تھے، حکیم محمد سعید Cyril Elgood کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ محتسب دوا خانوں کو پہنچ کر یہ دیکھا کرتے تھے کہ دوا ساز اپنے فن سے اچھی طرح واقف ہیں یا نہیں، وہ دوا سازی کے برتنوں کا بھی معائنہ کیا کرتے، برتن اگر بہت پرانے یا بدبودار ہوتے تو وہ انہیں تلف کر دیا کرتے تھے، بعض اوقات وہ خود کھڑے ہو کر دوا سازی کی نگرانی کرتے، عطاروں کے لئے لازمی ہوتا تھا کہ وہ کسی مستند ماہر ادویہ مخزن الادویہ میں تجویز کئے ہوئے نسخوں سے ہی دوا تیار کیا کریں، جس زمانے میں محتسب مقرر ہوئے اس زمانے میں صبور بن سہل اور ابن البیان کے مخزن الادویہ مستند مانے جاتے تھے۔

۶۔ طبابت کے لئے اطباء کی سند یافتگی بھی لازمی تھی، اسے عباسی عہد خلافت میں

لازمی قرار دیا گیا، سند یافتگی کے ضابطے کے نفاذ کا سبب ابن ابی صبیحہ نے یہ بیان کیا کہ خلیفہ مقتدر باللہ کے عہد حکومت ۳۱۹ھ/۹۲۱ء میں خلیفہ کو اطلاع ملی کہ شفا خانہ مقتدری میں داخل ایک مریض اطباء کی غلطی سے ہلاک ہو گیا ہے، یہ اطلاع سن کر خلیفہ نے بغداد کے بڑے طبیب سنان بن ثابت کو ہدایت دی کہ وہ اطباء کا امتحان لیں، اور طبابت کی اجازت صرف ایسے اطباء کو دیں جو امتحان میں کامیابی حاصل کر لیں، خلیفہ نے شفا خانہ مقتدری کے حکام کو بھی احکام بھیجے کہ آئندہ سے صرف ایسے اطباء کو اس میں ملازم رکھا جائے جنہوں نے امتحان میں کامیابی کی سند حاصل کر لی ہو، اس حکم کی تعمیل میں سنان بن ثابت نے اطباء کے امتحان لینے اور کامیاب ہونے والے آٹھ سو اطباء کو اسناد عطا کیں۔

۷۔ امراض کے تخصص (specialization) کی بنیاد ڈالی گئی، ابتداء میں بچوں کے امراض اور مستورات کے پوشیدہ امراض کے تخصصات قائم کئے گئے اور ان پر علاحدہ علاحدہ کتابیں لکھی گئیں، امراض چشم کو بھی تخصص کی حیثیت دی گئی، بہت سے حکماء نے پوری عمر صرف امراض چشم کے علاج کے لئے خود کو مختص کئے رکھا اور اس پر کتابیں لکھی۔

۸۔ جراحات کو بھی بہت ترقی دی گئی اور ایسے امراض کی جراحات کے طریقے ایجاد ہوئے جن میں قدماء کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ پہلے جراحی کا پیشہ جہانوں کا کام اور حقیر اور بچ سمجھا جاتا تھا، مسلم اطباء نے اسے اونچا پیشہ بنادیا، مسلمان اطباء سے پہلے ایک شخص پال آف ایجانا نظر آتا ہے جس نے طبیب کی حیثیت سے اس فن کی طرف توجہ دی، مسلمان اطباء میں ابو القاسم زہراوی، عمار موصلی نے اسے بہت ترقی دی، ان دونوں نے ایسے امراض کی جراحات کی ابتداء کی جن کا علاج دوا کے بجائے صرف آپریشن کے ذریعے ممکن تھا مگر جو فن جراحی کی پسماندگی کی وجہ سے ناقابل علاج بنے ہوئے تھے۔

آپریشن کے ذریعے جن امراض کا علاج کیا گیا وہ یہ ہیں:

بچوں کے سر میں جمع ہونے والے پانی کو نکالنے کے لئے، ناک کے اندر بڑھے ہوئے گوشت کو کاٹنے کے لئے، ناک کے ناسور کے لئے، مسوں کے لئے، بڑھے ہوئے لوزتین کے لئے، پتھری نکالنے کے لئے، وضع حمل کے لئے، ناور کے لئے، آنکھ کے کئی اور امراض کے لئے، کان کے ناسور کے لئے، استسقاء کے مریض کے پیٹ کا پانی نکالنے کے لئے، گردے کی پتھری نکالنے کے لئے اور مثانہ کے زخم کے لئے۔

سرجری میں زہراوی کے امتیازی کارناموں میں سے ایک بھی ہے کہ اس نے گرم لوہے سے داغ کر (By Cauterization) چھین قسم کے زخموں کا علاج تجویز کیا، ان میں ناسور چشم، ورم جگر، امراض طحال، بواسیر، امراض رحم، عرق النساء، درد پشت، نقرس، جذام اور سرطان شامل ہیں۔

آپریشنوں کے لئے اس نے جراحی کے آلات بھی ڈیزائن کئے، ان کی تعداد ۲۰۹ بیان کی جاتی ہے، خاص خاص آلات میں مختلف قسم کی قینچیاں، چمچے (Forceps) چاقو، نشرت (scalpels) اور آنکڑے (Hooks) وغیرہ شامل ہیں، قینچی کے بارے میں کہا جاتا ہے جراحات میں پہلی بار اسے زہراوی نے ہی استعمال کیا۔

۹۔ حفاظتی ٹیکوں کی ایجاد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کہاں ہوئی، ایک روایت یہ ہے کہ اس کی ایجاد ہندوستان میں ہوئی، مگر ڈاکٹر ایس صابر علی لکھتے ہیں:

چچک کا ٹیکہ ۱۶۷۹ء کے لگ بھگ ایک ترک مسلمان کی دریافت ہے، وہاں سے ترکی میں مقیم برطانوی سفیر کی بیگم کے ذریعہ اٹھارہویں صدی میں یورپ میں متعارف ہوئی، یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ملکوں میں جدا جدا طور پر دریافت ہوا، ایک روایت یہ ہے کہ اس کام میں اولیت ہندوستان کو ہی حاصل ہے، مگر وہاں ٹیکے ایجاد نہیں ہوئے تھے؛ بلکہ چچک کے مریض کی کھرنڈ صحت مند انسان کے جسم پر مل دی جاتی تھی جس اس میں مامونیت پیدا ہو جاتی تھی۔

۱۰۔ اطباء اسلام نے طب میں حسن اخلاق کو غیر معمولی اہمیت دی، ماضی میں اس کی نظیر قابل ذکر طور پر بقراط کے یہاں ملتی ہے جس نے فارغ التحصیل ہونے والے اطباء کے لئے ایک عہد نامہ مرتب کیا تھا جو آج بھی مشہور ہے، اطباء اسلام نے حسن اخلاق کے معیار کو بہتر بنایا، اس کام کے سلسلے میں فاطمی عہد حکومت کے مشہور طبیب علی بن رضوان (م ۴۵۳ھ ۱۰۶۱ء) کو بڑا امتیاز حاصل ہے، اس نے طبی اخلاقیات کے سات زریں اصول وضع کئے۔

علی بن رضوان کے مرتب کردہ ضوابط اخلاق درج ذیل ہیں:

☆ طبیب جسمانی ساخت میں کامل، صحیح الاعضاء، ذہین، خوش فکر، دانشور، یادداشت میں عمدہ اور خیر پسند ہو۔

☆ لباس اور خوشبو عمدہ ہوں۔

☆ مریضوں کے رازوں کو بالکل پوشیدہ رکھے، ان کی بیماری کی کوئی بات ظاہر نہ کرے۔

☆ مریضوں کی صحت یابی کی خواہش حصول زر کی خواہش سے زیادہ اور فقراء کے علاج میں دلچسپی امراء کے مقابلے میں زیادہ رکھتا ہو۔

☆ تعلیم کا شید اور لوگوں کے مفاد میں زیادہ سوچتا ہو۔

☆ سلیم القلب، پاک نظر، صادق الکلام ہو، عورتوں کا اور بڑے لوگوں کے گھروں میں دولت کا انبار دیکھ کر اس کا خیال تک دل میں نہ لائے، چہ جائے کہ ان میں سے کسی شے سے تعرض کرے۔

☆ امین ہو، جان و مال کے حق میں معتمد ہو، کوئی مہلک دوا تجویز نہ کرے، نہ اس کی خبر دے، اسقاط حمل کے لئے نسخہ تجویز نہ کرے، دوست کی طرح دشمن کا علاج بھی سچی نیت سے کرے۔

۱۱۔ پوری دنیائے اسلام میں شفا خانوں کا جال بچھا دیا گیا، جیسا کہ اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

۱۲۔ بعض خوردنی اشیاء مثلاً چربی، کلیجی اور نمک وغیرہ کے مضر صحت اثرات سے واقف کرایا۔

۱۳۔ متعدد لاعلم امراض کی پہلی بار شناخت کی۔

۱۴۔ تشریحات (اناٹومی) اور فعلیات (فزیالوجی) میں مفید معلومات کا اضافہ کیا۔

اطباء اسلام قلب اور دوران خون کے امراض اور ان کی وجوہات کے بارے میں گہری واقفیت رکھتے تھے، انسانی جسم کے اعضاء کی تشریحات (اناٹومی) میں ان اعضاء کے علاوہ شریانوں، وریدوں اور شعریوں (capillaries) کا علم بھی رکھتے تھے، خون کی ساخت کے بارے میں بھی کافی حد تک واقف تھے، فشار الدم (بلڈ پریشر) اور اس کے نقصانات سے بھی آگاہی رکھتے تھے، پتلے خون اور گاڑھے خون کے فرق اور ان کے نقصانات سے بھی کافی حد تک واقف تھے، فشار الدم (بلڈ پریشر) اور اس کے نقصانات سے بھی آگاہی رکھتے تھے کہ یہ مہلک ہو سکتا ہے، فشار الدم ان کی اصطلاح میں امتلاء دموی کہلاتا تھا، یعنی جسم میں خون کا زیادہ ہونا، آنکھوں کی سرخی اس مرض کی ایک عام پہچان تھی، اس کا علاج یونانی زمانے سے فصد کھول کر خون کی کچھ مقدار خارج کرنا تھا۔

خلیفہ ہارون کے عہد حکومت میں ان کے فرزند مامون الرشید کے خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا جس کی وجہ سے ان پر غشی طاری ہو گئی، اور وہ قریب المرگ ہو گئے، دربار خلافت کے عیسائی طبیب جبرئیل بنخیشوع نے فوراً فصد کھول کر خون کی کچھ مقدار خارج کی جس سے مامون صحت یاب ہو گئے۔

☆ کلیجی اور نمک کے کثرت استعمال سے ہونے والے نقصانات کا تجزیہ اب جب کہ موجودہ اطباء نے کیا ہے جس کو قدیم اطباء نویں صدی عیسوی سے ہی جانتے تھے، خون کے گاڑھے پن سے پیدا ہونے والے اس ظاہری موت کو طب کی اصطلاح میں سکتہ دمویہ کا نام دیا گیا، یعنی وہ جو خون کی وجہ سے طاری ہوا، سکتہ دمویہ اور مریض کی ”حیات نو“ کے کئے واقعات طب کی کتابوں میں منقول ہیں:

ابن ابی صبیحہ نے بیان کیا ہے کہ طبیب ابوالحسن ثابت بن ابراہیم حرانی اور ان کے رفیق طبیب سنان بن ثابت راستے سے گزر رہے تھے کہ ایک شخص کو تقریباً روزانہ کلیجی بھونٹتے دیکھتے جسے وہ شخص کھاتا رہتا تھا، ایک دن یہ دونوں گزرے تو وہ نظر نہیں آیا معلوم ہوا کہ رات اس کا انتقال ہو گیا، یہ دونوں اطباء یہ سن کر رک گئے اور اس کے گھر جا کر اہل خانہ سے درخواست کی کہ وہ اس کی تجہیز و تکفین کے انتظامات تھوڑی دیر کے لئے روک دیں، پھر ان دونوں نے اس کی فصد کھولی، اس سے نہایت یعنی گاڑھا خون نکلنے سے مریض اٹھ کر بیٹھ گیا۔

☆ خون کے پتلا ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی امراض سے بھی قدیم اطباء واقف تھے اور اس کا علاج کرنا بھی جانتے تھے، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ مستقی باللہ (م ۵۷۵ھ) کے دربار کے ایک طبیب امین الدولہ بن تمیز کے پاس جو شفا خانہ عضدی میں بڑے عہدے پر فائز تھے، ایک مریض لایا گیا، اسے خون کا پسینہ آ رہا تھا، امین الدولہ نے اس بیماری کی یہ وجہ تشخیص کی کہ مریض کا خون پتلا ہو گیا ہے اس لئے وہ جلد مسامات کے ذریعہ باہر نکل آ رہا ہے، اس نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ مریض کو بھنے ہوئے بیگن کے ساتھ جو کی روٹی کھلائی جائے، اس سے مریض شفا یاب ہو گیا۔

غیر مسلم اطباء کے ساتھ فراخ دلانہ برتاؤ

مسلم طب کی تاریخ کا بیان نامکمل رہے گا اگر اس امر کا جائزہ پیش نہ کیا جائے کہ اسلامی حکومتوں کا اور دیگر اہل اسلام کا رویہ غیر مسلم اطباء کے ساتھ کس قسم کا تھا، ان کے رویہ سے غیر مسلم اطباء کی پیشہ وارانہ سرگرمیوں کو آیا سہولتیں حاصل ہوئیں یا ان کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

طب میں ان اطباء کے ساتھ اہل اسلام کا میل جول اور ربط و ضبط پہلی صدی ہجری میں ہی شروع ہو گیا تھا، اس کا ثبوت ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے: آنحضرت ﷺ نے ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنی بیماری پر مدینہ کے عیسائی طبیب

حارث بن کلدہ سے علاج کرانے کا مشورہ دیا تھا، کیوں کہ وہ مدینے کا سب سے بڑا طبیب تھا اور اس نے طب کی تعلیم ایران کے شہر جندی شاپور کے طبی مدرسے سے حاصل کی تھی۔

غیر مسلم اطباء اور علماء کے رابطے کی دوسری صورت ان سے مروجہ علوم کی کتابیں، ان کی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرانے کی شکل میں نکلی۔

اولین غیر مسلم اطباء سے جن اطباء سے مسلمان خلفاء اور سلاطین نے علاج و معالجے کے لئے رجوع کیا وہ تیا ذوق، اور جورجس بن جبرئیل تھے، تیا ذوق کو حجاج بن یوسف نے اپنے علاج کے لئے طلب کیا تھا اور اس کے علاج سے شفا پائی تھی اس لئے اسے مستقلاً اپنے دربار میں رکھ لیا اور اس کے لئے بھاری مشاہرہ مقرر کیا۔

جورجس بن جبرئیل کو اپنے علاج کے لئے دوم عباسی خلیفہ منصور (۹۵ء تا ۱۵۸ء) نے بغداد طلب کیا تھا، اس وقت وہ جندی شاپور کے شفا خانے کا رئیس الاطباء تھے، اس کے علاج سے منصور شفا یاب ہو گیا، جورجس ایک مدت تک خلیفہ کے دربار میں رہا اور جب مرض الموت میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے جندی شاپور واپس گیا تو اپنے پیچھے اپنے عیسائی شاگرد عیسیٰ بن شہلا چھوڑ گیا، عیسیٰ بن شہلا کو اس کے لالچی پن کی وجہ سے خلیفہ نے واپس ایران بھیج دیا اور جورجس کے بیٹے بختیشوع کو بلا کر درباری طبیب مقرر کیا، وہ زمانہ خلیفہ ہارون الرشید کا تھا، بختیشوع کے بعد اس کے بیٹے جبرئیل کو عباسی خلافت میں درباری طبیب مقرر کیا گیا کیوں کہ وہ اپنے والد سے بھی زیادہ بڑا طبیب تھا اور ۳۳ سال ہارون کی وفات تک درباری طبیب رہا۔

ان طبیبوں کو دربار میں اتنا گراں قدر مشاہرہ دیا جاتا تھا کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، ابن ابی صبیحہ لکھتا ہے کہ جبرئیل کا سالانہ مشاہرہ ایک لاکھ بیس ہزار درہم تھا۔

جبرائیل کی وفات کے بعد بختیشوع بن جبرئیل دربار خلافت کا طبیب ہوا، وہ زمانہ خلیفہ مامون الرشید کا تھا اسے بھی گرانقدر مشاہرہ ملتا تھا، اس لئے وہ اپنے گھر میں

خلیفہ متوکل کے معیار کے قائلین بچھاتا تھا۔

مختیشوع بن جبرئیل کے بعد جبرئیل بن عبید اللہ مختیشوع درباری طبیب ہوا، وہ زمانہ خلیفہ مقتدر باللہ کا تھا، غرضیکہ عیسائی اطباء یکے بعد دیگرے عباسی خلفاء کے دربار میں مقرر ہوتے اور بھاری تنخواہیں پاتے۔

غیر مسلم اطباء کے ساتھ ایسی فراخ دلی اموی اور عباسی دور کے خلفاء کے یہاں ہی روا نہیں رکھی گئی تھی بلکہ دنیائے اسلام میں مختلف النوع حکومتیں اندلس، تیونس اور مصر وغیرہ میں جو قائم ہوتی رہی ہیں ان میں بھی ویسی ہی فراخ دلی روا رکھی جاتی رہی، ان کا فراخ دلانہ طرز عمل اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ علم پروری کی مساعی میں بھی اور معاشرے میں اپنی صلاحیت کے لحاظ سے اپنا اپنا مقام حاصل کرنے کے معاملے میں اسلام میں تعصب پسندی جائز نہیں رکھی گئی، عباسی عہد خلافت کا زمانہ ساڑھے پانچ صدیوں پر محیط ہے، اور دور حکومت کی اتنی غیر معمولی طوالت حکمران خاندانوں کے ذہن، خیالات اور انداز فکر کو کچھ سے کچھ کر دیتی ہے مگر علمی بے تعصبی کے معاملے میں زمانے کی طوالت ذرا اثر انداز فکر کو کچھ سے کچھ کر دیتی ہے مگر علمی بے تعصبی کے معاملے میں زمانے کی طوالت ذرا اثر انداز نہ ہو سکی، ثابت ابن قرہ کو عباسی دربار میں اتنا قرب حاصل ہوا کہ لوگ اسے بھی مسلمان سمجھنے لگے، اور شاید یہ حکمرانوں کی بے تعصبی کا اثر تھا کہ ثابت ابن قرہ کی اولادیں سنان بن ثابت، ابراہیم بن سنان بن ثابت وغیرہ مشرف باسلام ہو گئیں۔

تیونس میں خاندان غالبہ کی حکومت قائم ہوئی تو اس کے عہد حکومت میں ایک یہودی طبیب اسحاق بن سلیمان نے اپنا وطن چھوڑ کر تیونس میں سکونت اختیار کر لی، وہاں سلطان زیادة اللہ کے دربار میں رسائی حاصل کی، اس نے طب کی تعلیم بھی ایک مسلمان طبیب اسحاق بن عمران سے حاصل کی تھی، اس نے طب کچھ کتابیں بھی لکھیں جن میں سے ایک کتاب ”الحمیات“ (بخاروں کے موضوع پر) کے بارے میں بلند پایہ مسلمان طبیب علی بن رضوان مصری نے بہت تعریفی تبصرہ کیا۔

ایک اور یہودی طبیب ابوالخیر سلامہ بن مبارک نے بمشرا بن فاطم سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

عبیدیوں کے عہد (۹۰۹ء تا ۱۱۷۱ء) میں بھی جو فاطمین مصر کے نام سے مشہور ہیں مسلمان اور غیر مسلم اطباء کے درمیان رواداری اور عدم امتیاز کی پالیسی قائم رہی، عیسیٰ اور سعید نامی عیسائی اطباء عبیدی حکمرانوں کے درباری طبیب تھے، یوسف نصرانی (م ۹۸۴ء) بھی عبیدی عہد حکومت میں ابھرا، یعقوب بن اسحاق نامی ایک یہودی طبیب عبیدی حکمرانوں کا درباری طبیب تھا، ابوکشیار افرانیم بن الحسن اسرائیلی ایک عبیدی حکمران مستنصر کا درباری طبیب بنا، اس نے بھی طب کی تعلیم علی بن رضوان سے حاصل کی تھی۔

ان مثالوں سے امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ گویا عیسائیت اور یہودیت دونوں اسلام کے سب سے بڑے حریف تھے اس کے باوجود علم پروری کے شعبے میں بلاد اسلامیہ میں عیسائیوں اور یہودیوں دونوں مذاہب کے لوگوں کو پھلنے پھولنے کے پورے پورے مواقع حاصل تھے۔

مذہبی بے تعصبی کی وجہ سے مسلمان اطباء نے غیر مسلم اطباء کی شاگردی اختیار کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کیا، مثلاً فلسطینی مسلمان طبیب ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ساعد تمیمی نے طب کی تعلیم بیت المقدس کے ایک قبطی راہب ابن زکریا بن ثواب سے حاصل کی، ایسا ہی اندازہ سامی حمارنا کی ایک تحریر سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ جس میں اس نے لکھا ہے کہ ابن ربن طبری کی کتاب فردوس الحکمت زکریا رازی کی کتابیں الحاوی اور المنصوری اور ابن سینا کی القانون کے اہم مآخذ یونانی اطباء کی وہ کتابیں ہیں جو اسکندریہ میں مرتب ہو کر شائع ہوئیں اور نویں صدی عیسوی میں عربی زبان میں ترجمہ کی گئی تھیں۔

مسلمان اطباء نے ہندوستانی اطباء سے بڑی فراخ دلی سے استفادہ کیا اور ان سے فلسفہ اور نجوم وغیرہ کے علاوہ طب کا علم بھی حاصل کیا، خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں

در بار خلافت میں ہندوستانی اطباء میں سے ایسے ایسے ماہر اطباء بھی تھے جن کا مقابلہ یونانی اطباء کرنے سے عاجز تھے، مثلاً ہارون الرشید کا چچا زاد بھائی ابراہیم بن صالح کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوا، دربار کے مشہور یونانی طبیب جبرئیل بن مختشویع نے جواب دیا اور خلیفہ کو بتایا کہ اب وہ چند لمحوں کا مہمان رہ گیا ہے، مگر ایک ہندی طبیب صالح بن بہلہ نے اس کا شرطیہ علاج کیا، اس نے کہا اگر مریض صحت یاب نہ ہو تو اس کی بیوی اور اس کی قیمتی املاک اس سے چھین لی جائیں، پھر اس نے علاج شروع کیا اور تھوڑی دیر میں مرض اٹھ کے بیٹھ گیا۔

اس کے علاوہ بیمارستانوں میں ہندوستان ہندو اطباء تھے جن کا تذکرہ ابن ابی صبیحہ نے کیا ہے۔

سائنس و طب میں دنیائے اسلام اور ہم عصر اقوام کا موازنہ (نویں صدی تا تیرہویں صدی)

دنیا اسلام میں سائنس کے عروج و کمال کی قدر و منزلت بہتر طور پر اس وقت سمجھی جاسکتی ہے جب مسلمانوں کی سائنسی ترقیات کا ان ہم عصر اقوام کے ساتھ موازنہ کیا جائے، مسلمانوں کی پر جوش سائنسی سرگرمیوں کا زمانہ نویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی تک کا ہے؛ لہذا ہم نے ان پانچ صدیوں کا موازنہ مرتب کیا ہے، یہ موازنہ مقداری نہیں بلکہ اعدادی ہے، مسلمان حکماء کی تعداد اور ان کا ہم عصر اقوام کے ساتھ موازنہ بین طور پر اس امر کا مظہر ہے کہ ان پانچ صدیوں میں مسلمان حکماء سائنس کے میدان میں تمام اقوام پر فائق تھے اور ان کا تفوق بہت بلند درجہ کا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ تاریخ سائنس کے مصنفین کے ایک جائزے کے مطابق مذکورہ بالا پانچ صدیوں میں جتنے نامور سائنس داں پیدا ہوئے ان میں سے مسلمان حکماء کو مطلق اکثریت حاصل تھی، گویا سائنس میں وہ قوت فائقہ تھے، ان کے برعکس دیگر اقوام کے سائنسدانوں کی مجموعی تعداد ان سے کافی کم تھی۔

پھر مسلم حکماء کی تعداد کا موازنہ اگر یونانی حکماء سے کیا جائے تو ان کے مقابلے پر

بھی مسلمان فائق نظر آئیں گے، یونان میں ۶۲۵ ق م سے جب پہلا یونانی سائنس داں یا فلسفی پیدا ہوا، ۳۵۰ء تک جب وہاں کا آخری سائنس داں Dio[hantus of Alexandria سرگرم عمل تھا، ساڑھے آٹھ پونے نو صدیوں میں جتنی تعداد میں نامور سائنسدان پیدا ہوئے، ان سے کہیں زیادہ سائنسدان دنیائے اسلام نے صرف پانچ صدیوں میں پیدا کیں۔

موازنے کے لئے ان اعداد و شمار کا ماخذ امریکی مصنفین کی مرتب کردہ پندرہ جلدوں پر پھیلی ہوئی کتاب A Dictionary of Scientific biography ہے، یہ کتاب تاریخ سائنس کے تمام ماخذات کے درمیان سب سے جامع، معیاری اور قابل اعتماد ہے، اس میں یونانی عہد سے لے کر انیسویں صدی تک دنیا کی تمام اقوام میں پیدا ہونے والے نامور سائنسدانوں کے تذکرے لغات کے اصول پر انگریزی حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں، اس کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ محولہ بالا پانچ صدیوں میں سائنس کی سرگرمیاں دنیائے اسلام کے علاوہ یورپ، ہندوستان اور چین میں جاری تھی، بقیہ ممالک پر سناٹا طاری تھا، مذکورہ کتاب کی مدد سے ان ملکوں میں سائنس دانوں کی جو تعداد معلوم کی گئی وہ درج ذیل ہے:

دنیا اسلام	۱۰۶	سائنسدان
یورپ	۷۰	سائنسدان
ہندوستان	۸
چین	۵

میزان ۱۸۹

شرح فیصدی میں مسلمان حکماء ۵۵ فیصد تھے، ان کے مقابلے میں دیگر اقوام صرف ۴۵ فیصد، ان دیگر اقوام میں سے یورپی ۷۳ فیصد تھے، ہندی ۴۳ فیصد اور چینی ۲۶ فیصد۔

مذکورہ بالا اعداد و شمار اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ مسلمان حکماء پانچ صدیوں

تک سائنس کے میدان میں مطلق اکثریت کے حامل تھے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ یورپ میں ۷۰ فیصد حکماء جو پیدا ہوئے ان میں سے ۴۹ یعنی ستر فیصد سائنسدانوں کو یہ رتبہ مسلمان حکماء کی کتابوں سے استفادے سے ذریعہ حاصل ہوا۔

دنیاۓ اسلام کے اطباء کا ہم عصر اقوام سے ایک موازنہ

طب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی مسلمان حکماء نے گہری دلچسپی لی، طب کی یونانی تخلیقات کو سیکھا، اسے عربی قالب میں ڈھالا اور پھر تین چار صدیوں تک اس میں طبع زاد اضافے کئے، اس مجموعی سرمائے سے آگے چل کر یورپ نے استفادہ کیا؛ بلکہ یہ سرمایہ صدیوں تک یورپ کے طبی مدارس کا سب سے اہم ماخذ رہا۔ یہ نتیجہ جارج سارٹن کی تصنیف *An Intriduction to the History of Science* سے اخذ کیا گیا ہے، جو اس موضوع پر سب سے معتبر اور مبسوط کتاب ہے۔

مسلمان اطباء کی قدر شناسی جارج سارٹن کی اس تصنیف سے دو طرح سے جھلکتی ہے، ایک اس طرح سے کہ اس نے تاریخ سائنس کو پچاس پچاس سال کے ادوار میں جو تقسیم کیا ہے ان میں سے دس ادوار کو اس نے مسلمان سائنسدانوں کے نام سے منسوب کیا ہے، مثلاً آٹھویں صدی کے نصف آخر کو جابر بن حیان کے نام سے، نویں صدی کے نصف اول کو خوارزمی کے نام سے، اسی صدی کے نصف آخر کو زکریا کے نام سے اور علی ہذا القیاس، ان میں سے پانچ کو اس نے مسلمان اطباء کے ناموں سے منسوب کیا ہے، وہ پانچ ہستیاں زکریا رازی، البیرونی، ابن زہر، ابن رشد اور ابن بیطار ہیں جب کہ بقیہ پانچ کو غیر مسلم سائنسدانوں کے نام سے۔

طب میں مسلمان اور غیر مسلم اطباء کا ایک تقابلی مطالعہ کرنے پر جارج سارٹن کی رائے درست معلوم ہوتی ہے، سارٹن نے اپنی کتاب میں سائنس کے دیگر مضامین کے ساتھ طب کی تاریخ کا بھی جائزہ لیا ہے اور نویں صدی قبل مسیح سے لے کر چودھویں صدی

کے و آخر تک دنیا بھر میں پیدا ہونے والے نامور و ممتاز اطباء کے احوال بیان کئے ہیں۔

عیسائی اطباء	۵۱
مسلمان	۴۱
یہودی	۱۱
چینی	۷
جاپانی	۵
ہندوستانی	۴
میزان	۱۱۹

اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو کہ یہودیت اور چینی، جاپانی اور ہندوستانی اقوام سے بہت کم عمر ہے، پھر بھی مسلمان اطباء تعداد میں ان سب سے زیادہ ہیں، نویں صدی کے وسط سے لے کر تیرہویں صدی کے وسط تک دنیاۓ اسلام میں پیدا ہونے والے نامور اطباء کی تعداد میں یہودیوں، چینیوں، جاپانیوں اور ہندوستانیوں سے زیادہ تھے، عددی لحاظ سے مسلمانوں پر برتری صرف عیسائی اقوام کو حاصل ہے، اس کی دو بڑی وجوہات ہیں، ایک یہ کہ عیسائی اطباء نے طب کا ورثہ دو خاص ذرائع سے حاصل کیا ہے، یونانی اطباء سے اور مسلمان اطباء سے جب کہ مسلمان اطباء کو طب صرف ایک ذریعہ سے حاصل ہوئی، وہ ذریعہ یونانی اطباء تھے، مسلمانوں نے ہندی اور ایرانی اطباء سے جو استفادہ کیا وہ قابل لحاظ نہیں، کیوں کہ ان دونوں ملکوں کے اطباء سے استفادہ کرنے کی مدت بہت مختصر ہے، بمشکل ۷۵ سال، خلیفہ ہارون الرشید کے عہد خلافت ۸۶۷ء تا ۸۱۳ء سے لے خلیفہ متوکل کی وفات بہ سال ۸۶۱ء تک۔ (۱)

مسلمانوں کے شفا خانے

بیمارستان رشفا خانے: مسلمانوں پر کی طبی خدمات کا یہ تذکرہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک ان شفا خانوں پر گفتگو نہ کی جائے جو قرون وسطی کے دوران اسلامی بلاد و

(۱) ان اطباء کی مکمل فہرست دیکھنے کے لئے رجوع کیجئے ”دنیاۓ اسلام، سائنس و طب کا عروج، ڈاکٹر حفیظ الرحمن صدیقی

امصار میں قائم کئے گئے تھے مورخین نے عہد وسطی کے شفا خانے کے لئے ”بیمارستان“ کا لفظ استعمال کیا ہے، جو دو لفظوں (بیمار“ اورستان (جگہ) سے مل کر بنا ہے، یوں فارسی زبان کی اس ترکیب ”بیمارستان“ کے معنی ”بیمار کی جگہ“ ہے، عربوں کے یہاں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ ایران کے صوبہ خورستان کے شہر جندی شاپور میں ساسانی حکمرانوں نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جہاں طب کی تعلیم دی جاتی تھی، مدرسے میں ایک بیمارستان بھی تھا، اس مدرسے نے مسلم طب پر پر گہرے اثرات مرتب کیے، ایرانی اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ عربوں نے شفا خانے کے لئے فارسی ترکیب ”بیمارستان“ لی اور اسے اپنے یہاں رائج کیا، بیمارستان کا لفظ آگے چل کر ”مارستان“ بن گیا، اکثر طبی تصانیف میں مارستان ہی استعمال ہوا ہے۔ ساتویں صدی ہجری ۷۸۰/ صدی عیسوی اور اس کے بعد سے بلنسیہ کی مقامی بولی میں ہسپتال کا ترجمہ مرستان اور ”ملنستان“ رائج ہے، ہسپانوی بولیوں میں اور گیارھویں صدی ہجری کے قاہرہ میں بھی مرستان کا لفظ رائج ہوا، آجکل قاہرہ میں اس کا لفظ ”مرستان“ ہے المغرب کی جدید بولیوں میں مورصطانی اور بعض جگہ ”موصطران“ استعمال ہوتا ہے اور پورے المغرب میں اس کے معنی خطرناک پاگلوں کا قید خانہ ہے دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ عربی میں آجکل شفا خانے کے لئے ”مستشفى“ کا لفظ آتا ہے، مسرتان یا مرستانی پاگل خانے کیلئے مروج ہے۔

اسلام میں سب سے پہلا شفا خانہ خلیفہ ولید بن عبدالملک (۸۶/ ۹۶ھ ۷۰۵ء۔ ۷۱۵ء) نے دمشق میں بنوایا۔ (۸۸ھ ۷۰۷ء) میں خلیفہ نے اپنے ہاتھوں سے اس کا سنگ بنیاد رکھا، اسلامی دنیا کا یہ اولین شفا خانہ جذامیوں کے لئے مخصوص تھا، خلیفہ نے مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے اطباء تعینات کیے اور ان کے لئے تنخواہیں مقرر کر دیں۔ بیماروں کے لئے معاش اور طعام و قیام کا انتظام شفا خانے ہی میں کیا گیا، انھیں ہدایت تھی کہ وہ باہر آ کر تندرست لوگوں سے میل جول نہ رکھیں۔

خلافت عباسیہ میں خلیفہ ہارون الرشید نے جندی شاپور کے مدرسہ طب سے تحریک پا کر عیسائی طبیب جبرئیل بن یحییٰ شوع کو بغداد میں شفا خانہ کھولنے کا حکم دیا،

شفا خانہ قائم ہوا تو جندی شاپور کے بیمارستان سے ایک ماہر دواساز ماسویہ کو بغداد لایا گیا، بعد میں ماسویہ کا بیٹا یحییٰ بیمارستان کا نگران مقرر ہوا، ہارون الرشید کے عہد میں بغداد میں متعدد ہسپتال بنوائے گئے، ان کے وزیر یحییٰ بن خالد برکی نے اپنے خرچ سے ”بیمارستان براک“ تعمیر کیا، جس کا نگران ایک ہندوستانی طبیب ابن دھن مقرر تھا، اس کے بعد بغداد میں خلیفہ المعتمد (۲۷۹-۲۸۹ھ ۸۹۲-۹۰۲ء) کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے (۳۰۲ھ ۹۱۴ء) میں ایک وقف مقرر کیا، محرم (۳۰۶ھ) جون ۹۱۸ء میں سنان بن ثابت نے بغداد کے بازار سوق یحییٰ میں خلیفہ المعتمد کے حکم سے بیمارستان السیدہ بنوایا، جس کا ماہوار خرچ چھ سو دینار کے قریب تھا، اسی سال خلیفہ نے سنان کے مشورے پر بغداد کے باب الشام میں اپنے نام پر ایک شفا خانہ تعمیر کروایا جو ”بیمارستان المعتمدی“ کے نام سے مشہور ہوا، اس کا ماہانہ خرچ دو سو دینار تھا، جو خلیفہ اپنی حبیب خاص سے دیتے تھے، عباسی عہد کے مشہور وزیر ابن الفرات نے اپنے نام پر بغداد میں بیمارستان ابن الفرات قائم کیا، یہ شفا خانہ محلہ ”درب المفضل“ میں واقع تھا، چوتھی صدی ہجری دسویں صدی عیسوی میں خلافت اسلامیہ کا سب سے شاندار ہسپتال عضد الدولہ تھا میں بنوایا، بیمارستان عضدی کے نام سے مشہور ہوا، بیمارستان عضدی نہ صرف بغداد؛ بلکہ عالم اسلام کا بہترین شفا خانہ تھا۔

چوتھی صدی ہجری دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں شفا خانے کھولے گئے اسی زمانے میں رے اور نیشاپور میں کئی بیمارستان بنوائے گئے، رے کا بیمارستان بہت بڑا تھا۔

مصر میں سب سے پہلے خلیفہ متوکل کے وزیر فتح بن خاقان نے ہسپتال بنوایا، جو بیمارستان مغافر کے نام سے مشہور تھا، بعد ازاں احمد ابن طولون (المتوفی ۲۷۰ھ ۸۸۴ء) جب مصر کے والی ہوئے تو انہوں نے اپنے نام پر ایک بڑا بیمارستان بنوایا، جو بیمارستان احمد بن طولون کہلایا، یہ بیمارستان (۲۸۹/ ۸۷۲ء) میں بنا مصر کا ایک اور بیمارستان۔ بیمارستان کا فوری کے نام سے مشہور تھا۔

اسلامی مملکت کا سب سے شاندار شفا خانہ بغداد کا بیمارستان عضدی تھا، جس کی تقلید میں مختلف شہروں میں بڑے بڑے بیمارستان بننے لگے، چھٹی صدی ہجری میں نورالدین زنگی (۵۴۱-۵۷۹ھ/۱۱۴۶-۱۱۷۵ء) نے دمشق میں ایک بڑا شفا خانہ تعمیر کروایا جو بیمارستان کبیر دمشق کہلایا، اسی صدی میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے قاہرہ کے شاہی ایوان میں بیمارستان صلاح الدین غازی بنوایا، شفا خانے کی دیواروں پر مکمل قرآن مجید لکھا ہوا تھا، سسکندریہ میں بھی ایک ہسپتال تعمیر کروایا، جس کا تذکرہ مورخین نے کیا ہے، بغداد کے بیمارستان عضدی اور دمشق کے بیمارستان کبیر کے بعد سلطان منصور قلاؤن نے قاہرہ میں ایک بہت بڑا ہسپتال بنوایا۔

یہ شفا خانہ انھوں نے ایک بڑے محل میں قائم کیا، ملک منصور نے محل کی عمارت کے علاوہ متعدد عمارات بنوائیں جن کی تعمیر میں مصر کے تمام مزدور اور تین سو قیدی ہر روز کام کرتے تھے۔ بادشاہ خود بھی روزانہ عمارات کے ملاحظہ کے لئے آتا تھا، گیارہ ماہ لگا تار کام کے بعد (۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء) میں یہ عظیم الشان ہسپتال پایہ تکمیل کو پہنچا، جس محل میں یہ بیمارستان کھولا گیا، اس کا احاطہ (۱۰۶۰۰) گز تھا۔ عمارت کے ستون سنگ مرمر اور سنگ رخام سے تیار کرائے گئے تھے، یہ ہسپتال ”مارستان المنصور“ کے نام سے مشہور ہوا، ول دوران کے بقول یہ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ہسپتال تھا۔ (۱)

مصر کے علاوہ افریقہ کے دوسرے اسلامی خطوں میں بھی ہسپتال قائم کیے، سلطان یعقوب المنصور الموحدی، (۵۸۰-۵۹۵ھ/۱۱۸۴-۱۱۹۹ء) نے مراکش میں ایک بڑا بیمارستان بنوایا، مرینی سلاطین نے یعقوب المنصور کے شفا خانوں کو نہ صرف باقی رکھا؛ بلکہ خود بھی متعدد شفا خانے تعمیر کرائے، سلطان عبد الغالب مائسہ السعدی (۹۶۵/۹۸۱ھ-۱۵۵۷-۱۵۷۴ء) نے مرکش میں ایک ہسپتال تعمیر کروایا۔ (۲)

ترکی کے سلاطین نے بھی شفا خانوں کے قیام کی طرف خاص توجہ دی، ان کے

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۵/۸۸، ۲۰۳، بذیل مادہ بیمارستان از

(۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۵/۸۰۳-۷۰۳، بذیل مادہ بیمارستان از

یہاں ہسپتال کے لئے بیمارستان اور مارستان کے علاوہ دارالشفاء، دارالعافیہ اور تیمارخانہ کے الفاظ بھی استعمال ہوتے رہے ہیں، سب سے پہلا سلجوقی دارالشفاء (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) میں قیصری میں قائم ہوا۔ بعد ازاں دوسرے مقامات سیواس، دیورہری، چانکیری، قسطنطنیہ، قونینہ تو قواد، ارزروم، ارزنجان، مار دین اور آماسیہ میں شفا خانے کھولے گئے، عثمانی سلاطین نے سب سے پہلا ہسپتال دارالشفائے یلدرم کے نام سے بروسہ میں (۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء) کھولا، اس کے بعد (۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء) میں محمد دوم الفاتح (۸۸۵-۸۸۶ھ/۱۴۵۱-۱۴۸۱ء) نے دارالشفائے فتح تعمیر کیا، نویں صدی ہجری ہی کے آخر میں ادرنہ میں دریا کے کنارے ایک عمارت بنوائی اور اس کے ایک حصے میں دارالشفاء کھولا، اس کی تعمیر آٹھ برسوں میں مکمل ہوئی، دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے دوران استانبول میں تین بڑے ہسپتال کھولے گئے، ان میں سلیمان اعظم کی بیوی خرم سلطان کے نام پر بیمار خانہ (۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء) میں تعمیر ہوا۔ (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء) سلیمان کے نام پر ایک دارالشفاء اور مدرسہ طب وجود میں آئے، سلطان مراد ثالث کی والدہ نور بانو سلطان کے نام پر توپ طاشی کا بیمار خانہ (۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء) میں بنوایا گیا، جو ۱۹۲ء تک چلتا رہا، منیہ میں حافظ سلطان کی والدہ کے نام پر بھی ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء میں ایک بڑا ہسپتال تعمیر کیا گیا۔ اگلی صدی کے دوران ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں استانبول میں ایک اور ہسپتال قائم ہوا، خلافت عثمانیہ کے آخری دور کے شفا خانوں میں استانبول میں بچوں کا شیشلی (شیشہ دار) شفا خانہ بھی قابل ذکر ہے، جسے سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء میں بنوایا۔ بڑے ہسپتالوں کے علاوہ سلطنت ترکی کے دوسرے مقامات پر بھی شفا خانے کھولے گئے تھے۔ (۱)

مسلم اسپین میں بھی شفا خانوں کے قیام میں خلفاء نے خاص دلچسپی لی۔ قرطبہ میں ایک بڑا ہسپتال کھولا گیا، جس کے چیف سرجن ابوالقاسم زہروای تھے، غرناطہ اور رد دوسرے شہروں میں بھی متعدد شفا خانے بنوائے گئے، ہسپتالوں میں مسلمانوں کی

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ بذیل مادہ بیمارستان از ۵/bede n seshvaroglu ۳۰۹-۳۱۱

دلچسپی کا اندازہ اسے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف قرطبہ میں تین درجن سے زائد شفاخانے موجود تھے۔

ہسپتالوں کے قیام میں برصغیر ہندوپاک کے مسلم سلاطین بھی اپنے ہم مذہبوں سے پیچھے نہیں رہے، محمد تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ/۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) کے عہد حکومت میں بارہ سواطباء سرکاری ملازم تھے، صرف پایہ تخت دہلی میں چھوٹے بڑے شفاخانوں کی تعداد ستر تھی، ان کے جانشین فیروز شاہ تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ/۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) نے مزید پانچ شفاخانوں کا اضافہ کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے تخت نشین ہونے کے بعد ایک فرمان جاری کیا، جس میں ایک سو شفاخانے قائم کرنے کا حکم بھی شامل تھا، مغل حکمرانوں میں جلال الدین محمد اکبر (۹۶۳-۱۰۱۴ھ/۱۵۴۲-۱۶۰۵ء) نے متعدد دارالشفا قائم کرائے، جن میں کئی اکبر آباد میں تھے، جھانگیر نے ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی حکم دیا کہ بڑے شہروں میں شفاخانے کھولے جائیں اور بیماروں کے علاج کے لئے اطباء مقرر کئے جائیں، جن کے اخراجات سرکاری خزانہ سے دیے جائیں، شاہ جہاں، اورنگ زیب اور ان کے بعد کے حکمرانوں نے بھی بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے قائم کئے۔ (۱) جنہیں بخوف طوالت یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

قرون وسطیٰ کے دوران خلافت اسلامیہ کے مختلف شہروں میں شفاخانوں کا جال پھیلا یا گیا تھا، خراسان، موصل، صلب، اسکندریہ وغیرہ میں ان گنت شفاخانے قائم تھے، مورخوں اور سیاحوں نے جو چشم دید حالات بیان کئے ہیں، ان کے مطابق بغداد میں ساٹھ شفاخانے تھے، قرطبہ کے شفاخانوں کی تعداد پچاس تھی، اکیلے استانبول میں ترکوں نے پانچ صدیوں کے اندر ستر شفاخانے قائم کیے، قاہرہ، دمشق اور دوسرے بڑے کا حال اس سے مختلف نہ تھا، میکس میر ہاف کا بیان ہے:

”ہسپتال شروع ہی میں قائم کیے گئے، اور یہ غالباً قدیم اور مشہور مدرسہ جندی شاپور کے نمونے پر بنوائے گئے جس میں ایک بیمارستان بھی تھا،

اسلامی دنیا میں اسی سے ہسپتال کے لئے بیمارستان کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے، ہمارے پاس کم از کم چونتیس اداروں کے بارے میں مستند معلومات موجود ہیں، جو ایران سے مراکش اور شمالی شام سے مصر تک پھیلے ہوئے تھے۔“

یہ امر ملحوظ رہے کہ میکس میر ہاف کا یہ بیان عہد زریں یعنی ۱۹۰۰ء-۱۱۰۰ تک کے ہسپتالوں تک محدود ہے اور اس میں بھی مسلم اسپین شامل نہیں ہے۔ مسلم شفاخانوں کی یہ زریں تاریخ یہیں ختم نہیں ہوتی اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ولید نے جو پہلا شفاخانہ قائم کیا وہ جذامیوں کے لئے مخصوص تھا، یہ بدنصیب طبقہ ہر دور میں دردمند مسلم حکمرانوں کے لئے باعث توجہ رہا ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف جذامیوں بلکہ اندھوں، یتیموں اور اپانچ عورتوں کے لئے بھی مناسب انتظام کیا۔

خلیفہ ولید بن عبد الملک نے ہر اپانچ کے لئے ایک خادم اور ہر اندھے کے لئے ایک عصا کش مقرر کیا تھا، اس کے بعد خلیفہ منصور نے نابینا انسانوں، یتیموں اور اپانچ عوتوں کے لئے ایک دارالاقامہ (ہوسٹل) بنوایا، موحدین میں سلطان یعقوب المنصور الموحدی اپنی سلطنت کے الگ الگ حصوں میں پاگلوں، کوڑھیوں اور اندھوں کے لئے شفاخانے بنوائے، ترک سلاطین نے سیواس قسطنطنیہ اور قیصری میں کوڑھی خانے تعمیر کیے، جن میں کوڑھ کے مریضوں کا علاج ہوتا تھا۔

نویں صدی ہجری میں سلطان مراد دوم (۸۲۴-۸۵۵ھ/۱۴۲۱-۱۴۵۵ء) نے اورنہ میں ایک کوڑھی خانہ بنوایا جو دو سو سال جاری رہا۔

کوڑھ کے مریضوں کو جذامی کے بجائے مرضی کہا جاتا تھا، یہ نام انھیں حسن تعبیر کے طور پر دیا گیا تھا، عام طور پر انہیں شہر سے الگ ایک بستی میں بسایا جاتا تھا، شہر قرطبہ کا ایک پور محلہ ”ریض المرضی“ بیماروں کی بستی کی حیثیت سے معروف تھا، فاس میں کوڑھیوں کو پہلے باب النوحہ سے باہر تلمسان جانے والی سڑک پر بسایا گیا، پھر ساتویں صدی ہجری میں انھیں باب الشریعہ کے باہر غاورں میں رکھا گیا، ۶۵۸ھ میں انھیں باب

الشریعہ کے باہر دوسرے غاروں میں بسایا گیا۔ کوڑھیوں کی اس بستی کو ”الحارہ“ کہا جاتا تھا، اکثر مسلم شہروں میں ”الحارہ“ ضرور ہوتے تھے؛ لیکن ضرورت اور حالات کے پیش نظر الحارہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا تھا۔ (۱) شفاخانوں کی طرح مسلمانوں نے پاگلوں کے لئے ”دارالجنین“ کے نام سے پاگل خانے تعمیر کرائے، اسلام میں سب سے پہلا پاگل خانہ خلیفہ منصور نے بنوایا، جس کے دارالجنین کہتے تھے۔ تیسری ہجری میں واسط اور بغداد کے درمیان دیریکل کے مقام پر ایک پاگل خانہ تھا، چھٹی صدی ہجری میں دمشق میں ایک پاگل خانہ بنوایا گیا جس میں پاگلوں کا علاج کیا جاتا تھا، اسی صدی میں سلطان یعقوب المنصور الموحدی نے اپنی سلطنت میں پاگل خانے قائم کیے، مستقل پاگل خانوں کے علاوہ ہسپتالوں میں بھی پاگلوں کے لئے علیحدہ وارڈ تھے۔ (۲) قاہرہ میں بیمارستان احمد ابن طولون میں پاگلوں کے لئے مخصوص وارڈ تھے، قاہرہ ہی میں صلاح الدین ایوبی کے بنائے ہوئے بیمارستان میں پاگلوں کے علاج کے لئے الگ الگ مکانات تھے، جو ایک علیحدہ وسیع احاطے میں تھے، درپچوں میں لوہے کی جالیاں لگی تھیں۔ (۳)

ول دوران قرون وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”دیوانوں کے لئے تمام بڑے مسلم شہروں میں پاگل خانے تھے“ (۴)

قرون وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں میں بعض غیر ملکیوں، پردیسیوں، غریبوں، اور بیمار مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہوتے تھے، سلطان یعقوب المنصور الموحدی نے اپنے دارالسلطنت میں ایک شاندار ہسپتال بنوایا، جس میں ان لوگوں کا علاج کیا جاتا تھا جو غریب الدیار یا پردیسی ہوتے تھے، ساتویں صدی ہجری میں بنو نصر کے سلطان محمد پنجم نے غرناطہ میں ایک شاندار شفاخانہ کھولا، جس کی عمارت ۶۸ھ/ ۱۳۶۷ء میں مکمل ہوئی، اس میں صرف بیمار اور غریب مسلمانوں کا علاج ہوتا تھا، سلطان ابوفارس الحفصی

(۱) اردودائرہ معارف اسلامیہ ۵/ ۳۰۷-۳۰۸ (۲) اردودائرہ معارف اسلامیہ ۵/ ۳۰۸-۳۰۹

(۳) طب العرب: ۴۸۵ (۴) the age of faeth p 331

نے ”مفسل“، غریب الدیار اور بیمار مسلمانوں کے لئے ایک شفاخانے کی بنیاد ڈالی، جو ۸۲۳ھ/ ۱۴۲۰ء میں مکمل ہوا اسلامی قلمرو کے دوسرے شہروں میں بھی اس طرح کے ادارے قائم ہوئے، مغرب کے مسلم حکمرانوں نے شفاخانوں کے علاوہ مسافروں کے لئے شہروں کے باہر منزل بھی بنائے جہاں مسافر قیام کرتے تھے، انھیں تروایہ کہتے تھے۔ (۱)

مسلمانوں نے چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی ہی میں جیل خانوں میں قیدیوں کے علاج معالجے کا بندوبست کیا تھا، مقتدر کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے افسر الاطباء سنان بن ثابت کو حکم دیا کہ اطباء کی انکی جماعت مقرر کی جائے جو روزانہ جیلوں میں جا کر بیمار قیدیوں کا علاج کرے، سنان نے حکم کی تعمیل کی اور اطباء کا عملہ مقرر کیا، یہ لوگ روزانہ ہر جیل میں جا کر معینہ کرتے تھے، بیمار قیدیوں کا علاج کیا جاتا اور حسب ضرورت ان کے لئے ایسی غذا تیار کرواتے تھے جس میں گوشت نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ دھنیا وغیرہ ڈال کر بیماروں کے لئے پکتا تھا، اسے ”مزورات“ کہتے تھے۔ (۲)

گشتی ہسپتالوں کا قیام بھی اسی وزیر کی یادگار ہے، انھوں نے سنان بن ثابت کو حکم دیا کہ اطباء کی ایک جماعت ادویات اور سامان ساتھ لے دیہات میں گشت کرے؛ چنانچہ سنان نے تجربہ کار ڈاکٹروں کا ایک عملہ تیار کیا، یہ لوگ دیہات میں گشت لگا کر ہر گاؤں میں پہنچ جاتے تھے، ان کے ساتھ گشتی دواخانہ اور ضروری سامان ہوتا تھا، بقدر ضرورت ہر گاؤں میں قیام کر کے کسانوں اور نادار لوگوں کا علاج کرتے تھے، وزیر کی طرف سے ہدایت تھی کہ علاج میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق نہ کیا جائے؛ البتہ حیوان سے پہلے انسان اور غیر مسلم سے پہلے مسلم کا علاج کیا جائے۔ (۳)

ول دوران نے ان اقدامات کے علاوہ پاگلوں کے علاج کا تذکرہ بھی کیا ہے:

”وزیر علی بن عیسیٰ جو طبیب بھی تھے؛ انہوں نے ڈاکٹروں کا عملہ تربیت

(۱) اردودائرہ معارف اسلامیہ ۵/ ۳۰۷-۳۰۹

(۲) اردودائرہ معارف اسلامیہ ۵/ ۳۰۵ (۳) اردودائرہ معارف اسلامیہ ۵/ ۳۰۵

دیا تاکہ وہ جگہ جگہ جا کر بیماروں کا علاج کرے، اطباء کی ایک جماعت روزانہ جیلوں میں جا کر معاینہ کرتی تھی، پاگلوں کا علاج خاص ہمدردی سے کیا جاتا تھا“ (۱)

گشتی ہسپتال کی روایت کا آغاز ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں ہوا، ایک صدی کے اندر گشتی ہسپتال رائج ہو گئے تھے، میکس میر ہاف کا بیان ہے:

”گشتی شفا خانے گیارہویں صدی عیسوی میں معروف تھے“ (۲)

فوج کی طبی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایسے شفا خانے کئے گئے، جو سفر و حضر میں فوج کے ساتھ ہوتے تھے، سلطان محمود سلجوقی کا لشکر جب چلتا تو ان کا شفا خانہ چالیس اونٹوں پر لدا ہوتا تھا، جس کی حفاظت کے لئے ایک فوجی دستہ متعین تھا، فوج کے ساتھ جو اطباء ہوتے تھے، وہ نہایت تجربہ کار اور باصلاحیت ہوتے تھے۔

مسلم شفا خانوں کے انتظام کے متعلق مورخوں نے مکمل تفصیلات فرہم کی ہیں، میکس میر ہاف لکھتے ہیں۔

”اسلامی تاریخوں میں ان اداروں کے انتظام کے بارے میں بہت ہی درست معلومات دی گئی ہیں“ (۳)

ہم نہ صرف ان اداروں کے ذرائع آمدنی سے باخبر ہیں؛ بلکہ اطباء ماہرین امراض چشم اور ملازموں کی تنخواہیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔

مسلم بیمارستانوں کے مصارف کے لئے سرکار یا بعض اوقات امراء کی طرف سے اوقاف مقرر ہوتے تھے، جن کی سالانہ آمدنی سے ہسپتال کا خرچہ چلتا تھا، اوقاف متولی یا مہتمم کے زیر نگرانی ہوتے تھے، وہی شفا خانے کی ضروریات کے لئے رقم مہیا کرتا تھا، بغداد کے بیمارستان عضدی کے لئے عضد الدولہ نے ساڑھے سات لاکھ درہم سالانہ کی جاگیر وقف کر رکھی تھی، ملک منصور قلاوونی نے قاہرہ میں بیمارستان الکبیر المنصوری بنوایا تو

اخراجات کے لئے دس لاکھ درہم سالانہ کے اوقاف مقرر کیے۔

عہد وسطی کے ان طبی اداروں کا نظم و نسق چلانے کے لئے ایک مکمل انتظامیہ موجود تھا، ہر شفا خانے کی نگرانی ایک بڑے طبیب کے ذمہ ہوتی تھی جسے ساعور کہتے تھے، حکومت اپنی طرف سے اس شخص کو ساعور مقرر کرتی تھی جو اعلیٰ درجے کا طبیب ہوتا تھا، ہسپتال کا عملہ ساعور کی نگرانی میں کام کرتا تھا، یہ عہدہ سب سے پہلے بخشیشووع کو ملا تھا، بغداد کے بیمارستان رشیدی میں یوحنا ابن ماسویہ رئیس الاطباء (ساعور) تھے، جندی شاپور کے بیمارستان میں یہ عہدہ مشہور طبیب سابور بن سہل کو ملا تھا، رے کے ہسپتال میں ابوبکر رازی ساعور کے عہدے پر فائز تھے۔

بعد میں جب وہ بغداد چلے آئے تو انھیں ایک سو سے زائد رج اطباء میں سے منتخب کر کے بڑے ہسپتال کا ساعور بنایا گیا، مختلف زمانوں میں جبرئیل بن عبید اللہ، ثابت بن سنان بن ثابت (المتوفی ۳۳۱ھ) اور ابن التلمذ (المتوفی ۵۶۰ھ) جیسے اطباء بغداد کے شفا خانے کے ساعور رہے۔ قاہرہ میں مہذب الدین عبدالرحیم ابن علی الدخوار مملوک عہد حکومت میں رئیس الاطباء کے عہدے پر فائز تھے ”بیمارستان الکبیر المنصوری میں بھی انھیں رئیس الاطباء مقرر کیا گیا تھا، ان کے نامور شاگرد ابن النفیس پیرس کے دور سلطنت میں رئیس الاطباء تھے، عہد عباسی میں ہسپتالوں کی نگرانی کے لئے ایک ایک منتظم عمومی کا تقرر کیا گیا، خلیفہ المقتدر کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے ۳۰۲ھ/۹۱۵ء میں بغداد مکہ اور مدینہ کے شفا خانوں کی نگرانی کا کام ابوعثمان سعید بن یعقوب الدمشقی کو تفویض کیا۔

(introduction to the history of science)

(vol.p)۔ (۱)

منتظم عمومی کی حیثیت سے یہ غالباً پہلے شخص تھے، ان کے انتقال کے بعد سنان بن ثابت کو طبی اداروں کے نظم و نسق سنبھالنے کا کام تفویض ہوا، سنان شاہی طبیب تھے، مگر انھیں منتظم عمومی کی حیثیت سے زیادہ شہرت ملی، جیسا کہ جارج سارٹن کہتے ہیں:

”ان کی شہرت کی سب سے بڑی بغداد کے شفا خانوں کا انتظام اور طبی

پیشہ کا معیار بہتر بنانے کے اقدامات ہیں۔“ (۱)

سنان بن ثابت کی اصلاحات اور انتظامی اقدامات نے طب کے وقار میں چار چاند لگائے۔ ۳۱۹ھ/ ۹۳۱ء میں خلیفہ مقتدر کو شکایت پہنچی کہ کسی نیم حکیم کے غلط علاج سے ایک شخص جان سے ہاتھ دھو بیٹھا، خلیفہ نے شہر کے محتسب کو حکم دیا کہ جب تک سنان بن ثابت کے دستخط سے اطباء کے پاس اجازت نامے نہ ہوں، انھیں مطب کرنے سے روک دیا جائے، خلیفہ کے حکم پر سنان نے اطباء کا امتحان لینے کا طریقہ رائج کیا۔ سارٹن کا بیان ہے:

”۹۳۱ء/ ۹۳۲ء میں بغداد کے اطباء کو اس وقت تک مطب کرنے سے

روک دیا گیا جب تک ان کا امتحان نہ لیا جائے، اور وہ سرکاری سند حاصل

نہ کریں، سنان، جن کے ذمہ یہ کام تھا، نے آٹھ سو سے زائد اطباء کا

امتحان لیا۔“

امتحان سے شاہی اطباء اور مسلمہ صلاحیت کے معالج مستثنیٰ کئے گئے تھے، بغداد کے غیر معروف اطباء کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی، سنان بن ثابت نے انکا امتحان لیا اور جو طبیب جس فن میں ماہر پایا گیا، اسے صرف اسی فن میں علاج کرنے کی سند دی گئی، امتحان میں ایک ہزار اطباء میں سے صرف سات سو امیدوار کامیاب ہوئے، ناکام امیدواروں کو مطب کرنے سے روک دیا گیا۔ سنان بن ثابت کے اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطب کرنے کے لئے یا علاج کرنے کے لئے سرکاری سند لازمی ہو گئی۔ ول دوران کا بیان ہے۔

”کوئی شخص امتحان میں کامیاب ہوئے بنا اور سرکاری سند حاصل کئے بغیر

قانونی طور پر مطلب نہیں کر سکتا تھا، اسی طرح دوا فروش، حجام اور ماہرین

امراض اطفال بھی سرکاری قواعد اور معاینہ کرانے کے پابند تھے۔“ (۲)

اطباء کے امتحان کا طریقہ دوسرے ادوار و ممالک میں بھی جاری رہا، چھٹی صدی ہجری میں ابن التلمیذ نے اطباء کا امتحان لیا اور صرف ان لوگ وں کو علاج کرنے کی اجازت دی، جو اس کے اہل پائے گئے، مصر اور شام کے رئیس الاطباء یا منتظم عمومی مہذب الدین الدخوار تھے، انہوں نے ملک العادل کے حکم پر ایک مرتبہ مصر کے کچالوں (ماہرین امراض چشم) کا امتحان لیا اور صرف ان کچالوں کو علاج معالجے کی اجازت دی، جو امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ (۱)

جن اطباء کو مطب کرنے کی اجازت ملی تھی ان کے نام رجسٹر میں درج ہوتے تھے، ممتحن مقرر کئے جانے کے وقت خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ دیندار، ماہر فن اور دیانتدار ہوں۔

اطباء سے امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کی جھلک عبدالعزیز مطب کی تصنیف امتحان الاطباء سے سامنے آتی ہے، جس میں کمال سے پوچھا گیا ہے کہ ایک ایک کے دودو کیوں نظر آتے ہیں؟ یا شب کوری کے اسباب کیا ہیں؟ مجر (ہڑی بٹھانے والے) سے سوال کیا گیا ہے کہ خلع اور میل کی علامات کیا ہیں؟ جرح سے دریافت کیا جاتا ہے کہ انسان کے بدن میں کتنی ہڈیاں ہیں؟ عصاب اور عضلات کتنے ہیں؟ رگیں کتنی ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ حکیم نبروا سطلی صاحب کے بیان کے مطابق ابوسعید یمانی نے اطباء کے امتحان کے لئے ایک کتاب تیار کی تھی)

عہد اسلامی میں دوا فروشوں کی نگرانی کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، ترک سپہ سالار افشین نے زگریا طیفوری کو دوا فروشوں کی فہرست تیار کرنے حکم دیا اور ان دوا فروشوں کو چھاونی سے نکال دیا جو دھوکہ باز تھے، دیانتدار دوا فروشوں کو خلیفہ کے پاس بھیج دیا، نجی دوا خانوں کے علاوہ خود حکومت کی اپنے ڈسپنسریاں ہوتی تھیں، دوا خانوں کے مالکوں کا امتحان لیا جاتا تھا اور صرف انھیں لوگوں کو ڈسپنسری چلانے ملتا تھا جو امتحان میں کامیاب ہوتے تھے، دوا کی کیفیت اور قیمت پر سرکار کی طرف سے نگرانی کی جاتی تھی۔

ازمنہ وسطیٰ کے مسلم شفا خانوں میں اطباء متعین ہوتے مجھے بیمارستان عضدی میں چوبیس اطباء خدمات انجام دیتے تھے، ہسپتال میں ماہرین خصوصی کی مختلف جماعتیں کام کرتی تھیں جن میں طبایعیون (ماہرین عضویات) کحالون (ماہرین امراض چشم) جراحون (سرجن) اور مجرون (ہڑی بٹھانے والے) تھے، تبریز کے ربع رشیدی شفا خانے میں مختلف ممالک کے پچاس اطباء رہتے تھے، جارج کمال اور مجبر اس کے علاوہ تھے، بعض شفا خانوں میں اس سے زائد اطباء کام کرتے تھے، مسلم حکمرانوں کے پاس درباری اطباء بھی ہوتے، سیف الدولہ جب دسترخوان پر بیٹھتے تھے تو چوبیس ڈاکٹر موجود رہتے تھے، خلیفہ متوکل کے پاس مسلمان ڈاکٹروں کے علاوہ چھین عیسائی اطباء تھے درباری اطباء کو مختلف خدمتوں کے عوض دودو تین تین تنخواہیں ملتی تھیں، اطباء میں ہمارے زمانے کے اسپیشلسٹوں کی طرح مختلف امراض کے ماہرین خصوصی ہوا کرتے تھے، ان میں بعض فساد، کچھ کمال اور کچھ انسانی ہوتے تھے، بعض اطباء صرف عورتوں کے علاج کے ماہر تھے اور صرف یہی خدمت انجام دیتے تھے، مصر میں اکثر کمال تھے کیوں کہ وہاں آنکھوں کی بیماری عام تھی، یہ لوگ قدح عین کے ذریعے موتیابند کا اس طرح علاج کرتے تھے، جس طرح آج اس آپریشن کیا جاتا ہے، بیمارستان عضدی میں دوشنبہ اور جمعرات کے دنوں میں بغداد کے بڑے بڑے اطباء آتے اور پیچیدہ امراض کی تشخیص و امراض میں متعین اطباء کی مدد کرتے تھے، رئیس الاطباء کے کام کرنے کے ایام اور اوقات مقرر تھے، جبرئیل بن عبید اللہ ہفتے میں دو روز اور دوشب کام کرتے تھے، انہیں ماہانہ تین سو درہم تنخواہ ملتی تھی، ساعور کی حیثیت سے رازی شفا خانے میں خود بھی کام کرتے تھے، سنان بن ثابت بھی دیگر اطباء کے ہسپتال میں کام کرتے تھے، بیمارستان اسکندریہ میں سرکار کی طرف سے ان لوگوں کے لئے علیحدہ اطباء اور جراح تعینات تھے، جو ہسپتال میں رہ کر علاج کرانا نہیں چاہتے تھے، یہ اطباء اور جراح بیماروں کے گھروں میں جا کر ان کا علاج کرتے تھے۔ (۱)

ہسپتالوں میں لائبریریاں ہوتی تھیں، بڑے بڑے اطباء ہسپتالوں ہی میں طب کا درس دیتے تھے، عضدی ہسپتال میں لیکچر دیتے تھے۔ قاہرہ کے بیمارستان الکبیر المنصوری میں درس و تقریر کے لئے علاحدہ کمرے مخصوص تھے، شفا خانے میں متعین ممتاز طبیب کے لئے روزانہ معمول تھا کہ وہ بیماروں میں گشت لگا کر معاینہ کرے اور ان کا حال پوچھے، ہر بیمار کے لئے نسخے اور ہدایات تجویز کرے نجی بیماروں کا معاینہ کرے شام کو واپس ہسپتال آ کر الایوان الکبیر (بڑے ہال) میں بیٹھ کر جہاں کتب خانہ بھی تھا، اطباء اور طلبہ کی جماعت کے ساتھ تین گھنٹے تک طبی مباحث اور درس میں مشغول رہتے اور کتابوں کا مطالعہ کرے۔ (۱) تبریز کے ربع رشیدی شفا خانے میں پچاس اطباء تھے، جن میں سے ہر ایک کے ذمہ ہسپتال کے فرائض کے علاوہ دس طلبہ کو تعلیم دینا تھا، ان کے علاوہ بیمارستان میں جو جراح کمال اور مجبر تھے ان ہر ایک کے ذمہ پانچ طلبہ کو عملی تعلیم دینا تھا۔ (۲)

مسلم شفا خانوں میں الگ الگ وارڈ ہوتے تھے، بغداد کے بڑے دارالشفاء میں متعدد وارڈ ہر وارڈ شاہی محلہ معلوم ہوتا تھا، قاہرہ میں منصوری ہسپتال محل میں قائم کیا گیا تھا، جس کے چار بڑے ایوان تھے، بادشاہ نے بہت سی نئی عمارات بنوائیں، ہسپتال میں مختلف وارڈ تھے، قدیم چار ایوان نجار (حمیات) کے مریضوں کے لئے مخصوص تھے، آشوب چشم والوں کے لئے علیحدہ وارڈ تھا، موارد عمل جراحی (surgical cases) کے لئے اپنا الگ وارڈ اور امراض بطن یا اسہال کے بیماروں کے لئے علیحدہ وارڈ تھا، بیمار خواتین کے لئے زنانہ وارڈ علاحدہ تھے، جن کی تیمارداری اور خدمت کے لئے نرسیں تعینات تھیں، مردوں کے لئے جداگانہ وارڈ تھے، جن کے خدام اور تیماردار مرد ہوتے تھے، جرجی زیدان کے بقول مسلم شفا خانوں میں ہر مرض کے لئے علاحدہ وارڈ تھا یا مخصوص وارڈ بنائے گئے تھے، وارڈ کے لئے جو طبیب متعین ہوتا تھا وہ اس میں چکر لگاتا تھا۔ اس کے آگے وہ تیماردار اور خدام ہوتے تھے، جو اس کام کے لئے مقرر ہوتے تھے، طبیب بیماروں کو تشفی دیتا، دوائیں تجویز کرتا اور ہر مرض کے لئے دوائیں لکھتا تھا۔ میکس

میر ہاف کا بیان ہے:

”شفابخانے دو حصوں میں منقسم ہوتے تھے، ایک حصہ مردوں اور دوسرا عورتوں کے لئے مخصوص ہوتا، ہر حصے میں اپنا وارڈ اور ایک دواخانہ ہوتا تھا۔“ (۱)

ہسپتالوں میں ادویات وافر مقدار میں موجود ہوتی تھیں، یہ دوائی دور دراز ممالک یا شہروں سے منگائی جاتی تھیں، ربع رشیدی میں طبی افسر نے مختلف قسم کے روغنوں کی فوری ضرورت محسوس کی تو رشید الدین نے علاء الدین ہندو کو خط لکھا کہ یہ روغن مہیا کئے جائیں، خط میں بکمال صحت و احتیاط بتایا گیا ہے کہ یہ روغن کس مقدار میں کہاں سے حاصل کئے جائیں، ہر ایک روغن کی مقدار ایک سے تین سومن تک لکھی گئی ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ شیراز سے چھ بصرہ سے سات، ایشیائے کوچک سے چھ، بغداد سے نو، شام سے تین اور حبلہ سے تین قسموں کے روغن فراہم کیے جائیں، ہر ایک مقام پر الگ الگ ہر کارہ بھیجا جائے؛ تاکہ تاخیر نہ ہو، اسی شفابخانے کے لئے رشید الدین نے اپنے بیٹے جلال الدین جو ایشیائے کوچک کا حاکم تھا، اسے ایک خط میں مطالبہ کیا کہ وہ ہر سال غاریقوں، بادیان، مصطکی، اسطوخودوس، افیتیون اور کمیلہ ارسال کرے، ہر دوا کی مقدار پچاس سے سومن تک ہو، خود رشید الدین کے پاس شربت کی ایک ہزار صراحیاں تھیں، یہ صراحیاں بے حد خوبصورت تھیں، ہر صراحی پر اس شربت کا نام درج ہے، جس کے لئے وہ بنائی گئی تھی، علاوہ ازیں معجونوں اور لحوٹوں کے لئے چینی ڈبے تھے، رشید الدین طبیب نے سلطان علاء الدین کے عہد میں ہند کا دورہ کیا، جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ ہندوستان سے وہ مفردات فراہم کیے جائیں، جو فارس میں دستیاب نہ تھے؛ چنانچہ علاء الدین نے رشید الدین طبیب کو جو تحائف بصرے کی بندرگاہ کے راستے سے بھیجے، ان میں بائیس دوائیں شامل تھیں، بیمارستان منصوری میں روزانہ خرچ ہونے والی معمولی دواؤں کو چھوڑ کر خاص دواؤں میں صرف شربت انار کے پانسورٹل خرچ ہوتے تھے۔ (۲)

ادویہ سازی میں ماہر دوا ساز ملازم رکھے جاتے تھے، بیمارستان رشیدی کے لئے جندی شاپور کے ہسپتال سے ماسویہ جیسے ماہر دوا ساز کو لایا گیا تھا، ابن البرزوخ دوا سازی و عطر سازی میں مشہور تھے، احمد تیمی اور احمد و عمر ابنائے یونس کو ادویہ سازی اور ترکیب نسخہ جات میں خصوصی مہارت حاصل تھی، شفابخانوں میں ادویہ سازی کے لئے مخصوص مہارت حاصل تھی، شفابخانوں میں ادویہ سازی کے لئے مخصوص کمرے اور گودام ہوتے تھے، نسخے تیار کرنے کے لئے الگ کمرے تھے، اسپین کے ایک طبیب نے ادویہ سازی میں درکار نادر پودوں کی کاشت کے لئے ایک نباتاتی باغ لگوایا تھا، یہ پودے وہ دوران سفر دوسری جگہوں سے لائے تھے۔ (۱)

ادویہ سازی پر ساہور بن سہل کی تصنیف قرابادیں شفابخانوں میں رائج تھی، صیادلہ کی دکانوں پر بھی یہی استعمال ہوتی تھی، بغداد میں ابن التلمیذ نے موجز بیمارستانی تصنیف کی تو شفابخانوں میں اس کا بھی رواج ہوا، بیمارستانوں میں استعمال ہونے والی دواؤں کے بارے میں انہوں نے ایک اور رسالہ مقالۃ امینیہ فی الادویۃ البیمارستانیہ تحریر کیا تھا۔

مسلم شفابخانوں میں وسیع انتظامی عملہ ہوتا تھا، ان میں دوائیں کوٹنے والے، نسخے تیار کرنے والے، مرہم پٹی کرنے والے، کھانا پکانے والے، خدام، منشی اور طبی افسر ہوتے تھے، شفابخانوں میں رہائشی مکانات بھی ہوتے تھے، جہاں طبی افسر اور انتظامی عملے قیام کرتے تھے۔

قاہرہ کے بیمارستان منصوری میں بیماروں کے کپڑے دھونے، مریضوں کو غسل کرانے، کمروں اور بستروں کی صفائی اور دوسری خدمتوں کے لئے نوکر اور نرسیں مقرر تھیں، خدمت کے لئے ہر مریض کو دو محافظ اور نگراں میسر تھے، مختلف قسم کی ادویات، تیل اور فیتلے، پیالے اور دوسری چیزیں تقسیم کرنے کے لئے ملازم مقرر تھے، جن کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ مطبخ میں اپنی نگرانی میں مریضوں کے لئے مقوی کھانے، مرغ چوزے اور گوشت

تیار کروائیں اور ہر بیمار کے لئے مجوزہ طعام ایک الگ اور خاص تھالی میں اس کے سامنے پیش کریں، جس میں کوئی دوسرا مریض شریک نہ ہوگا، ملازمین کو حکم تھا کہ وہ کھانا ڈھانپ کر بیماروں تک پہنچائیں اور تب تک ڈیوٹی انجام دیتے رہیں، جب تک تمام مریضوں کو کھانا فراہم نہیں کیا جاتا۔

بیمارستان منصوری میں بے خوابی کے مریضوں کے لئے علیحدہ وارڈ کا انتظام تھا، جہاں گویے اور داستان گو ملازم رکھے گئے تھے، یہ لوگ موسیقی اور دلچسپ قصوں سے بیماروں کو خوش کرتے تھے، مریضوں کو مطالعے کے لئے تاریخ کی کتابیں فراہم کی جاتی تھیں، کمزور مریضوں کے لئے ایسی ایکٹنگ کی جاتی تھی، جس سے وہ خوش ہو کر ہنس پڑیں، انہوں خوش کرنے کے لئے دیہاتی ناچ پیش کیے جاتے تھے، شفاخانے کے نزدیک جو مسجدیں واقع تھیں، ان کے مؤذنوں کو حکم تھا کہ وہ صبح سے تقریباً دو گھنٹے پہلے اذان دے دیا کریں، اور اچھے لحن کے ساتھ اشعار پڑھیں تاکہ بیمار خوش ہو جائیں؛ کیوں کہ بے خوابی اور طویل رات ان کے لئے تکلیف کا باعث ہوتی ہے، بیمارستان میں روبہ صحت مریضوں کی فوری شفایابی کے لئے بھی موسیقی کا انتظام تھا، جس کے لئے گویے ملازم رکھے گئے تھے، انسانی ہمدردی کے یہ خوبصورت نظارے کسی ایک ہسپتال کی چار دیواری تک محدود نہ تھے۔ قرون وسطی کے دوسرے مسلم ہسپتال بھی یہی روح پرور سماں پیش کر رہے تھے، اور نہ کے شفاخانے میں دس موسیقار تعینات تھے، جو ساز بجا کر مریضوں کی دل بہلائی کا فرض انجام دیتے تھے، ازمنہ وسطی کے مسلم شفاخانوں میں بیماروں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا، بیمارستان منصوری میں عام اجازت تھی کہ اس میں بلا تفریق مذہب و ملت، رنگ و نسل ہر مریض داخل ہو سکتا ہے، اس کے وقف نامے میں کہا گیا تھا کہ یہ ہسپتال امراء و غرباء، مرد و زن، مقامی و غیر مقامی، بچوں اور بوڑھوں، لڑکے اور لڑکیوں، اجنبی ورشتہ داروں، مقیم و مسافر، قوی و ضعیف، عام و خاص اعلیٰ و ادنیٰ، افسر و ماتحت، بینا و نابینا، افضل و کمتر، مشہور و گمنام، ذی قدر و بے قدر، مالک و مملوک چاہے ان کا تعلق کسی رنگ و نسل سے ہو، ان کے امراض جسمانی ہوں

یا روحانی یا اعصابی، کم ہوں یا زیادہ، ایک جیسے ہوں یا مختلف، ظاہری ہوں یا باطنی سب کے لئے وقف ہے، سب کا علاج بلا معاوضہ ہوگا جس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا، یہ علاج محض خدا کے لئے اور آخرت کا اجر حاصل کرنے کی غرض سے اور اس کے احسان عام کی وجہ سے ہوگا؛ کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ مریض کی بھلائی پر خرچ کیا جائے اور ان لوگوں پر جو بیماروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، وقف نامے میں کہا گیا ہے کہ غریب بیمار چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں مکمل صحت یابی تک شفاخانے کے اندر داخل رہیں گے، جہاں علاج کی تمام سہولیات ان پر صرف کی جائیں گی اور تمام لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں گی، اس ہسپتال میں علاج کی کوئی مدت مقرر نہ تھی، مریض شفا یاب ہونے یا مرنے کے بعد ہسپتال سے نکلتا تھا، دمشق، قاہرہ، بغداد اور دوسرے شہروں کے شفاخانوں کے دروازے ہر قسم کے مریضوں کے لئے کھلے تھے، ہندوستان میں فیروز شاہ تغلق کے بنائے ہوئے بڑے شفاخانے میں بلا لحاظ رنگ و نسل، مذہب و ملت تمام بیماروں کا علاج یکساں طور پر کیا جاتا تھا۔

عہد وسطی کے مسلم شفاخانوں میں مریضوں کو جو سہولیات میسر تھیں، وہ دجید دور کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بھی فراہم نہیں ہوتیں، شفاخانوں میں کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی تھی، علاج معالجے کا سارا خرچ اوقاف سے پورا کیا جاتا تھا، ہسپتال کے بیرونی حصے میں نو وارد مریض کا سب سے پہلے گہرا معاینہ کیا جاتا تھا، مرض اگر ہلکا ہوتا تو اسے نسخہ لکھ کر دیتے اور وہ شفاخانے کی ڈسپنسری سے دوا لے کر چلا جاتا، بیماری زیادہ ہوتی تو مریض کا نام و پتہ درج کیا جاتا۔ حمام میں اس کے کپڑے اتروا کر ایک مخصوص گودام میں جمع کیے جاتے پھر اسے شفاخانے کے کپڑے پہنا کر متعلقہ وارڈ میں پہنچا دیا جاتا، جہاں پاک و صاف بستر والا پلنگ الاٹ ہوتا، اس کے بعد ڈاکٹر اس کا علاج شروع کرتے تھے، دوا اور غذا تجویز ہوتی تھی، کھانے میں بکری، گائے، تیتیر، مرغ، اور دوسرے پرندوں کا گوشت فراہم کیا جاتا تھا، روبہ صحت مریض جب مقررہ روٹی اور سالم مرغ ایک دفعہ کھاتا اور اسے ہضم کر جاتا تو اسے تندرست مانا جاتا بیمارستان احمد ابن طولون میں مریض جب

مرغ کا شوربا اور پھلکے کھانے لگتا تب اسے گھر جانے کی رخصت ملتی تھی، بیمارستان کبیر دمشق میں مریضوں کے اخراجات کی تفصیل درج ہوتی تھی، بیمارستان صلاح الدین ایوبی میں مریضوں کے لیے شاندار کمرے تھے، ہر کمرے میں پلنگ اور اس پر سلیتہ مندی سے بچھونے اور تکیے رکھے ہوتے تھے۔ شفاخانوں میں بیماروں کو جاڑوں میں گرم کپڑے، کمبل اور کونہ فراہم کیا جاتا تھا، منصوری شفاخانے میں ناظم وقت کو حکم تھا کہ وہ بیماروں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں، آنکھوں کے استعمال کی اشیاء، دیگیجا، برتن، معجون، مختلف مرہم، تیل مشروبات، ادویات، فرش، بستر اور ضروری آلات وقف کی آمدنی سے پوری کرے، بیماروں کی عام ضروریات بھی شفاخانے ہی کی طرف سے پوری کی جاتی تھیں، مریض کے لئے روزانہ جلانے کی خوشبو، کھانے پینے کے لئے رکابیاں، شیشے کے پیالے اور گلاس فراہم کیے جاتے تھے، مٹی کی صراحیوں کو زے اور دیئے، جلانے کے تیل، کھانے پینے میں استعمال کے لئے دریائے نیل کا پانی، مریض کے کھانے کو ڈھانپنے کا سامان اور گرمی میں کھجور کے پتوں کے بنے ہوئے پتکھے بھی وقف کی طرف سے ملتے تھے، مراکش کے شفاخانے میں بھی مریضوں کو کم سہولیات میسر نہ تھیں، یہاں اون، کتان، ریشم اور چڑے سے بہترین بستر تیار کرائے گئے تھے، بیماروں کے لئے جاڑوں اور گرمیوں میں دن اور رات کے لئے الگ الگ کپڑوں کا انتظام تھا، مملکت کے کسی حصے میں بھی کوئی بھی پردیسی اور اجنبی بیمار ہوتا اسے لا کر ہسپتال میں داخل کر دیا جاتا، بیمارستان عضدی بغداد میں کمزور اور فقیر مریض کشتیوں میں لائے جاتے تھے، جہاں ڈاکٹر صبح و شام ان کا علاج کرتے تھے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے طرابلس کے ایک عجیب وقف کا ذکر کیا ہے، اس وقف کی آمدنی ایسے دواؤں کے لئے مخصوص ہے، جو ہر روز شفاخانوں میں جائیں اور بیماروں کے پاس میں سرگوشی کے انداز میں اس طرح باتیں کریں کہ مریض سن لے اور وہ ان کی باتوں سے یہ اثر لے کہ اب اس کی حالت بہت اچھی ہو رہی ہے، اس کا چہرہ سرخ معلوم ہوتا ہے اور آنکھوں میں چمک ہے۔ (۱)

ہندوستان میں داخل مریضوں کے لئے انواع و اقسام کے لذیذ کھانے، بہترین میوے اور پھل، قسم قسم کے مشروبات میسر ہوتے تھے، جنہیں دیکھ کر کوئی بھی تندرست آدمی بیمار بن جاتا، ۸۳۱ھ/ ۱۴۳۷ء میں ایک سیاح دمشق کے شفاخانے میں لذیذ کھانے دیکھ کر بیمار بن گیا اور اپنا نام مریضوں کے رجسٹر میں درج کرالیا، طبی افسر نے لذیذ کھانے، گوشت، مرغ، مٹھائیاں، اور بہترین پھل تجویز کیے؛ لیکن انھیں سیاح کی ”اصل بیماری“ معلوم ہوگئی تھی، تین روز بعد رقعہ لکھ کر بھیجا کہ مہمان صرف تین روز ٹھہر سکتا ہے۔

بیمارستان منصوری پوری دنیا میں قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ہسپتال تھا، جس کا احاطہ دہلی کے لال قلعے کے احاطے سے تین گنا بڑا تھا، اس میں بیماروں کے لئے آٹھ ہزار بستروں کی گنجائش تھی، روزانہ چار ہزار سے زائد مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا، اتنے بڑے ہسپتال میں بھی ناظم وقف کے فرائض میں ایک فرض میں یہ تھا کہ جو لوگ ہسپتال میں تندرست ہو جائیں، انھیں حسب حال اوسط درجے کا لباس فراہم کیا جائے، اور اس کے ساتھ نقدی رقم دی جائے؛ تاکہ باہر جا کر وہ دوسروں کے محتاج اور دست نگر نہ ہو جائیں، دوسرے مسلم شفاخانوں میں بھی دستور تھا کہ مریض جب شفا یاب ہونے کے بعد ہسپتال سے چھٹی پاتا تو اسے گھر جانے کے لئے کرایہ اور سفر خرچہ دیا جاتا تھا، جسے زادالسلام کہتے تھے، اس کے علاوہ اسے اتنی رقم دی جاتی تھی، جس میں وہ اپنے گھر پر رہ کر بیماری کے بعد کے کمزوری کے ایام بے فکری سے گزار سکے تاکہ معاشی مجبوری کے تحت اسے فوری طور پر کام کرنا نہ پڑے، جس سے وہ دوبارہ بیمار ہو جائے، لباس اور نقدی رقم امیر و غریب سب کو ملتی تھی؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس قدر نقدی فراہم کی جاتی تھی، جس پر وہ اس وقت تک گزارہ کر سکتے تھے، جب تک انھیں روزگار دوبارہ نہ مل جاتا، مراکش کا ہسپتال اس معاملے میں سب سے آگے تھا، یہاں ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت اغنیاء اور فقراء سب کو رقم ملتی تھی، البتہ غریب کو اس رقم کے علاوہ اتنا سرمایہ دیا جاتا تھا، جس سے وہ اپنا کاروبار شروع کر سکتے تھے۔ پردیسیوں کے لئے جو شفاخانے مخصوص تھے، ان میں

بھی یہی سہولیات میسر تھیں۔

مسلم بیمارستانوں میں اگر کسی مریض کی موت واقع ہو جاتی تو اسکی تجہیز و تکفین پورے اسلامی آداب کے ساتھ شفاخانے کی طرف سے ہوتی تھی، غسل دینے، حنوط لگانے، کفن کے اخراجات اور قبر کھودنے کی اجرت شفاخانے کے وقف سے ادا کی جاتی تھی، میت کو سنت نبوی کے مطابق باعزت طور دفن کیا جاتا تھا، قاہرہ کا بیمارستان منصورى تمام مسلم شفاخانوں کے لئے انسانی ہمدردی کی قابل رشک مثال پیش کر رہا تھا، اس ہسپتال میں خارجی بیماروں کے لئے بھی بڑے پیمانے پر سہولیات فراہم تھیں، اس کے وقف نامے میں ناظم اوقاف کو ہدایت کی گئی تھی کہ جو آدمی اپنے گھر میں بیمار ہو اور ہسپتال میں علاج کرانے سے لاچار ہوں اسے جس دوا، شربت یا معجون کی ضرورت ہو وہ اس کے گھر پہنچا دے، اگر کوئی ایسا خارجی مریض اپنے گھر میں مرجائے تو ناظم اہل میت کے شایان شان اس کی تجہیز و تکفین کے اخراجات، غسل دینے، قبر کھودنے اور قبرستان تک پہنچانے کی اجرت شفاخانے کے وقف سے ادا کرے، یہ وہ ہدایات تھیں، جن سے سرمو انحراف نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ اگر ناظم اوقاف چاہتے تو سہولیات کا دائرہ بڑھا سکتے تھے، یہ اس کی صوابدید پر منحصر تھا، وقف نامے میں کہا گیا تھا کہ ناظم کا فرض ہے کہ ظاہری اور باطنی حالات میں اللہ سے ڈرے، کسی بڑے آدمی کے ساتھ نچلے طبقے کے آدمی سے بہتر سلوک نہ کرے، نہ اپنے ملک کے باشندے کو غیر ملکی پر دیسی پر ترجیح دے؛ بلکہ خرچ میں ثواب اور اللہ کے قرب کا لحاظ رکھے جو رب الارباب ہے۔ (۱)

بیمارستانوں میں نفیس آلات اور عمدہ ساز و سامان ہوتا تھا، بیماروں میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا، بیمارستان منصورى میں مردوں کی طرح عورتیں بھی داخل کی جاتی تھیں، امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم، آزاد و غلام کی کوئی قید نہ تھی، بیمارستان کبیر دمشق، بیمارستان احمد بن طولون قاہرہ اور دوسرے بڑے شفاخانوں کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوتے تھے، فیروز شاہ تغلق کے بنائے ہوئے بڑے شفاخانے میں امیر و غریب، مقامی

و مسافر، شریف و رذیل، آزاد و غلام سب کا علاج یکساں ہوتا تھا، بیمارستان منصورى میں ہر انسان کے لئے اذن عام تھا، اس کے وقف نامے میں اجازت تھی کہ جو لوگ اس میں نہ آسکیں، وہ بھی اس کی نایاب دوائیں استعمال کر سکتے ہیں، اس ہسپتال میں کسی کو رنہیں کیا جاتا تھا، اور نہ ہی علاج کی مدت کی کوئی حد تھی، ہسپتال میں آٹھ ہزار مریضوں کے لئے جگہ تھی روزانہ کئی ہزار مریض علاج کرواتے تھے، بیمارستان کبیر دمشق میں مریضوں کے نام اور پتے رجسٹروں میں درج ہوتے تھے، ان میں مریضوں کے اخراجات کی تفصیل بھی لکھی جاتی تھی، بیمارستان احمد ابن طولون میں مریض کے کپڑے اتروا کر اسے ہسپتال کے کپڑے دیے جاتے تھے، اسے بستر ملتا تھا، صبح و شام اطباء و جراح اس کے پاس آتے تھے، جب وہ مرغ کا شور باور پھلکے کھانے لگتا تب اسے گھر جانے کی رخصت ملتی تھی، بیمارستان صلاح الدین ایوبی میں بیماروں کے لئے شاندار کمرے تھے، ہر کمرے میں پلنگ اور اس پر سلیقہ مندی سے بچھونے اور تکیے رکھے ہوتے تھے، شفاخانوں میں مریضوں کو جاڑوں میں گرم کپڑے، کمبل اور کوئلہ فراہم کیا جاتا تھا، دوا اور غذا مفت ملتی تھی، یہ تمام سہولیات شاہی مصارف سے ملتی تھیں، بیماروں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی، بیمارستانوں میں انواع اقسام کے کھانے میسر ہوتے تھے۔

قاہرہ کے بیمارستان میں روبہ صحت بیماروں کی فوری شفایابی کے لئے موسیقی کا انتظام تھا اور اس مقصد کے لئے گویے ملازم رکھے گئے تھے، اور نہ کے شفاخانے میں دس موسیقاروں کا عملہ تعینات تھا جو ساز بجا کر مریضوں کی دل بہالائی کا فرض انجام دیتا تھا، مسلم ہسپتالوں میں جو مریض بے خوابی کے شکار ہوتے تھے، ان کے لئے ہلکی موسیقی کا انتظام موجود تھا ان کے لئے داستان گو تعینات ہوتے تھے، جو انہیں قصے سناتے تھے، ایسے مریضوں کو مطالعے کے لئے تاریخ کی کتابیں فراہم کی جاتی تھیں، بیمارستانوں میں نہ صرف مریض کو علاج، کھانا اور اشیاء ضروریہ مفت ملتی تھیں؛ بلکہ شفایاب ہونے کے بعد وقت رخصت گھر جانے کے لئے اسے شفاخانے کی طرف زاد اسلام (کرایہ اور سفر خرچہ) دیا جاتا تھا، نیز اسے ہسپتال سے رخصت ہونے کے وقت اتنی رقم دی جاتی تھی کہ

بیماری کے بعد گھر میں اپنی کمزوری کے ایام بے فکری سے گزار سکے؛ تاکہ معاشی مجبوری کے تحت اسے فوری طور پر کام کرنا نہ پڑے جس سے دوبارہ بیمار ہو جائے، مراکش کے شفا خانے میں مفت علاج و طعام کے علاوہ مفلس مریض کو شفا خانے سے گھر جاتے اتنی رقم ملتی تھی جس میں وہ کمزوری کی مدت آرام سے گزار سکے، مکمل صحتیابی کے بعد بھی یہ رسم اس وقت تک کے لئے شفا خانے کی طرف سے فراہم کی جاتی تھی، جب تک اسے دوبارہ روزگار نہ مل جاتا۔

ہسپتالوں میں اگر کسی کا انتقال ہوتا تو شفا خانے کی طرف سے تجہیز و تکفین کر کے اسے دفن کیا جاتا تھا۔

ول دوران نے قرون وسطیٰ کے مسلم شفا خانوں کے حسن انتظام کو اس طرح خراج تحسین ادا کیا۔ (۱)

اسلام نے شفا خانوں کے آلات اور حسن انتظام کے معاملے میں بھی دنیا کی رہنمائی کی ہے، دمشق کا ایک ہسپتال جس کی بنیاد نور الدین زنگی نے ۱۱۶۰ء میں ڈالی تھی، تین صدیوں تک مفت علاج اور دوا فراہم کرتا رہا، بتایا جاتا ہے کہ اس کے چولھے کی آگ دو سو سڑھ سال تک کبھی نہیں بجھی، ۱۱۸۴ء میں ابن جنید بغداد پہنچے تو بیمارستان عضدی دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے، ہسپتال کیا تھا، دجلہ کے کنارے گویا شاہی محل تھا، یہاں مریضوں کو دوا اور غذا مفت ملتی تھی، قاہرہ میں ۱۲۸۵ء میں سلطان قلاؤن نے ایک وسیع چہار گوشہ احاطے میں قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ہسپتال، بیمارستان المنصوری قائم کیا، وسیع صحن کے گرد چار عمارتیں کھڑی تھیں، صحن محراب دار راستوں سے آراستہ اور فواروں و نہروں سے ٹھنڈا تھا، شفا خانے مختلف بیماریوں کے لئے الگ الگ وارڈ تھے، افاقہ یاب بیماروں اور لیبارٹریوں کے لئے مخصوص کمرے تھے، نیز اس میں دواخانہ بیرونی مریضوں کے لئے مطب، باورچی خانے، حمام، کتب خانہ، عبادت خانہ، لیکچر ہال اور خاص کر پاگلوں کے لئے عمدہ رہائش کا انتظام تھا، مرد یا عورت، امیر و غریب، غلام

و آزاد سب کا علاج مفت ہوتا تھا، رو بہ صحت مریض کو رخصت ہوتے وقت رقم دیجاتی تھی؛ تاکہ فی الفور کام کرنے کی ضرورت نہ پڑے، بے خواب مریضوں کے لئے ہلکی موسیقی یا پیشہ ورقصہ گولوگوں اور تاریخ کی کتابوں کا بند و سبت تھا، دیوانوں کے لئے تمام اسلامی شہروں میں پاگل خانے تھے۔



چند سیاستداں، قلم کار اور مصلحین امت

ڈاکٹر سید محمود

یہ ضلع غازی پور کے ایک قصبہ سید پور بھٹری کے رہنے والے ہیں، یہ ہندوستان کے وزیر برائے امور خارجہ رہ چکے ہیں، یہ دارالمصنفین کے رکن رکیں، انہوں نے تاریخ میں ڈاکٹریت کی ڈگری کی ہوئی تھی اور یہ بہار کے وزیر تعلیم بھی رہ چکے تھے، ان کو اسلامیات سے گہرا شغف تھا، وہ اپنی موروثی و فطری اسلامیت اور اپنے ذاتی و عملی نیشنلزم اور حب الوطنی میں مطابقت و ہم آہنگی کے متنبی تھے، آپ کے دادا قاضی فرزن علی صاحب کو حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و ارادات کا تعلق تھا، اس لئے ڈاکٹر صاحب کو سید احمد شہید تحریک جہاد سے کافی لگاؤ تھا جو کہ آزادی ہند کے لئے انگریزوں سے لڑی گئی تھی، وہ نہایت سچے محب وطن اور ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے، وہ مابعد آزادی ہند ہندوستان میں ہندو اجماعیت کی تحریک، مسلمانوں کی تہذیب و کلچر سے نفرت اور مسلم حکومتوں کے مظالم اور ہندو کشی کی مبالغہ آرائی پر مشتمل داستانوں اور اس میں رنگ آمیزی کی وجہ سے جو فرقہ وارانہ منافرت کی مہم شروع ہو گئی تھی اس سے خائف تھے، وہ یہ چاہتے تھے کہ ملک کے ان دو عظیم فرقوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتحاد و اعتماد کی فضاء پیدا ہو، اختلاف سے زیادہ اتفاق کے لفظوں کو نمایاں کیا جائے، چنانچہ انہوں نے اپنے اس مدعا کی تحریک دینے کے لئے ۸/۹ اگست کو ۱۹۶۴ء کو کل ہند مسلم مشاورتی اجتماع کے نام دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک اجلاس بلایا، دسمبر ۱۹۶۳ء اور جنوری ۱۹۶۴ء میں کلکتہ میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد ہوا، پھر مارچ اور اپریل ۱۹۶۴ء میں مشرقی ہندوستان کی صنعتی پٹی جس میں، رانچی، جمشید پور اور راوڑ کیلا واقع وہیں سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت فرقہ وارانہ فساد کی لہر چلی، ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے یہ فرقہ وارانہ

منافرت کی مسموم فضا کا خاتمہ ہو، وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد اس ملک عظیم ضرورت ہے، چنانچہ ان کی اس تحریک سے مولانا سید ابوالحسن علی الندوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ابوللیث رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ منسلک ہو گئے، چنانچہ انہوں نے ندوہ میں ہندوستان کی موثر تنظیموں کے نمائندوں کے اجلاس کو طلب کیا جس میں ہندوستان کی چار موثر تنظیموں جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے سربراہ اور صدور و سرکاری موجود تھے، اور اس وقت کے ممبران پارلیمنٹ جن میں بمبئی کے محمد یاسین نوری صاحب بیرسٹر، حیدرآباد کے محمد یونس سلیم (جو بعد میں مرکزی حکومت میں وزیر قانون ہوئے) مدراس کے این، ایم انور ممبر پارلیمنٹ، بہار کے سابق ایم پی سید مظہر امام صاحب، لکھنؤ کے ڈاکٹر محمد عبد الجلیل اور مولوی سید کلب صاحب صدر شیعہ کانفرس وغیرہ شریک تھے، چنانچہ مجلس مشاورت نے ڈاکٹر سید محمود صاحب کی معیت میں اولافساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا وہاں کی سیاسی، سماجی اور ہندو مسلم مذہبی شخصیات کو مدعو کیا، ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت پر زور دیا گیا، چنانچہ، بہار، پٹنہ، رانچی، جمشید پور وغیرہ کے دورے ہوئے، کافی سے زیادہ اس قافلے اور اس کے کاڑکی پذیرائی ہوئی، بڑے بڑے اجتماعات ہوئے، ہندو مسلم دونوں فرقوں کے لوگوں نے لاکھوں کی تعداد میں شرکت کی، ڈاکٹر محمود صاحب کے ان اجلاسوں میں چستی، پھرتی، مستعدی قابل دید تھی، نومبر ۱۹۶۴ء میں اس وفد نے مہاراشٹرا کا دورہ کیا، وہاں بھی مجلس کا شایان شان استقبال ہوا، بمبئی، مالیگاؤں، اورنگ آباد، شولہ پور میں جلسے منعقد ہوئے، پھر اس طرح مجلس کی شاخیں متعدد جگہ قائم ہوئیں، پھر مجلس نے گجرات کا سفر کیا، سفر میں پنڈت سندر لال بھی شریک تھے، پالن پور، احمد آباد، گودھرا، بڑودھ، بھڑوچ وغیرہ کے سفر ہوئے، کافی سے زائد اس وفد کا استقبال ہوا، بلا لحاظ مذہب و ملت کے ہر قسم کی سیاسی، سماجی، شخصیات نے اس وفد کے پروگراموں میں شرکت کی، ہر علاقہ کے معتبر، ذی وقار، صاحب حیثیت لوگوں نے مجلس کے کام کی پذیرائی کی، اس کے علاوہ حیدرآباد، میسور وغیرہ کے بھی دورے ہوئے، میسور کے دورہ میں مجلس نے نہایت منظم، مربوط، طویل وسیع اور موثر دورہ کیا، تقریباً ساڑھے چھ ہزار میل کی مسافت طے

کی مجلس مشاورت کی مقبولیت اور اس کے کام کی اہمیت کی وجہ سے ہر شخص خائف تھا، چنانچہ سب سے پہلے جمعیت علماء ہند نے اس سے علاحدہ کی اختیار کی، پھر حکومت نے اس کے اثرات کو کم کرنے میں رول ادا، بہر حال مجلس نے کانگریس کی اثر کو کم کرنے کے لئے انتخابات میں حصہ لیا، بہر حال مجلس کو نظر بد لگ گئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا اور مجلس کے شیرازہ کے منتشر ہونے سے ڈاکٹر صاحب نہایت بدل ہو گئے، ویسے ان کی قوی بھی جواب دے گئیں تھیں، گرچہ اس مجلس مشاورت کے اثرات بعد میں برقرار رہے، لیکن جس جدوجہد اور جانفشانی اور تگ و دو سے ڈاکٹر صاحب نے مجلس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور ان کی تحریک کو جو وسعت اور ہمہ گیری اور جامعیت نصیب ہوئی وہ واقعہ ان کی درد و سک اور مسلمان ہند کے تئیں ان کے خدشات اور ان کے جان و مالک اور ان کی عزت و آبرو کے تحفظ اور خود اپنے ملک میں ان کے شان سے جینے کے لئے راہ ہموار کرنے کی کوشش تھی۔ وہ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۱ء اس دنیائے فانی عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ (۱)

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی

ڈاکٹر آصف قدوائی ڈاکٹر زین العابدین کے فرزند ارجمند تھے، جو ہیومیو پیتھک کے ایک کامیاب معالج تھے، آصف قدوائی ۱۹۴۶ء سے ایک مرض و علاج کے نتیجے میں مستقل صاحب فریش ہو چکے تھے، لیکن وہ اسی حالت میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے، واصل صاحب اور ان کے والد محترم نے حضرت عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم کر لیا تھا۔

یہ انگریزی بڑے ماہر تھے، اور اس کے اہل قلم اور ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، انہوں نے جو پی ایچ ڈی کا مقالہ لندن یونیورسٹی سے لکھا تھا یونیورسٹی کے مشہور نقاد و محقق استاذ سیاسیات پروفیسر لاسکی نے اس کو دیکھا اور اس پر اظہارِ اطمینان اور تعریفی نوٹ لکھے تھے، اس کے ساتھ وہ اردو کے مایہ ناز قلم کار تھے، ان کا تاریخ و سیرت اور دینیات پر

مطالعہ پر گہرا تھا، ۱۹۵۹ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطے میں ”مجلس تحقیقات و نشریات اسلام“ کا قیام عمل میں آیا تو اس نے اپنی نشریات و مطبوعات کا آغاز انہیں کی کتاب ”مقالات سیرت“ سے کیا، یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں طبع ہوئی اور اہل نظر اس کو پسند کیا۔

انہوں نے اس کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن الندوی کی مشہور زمانہ کتاب ”انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر“ (جو ان کی سب سے مشہور و مقبول کتاب ”ماذا خسر العالم بانحاط المسلمین“ کا ترجمہ ہے اور جس کی عربی میں تقریباً سینکڑوں ایڈیشن نکل چکے ہیں) کا انگریزی میں ترجمہ بنام (Islam and the world) سے کیا، جس سے ان کا ہندوستان اور ہندوستان کے باہر تعارف ہوا، اس ترجمہ کے تعلق انگیزی کے ایک مسلمان اہل قلم (ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری) نے جو خود انگریزی کتاب کے اچھے لکھنے والے اور اور مترجمین میں سے تھے، انہوں حضرت سید مولانا ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ سے کہا تھا: مولانا آپ یقین کیجئے کہ کسی غیر انگریزی کتاب کا بھی اب تک انگریزی میں اس کتاب سے بہتر ترجمہ نہیں ہوا، مشہور ایرانی فاضل اور اسلامیات پر لکھنے والے ڈاکٹر نصر لکھنؤ آئے تو ان سے ملنے آئے، اس کے علاوہ مولانا کے ۱۹۷۳ء میں رابطہ کے وفد کے ساتھ مختلف اسلامی ممالک کے سفر کے دوران جب وہ ایران گئے تو ڈاکٹر حسن نصر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آصف صاحب کے بارے میں پوچھا۔

اس کے علاوہ انہوں نے حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ کی کئی کتابوں کا کامیاب ترجمہ کیا، انہوں نے صرف ازراہ تعلق اور جذبہ دینی کے تحت اس معذوری کی حالت میں بھی جب کہ وہ کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے (اٹھ کر بیٹھنا تو درکنار) وہ کوئی بھاری کتاب اپنے سینے پر نہیں رکھ سکتے تھے، وہ اس کی جلد توڑتے اور تھوڑے تھوڑے اوراق سامنے رکھ کر ترجمہ کرتے، انہوں نے کسی لکھنے والے یا ٹائپسٹ کے انتظام کرنے کو کہا گیا تو منظور نہیں کیا، اس طرح انہوں نے تیرہ کتابوں کے انگریزی میں ترجمہ کئے،

ان میں مولانا منظور صاحب نعمانی کی ”معارف القرآن“ (۱-۴) ابوالحسن علی ندوی کی ”ارکان اربعہ“ نقوش اقبال (Glory of Iqbal)، کاروان مدینہ شامل ہیں، بقول مولانا علی میاں ندوی کے: ”انہوں نے انگریزی میں اسلامیات کا ایک قیمتی و متنوع ”مکتبہ“ تیار کر دیا، جس کی نظیر میرے محدود علم میں اس برصغیر میں نہیں، انگریزی بولنے اور لکھنے ملکوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔

ان کو نقل و حرکت کی اس معذوری و مجبوری کے علاوہ متعدد اندرونی تکلیفوں سے بھی سابقہ پڑا، انہوں نے فرائض کی پابندی، ذکر و شکر، تحریری مشغولیت اور علاج و معالجہ کی خدمت کو جاری رکھا، کبھی زبان سے حرف شکایت نہیں سنا گیا، ۲۰ فروری ۱۹۸۹ء کو اس دارفانی سے کوچ فرما گئے۔ حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی نماز جنازہ پڑھائی۔ (۱)



مسلم سائنس یورپ میں

دنیا کے اسلام بالخصوص اندلس (مسلم اسپین) میں سائنس کے عملی فوائد دیکھ کر اہل یورپ اس کی طرف تیزی سے کھینچے لگے، قرطبہ میں پختہ سڑکوں کی تعمیر، صاف پانی کی بہم رسانی اور گندے پانی کی نکاسی کے لئے زیر زمین نلکوں کی جال دار، سڑکوں اور گلیوں میں قدیلوں کی تنصیب اور عالیشان عمارات کی تعمیر نے قرطبہ کو صرف یورپ کا نہیں؛ بلکہ دنیا کا سب سے خوبصورت شہر بنا دیا تھا، قسطنطنیہ (موجود استنبول) کی جو صدیوں سے خوبصورت شہر مانا جاتا تھا، خوبصورتی اس کے آگے ماند پڑ گئی تھی، غالباً یہی ایک شہر تھا جو رات کو بھی روشن رہنے لگا تھا، اس کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی، صنعت میں بھی یہ شہر سب سے آگے نکل گیا تھا۔

Thomas Arnold legacy of Islam نامی و قیع کتاب کا مدیر

sir لکھتا ہے کہ قرطبہ دسویں عیسوی میں یورپ کا سب سے متمدن شہر تھا، یہ دنیا بھر کے لئے یکے از عجائبات اور تحسین آور تھا، یہ بلقان کی ریاستوں کا ویانا (Vienna) تھا، یہاں ستر (۷۰) لائبریریاں اور ۹۰۰ عوامی غسل خانے تھے۔

آرنلڈ مزید لکھتا ہے جس زمانے میں یورپ مادی اور روحانی حیثیتوں سے اکثر و بیشتر زبوں حالی اور انحطاط میں مبتلا تھا، اسپین کے مسلمانوں نے ایک عظیم الشان تہذیب اور ایک منظم معاشی زندگی تخلیق کی، مسلم اسپین نے فنون، سائنس، فلسفہ اور شاعری کو فروغ دینے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا اور اس کے اثرات تیرہویں صدی کی عیسائی فکر بلند ترین چوٹیوں تک پہنچے، وہ اعلیٰ ترین چوٹیاں Theomas Hquinas اور Dante کی شخصیتیں تھیں، یورپ کے لئے جو ملک مینارہ نور کی حیثیت کا حامل بنا وہ اسپین تھا۔

اندلس میں گھر گھر کاغذ سازی کی صنعتیں قائم ہو گئی تھیں، اس سے پہلے تک

کھالوں اور جھلیوں پر لکھائی ہوا کرتی تھی، مسلمان حکمرانوں نے یہاں سوتی کپڑوں کی صنعت متعارف کرائی، قالین سازی کی صنعت نے بھی رواج پایا، نئی نئی قسم کے برتن بنائے جانے لگے، بارود کو جو چین کی ایجاد تھا آتشیں اسلحہ بنانے کے لئے استعمال کیا جانے لگا، مسلمان ملاح اپنی کشتیوں میں قطب نما استعمال کرنے لگے۔

یہاں نئے نئے پھلوں کے باغات لگائے گئے، تعمیرات کے فن کو اتنی ترقی دی گئی کہ وہ یورپ کے لئے معیار بن گئی، عربی ہندسوں نے جو مسلمانوں نے اہل ہند سے سیکھے تھے، ریاضی کی بے پناہ ترقی کا دروازہ کھول دیا، اتنی ترقی رو من ہندسوں کے ذریعہ ممکن نہ تھی، اس کے فائدے دیکھ کر اہل یورپ نے اپنے ہند سے چھوڑ کر عربی ہند سے اختیار کر لیئے، ریاضی کی بنیادی شاخوں میں سے الجبرا اور مثلثیات (Trigonometry) میں مسلمانوں کی بے مثل ترقی نے بھی اہل یورپ میں اسلامی سائنس کے لئے زبردست کشش پیدا کر دی، مثلثیات پر نصیر الدین طوسی کی کتاب المشکل القطع (Bond of the Sector) یورپ کی شہ پارہ کہلائی، ایسی ہی ان لوگوں نے طب میں بھی محسوس کیا کہ ڈنلپ کے بقول مسلم طب اتنی ترقی یافتہ تھی کہ یورپی طب پر غالب آگئی تھی۔

مختصر یہ کہ جس طرح آج کے میں ترقی پذیر ممالک مغربی ممالک کی سائنسی ترقیوں کو دیکھ کر سائنس کی جانب راغب ہو رہے تھے اسی طرح سے قرون وسطی کے اہل یورپ دنیائے اسلام کی سائنسی ترقیوں کو دیکھ کر سائنس کی طرف راغب ہونے لگے تھے۔

جس طرح ریاضی ترقی کی کلید عربی ہند سے تھی، اسی طرح سے دیگر علوم کی ترقی کی کلید عربی زبان تھی، اس کی وجہ سے مروجہ علوم فلکیات، جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور طب وغیرہ سیکھنے کے لئے عربی جاننا ضروری ہو گیا، اس لئے قرون وسطی میں اہل یورپ میں سے جن لوگوں نے ان علوم کو سیکھنا چاہا، ان لوگوں نے عربی سیکھی، اس پالیسی کی وجہ سے عربی زبان صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہی؛ بلکہ یورپ کی پوری عیسائی دنیا میں بھی عام ہو گئی۔

لاطینی یا کسی بھی یورپی زبان پر عربی زبان کی فوقیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یورپ

کے اہل کلیسا، مسلمان امراء و سلاطین سے خط و کتابت عربی زبان میں کیا کرتے تھے، اسکوریل لائبریری (Escorial library) اسپین میں کچھ خطوط عربی زبان میں موجود ہیں جو فرانس کے کسی نامعلوم راہب نے ساراگوزا (Saragossa) کے فرماں روا المتقدر بن ہود کو لکھتے تھے۔ بہت سے پادریوں نے عربی زبان میں اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ وہ عربی میں شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ اس سے مسلمانوں اور ان کی علمی دھاک اور تفوق کا پتہ چلتا ہے زمانہ کے ہم آہنگ ہونے کے لئے ان کے لئے اس وقت علمی زبان عربی سیکھنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

دسویں صدی میں لکھے جانے والے خط میں عربی سے لاطینی میں ترجمہ شدہ کوئی کتاب طلب کرنا اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ کتابوں کے تراجم کا کام دسویں صدی میں شروع ہو چکا تھا، شروع شروع میں فلکیات اور ریاضی کی کتابیں ترجمہ کی گئیں؛ کیوں کہ ان دونوں علوم میں مسلمان بہت قابل قدر خدمات انجام دے چکے تھے، فلکیاتی مشاہدات کے لئے ابراہیم حبیب الفرازی نے دنیائے اسلام میں پہلی بار اصطراب بنایا اور پھر عمدہ سے عمدہ اصطراب بناتے چلے گئے، ان کے ذریعہ ستاروں کی بلندیوں اور ان کے زاویوں کا تعین کیا جاتا تھا۔

ڈنلپ نے Haskins کے حوالہ سے لکھا ہے کہ لارین (lorraine) کے کلیسا کے ایک شخص نے جس کا نام والچر تھا، ایک عربی اصطراب کی مدد سے ۱۱۸ اکتوبر ۱۰۹۲ء کو ایک چاند گرہن کا مشاہدہ کیا۔

ریاضی اور فلکیات کے علاوہ اہل یورپ نے جغرافیہ کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے کیوں کہ مسلمانوں نے اس مضمون میں بھی کافی کام کیا تھا، اس مضمون پر نویں صدی میں ہی بغداد میں کام شروع ہو چکا تھا، بغداد کے علاوہ اندلس میں بھی کام ہوا، وہاں ابراہیم بن یعقوب طروش نامی ایک بلند پایہ جغرافیہ داں تھا، اس سے الڈری نامی ایک مسلمان جغرافیہ داں نے اندلس کے شہروں کو ملانے والے راستوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ۱۰۵۸ء میں ایک کتاب تصنیف کی تھی، یہ مشہور جغرافیہ داں الادریسی سے

بھی تقریباً ایک صدی پہلے ہوا کرتا تھا، الادریسی کی تصنیف قریباً ۱۱۵۴ء میں منظر عام پر آئی۔

طب کی تصانیف کے تراجم کا آغاز گیارہویں صدی میں ہوا، طب کی کتابوں کے اولین مترجمین میں Constantinus Africanus کا نام مشہور ہے جس نے طب پر کوئی ایک آدھ نہیں؛ بلکہ کئی کتابوں کے ترجمے لاطینی میں کئے، ان کے نام اس باب کے گوشوارہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈنلپ مزید رقم طراز ہیں: ریاضی، فلکیات، کیمیا اور طب پر تراجم کا سلسلہ جاری تھا کہ بارہویں صدی عیسوی میں یورپی مترجمین نے فلسفے کی کتابوں کی طرف توجہ مبذول کی، فلسفے پر پہلی مسلم تصنیف کا لاطینی ترجمہ Dominicus Gundisalvi نامی ایک مترجم کے قلم سے ۱۱۵۰ء میں منظر عام پر آیا، تراجم کا سلسلہ دسویں صدی میں شروع ہوا تھا، تیرہویں صدی یعنی تین صدیوں تک جاری رہا، یاں تک کہ بقول ڈنلپ جو کتابیں قابلِ قدر نظر آئیں ان سب کے لاطینی میں ترجمے کر ڈالے گئے۔

تراجم کا کا زیادہ تر اسپین، سسلی اور اٹلی میں ہوا، اسپین تراجم کا ایک اہم مرکز اس وجہ سے بنا کہ وہاں کی مسلم حکومت کے انحصار کی وجہ سے عیسائیوں نے وہاں کے متعدد شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں اپنی شہری حکومتیں قائم کر لیں تھیں، اسلام کے خلاف ان کے دلوں میں بے اندازہ عداوت تھی، مسلمانوں کی علم دوستی انہیں بہت بھاگتی تھی، ان کے مقابلہ پر خود براعظم یورپ میں اشاعت علم پر ۵۲۹ء میں، رومی شہنشاہ جسطین (Justian) کی عائد کردہ قدغن کے عواقب بھی وہ خوب خوب دیکھ چکے تھے۔

ان شہروں میں تراجم کے لئے عیسائی حکمرانوں کی طرف سے باقاعدہ طور پر شاہی فرمان جاری کئے گئے تھے، جن کے ذریعہ سرکاری خرچ پر دارالترجمے قائم کئے گئے، پہلا دارالترجمہ طلیہ (Toledo) کے بادشاہ ریمینڈل (Raymond) کے حکم سے ۱۱۳۵ء میں طلیہ میں قائم ہوا، اس میں ڈیڑھ سو سال تک تراجم کا کام ہوتا رہا۔ (۱)

john of Seville, Adelard of Bath, Alfred Sergshal, Dominicus gundisalvi, Daniel of Morly, Gearard of cremona, Michael scot (d, 1235)

ان میں سے جراڈ آف کریمونانے جو اٹلی کے شہر کریمونانے کا رہنے والا تھا، سب سے زیادہ ستر تانوں کتابوں کے ترجمے کئے، ابن سینا، زکریا رازی اور ابوالقاسم زہراوی کی تصنیفات کے ترجمے بھی اسی نے کئے تھے۔

مائیکل اسکات لکھتا ہے کہ اس نے طلیہ کے علاوہ سسلی اور اٹلی میں بھی رہ کر تراجم کا کام کیا، اس کے تراجم میں فلکیات پر البتہ وجہ کی کتاب بھی شامل ہے، جو طلیہ میں ۱۲۱۷ء میں مکمل ہوئی اور انگریزی میں On the Sphere کہلاتی ہے۔

دوسرا دارالترجمہ کستالیا (Castalia) اور لیون (leon) کے بادشاہ الفانسودہم (Alphonso x) نے ۱۲۵۲ء میں اشبیلہ (Seville) میں قائم کروایا، اشبیلہ کے ممتاز مترجمین یہ تھے۔

Aratham of Toledo. Issac Bin sid, juda Bin Moses, Samuel Ha levi ete)living p.88)

تیسرا دارالترجمہ اٹلی کے شہر سالرنو (Salerno) میں قائم ہوا، سالرنو کے دارالترجمہ میں زیادہ تر مسلم طب کی کتابیں ترجمہ کی جاتی تھیں، کیوں کہ وہاں ایک اسکول جو ۶۰۰ء سے چلا آ رہا تھا، اسے بعد میں میڈیکل اسکول بنا دیا گیا، اس لئے مسلمان حکماء کی طبی کتابیں جو خود ان کی اپنی کتابوں سے زیادہ معلوماتی ہوتیں ترجمے کرا کے سالرنو کے میڈیکل اسکول میں داخل نصاب کرادی جاتیں، ابن سینا کی القانون، زکریا رازی کی الحادی، ابوالقاسم زہراوی کی التصریف، ابن رشد کی کلیات، ابن زہر کی التیسیر اور ابن الہیشم کی کتاب المناظر یہاں داخل نصاب رہی۔

سالر نو کے ممتاز مترجمین کے نام یہ تھے:

Constantinus Africanus, Adelard of Bath,
john petrus Alfonso. stephan of Pisa and
moses Farachi(d. 1185)

سالر نو میڈیکل اسکول کے بارے میں یہ بات جاننے کے لائق ہے کہ وہاں کافی دنوں تک لاطینی کے پہلو بہ پہلو عربی زبان بھی ذریعہ تعلیم رہی، اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ابتداء میں مسلمان کی کتابیں داخلِ نصاب تو کر لی گئیں مگر لاطینی زبان میں ان کے ترجمے کرنا وقت طلب کام تھا، اس لئے تراجم کی تکمیل کے انتظار کرنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا گیا کہ عربی زبان میں ہی ان کتابوں کی تدریس شروع کرادی جائے، مسلم طب سالر نو کے میڈیکل اسکول کے ہی ذریعہ یورپ میں پھیلی، وہاں کے ایک مترجم (Petrus Alfonso) جو انگلستان کے بادشاہ ہنری اول کا طبیب بھی تھا، عربی طب کو یورپ میں پھیلانے میں بہت اہم حصہ لیا۔

تراجم کا کام اسپین کے ہمسایہ ملک پرتگال میں بھی کرایا گیا، اس لئے کہ وہاں کے بادشاہ (Diniz the Liberal) نے باقاعدہ ایک شاہی فرمان جاری کیا تھا، پرتگال کے علاوہ Island of Malloria میں بھی ۱۲۷۶ء میں Arabic college of Miramer قائم کیا گیا، عربی کالج وہاں کے بادشاہ جیمز دو (James 11) کے حکم سے قائم ہوا تھا۔

اس کے صرف پندرہ برس بعد ۱۲۹۱ء میں fray De puigrentos نے اسپین کے شہر ویلینٹیا (valencia) میں بھی لاطینی کے ساتھ عربی ذریعہ تعلیم کا نظم کیا تھا۔

مندرجہ بالا دارالترجمہ میں عیسائیوں کے علاوہ یہودیوں نے بہت ذوق و شوق سے کام کیا تھا، کیوں کہ وہ ان علوم سے خود اپنی قوم کو بھی روشناس کرانا چاہتے تھے، اس غرض سے ان لوگوں نے اپنی زبان عبرانی میں بھی ترجمے کرائے۔، یہودی مترجمین میں

سے خاص خاص کے نام یہ ہیں:

Abraham Bar Hiyya, Abrham ben Erza,
Joseph Bin Issac(d,1170 (Judah Ben
Tibban(d,1150(and Benjamin of toledo

ترجمہ طلیہ، اشبیلہ، سالونزا اور پرتگال کے علاوہ کچھ اور مراکز میں بھی ہوئے، مگر ان کی قدر و قیمت سے کم لوگ واقف ہیں، ان مراکز میں سے ایک Lotharingir تھا، اس کے بارے میں Mary catherine Welborn نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ یہ شہر گیارہویں صدی میں عربی زبان اور سائنس کا مرکز تھا۔ اصطلاحات کے سلسلے میں ایک اہم کام یہ کیا گیا کہ عربی سے لاطینی میں ایک لغت مرتب کی گئی، یہ لغت croningen university کے ایک ولندیزی پروفیسر (1612-1666) نے مرتب کی، Deusing نے اس لغت کے علاوہ عربی گرامر پر بھی ایک کتاب تصنیف کی جو شرح تھی۔

مندرجہ بالا دارالترجموں کے علاوہ جو عربی کتابوں لاطینی تراجم کے لئے ہی قائم کئے گئے تھے، یورپ کی متعدد یونیورسٹیوں میں بھی وہاں کے اساتذہ نے مسلمان حکماء کی تصنیفات کے تراجم کئے اور پھر انہیں اپنے یہاں نصاب داخلِ نصاب بھی کیا، ان میں بولونا (Bologna)، مونٹ پلیر (Mount pellir) اور سلماٹکا (salmancs) کی یونیورسٹیاں قابل ذکر ہیں، ان یونیورسٹیوں کے ڈاکٹر اساتذہ نے ابن سینا اور ابن رشد کی کتابوں کے اور ان کی شرحوں کے اور جالینوس کی کتابوں کی عربی شرحوں کے ترجمے کئے، ان سب یونیورسٹیوں کے درمیان سب سے بڑا علمی مرکز پیڈوا یونیورسٹی (Padua University) بنی، یہاں فلسفے میں ابن سینا رشد کو اتنی عظمت حاصل ہوئی کہ ارسطو کا نام پس پشت چلا گیا، حالانکہ ابن رشد کو فلسفے میں جو مقام ملا تھا وہ ارسطو کی تصنیفات کا شارح ہونے کی بناء پر ہی ملا تھا، پیڈوا یونیورسٹی میں فلسفے کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں بیان کیا جاتا ہے، اور وہ لفظ ہے ”ابن رشد“ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ

تیرہویں صدی کے دوران پیرس میں بھی ابن رشدیت (Averrois) فلسفے کا فیشن تھی۔

مسلم فلسفہ کی طرح سے مسلم طب کی جڑیں بھی پیڈوار یونیورسٹی میں بڑی گہری تھیں، طب میں وہاں ابن سینا کو امام کی حیثیت حاصل تھی، اور عربی طب کو ہی معیار مانا جاتا تھا، ڈاکٹر اوسلر (Osler) کے بقول القانون یورپ میں طب کا بائیل کہلائی۔

اثانومی کا مشہور پروفیسر ویزالینس (Vesalius) بھی ۱۵۳۶ء میں اسی یونیورسٹی سے وابستہ ہو گیا تھا، وہ بھی مسلم طب سے بہت متاثر تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے رازی کی کتاب المنصوری کے دس ابواب کے لاطینی ترجمے کئے تھے۔

ویزالینس کے علاوہ پیڈوار یونیورسٹی کے اور بھی متعدد ڈاکٹر مسلم طب کے پیروکار تھے، انگلستان میں بھی عربی طب کا اثر موجود تھا، وہاں کے ایسے طباء میں سے ڈیولپ نے Greenhill.W.A کا نام بیان کیا ہے۔

ان تراجم کو اہل یورپ نے اپنی درسگاہوں میں داخل نصاب کیا جس کی وجہ سے پندرہویں صدی کے وسط میں چھاپا خانہ ایجاد ہونے کے بعد سے یہ تراجم بار بار طبع ہونے لگے، مثال کے طور پر ابن سینا کی القانون (قانون الطب) یورپ میں پچاس بار طبع ہوئی۔

جابر بن حیان کی کیمیا کی تصانیف کے تراجم بھی یورپ میں بار بار طبع ہوئے جس کی وجہ سے اس کی ذات یورپ میں اس قدر معروف ہوئی اور اس کے کام نے اتنی قوت وقعت حاصل کی کہ اپنے اختراعی کارناموں کی وجہ سے یورپ میں بابائے کیمیا کہلایا، اسی طرح سے ابن الہیثم کی ”کتاب المناظر“ (The book of Optics) کا ترجمہ منظر عام پر آیا تو بصریات پر اس کے تخلیقی کاموں کی وجہ سے اہل یورپ نے اسے بابائے بصریات کا لقب سے ملقب کیا۔

تراجم کے بعد پھر ان میں سے بہت سی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی جانے لگیں، کتابوں کی شرحیں کئی کئی مصنفین نے لکھیں، ڈاکٹر اے۔ آر۔ قدوائی نے بعض شرحوں کی

تعداد بھی پیش کی ہے، زکریا رازی کی کتاب المنصوری کی نو شرحیں لکھی گئیں، القانون کی بارہ اور علی ہذا القیاس۔

ان ترجموں اور شرحوں نے یورپ میں بڑے بڑے سائنس دان پیدا کئے، K.Z.Zabo نامی ایک مغربی مصنف لکھتا ہے ابن الہیثم ڈیکارٹ (Descarte)، نیوٹن (Newton) اور ہیجنس (Huygens) کا پیش رو تھا۔

البتہ وجی بھی ایک بڑا مسلمان سائنس داں تھا، جس کی فلکیات پر تصنیفات یورپ میں بہت مقبول ہوئیں، اس کی ایک کتاب (مبینہ) تصنیف کتاب الہیات کا ترجمہ مائیکل اسکاٹ نے کیا، اس کتاب میں البتہ وجی نے بطلموس کے مشہور فلکیاتی نظریوں پر جو Eccentrics اور Epicycles کے نام سے مشہور ہیں اور جو اجرام سماوی کی چال کی توجیہ کرتے ہیں، تنقید کی تھی اور ارسطو Homocentric Spheres کے نظریے کی اصلاح تھی۔

قارئین سے بین طور پر واضح ہوتا ہے کہ جن برسوں اور صدیوں میں یورپ میں مسلمان حکماء کی کتابوں کے ترجمے کئے جا رہے تھے، ان برسوں اور صدیوں میں اہل یورپ کے پاس علوم کا سب سے بڑا ماخذ مسلمان حکماء کی کتابیں تھیں، ایک قرینہ تو یہی ہے کہ یورپ میں جن لوگوں نے خود کتابیں لکھنی شروع کیں انہوں نے زیادہ تر عربی ماخذات سے استفادہ کیا، مثلاً Albertus Magnus نے حیوانات کے موضوع پر سولہ سو (۱۶۰۰) صفحات پر پھیلی ہوئی نہایت ضخیم کتاب De Anamilibus نامی جو لکھی ہے اس بارے میں ایک یورپی مصنف لکھتا ہے کہ اس کے مواد تین چوتھائی کے لگ بھگ حصہ عربی ماخذات سے حاصل کیا گیا تھا۔

ان عربی ماخذات میں سے ایک ماخذ ابن سینا کا قانون تھا جس کا جیرارڈ آف کریمونا نے لاطینی میں ترجمہ کیا تھا، دوسرا ماخذ مائیکل اسکاٹ کی عربی سے لاطینی میں ترجمہ کردہ کتاب (Historia Animalium) تھی، تیسرا ماخذ ابن جلیجل کی ایک کتاب تھی۔

اسی طرح سے نباتیات پر Albertus کی کتاب De Vegetabilibus

کے بارے میں ڈنلپ لکھتا ہے کہ اس میں بھی عربی ماخذات استعمال کئے گئے ہیں، ان عربی ماخذات میں ایک بار پھر قانون کا تذکرہ کرتا ہے، یہ دو مثالیں صرف نمونے کی طور پر ہیں ورنہ ایسی عربی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جنہیں قرون وسطیٰ کے یورپ مصنفین نے ماخذات (source Books) کے طور پر استعمال کیا۔

اس ضمن میں یہ بات نہایت قابل ذکر نظر آتی ہے کہ یورپی مصنفین نے یونانی مصنفین کی کتابوں سے بھی اکثر و بیشتر ان کے تراجم کے ذریعہ استفادہ کیا کیوں کہ اکثر یونانی نسخے مدتوں پہلے تلف ہو چکے تھے، صرف عربی تراجم کی صورت میں باقی رہ گئے تھے، ایسی کتابوں میں مشہور فلکیات داں بطلمیوس کی گراں قدر تصنیف The megale Syntaxis بھی تھی جو عربی میں السجلی کے نام سے ترجمہ ہوئی تھی۔

اہل یورپ کے لئے جب اس کتاب سے استفادہ کا وقت آیا تو ان لوگوں نے الجسطی کے ذریعہ اس سے استفادہ کیا، اسی طرح سے ارسطو، اقلیدس (Euclid) بقراط اور تھیوفراستس (Theophrastus) وغیرہ کی کتابوں کے عربی تراجم کے ذریعہ ان سے استفادہ کیا، ایک اور مثال ارسطو کی کتاب (De coelo) ہے جس کی ابن رشد نے عربی میں شرح لکھی تھی، اس کے شرح کے ذریعہ De coelo سے استفادہ کی صورت نکلی۔

اس ترجمے کے ذریعہ اہل یورپ نے ارسطو کی تصنیف سے اپنی تصنیفات میں استفادہ کیا، حیوانات پر ارسطو کی کتاب Historia Animalium بھی عربی ترجمے کے ذریعہ اہل یورپ کو دستیاب ہوئی کیوں کہ ابن رشد نے اس کی بھی شرح لکھی تھی، مائیکل اسکاٹ نے اس عربی متن De Anima کے نام سے ترجمہ کیا۔

ارسطو کی کئی اور تصانیف کے جن کے مائیکل اسکاٹ نے عربی تراجم سے لاطینی میں ترجمے کئے، لاطینی نام درج ذیل ہیں:

1- De Generations Et corruptione

2 - Book IV of the meteore

3- the sensu

4- The First Treatises of the Parva Naturalia

5- Physics

6- Metaphysics

7- Ethics

ڈنلپ لکھتا ہے کہ ارسطو کی کتابوں کے عربی تراجم کے لاطینی تراجم نے جو مائیکل اسکاٹ نے کئے یورپ میں ارسطو کے مطالعے کا دروازہ وا کر دیا۔

مگر یونانی کتابوں کی تعداد، مسلمان حکماء کی تصانیف کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی، اس لئے یہ بات شرح صدر کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یورپ میں علم کا احیاء جو ہوا وہ یونانی حکماء مقابلے بدرجہا مسلمان حکماء کی تصنیفات کے مرہون منت تھا، قریب قریب اسی قسم رائے آرنلڈ کی بھی ہے وہ لکھتا ہے کہ اسپین پر عیسائیوں کی فتوحات کے بعد مسلم تہذیب اسپین سے نکل کر پورے یورپ میں پھیل گئی اور جوں جوں اسپین کے شہروں طلیہ (سقوط بہ سال ۱۰۸۵ء) قرطبہ (سقوط بہ سال ۱۲۳۶ء) اور اشبیلہ (سقوط بہ سال ۱۲۴۸ء) کا سقوط ہوتا گیا، یورپ میں علوم و فنون اور کاریگری وغیرہ تیزی سے پھیلتی گئی۔

پھر یہ کہ طلیہ، اشبیلہ، سالرنو، پیڈوا اور دیگر بلاد یورپ میں دسویں سے تیرہویں صدیوں تک مسلمان حکماء کی کتابوں کے تراجم کا جاری رہنا اس امر کی بہت قوی دلیل ہے کہ یورپ میں علم کی روشنی ان کتابوں کے ذریعہ ہی پھیلی، اس کے علی الرغم اس کے لئے نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی اصطلاح جو اہل یورپ نے استعمال کی وہ نہایت متعصبانہ بلکہ گمراہ کن ہے، نشاۃ ثانیہ کی اصطلاح کا استعمال ان کے اس ادعا کا غماز ہے کہ یورپ میں علم خود ان کے اپنے براعظم کے ملک یونان کے حکماء کی تصنیفات کو پھر سے زندہ کرنے سے پھیلا، حالانکہ شواہد جن کے کچھ نمونے سطور بالا میں پیش کئے گئے اس ادعا کی صریح نفی کرتے ہیں، یورپ میں مندرجہ بالا جو دارالترجمے قائم ہوئے ان میں سے ایک بھی یونانی کتابوں کے تراجم کے لئے قائم نہیں کیا گیا تھا، بلکہ وہ سب کے سب

عربی کتابوں کے تراجم کے لئے قائم کئے گئے تھے، اس غرض سے ان مترجمین نے عربی سیکھی تھی کیوں کہ Island of Milloria کے بادشاہ جیمز دوم نے عربی سیکھنے کا فرمان جاری کر رکھا تھا، بالفرض یونانی حکماء کے تراجم کے لئے یہ دارالترجمہ قائم کئے گئے ہوتے تو انہیں ڈیڑھ تا تین صدیوں کی مدت درکار نہ ہوتی؛ کیوں کہ یونانی حکماء کی چھوڑی ہوئی کتابیں اتنی تعداد میں باقی نہیں رہ گئی تھیں کہ مندرجہ بالا پانچ دارالترجمہ اس کام کی تکمیل کے لئے صدیوں کی مدت کے طلب گار ہوتے، ایک اور بات محل نظر یہ ہے کہ یہ مسلمان حکماء کی تصنیفات کی تعداد کے تازہ ترین جائزے کے مطابق جو Islamic Hertige Foundation London کی شائع کردہ کتاب یہ چار مجلدات نے شائع کی ہیں، دنیا بھر میں مسلمان حکماء و فضلاء کی کتابیں آج بھی پندرہ سولہ لاکھ کی تعداد میں موجود ہیں، جس صدیوں میں یورپ میں ان کے ترجمے ہو رہے تھے بعض دسویں تا تیرہویں صدی کے دوران کی تعداد ان سے زیادہ ہی رہی ہوگی۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
 ثریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا
 مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
 جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ





☆ حضرت عمرؓ کے مبنی بر عدل فیصلے

☆ حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانہ خلافت میں جبلہ جو ملک غسان میں تھا مسلمان ہوا اور موسم حج میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا، ایک دوسرا غریب آدمی بھی ساتھ ساتھ طواف کر رہا تھا، اتفاق سے اس غریب آدمی کے پیروں تلے اس کی ازار کا کنارہ روند گیا، جبلہ جب آگے بڑھا تو اس لنگی اٹک گئی اور برہنہ ہو گیا، چونکہ وہ اپنے کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا اور یہ دوسرا شخص نہایت غریب آدمی تھا، لہذا اس کو بہت غصہ ہوا اور ایک طمانچہ اس زور سے مارا کہ اس کا ایک دانٹ ٹوٹ گیا، وہ غریب حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ: اے امیر المؤمنین! جبلہ نے میرا دانٹ توڑ دیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا: جبلہ کو میرے پاس لاؤ، چنانچہ جبلہ کو لا گیا، حضرت عمرؓ نے واقعہ دریافت فرما کر اس غریب آدمی کو اجازت دی کہ وہ جبلہ سے اپنا بدلہ لے، جبلہ نے جب یہ سنا تو طیش میں آکر یہ کہا کہ: امیر المؤمنین مجھ کو اور ایک غریب آدمی کو کس چیز نے برابر کر دیا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: کہ اسلام نے، اس میں امیر غریب سب برابر ہیں، تم نے اس کا دانٹ توڑا اور تمہارا دانٹ ضرور توڑا جائے گا، جبلہ نے کہا: کیا مجھے ایک دن کی مہلت مل سکتی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: مل سکتی ہے اگر یہ شخص مہلت دے، صاحب حق سے پوچھا گیا تو وہ بیچارہ نیک دل تھا، اس نے اجازت دے دی، جبلہ موقع پا کر رات کو اٹھ کر کھڑا ہوا اور روٹیوں سے جاملا اور بدستور سابق نصرانی ہو گیا۔ (۱)

☆ کوفہ کے ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ: حضرت عمرؓ نے ایک لشکر بھیجا

اور اس کے امیر کو لکھا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارے کچھ ساتھی کبھی موٹے تازے کافر کا پیچھا کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ کافر دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے اور خود کو محفوظ کر لیتا ہے، اس سے تمہارے ساتھی فارسی میں مترس (مت ڈر) کہہ کر اسے امان دیتے ہیں اور وہ کافر خود کو مسلمان کے حوالہ کر دیتا ہے، پھر یہ مسلمان اس کافر کو پکڑ کر قتل کر دیتے ہیں، یہ قتل دھوکہ دے کر کیا گیا ہے، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے آئندہ اگر مجھے کسی کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ اس نے ایسا کیا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا، حضرت ابوسلمہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کسی نے آسمان کی جانب اشارہ کر کے کسی کو امان دی اور وہ مشرک اس وجہ سے مسلمان کے پاس آ گیا پھر مسلمان نے اس کو قتل کر دیا تو میں اس مسلمان کو ضرور قتل کروں گا۔ (۱)

☆ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ: ہم نے تستر کا محاصرہ کیا، (آخر محاصرہ اور جنگ سے تنگ آکر تستر کے حاکم) ہرمزان نے اپنے حق میں حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر اترنا قبول کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، جب ہم حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے اس سے کہا: کہو کیا بات ہے؟ اس نے کہا: زندہ رہنے والوں کی طرح بات کروں یا مرنے والوں کی طرح بات کروں؟ حضرت عمرؓ نے کہا: ”لا بأس“ یعنی تم اپنے آپ میں مت ڈرو، بات کرو، ہرمزان نے کہا: اے قوم عرب! جب تک تمہارے ساتھ نہ تھا؛ بلکہ اللہ نے معاملہ ہمارے اور تمہارے درمیان چھوڑ رکھا تھا، اس وقت تک تو ہم تم کو غلام بناتے اور تمہیں قتل کرتے تھے اور سارا مال تم سے چھین لیتے تھے؛ لیکن جب سے اللہ تمہارے ساتھ ہو گیا، اس وقت سے ہم میں تم سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رہی، حضرت عمرؓ نے کہا: اے انس! تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا:

امیر المؤمنین اس نے اپنے پیچھے بڑی تعداد میں دشمن اور بدبہ چھوڑ کر آیا ہو، اگر آپ اسے قتل کر دیں گے تو اس کی قوم اپنی زندگی سے ناامید ہو کر مسلمانوں سے لڑنے میں زیادہ زور لگائے گی، اس لئے آپ اسے قتل نہ کریں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں براء بن عازت اور حجر بن ثور کے قاتل کو کیسے زندہ چھوڑ دو، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: جب مجھے خطرہ ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے قتل کر دیں گے تو میں نے کہا: آپ رضی اللہ عنہ سے ”لا بائس“ مت ڈرا اور بات کہہ چکے ہیں اور ”لا بائس“ کہنے سے جان کی امان ملتی ہے، لہذا آپ تو اسے امان دے چکے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس سے کوئی رشوت لی ہے اور اس سے کوئی مفاد حاصل کیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہا کہ اللہ کی قسم میں نے نہ رشوت لی ہے اور نہ کوئی مفاد، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم اپنے دعویٰ ”لا بائس“ کی تصدیق کرنے والا کوئی گواہ اپنے علاوہ لاؤ ورنہ میں تم سے سزا کی ابتداء کروں گا، مجھ کو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ملے، میں ان کو لے کر آیا اور انہوں نے میری بات کی تصدیق کی جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہرمزان کے قتل سے رک گئے اور ہرمزان مسلمان ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا۔ (۱)

☆ حضرت ایاس بن سلمہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ: ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بازار سے گذرے، ان کے ہاتھ میں کوڑا تھا، انہوں نے آہستہ سے وہ کوڑا مجھے مارا جو میرے کپڑے کے کنارے پر لگا اور فرمایا کہ: تمہارا جج کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور مجھ کو چھ سودر ہم دیئے اور کہا کہ: انہیں اپنے سفر حج میں کام میں لانا اور یہ اس ہلکے سے کوڑے کے بدلہ میں ہے جو میں نے تم کو مارا تھا، میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! مجھے تو وہ کوڑا یاد بھی نہ رہا، فرمایا: لیکن میں تو اسے نہیں بھولا۔ (۲)

(۱) حیاة الصحابة: کتاب عمر الى امير جيش في منع قتل: ۲/۴۲۵، مؤسسة الرسالة، بيروت

(۲) حیاة الصحابة: قصة عمر وإياس بن سلمه: ۲/۴۲۳

☆ حضرت شعبی کہتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے درمیان (کھجور کے ایک درخت کے بارے میں) جھگڑا ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: آؤ ہم آپس میں فیصلہ کر کے کسی کو ثالث مقرر کرتے ہیں، یہ دونوں حضرات حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں؛ تاکہ آپ ہمارے درمیان فیصلہ کریں، جب یہ دونوں حضرات حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ہاں داخل ہوئے تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر کے سرہانے بٹھانا چاہا، اور یوں کہا: امیر المؤمنین! یہاں تشریف رکھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: یہ پہلا ظلم ہے جو آپ نے اپنے فیصلہ میں کیا، میں اپنے فریق مخالف کے ساتھ بیٹھوں گا، حضرت ابن بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنا دعویٰ پیش کیا جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انکار کیا، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ امیر المؤمنین کو قسم کھانے کی زحمت نہ دیں اور میں امیر المؤمنین کے علاوہ کسی اور سے یہ درخواست نہیں کر سکتا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی اور قسم کھا کر فرمایا کہ: حضرت زید رضی اللہ عنہ تب ہی قاضی بن سکتے ہیں جب ان کے نزدیک امیر المؤمنین اور ایک عام آدمی دونوں برابر ہوں۔ (۱)

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مصر سے ایک آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: اے امیر المؤمنین! مجھ پر ظلم ہوا ہے میں آپ سے پناہ لینا چاہتا ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، تم میری مضبوط پناہ گاہ میں ہو، اس نے کہا: میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد سے دوڑنے میں مقابلہ کیا تو اس سے آگے نکل گیا وہ مجھے کوڑے مارنے لگے اور کہنے لگے کہ میں بڑے کریم لوگوں کی اولاد میں سے ہوں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ وہ خود بھی مدینہ آئیں اور ساتھ میں اپنے بیٹے کو بھی

(۱) حیاة الصحابة: عدل عمر الفاروق رضي الله عنه: ۲/۳۳۳

لائیں، چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مدینہ آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ شکایت کرنے والا مصری کہاں ہے؟ کوڑا لو اور اسے مارو، وہ مصری کوڑے مارتے جا رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے جا رہے تھے: کمینے کے بیٹے کو مارو، اس مصری نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو خوب پیٹا اور ہم چاہتے تھے کہ وہ خوب پیٹے اور اس نے مارنا تب چھوڑا جب ہم کو تقاضہ ہوا کہ وہ اب نہ مارے یعنی اس نے مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مصری سے فرمایا: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو چند کوڑے مارے، اس نے کہا: امیر المؤمنین! مجھ کو تو ان کے بیٹے نے مارا تھا، میں نے بدلہ لیا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: کب سے تم نے لوگوں کو غلام بنائے رکھا ہے؟ حالانکہ ان کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا ہے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اس قصہ کا بالکل پتہ نہ چلا اور نہ مصری میری پاس شکایت لے کر آیا ہے ورنہ میں اپنے بیٹے کو خود سزا دیتا۔ (۱)

☆ حضرت حسن کہتے ہیں کہ: ایک عورت کا شوہر غائب تھا، اس کے پاس کسی کی آمد و رفت تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے کھٹک ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلانے کے لئے اس کے پاس آئی بھیجا، اس آدمی نے اس عورت سے کہا کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس چلو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمہیں بلارہے ہیں، اس نے کہا: ہائے میری ہلاکت مجھے عمر سے کیا واسطہ؟ وہ گھر سے چلی، وہ حاملہ تھی، ابھی وہ راستہ میں ہی تھی کہ وہ گھبرا گئی اور اسے درد زہ شروع ہو گیا، وہ ایک گھر میں چلی جہاں اس کا بچہ پیدا ہوا، بچہ دو دفعہ رویا اور مر گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ میرے ڈر کی وجہ سے تو وہ عورت گھبرا گئی، اس وجہ سے بچہ قبل از وقت پیدا ہوا، اس وجہ سے بچہ مر گیا، کیا اس بچہ کے اس طرح مرنے کی وجہ سے مجھ پر کوئی چیز شرعاً لازم ہوتی ہے، بعض صحابہ نے کہا: آپ پر کچھ لازم نہیں آتا؛ کیوں کہ آپ

مسلمانوں کے والی ہیں اور آپ کے ذمہ ان کو ادب سکھانا ہے، کوئی کمی دیکھے تو انہیں بلا کر تنبیہ کریں، حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموش تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر ان لوگوں نے یہ بات بغیر دلیل کے محض اپنی رائے سے کہی تو غلط ہے، اگر ان لوگوں نے آپ کو خوش کرنے کے لئے یہ بات کہی ہے تو انہوں نے آپ کے ساتھ خیر خواہی نہیں کی، میری رائے یہ ہے کہ اس بچہ کی دیت یعنی خون بہا آپ کو دینا پڑے گا؛ کیوں کہ آپ کے بلانے کی وجہ سے وہ عورت گھبرا گئی؛ اس لئے یوں بچہ کا قبل از وقت پیدا ہونے کا سبب آپ ہی ہیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اس بچہ کا خون بہا سارے قریش سے وصول کریں؛ اس لئے کہ یہ قتل ان سے خطا کے طور پر صادر ہوا ہے ”فَأَمَرَ عَلِيًّا أَنْ يُقَسِّمَ عَقْلَهُ عَلَى قُرَيْشٍ“ (۱)

☆ حضرت جریر کہتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ جہاد میں ایک آدمی تھا، اس لڑائی میں مسلمانوں کو بہت مال غنیمت حاصل ہوا، حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کو مال غنیمت سے حصہ دیا؛ لیکن پورا نہ دیا، اس نے کہا: لوں گا تو پورا لوں گا، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس کو بیس کوڑے مارے اور سر موٹا، وہ اپنے بالوں کو جمع کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا، وہاں جا کر اس نے اپنے جیب سے بال نکالے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سینے پر دے مارا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تمہیں کیا ہوا؟ اس نے سارا قصہ سنایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ کو خط لکھا ”سلامہ علیک“ اما بعد! فلاں بن فلاں نے مجھے سارا قصہ اس طرح سنایا میں تمہیں قسم دے کر کہتا ہوں کہ اگر یہ کام آپ نے اس کے ساتھ بھرے مجمع کے سامنے کیا ہے تو آپ اس کے لئے بھرے مجمع میں

اس کے سامنے بیٹھ جائیں، اگر آپ نے اس کے ساتھ یہ کام تنہائی میں کیا ہے تو آپ اس کے لئے تنہائی میں بیٹھ جائیں؛ تاکہ وہ آپ سے اپنا بدلہ لے، اُقْسِمُ عَلَيْكَ اِنْ كُنْتَ فَعَلْتَ مَا فَعَلْتَ فِي مَلَأٍ مِنَ النَّاسِ جَلَسْتُ لَهُ فِي مَلَأٍ مِنَ النَّاسِ فَاقْتَضُ مِنْكَ وَاِنْ كُنْتَ فَعَلْتَ مَا فَعَلْتَ فِي خَلَاءٍ فَاقْعُدْ لَهُ فِي خَلَاءٍ فَلْيَقْتَضُ مِنْكَ۔ چنانچہ جب حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو یہ خط پہنچا تو بدلہ دینے کے لئے اس آدمی کے سامنے بیٹھ گئے، اس آدمی نے کہا: میں نے اللہ کے لئے معاف کر دیا ہے (۱)

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں مصر میں میرے بھائی عبدالرحمن اور ان کے ساتھ ابوسردی نے نبیذپی جس سے انہیں نشہ ہو گیا، صبح کو جب یہ دونوں مصر کے امیر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ: ہمیں پاک کر دیں؛ کیوں کہ ہم نے ایک مشروب پیا تھا جس سے ہمیں نشہ ہو گیا تھا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مجھے میرے بھائی نے کہا: مجھے نشہ ہو گیا تھا، میں نے ان سے کہا: گھر چلو میں تمہیں پاک کر دوں گا، مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا چکے تھے، پھر میرے بھائی نے مجھ سے کہا کہ امیر مصر کو یہ بات بتا چکے ہیں تو میں نے کہا: تم گھر چلو تمہارا سر مونڈو؛ تاکہ تمام لوگوں کے سامنے تمہارا سر نہ مونڈا جائے، اس زمانہ کا دستور تھا کہ حد لگانے کے ساتھ سر بھی مونڈا جاتا تھا، چنانچہ وہ دونوں گھر چلے اور میں نے اپنے بھائی کا اپنے ہاتھوں سر مونڈا ہا، پھر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان پر شراب کی حد لگائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ پتہ چلا تو انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میرے پاس عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کو بغیر کجاوے کے اونٹ پر سوار کر کے بھیج دو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، جب وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کوڑے لگائے اور اپنا بیٹا ہونے کی

وجہ سے اسے سزا دی، پھر چھوڑ دیا، ”فَلَمَّا قَدِمَ عَلَى عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ جَلَدَهُ وَعَاقَبَهُ لِمَكَانِهِ مِنْهُ“ اس کے بعد وہ ایک مہینہ تک ٹھیک رہے، پھر تقدیر الہی غالب آگئی اور ان کا انتقال ہو گیا۔ (۱)

☆ حضرت یزید بن منصور کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی کہ بحرین میں ان کے مقرر کردہ گورنر حضرت ابن جارد کے پاس ایک شخص لایا گیا جس کا نام ادریاس تھا، اس نے مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ خفیہ خط و کتابت رکھی تھی اور ان دشمنوں کے ساتھ مل جانے کا ارادہ بھی کر رکھتا تھا، اس کے ان جرائم پر گواہ بھی موجود تھے، اس پر اس گورنر نے اسے قتل کر دیا اور وہ شخص قتل ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا: اے عمر! میں مظلوم ہوں، میری مدد کو آئیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس گورنر کو خط لکھا کہ میرے پاس آؤ، چنانچہ وہ حاضر ہوئے، حضرت عمر ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نیزہ تھا، جب وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اندر داخل ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس چھوٹے نیزے سے ان کے جبروں پر مارنا چاہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہے جا رہے تھے: اے ادریاس! میں تیری مدد کے لئے حاضر ہوں، اے ادریاس! میں تیری مدد کے لئے حاضر ہوں، حضرت ابن جارد کہنے لگے: اے امیر المؤمنین! اس نے مسلمانوں کی خفیہ باتیں دشمنوں کو لکھی ہیں اور دشمنوں سے جانے کا ارادہ بھی کر رکھا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے صرف برائی کے ارادہ پر ہی قتل کر دیا، ہم میں سے کون ایسا ہے جس کے دل میں برے ارادے نہ آتے ہو، اگر گورنروں کے قتل کا مستقل دستور بن جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں تمہیں ضرور قتل کر دیتا۔ ”لَوْلَا اَنْ تَكُوْنَ سُنَّةً لَقَتَلْتُكَ بِهِ“ (۱)

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل و انصاف

☆ حضرت حرمازی فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت فیروز دہلی کو یہ خط

لکھا، اما بعد! مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ میدے کی روٹی شہد کے ساتھ کھانے میں مشغول ہو گئے ہو، لہذا جب آپ کا پاس میرا خط پہنچے تو آپ اللہ کا نام لے کر میرے پاس آجائیں اور اللہ کے راستہ میں جہاد کریں، چنانچہ حضرت فیروز خط ملتے ہی مدینہ پہنچے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اندر آنے کی اجازت مانگی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی، وہ اندر جانے لگے تو ایک قریشی نوجوان بھی اندر جانے لگا جس سے راستہ تنگ ہو گیا، انہوں نے اس قریشی کی ناک پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ خون نکل آیا، وہ قریشی اسی حال میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اندر چلا گیا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نوجوان سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: حضرت فیروز نے اور وہ اس وقت دروازے پر ٹھہرے ہوئے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت فیروز کو اندر آنے کی اجازت دی، وہ اندر گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے فیروز یہ کیا ہے؟ حضرت فیروز نے کہا: اے امیر المؤمنین! ہم نے کچھ عرصہ پہلے ہی بادشاہت چھوڑی ہے (جس کا اثر ہماری طبیعت میں باقی ہے) یہ بات ہوئی کہ آپ نے مجھے خط بھیج کر بلا یا، اسے آپ نے خط نہیں لکھا اور نہ اجازت مانگنے پر آپ نے اندر آنے کی اجازت دی، اس نے قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بلا اجازت مجھ سے پہلے میری اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندر داخل ہوا، اس پر مجھے غصہ آیا، اس لئے مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ کو بدلہ دینا پڑے گا، حضرت فیروز نے کہا: کیا بدلہ دینا پڑے گا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں بدلہ ضرور دینا پڑے گا، چنانچہ حضرت فیروز گھٹنے کے بل بدلہ دینے کے لئے بیٹھ گئے اور وہ نوجوان بدلہ لینے کے لئے کھڑا ہوا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کئے اس سے کہا: اے نوجوان! ذرا ٹھہر! میں تجھے وہ بات بتاتا ہوں جو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، ایک دن صبح کے وقت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جھوٹے نبی اسود عسی کو آج

قتل کر دیا گیا ہے اور اس کو اللہ کے نیک بندے فیروز دیلمی نے قتل کیا ہے، جب تو نے ان کے بارے میں یہ حدیث سنی تو کیا تو اس کے بعد بھی بدلہ لینا چاہتا ہے، اس نوجوان نے کہا: جب آپ نے ان کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنا لی تو میں نے ان کو معاف کر دیا، اس کے بعد میں اپنی غلطی پر اللہ کے پکڑ سے بچ جاؤں گا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں اس پر حضرت فیروز نے کہا: آپ کو گواہ بنانا ہوں کہ میری تلوار میرا گھوڑا اور میرے مال میں سے تیس ہزار درہم اس نوجوان کو ہدیہ ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے قریشی! تم نے معاف کر کے ثواب بھی لیا اور تم کو اتنا مال بھی مل گیا۔ ”فَعَفَوْتُ مَا جُورًا أَخَا قُرَيْشٍ، وَأَخَذْتُ مَالًا“ (۱)

☆ حضرت عطاء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گورزوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ حج کے موقع پر ان کے پاس آیا کریں، جب سارے گورز آجاتے تو آپ عام مسلمانوں کو جمع کر کے فرماتے: اے لوگو! میں نے اپنے گورز تمہارے یہاں اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ وہ تمہاری کھال ادھیڑیں یا تمہارے مال پر قبضہ کریں یا تمہیں بے عزت کریں، بلکہ میں نے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ تمہیں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنے دیں اور تمہارے درمیان مال غنیمت تقسیم کریں، لہذا جس کے ساتھ اس کے خلاف کیا گیا ہو وہ کھڑا ہو جائے، چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ گورزوں کو جمع کر کے اعلان کیا تو صرف ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہا: اے امیر المؤمنین! آپ کے فلاں گورز نے مجھے ظلماً سو کوڑے مارے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس گورز سے کہا: تم نے اسے کیوں مارا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس گورز سے کہا: تم نے اسے کیوں مارا؟ اور اس آدمی سے کہا: اٹھ اس گورز سے بدلہ لے، اس پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر آپ اس طرح گورزوں سے بدلہ دلانا شروع کر دیں تو پھر آپ کے پاس بہت زیادہ شکایتیں

آنے لگ جائیں گے اور یہ گورنروں سے بدلہ لینا ایسا دستور بن جائے گا کہ جو بھی آپ کے بعد آئے گا اسے اختیار کرنا پڑے گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات سے بدلہ دلوانے کے لئے تیار رہتے ہوئے دیکھا تو میں نے اپنے گورنروں سے کیوں نہ بدلہ دلاؤں؟ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ ہمیں اس آدمی کو راضی کرنے کا موقع دیں، حضرت رضی اللہ عنہ نے کہا: اچھا چلو تم اسے راضی کرلو؛ چنانچہ اس گورنر نے ہر کوڑے کے بدلہ میں دو دینار کے حساب سے دو سو دینار اس آدمی کو بدلہ میں دے دیئے۔

فَافْتَدَى مِنْهُ بِمِائَتَيْنِ دِينَارٍ عَنْ كُلِّ سَوْطٍ بِدَيْنَارَيْنِ (۱)

☆ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک گھر مدینہ منورہ کی مسجد کے بالکل متصل تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے مسجد میں شامل کرنا چاہا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ یہ گھر میرے ہاتھ بیچ دیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ مجھے ہدیہ ہی کر دیں، وہ یہ بھی نہ مانے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ یہ گھر خود ہی مسجد میں شامل کر دیں، انہوں نے اسے بھی انکار کر دیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ کو تین کاموں میں سے کسی ایک کو کرنا ہوگا؛ لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ پھر بھی تیار نہ ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اچھا آپ کسی ثالث کو مقرر کر دیں جو ہمارا فیصلہ کر دے، انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا، یہ دونوں حضرات اپنا مقدمہ ان کے پاس لے گئے، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میرا فیصلہ ہے کہ آپ ان کا گھر ان کی مرضی کے بغیر نہیں لے سکتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: کیا آپ کو یہ فیصلہ قرآن میں ملا ہے یا حدیث میں؟ انہوں نے کہا: میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: سلیمان بن داود بیت المقدس کی تعمیر کے دوران جب بھی کوئی دیوار بناتے تو

صبح وہ گری ہوئی ہوتی، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی بھیجی کہ اگر آپ کسی کی زمین میں بنانا چاہتے ہوں تو پہلے انہیں راضی کر لیں، یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا، بعد میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی خوشی سے اس گھر کو مسجدی شامل کر دیا۔ ”فَوَسَّعَهَا الْعَبَّاسُ بَعْدَ ذَلِكَ فِي الْمَسْجِدِ“ (۱)

☆ حضرت زید بن وہیب کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے باہر نکلے اور کہہ رہے تھے، ”یا لبیک“ میں حاضر ہوں، مدد کو حاضر ہوں، لوگوں نے ان سے پوچھا کہ انہیں کیا بات پیش آئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ان کے مقرر کردہ ایک امیر کی جانب سے ایک آدمی یہ خبر لایا ہے کہ ان کے علاقہ میں مسلمانوں کے راستہ میں ایک نہر پڑتی ہے جسے پار کرنے کے لئے مسلمانوں کوئی کشتی نہ ملی تو ان کے امیر نے کہا کہ کسی ایسے آدمی کا پتہ لگاؤ جو نہر کی گہرائی کو معلوم کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ ان کے پاس ایک بوڑھے کو لایا گیا، اس بوڑھے نے کہا: مجھے سردی سے ڈر لگتا ہے اور وہ موسم سردی کا تھا، لیکن اس امیر نے مجبور کر کے اسے نہر میں داخل کر دیا، تھوڑی ہی دیر میں اس پر سردی کا اثر ہوا اور وہ بہت زور زور سے پکارنے لگا، اے عمر! میری مدد کو آؤ، اور وہ بوڑھا ڈوب گیا، اس بوڑھے کی فریاد کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کانوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے ”یا لبیک“ کہتے ہوئے نکلے تھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس امیر کو خط لکھا جس پر وہ مدینہ آگئے اور ان کے آئے ہوئے کئی دن گزر گئے؛ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف کوئی توجہ مبذول نہ فرمائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت شریفہ تھی کہ جب کسی پر غصہ آتا تو اس سے اعراض فرماتے تھے، پھر اس امیر سے کہا: جس آدمی کو تم نے مار ڈالا ہے اس کا کیا بنا؟ امیر نے کہا: ارادہ اس آدمی کو قتل کرنے کا نہ تھا، ہمیں نہر پار کرنے کے لئے

کوئی چیز نہیں مل رہی تھی، ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ نہر کی گہرائی معلوم کریں، پھر بعد میں ہم نے اللہ کے فضل سے فلاں فلاں علاقے فتح کئے ہیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم جو کچھ فتوحات کی خبر لے آئے ہو مجھے ایک مسلمان اس سے زیادہ محبوب ہے، اگر مستقل دستور بن جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا، تم ان کے رشتہ داروں کو خون بہا دو اور میرے پاس سے چلے جاؤ، پھر آئندہ کبھی نہ دیکھوں:

”لَوْلَا أَن تَكُونُ سُنَّةً لِّصَرَبْتُ عُنُقَكَ إِذْ هَبْتَ فَاعْطِ أَهْلَهُ دِيَّتَهُ وَأُخْرُجْ فَلَا أَرَاكَ“ (۱)

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: ایک باندی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آکر کہا کہ میرے آقا نے مجھ پر تہمت لگائی، پھر مجھے آگ پر بٹھایا جس سے میری شرمگاہ جل گئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم کو تمہارا آقا نے وہ برا کام کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس باندی نے کہا: نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے اس کے سامنے کسی برائی کا اقرار کیا تھا؟ اس باندی نے کہا: نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسے میرے پاس لاؤ، چنانچہ وہ آدمی حاضر ہوا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آدمی کو دیکھا تو فرمایا: تم انسانوں کو وہ عذاب دیتے ہو جو اللہ کے ساتھ خاص ہے، اس آدمی نے کہا: اے امیر المؤمنین! مجھے اس پر شبہ ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: کیا تم نے تمہارے سامنے اس جرم کا اعتراف کیا تھا؟ اس نے کہا: نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ مالک سے اس کے غلام کو اور والد سے اس کے لڑکے کو بدلہ نہیں دلویا جائے گا تو میں تمہیں اس باندی سے ضرور بدلہ دلواتا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آدمی کو سو کوڑے مارے، پھر اس باندی سے کہا: تو جا آزاد ہے،

اس لئے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جسے آگ میں جلایا جائے گا یا جس کی شکل آگ سے جلانے کی بناء پر بگڑ گئی ہو وہ آزاد ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول کا آزاد کردہ ہے ”إِذْ هَبْنِي لَوْ جَهَّ اللَّهُ وَأَنْتِ مَوْلَاةُ اللَّهِ وَرَسُولِهِ“ (۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (جب) رسول کریم ﷺ نے مجھے قاضی بنا کر بھیجے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ آپ مجھ کو جوان کو (قاضی بنا کر) بھیج رہے ہیں (جو کم عمری کی وجہ سے نا تجربہ کار بھی ہے اور) (جس کو) منصب قضا کی ذمہ داریوں کا پوری طرح علم بھی نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا (تم اس بارے میں فکر نہ کرو) اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو فہم و فراست کی ہدایت عطا کرے گا اور تمہاری زبان کو صحیح اور برحق حکم و فیصلہ کرنے پر (ثابت رکھے گا)، پھر آنحضرت ﷺ نے منصب قضا کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے سلسلہ میں یہ تعلیم و ہدایت دی کہ جب تمہارے پاس دو آدمی اپنا قضیہ لے کر آئیں تو تم پہلے آدمی (یعنی مدعا علیہ) کا بیان سن لو کیونکہ یہ (مدعا علیہ کا بیان تمہیں) صحیح حکم و فیصلہ دینے میں اچھی مدد دے گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (آنحضرت ﷺ کی) اس مبارک دعا کی برکت سے اور آپ ﷺ کی اس ہدایت و تعلیم پر عمل کرنے کے بعد میں کسی بھی قضیہ کا حکم اور فیصلہ کرنے میں مذذب نہیں ہوا ”فَمَا شَكَّ كُنْتُ فِي قَضِيَّةٍ بَعْدُ“ (۲)

حضرت زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے تو ان کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جس سے ایک ہی طہر میں تین آدمیوں نے بدکاری کی تھی انہوں نے ان میں سے دو آدمیوں سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کے لئے بچے کا اقرار کرتے ہو؟ انہوں نے اقرار نہیں کیا اسی طرح ایک ایک کے ساتھ دوسرے کو ملا کر سوال کرتے رہے یہاں تک کہ اس مرحلے سے فارغ ہو گئے اور کسی نے بھی بچے کا اقرار نہیں کیا پھر انہوں نے

ان کے درمیان قرعہ اندازی کی اور قرعہ میں جس کا نام نکل آیا بچہ اس کا قرار دے دیا اور اس پر دو تہائی دیت مقرر کر دی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو نبی کریم ﷺ اتنے مسکرائے کہ دندان مبارک ظاہر ہو گئے ”فَضَحَكَ حَتَّى بَدَتْ نَوَاجِدُكَ“ (۱) حش کمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: یمن میں ایک قوم نے شیر کو شکار کرنے کے لئے ایک گڑھا کھود کر اسے ڈھانپ رکھا تھا شیر اس میں گر پڑا اچانک ایک آدمی بھی اس گڑھے میں گر پڑا، اس کے پیچھے دوسرا، تیسرا حتیٰ کہ چار آدمی گر پڑے، اس گڑھے میں موجود شیر نے ان سب کو زخمی کر دیا، یہ دیکھ کر ایک آدمی نے جلدی سے نیزہ پکڑا اور شیر کو دے مارا، چنانچہ شیر ہلاک ہو گیا اور وہ چاروں آدمی بھی اپنے اپنے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دنیا سے چل بسے۔ مقتولین کے اولیا اسلحہ نکال کر جنگ کے لئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے، اتنی دیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آ پہنچے اور کہنے لگے کیا تم چار آدمیوں کے بدلے دو سو آدمیوں کو قتل کرنا چاہتے ہو؟ میں تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں، اگر تم اس پر راضی ہو گئے تو سمجھو کہ فیصلہ ہو گیا، فیصلہ یہ ہے کہ جو شخص پہلے گر کر گڑھے میں شیر کے ہاتھوں زخمی ہوا، اس کے ورثا کو چوتھائی دیت دے دو اور چوتھے کو مکمل دیت دے دو، دوسرے کو تہائی اور تیسرے کو نصف دیت دے دو، ان لوگوں نے یہ فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا (کیونکہ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا) چنانچہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں، اتنی دیر میں ایک آدمی کہنے لگا، یا رسول اللہ! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمارے درمیان یہ فیصلہ فرمایا تھا، نبی کریم ﷺ نے اسی کو نافذ کر دیا: ”فَأَجَازَ رَسُولُ اللَّهِ الْقَضَاءَ كَمَا قَضَيْتُ بَيْنَهُمْ“ (۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوراندیشی

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک عجیب و غریب مقدمہ عدالتِ فاروقی میں

(۱) مسند احمد، حدیث: ۱۹۳۲۸

(۲) أخبار القضاة: قضاء معاذ فی اليمن: ۱/۹۷، المكتبة التجارية الكبرى، بشارع محمد علي بمصر

پیش ہوتا ہے، ایک انصاری نو جوان لڑکا کہتا ہے کہ: میں اس عورت کا بیٹا ہوں، مگر وہ عورت مجھے بیٹا ماننے سے انکار کر دیتی ہے، عورت سے سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: میری تو کبھی شادی ہی نہیں ہوئی، ادھر عورت نے چند گواہوں کو بھی امیر المؤمنین کی خدمت میں پیش کر دیا جنہوں نے ثابت کیا کہ یہ عورت شادی شدہ نہیں ہے، امیر المؤمنین نے ساری باتیں سن کر اس نو جوان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور سارے مقدمے کی تفصیلات سنیں، پھر مسجد نبوی میں ان سارے حضرات کو بلا کر عورت سے پوچھا: کیا یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے؟ اس عورت نے کہا: نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نو جوان سے کہا: تم بھی اس طرح اس کے ماں ہونے کا انکار کر دو جیسے یہ تمہارے بیٹے ہونے کا انکار کر رہی ہے، اس نو جوان نے کہا: میں یہ کیسے کر سکتا ہوں جب کہ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ میری ماں ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس نو جوان کو ترغیب دلانے پر کہ آج سے تمہارا باپ میں اور تمہارے بھائی حسن و حسین ہوں گے تم اس عورت کے ماں ہونے کا انکار کر دو تو اس نو جوان اس کے ماں ہونے کا انکار کر دیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عورت کے اولیاء سے فرمایا: ”أَمْرِ بِي فِي هَذِهِ الْمَرْأَةِ جَائِزٌ“ کیا اس عورت کے سلسلے میں میری بات مانی جائے گی؟ اولیاء نے کہا: کیوں نہیں؟ ضرور آپ کی بات مانیں گے۔ ان کی باتیں سننے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ گویا ہوئے: اے قبیر! (قبیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام کا نام تھا) ان حاضرین کے سامنے تم گواہ رہو کہ میں نے اس اجنبی خاتون کی شادی اس نو جوان سے کر دی، تم جا کر درہموں کی تھیلی لاؤ۔ قبیر گئے اور (۴۸۰) درہم کی تھیلی لائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس عورت کو وہ رقم بطور مہر دیتے ہوئے اس نو جوان سے کہا: اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑو اور اس کے بعد ہمارے پاس اسی وقت آنا جب کہ تمہارے اوپر سہاگ کے نشانات ہوں۔

یہ سنتے ہی اس عورت نے کہا: اے ابوالحسن! یہ نو جوان تو میرے حق میں جہنم کا ٹکڑا بن جائے، میں اقرار کرتی ہوں کہ یہ میرا لڑکا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ: اس نو جوان کا ایک باپ حبشی تھا، میرے بھائیوں نے اس کے ساتھ میری شادی کر دی تھی، کچھ دنوں

کے بعد وہ اللہ کی راہ میں شہید ہو گیا، اس کے بعد میرا یہ بچہ پیدا ہوا تو میں نے اسے فلاں قبیلہ میں بھیج دیا، اس نے وہیں پرورش پائی، اس کے بعد میں نے اس کو بیٹا ماننے سے انکار کر دیا "وَأَنْفَيْتُ أَنْ يَكُونَ ابْنِي" (۱)

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ تھے تو ان کے سامنے ایک دلچسپ مقدمہ آیا، دو شخص ہمسفر تھے، ایک شخص کے پاس تین روٹیاں اور دوسرے کے پاس پانچ روٹیاں تھیں، دونوں مل کر کھانے بیٹھے، یکا یک ایک اور مسافر ان کے ساتھ شریک ہو گیا اور چلتے وقت اپنے ذمہ کی روٹیوں کی قیمت آٹھ درہم ادا کی، پانچ روٹیوں والے پانچ درہم ساتھ رکھ کر تین درہم دوسرے کو دینا چاہا تو وہ راضی نہ ہوا اور نصف قیمت طلب کی، اب یہ مقدمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خدمت میں پیش ہوا، آپ نے دوسرے سے کہا کہ اپنے ساتھ کا فیصلہ قبول کر لو، اس میں تمہارا نفع ہے، مگر اس نے انکار کیا کہ حق کے ساتھ جو بھی مل جائے وہ بہتر ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حق یہ ہے کہ تم ایک درہم کے اور تمہارا ساتھی ساتھ درہم کا مستحق ہے، یہ فیصلہ سن کر وہ حیران و ششدر رہ گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تین آدمی تھے اور تمہارے تین روٹیاں اور تمہارے رفیق کی پانچ روٹیاں تھیں، تم دونوں برابر کھائے اور تیسرے کو بھی برابر کا حصہ دیا، تمہاری روٹیوں کے تین ٹکڑے کئے جائیں تو ٹکڑے بنتے ہیں اور تمہارے ساتھی کی پانچ روٹیوں کے تین تین ٹکڑے کئے جائیں تو وہ پندرہ بنتے ہیں اور ان کا مجموعہ چوبیس ہوتا ہے، تینوں میں سے ہر ایک نے برابر ٹکڑے کھائے تو ہر ایک کو آٹھ آٹھ ٹکڑے ملتے ہیں تو تم نے اپنے نو ٹکڑوں میں سے آٹھ خود کھائے اور ایک ٹکڑا تیسرے کو دیا، تمہارے ساتھی آٹھ ٹکڑے کھائے اور باقی سات ٹکڑے تیسرے کو دیا، اس لئے تم ایک درہم اور تمہارا ساتھی سات درہم کا حق دار ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اللہ عز و جل نے علم و حکمت کا وافر حصہ عطا فرمایا، حضور اکرم رضی اللہ عنہ

نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تعلق سے فرمایا تھا کہ: میں علم ہوں اور علی اس کا دروازہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک عورت کے بارے میں فیصلہ فرمایا، اس کے ساتھ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فیصلہ پر غور فرمایا تو فیصلہ ان کو حق کے موافق نظر نہ آیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عورت کے بارے میں پھر سے فیصلہ فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کی حقانیت و صداقت کو دیکھ کر فرمایا: "لَوْ لَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ" (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا) اسی حکمت اور عقل و دانائی و بینائی کی بنا پر ایسے مبنی برحق فیصلہ فرماتے کہ ہر شخص حیران و ششدر رہ جاتا۔ (۱)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے قضا کے واقعات

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بعض ساتھیوں سے روایت ہے کہ جب حضور اکرم رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا فرمایا تم کس طرح فیصلہ کرو گے جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے انہوں نے کہا اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا آپ نے فرمایا اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ عرض کیا کہ رسول اللہ رضی اللہ عنہ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا، حضور رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر سنت رسول میں بھی نہ پاؤ تو؟ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ انہوں نے کہا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا، رسول اللہ رضی اللہ عنہ نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور فرمایا کہ اللہ ہی کیلئے تمام تعریفیں ہیں جس نے اللہ کے رسول رضی اللہ عنہ کے پیغامبر (معاذ) کو اس چیز کی توفیق دی جس سے رسول اللہ رضی اللہ عنہ راضی ہیں "وَفَقَّ رَسُولُ اللَّهِ لِمَا يَزَيِّ رَسُولُ اللَّهِ" (۲)

ابو الاسود دؤلی کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جس وقت یمن میں تھے تو ان کے سامنے ایک یہودی کی وراثت کا مقدمہ پیش ہوا جو فوت ہو گیا تھا، اور اپنے پیچھے ایک مسلمان بھائی چھوڑ گیا تھا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے نبی کریم رضی اللہ عنہ کو یہ

فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام اضافہ کرتا ہے کمی نہیں کرتا اور اس حدیث سے استدلال کر کے انہوں نے اسے وارث قرار دے دیا۔ ”إِنَّ الْإِسْلَامَ يَزِيدُ“ (۱)

☆ حضرت یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: حضرت معاذ بن جبل رحمہ اللہ کی دو بیویاں تھیں، ان میں سے جس کی باری کا دن ہوتا اس دن دوسرے کے گھر سے وضو نہ کرتے، پھر دونوں بیویاں حضرت معاذ رحمہ اللہ کے ساتھ ملک شام گئیں اور وہاں دونوں اکٹھے بیمار ہوئیں اور اللہ کی شان دونوں کا ایک ہی دن انتقال ہوا، لوگ اس دن کافی مشغول تھے جس کی بناء پر دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا؛ لیکن یہاں پر بھی حضرت معاذ رحمہ اللہ نے دونوں میں قرعہ ڈالا کہ کس کو قبر میں پہلے رکھا جائے۔ ”فَأَسْهَمَ بَيْنَهُمَا أَيُّهُمَا تَقَدَّمُ فِي الْقَبْرِ“ (۲)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رحمہ اللہ بحیثیت قاضی یمن

حضرت ابو موسیٰ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں اور حضرت معاذ رحمہ اللہ کو یمن بھیجتے ہوئے فرمایا خوشخبری دینا، نفرت مت پھیلانا، آسانی پیدا کرنا، مشکلات میں نہ ڈالنا، ایک دوسرے کی بات ماننا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا، چنانچہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا خیمہ تھا جس میں وہ ایک دوسرے سے ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔ ”يَزُورُ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ“۔ (۳)

اسحاق نصر شعبہ سعید بن ابی بردہ اپنے والد سے وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ جب ان کو اور معاذ بن جبل رحمہ اللہ کو رسول اللہ ﷺ یمن بھیجنے لگے تو دونوں سے فرمایا کہ آسانی کرنا سختی نہ کرنا اور خوش خبری سنانا نفرت نہ دلانا بلکہ رغبت دلانا ابو موسیٰ رحمہ اللہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں شہد

(۱) اخبار القضاة: قضاء معاذ في اليمن: ۱/۱۹۸ المكتبة التجارية الكبرى، بشارع محمد علي بمصر

(۲) صفوة الصفوة: ذكر نبذة من تعبدہ واجتهاده: ۱/۴۹۲، دار المعرفة، بيروت

(۳) مسند احمد: حديث أبي موسى الأشعري، حديث: ۱۹۷۱۲، محقق شعيب الأرنؤوط نے اس حدیث کو صحیح اور اس کے رجال کو ثقہ کہا ہے۔

سے شراب بنائی جاتی ہے جس کو مزر کہا جاتا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ ”كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ“ (۱)

سیدنا ابو ہریرہ رحمہ اللہ اور ان کے عدالتی فیصلے

عہدی اموری کے مشہور و معروف قضاة میں حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، ان کے فیصلے بھی نہایت معروف ہیں۔

☆ ایک مقروض شخص جو بالکل مفلس ہو چکا تھا، ادائیگی قرض سے عاجز ہو چکا تھا، قرض دینے والے نے یہ درخواست کی کہ اسے جیل بھیج دیا جائے، سیدنا ابو ہریرہ رحمہ اللہ نے یہ درخواست رد کر دی اور فرمایا کہ: میں صرف تمہارے لئے اسکو قید نہیں کر سکتا، میں اس کو آزاد کر دیتا ہوں کہ تلاش معاش کے ذریعہ تیرا قرض بھی ادا کرے اور اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے رزق بھی حاصل کر سکے

”لَا أَحْبَسُهُ لَكَ، وَلَكِنْ أَدْعُهُ يَطْلُبُ لَكَ وَلِنَفْسِهِ وَلِعِيَالِهِ“ (۲)

☆ مروان بن الحکم کے بھائی حارث بن حکم حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ کے پاس آ کر ان کے تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے حارث کے خلاف دعویٰ کیا، سیدنا حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ نے فوراً حارث کو حکم دیا اور اسے اٹھا کر اس کے فریق کے ساتھ بٹھایا، پھر مقدمہ سنا اور فیصلہ کیا۔ (۳)

(۱) قاضی شریح بن حارث

نام شریح، کنیت ابو امامیہ، نسب اکندی ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ شریح نسل عرب نہ تھے؛ بلکہ ان خانوادوں میں سے تھے جو کندہ کے حلیف بن کر یمن میں آباد ہو گئے تھے۔

علامہ ابن سعد اور حافظ ابن عبد البر وغیرہ تمام ارباب سیر و طبقات اسی کے قائل ہیں کہ وہ تابعی ہیں، البتہ وہ تابعین کے زمرے میں نہایت ممتاز اور اونچا درجہ رکھتے ہیں۔

(۱) بخاری: باب أبي موسى ومعاذ، حديث: ۴۰۸۸

(۲) اخبار القضاة: تسوية أبي هريرة بين الخصوم: ۱/۱۱۲

(۳) اخبار القضاة: تسوية أبي هريرة بين الخصوم: ۱/۱۱۲

قضا کی استعداد و قابلیت

ایک قاضی کے لئے جن اوصاف و کمالات کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھے، فضل و کمال کا یہ حال تھا کہ امام نووی لکھتے ہیں کہ شریح کی توثیق، دینداری، فضل و کمال، ذکاوت اور ان کی روایات سے احتجاج پر سب کا اتفاق ہے۔

”وَاتَّفَقُوا عَلَى تَوْثِيقِ شَرْحِهِ وَفَضْلِهِ، وَالْإِحْتِجَاجِ

بِرَوَايَاتِهِ، وَذَكَائِهِ“ (۱)

حافظ صفی الدین خزر جی لکھتے ہیں کہ: وہ بڑے جلیل القدر اور ذکی علماء میں سے

تھے۔ (۲)

حدیث و فقہ کے علاوہ مروجہ فنون قیافہ شناسی اور شاعری میں بھی کمال دستگاہ رکھتے تھے، وہ طبعاً نہایت ذہین، ذکی، طباع، فریس اور فہیم واقع ہوئے تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کی تہہ تک باسانی پہنچ جاتے تھے، ان اوصاف و کمالات نے ان میں قدرۃ قضاء کی نہایت اعلیٰ استعداد پیدا کر دی تھی، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو زبان رسالت سے ”أَقْضَاهُمْ عَلَيَّ“ کی سند ملی اور شریح کو ”أَقْضَى الْعَرَبِ“ عرب کا سب سے بڑا قاضی فرماتے تھے۔

عہدہ قضا پر تقرر سے پہلے ان کی یہ صلاحیت و استعداد زبان زد عام و خاص ہو چکی تھی، لوگ اپنے معاملات اور فیصلہ کن امور میں ان کو حکم اور ثالث بناتے تھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے ایک فیصلہ کو دیکھ کر انہیں کوفہ کا قاضی بنایا تھا۔

اس کا واقعہ یوں ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے بشرط پسندیدگی ایک گھوڑا خریدا اور امتحان کے لئے ایک سوار کو دیا، گھوڑا سواری میں چوٹ کھا کر داغی ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو واپس کرنا چاہا، گھوڑے کے مالک نے لینے سے انکار کر دیا، اس پر نزاع ہوئی اور شریح ثالث بنائے گئے، انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ اگر

گھوڑے کے مالک سے اجازت لے کر سواری کی گئی تھی تو گھوڑا واپس کیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔ (۱)

اسی فیصلہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو کوفہ کا قاضی بنایا، قاضی شریح نے اس قابلیت، اس خوش اسلوبی اور دیانت سے اس خدمت کو انجام دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے لے کر عبدالملک کے زمانہ تک مسلسل ساٹھ سال قاضی رہے، اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات و حوادث ہوئے، خلافت راشدہ کا وجود ختم ہو کر اموی حکومت کا آغاز ہوا، ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور امویوں میں خوں ریز معرکہ آرائیاں ہوئیں، ساری دنیائے اسلام میں انقلاب برپا ہوا، لیکن شریح بدستور مسند قضاء پر متمکن رہے، ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالملک کی جنگ کے زمانہ میں اپنا دامن بچانے کے لئے صرف چند برسوں کے لئے مستعفی ہو گئے تھے۔

قاضی شریح کے مبنی برانصاف عدالتی فیصلے

فیصلوں میں عدل یہ ان کا عظیم اور بڑا وصف تھا، وہ فیصلہ کرنے میں کسی خارجی یا داخلی اثر سے بالکل متاثر نہ ہوتے، وہ قانون اور حق و انصاف کے مقابلے میں بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

☆ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا واقعہ بعض روایتوں میں یوں منقول ہے کہ: گھوڑا جب امتحان میں ہلاک ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے واپس کرنا چاہا اور اس پر تنازعہ ہوا اور شریح حکم مقرر ہوئے، تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس کو خریدا ہے اسی کو لینا ہوگا یا جس حالت میں لیا تھا، اسی حالت میں واپس کرنا ہوگا، اس فیصلہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو کوفہ قاضی بنا دیا ”فَبَعَثَهُ قَاضِيًا“ (۲)

یہاں انہوں نے ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف فیصلہ دیا ہے، اگر ان کا لڑکا بھی قانون کی زد میں آجاتا تھا تو اس کی بھی

(۱) کتاب الاوائل: الباب السابع ذكر القضاة

(۲) طبقات ابن سعد: ۶/۱۳۱، دار صادر، بیروت

(۱) تہذیب الاسماء: حرف الشین المعجمة: ۱/۳۴۱

(۲) تہذیب الکمال: ۱۲/۴۳۷، مؤسسة الرسالة، بیروت

پرواہ بالکل نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ ان کے ایک لڑکے نے ایک ملزم کی ضمانت کی، ملزم بھاگ گیا تو اس کے بدلہ شریعت نے لڑکے کو قید کر دیا۔ (۱)

☆ ایک مرتبہ ان کے ایک اہم خاندان نے ایک شخص پر کچھ ناروا ظلم کیا، شریعت نے اس کو ایک ستون میں بندھوا دیا، جب وہ فیصلہ کر کے اٹھے تو اس شخص نے کچھ کہنا چاہا تو شریعت نے کہا: مجھ سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے؛ اس لئے کہ میں نے تم کو نہیں قید کیا ہے؛ بلکہ حق نے قید کیا ہے "إِنِّي لَكُمُ أَحْبَبُكُمْ"، اِنَّمَا حَبَسَكَ الْحَقُّ" (۲)

☆ عدل گستری کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے کہ: ان کے ایک لڑکے اور بعض دوسرے اشخاص کے درمیان کسی حق کے بارے میں تنازعہ تھا، لڑکے نے ان سے واقعات بتا کر پوچھا کہ اگر میرا حق نکلتا ہو اور مقدمہ میں کامیابی کی امید ہو تو میں دعویٰ کروں ورنہ خاموش رہوں، شریعت نے مقدمہ کی نوعیت پر غور کر کے دعویٰ کرنے کا مشورہ کیا، لیکن جب مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا تو لڑکے کے خلاف فیصلہ دیا، فیصلہ دے کر جب گھر آئے تو لڑکے نے کہا: اگر میں نے پہلے آپ سے مشورہ نہ کر لیا ہوتا تو مجھ کو آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی؛ لیکن مشورہ دینے کے بعد آپ نے مجھے ذلیل کیا، شریعت نے جواب دیا، جان پدر! تو مجھے ان لوگوں کے زیادہ عزیز ہے، "يَا بُنَيَّ وَاللّٰهُ اَنْتَ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ مِلْحِي الْاَرْضِ مِثْلَهُمْ؛ وَلَكِنَّ اللّٰهَ هُوَ اَعَزُّ عَلَيَّ مِنْكَ" جب تو نے مجھ سے مشورہ کیا تو مقدمہ دیکھنے کے بعد مجھے ان لوگوں کا حق نظر آیا، اگر میں اس وقت تجھ سے اس کو ظاہر کر دیتا تو تو ان سے صلح کر لیتا اور ان لوگوں کا حق ضائع ہو جاتا۔ (۳)

(۱) طبقات ابن سعد: ۶/۱۳۱، دارصادر، بیروت

(۲) طبقات ابن سعد: ۶/۱۳۵، دارصادر، بیروت

(۳) طبقات ابن سعد: ۶/۱۳۱

☆ شعبی کہتے ہیں کہ: میں قاضی شریعت کی خدمت میں بیٹھا تھا، اتنے میں ایک عورت روتے ہوئے اپنے شوہر کی شکایت لے کر آئی جو کہ گھر سے باہر تھا، عورت زار و قطار رو رہی تھی، میں نے قاضی شریعت سے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، میرے خیال میں یہ عورت مظلوم ہے اور اس کا حق پامال ہوا ہے۔ قاضی شریعت نے پوچھا: کس دلیل کی بنا پر تم اس عورت کو مظلوم سمجھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس کے زار و قطار رونے اور آنسوؤں کا سمندر بہانے کی وجہ سے۔ قاضی شریعت نے فرمایا: جب تک حقیقت معاملہ واضح نہ ہو جائے، فیصلہ سنانے میں جلدی مت کرو؛ کیوں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی جب اپنے والد یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں آئے تھے تو وہ بھی زار و قطار آنسو بہا رہے تھے، حالانکہ انہوں نے یوسف علیہ السلام پر ظلم ڈھایا تھا "يَا شَعْيُ اَنَّ اِخْوَةَ يُوْسُفَ عَلَيْهِ السَّلَامُ جَاءُوا اَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُوْنَ"۔ (۱)

عزیز قریب کی شہادت کا قانون

حدیث میں عزیز و قریب کی شہادت کی کوئی ممانعت نہیں ہے، اس لئے ایک عزیز کے مقدمہ میں دوسرے عزیز کی شہادت قبول کرنے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے، ابن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ قاضی شریعت نے عزیز کے مقابلہ میں عزیز کی شہادت ناقابل اعتبار قرار دی اور یہ قانون بنادیا کہ لڑکے کی شہادت باپ کے متعلق، باپ کی شہادت لڑکے کے متعلق، بی بی کی شہادت شوہر کے متعلق، شوہر کی شہادت بیوی کے متعلق، آقا کی شہادت غلام کے متعلق اور غلام کی شہادت آقا کے متعلق اور اجیر کی شہادت اس شخص کے متعلق جس نے اس کو اجرت پر لیا ہو قبول نہیں کی جاسکتی، اس اصول پر وہ اس سختی سے عامل تھے کہ حضرت علی علیہ السلام کے مقابلہ میں حضرت امام علیہ السلام کی شہادت مسترد کر دی، اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی علیہ السلام کی زرہ کہیں گر پڑی اور ایک ذمی کے ہاتھ لگی، حضرت علی علیہ السلام نے شریعت کی عدالت میں دعویٰ پیش کیا، شریعت نے ذمی سے پوچھا:

(۱) وفیات الأعیان: القاضی شریح، ۲/۲۶۰

تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: میری ملکیت کا ثبوت یہ ہے کہ زہ میرے قبضہ میں ہے، شرع نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ: آپ کے پاس اس کی کوئی شہادت ہے کہ زہ گر گئی تھی، انہوں نے حضرت حسنؓ اور قنبر کو شہادت میں پیش کیا، شریح نے کہا: قنبر کی شہادت تو قبول کرتا ہوں، لیکن حسنؓ کی شہادت رد کرتا ہوں، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: آپ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نہیں سنا ہے کہ ”الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ“ شریح نے کہا سنا ہے، لیکن باپ کے مقابلہ میں لڑکے کی شہادت معتبر نہیں ہوتی، اس فیصلہ کو حضرت علیؓ نے بلاچوں و چرا تسلیم کیا اور زہ یہودی کے پاس رہنے دی، اس واقعہ کا اس یہودی پر یہ اثر ہوا کہ اس نے خود اقرار کر لیا کہ زہ آپ ہی کی ہے اور تمہارا دین سچا ہے، مسلمانوں کا قاضی امیر المومنین کے خلاف فیصلہ کرتا ہے اور وہ بلاچوں و چرا سرخم کر دیتا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد خدا کے سچے رسول ہیں، حضرت علیؓ کو اس کے اسلام سے اتنی مسرت ہوئی کہ اس یادگار میں انہوں نے زہ اپنی طرف سے اس کو دے دی۔ (۱)

☆ ایک مرتبہ عدی بن ارطاة نے قاضی شریح کے سامنے ایک دعویٰ پیش کیا، دونوں میں حسب ذیل گفتگو ہوئی:

عدی: میں آپ کے سامنے کچھ باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

شریح: فرمائیے میں سننے کے لئے تیار ہوں۔

عدی: میں شام کا رہنے والا ہوں۔

شریح: اتنے دور دراز مقام کے؟ (بطور مذاق کہا)۔

عدی: میں نے آپ کے ہاں شادی کی ہے۔

شریح: شادی مبارک ہو۔

عدی: میں اپنی بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔

شریح: شوہر اپنی بیوی کا حق دار اور مختار ہے۔

عدی: لیکن اس نے اپنے گھر میں رہنے کی شرط کر لی ہے۔

شریح: تو پھر شرط پوری کرنی چاہئے۔

عدی: آپ ہمارا فیصلہ کیجئے۔

شریح: فیصلہ کر دیا۔

عدی: کس کے خلاف؟

شریح: تمہاری ماں کے لڑکے یعنی تمہارے خلاف۔

عدی: کس کی شرط پر؟

شریح: تمہارے ماموں کی بہن کے لڑکے کی شہادت پر یعنی خود تمہاری شہادت پر۔ کیوں کہ عدی نے خود اقرار کر لیا تھا کہ بیوی سے گھر میں رہنے کی شرط منظور کر لی تھی۔

دینی و اخلاقی مزاج

علمی کمالات کے ساتھ وہ فضائل اخلاق سے بھی آراستہ تھے، بڑے دیندار اور عبادت گزار تھے، قضاء کی ذمہ داریوں اور مشغولیتوں کے باوجود ان کا کافی وقت عبادت میں گذرتا تھا، ان کے غلام ابطلحہ کا بیان ہے کہ: جب وہ صبح کی نماز پڑھ کر واپس آتے تھے تو گھر کے دروازے بند کر کے قریب قریب آدھے دن تک نوافل میں مشغول رہتے تھے ”فَظَنُّ أَنَّهُ يَصِلُ“ (۱)

طبعاً نہایت خوش اخلاق اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے، سلام میں ہمیشہ خود سبقت کرتے تھے، قاسم کا بیان ہے کہ کوئی شخص سلام میں شریح پر سبقت نہیں کر سکتا تھا، عیسیٰ بن حارث کا بیان ہے کہ میں ہمیشہ سبقت کرنے کی کوشش کرتا تھا، مگر کبھی کامیاب نہ ہوا ”كَانَ أَوَّلًا هُمَا بِاللَّهِ الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ“ (۲)

وہ فتنہ و فساد کو ناپسند کرتے تھے، ان کی زندگی میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات آئے، عبد الملک اور ابن زبیرؓ کا ہنگامہ برسوں جاری رہا، جس کی لپیٹ سے بہت کم

لوگ محفوظ رہ سکے، لیکن شریح کا دامن اس سے بھی بچا رہا، اس ہنگامہ کے زمانہ میں وہ چند سال کے لئے مستغنی ہو گئے تھے "فَأَقَامَهُ قَاضِيًا خَمْسًا وَسَبْعِينَ سَنَةً لَمْ يَتَعَطَّلَ فِيهَا إِلَّا ثَلَاثَ سَنِينَ امْتَنَعَ فِيهَا مِنَ الْقَضَاءِ فِي فِتْنَةِ الزَّبِيرِ" (۱)

دوسروں کی راحت کا اتنا خیال تھا کہ اپنے لئے کسی کو ادنیٰ تکلیف دینا بھی پسند نہ کرتے تھے، اپنے گھر کے تمام پرنا لے اندر لگاتے تھے کہ اس کے پانی سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے "لَا يَتَّخِذُ مُشْعَبًا فِي دَارِهِ" (۲)

وفات

آپ نے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کوفہ کے عہدہ قضا پر فائز رہے، اور ۱۰۸ سال کی عمر پر کسر زمین کوفہ میں ۸۷ ہجری میں داغ مفارقت دے گئے، آپ نے آخری عمر ضعف پیری کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا، دم آخر یہ وصیت کی تھی کہ بغلی قبر کو دی جائے، جنازہ کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے، جنازہ کے ساتھ نو حہ نہ کیا جائے، جنازہ کو آہستہ آہستہ لے جایا جائے، قبر پر چادر نہ ڈالی جائے، ان وصایا کے بعد انتقال فرمایا۔ (۳)

(۲) کعب بن سور

کعب سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے، اس لئے ارباب رجال نے ان کے حالات نہیں لکھے ہیں؛ لیکن وہ ایک ممتاز تابعی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہم صحبت و ہم جلس اور نہایت ذہین اور طباع تھے، ان کی ذہانت اور طباعی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو عہدہ قضا پر مامور کیا۔

ان کے تقرر کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے

(۱) وفیات الاعیان: القاضی شریح: ۲/۴۶۰، دارصادر، بیروت

(۲) طبقات ابن سعد: ۶/۱۴۳، دارصادر، بیروت

(۳) وفیات الاعیان: القاضی شریح: ۲/۴۶۳

ہوئے تھے کہ ایک عورت آپ کے پاس حاضر ہوئی اور کہا کہ: میں آپ کے پاس دنیا کے ایک بہترین آدمی کی شکایت لے کر آئی ہوں، کوئی آدمی عمل میں اس پر سبقت نہیں لے جاسکتا، اور اس کے جیسا عمل نہیں کر سکتا، وہ قیام لیل میں صبح کر دیتا ہے، روزے میں سارا دن گزار دیتا ہے، اتنا کہنے کے بعد اس عورت کو شرم دامن گیر ہوئی اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی کہ امیر المؤمنین مجھے معاف فرمائیے، آپ نے فرمایا: خداتم کو جزائے خیر دے، تم نے اچھی تعریف کی، میں نے تم کو معاف کیا، اس کے بعد وہ عورت چلی گئی، اس کے واپس جانے کے بعد کعب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: امیر المؤمنین اس عورت نے آپ کے سامنے نہایت مبلغ پیرایہ میں شکایت پیش کی ہے، فرمایا کہ: کیسی شکایت؟ کعب نے کہا: اپنے شوہر کی (یعنی وہ رات دن عبادت میں مشغول رہتا ہے، اور اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا) یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کو بلوا کر کعب سے کہا: تم دونوں کا فیصلہ کر دو، کعب نے عرض کیا: آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں؟ فرمایا: جس چیز کو تم نے سمجھ لیا میں نہ سمجھ سکا، اس کا فیصلہ بھی تم ہی کو کرنا چاہئے، چنانچہ کعب نے کلام پاک کی اس آیت: "فَأَنكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ" تم کو جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو دو، تین اور چار تک۔ (۱)

سے استدلال پر کہ جب قرآن میں چار بیویوں کی اجازت ہے تو اس کے یہ معنی یہ ہوئے کہ ہر چار شبانہ یوم میں ایک شبانہ یوم ہر بیوی کا حق ہوا تو تنہا بیوی کا کم سے کم یہی حق ہوگا، اس عورت کے شوہر کو تین دن روزہ رکھنے اور ایک دن بیوی کے لئے افطار کرنے اور تین رات عبادت کرنے اور ایک رات بیوی کے پاس رہنے کا حکم دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ استدلال سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ: یہ (استدلال) میرے لئے پہلے (ذہانت) سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے، چنانچہ اسی وقت ان کو بصرہ کا قاضی بنا کر بھیج دیا "أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ بَعَثَ كَعْبَ بْنَ سُوْرٍ عَلَى قَضَاءِ الْبَصْرَةِ" (۲)

(۱) كنز العمال: حقوق متفرقة، حدیث: ۴۵۹۱۶

(۲) طبقات ابن سعد: کعب بن سور: ۷/۹۲، دارصادر، بیروت

فتنہ سے اجتناب

کعب بصرہ جانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اختلاف رونما ہوا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کی تیاری کے لئے طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بصرہ آئیں تو کعب اس خانہ جنگی سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک گھر میں خلوت نشیں ہو گئے اور کھانے کا سامان لینے کے لئے اس میں ایک سوراخ کر لیا، لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا: اگر کعب آپ کے ساتھ ہو جائیں تو پورا قبیلہ ازد آپ کے ساتھ ہو جائے گا، یہ سن کر آپ کعب کے پاس تشریف لے گئیں اور باہر سے پکار کر کعب سے گفتگو کرنی چاہی، انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، آخر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کعب کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں اور تم پر میرا حق نہیں ہے، یہ سن کر کعب جواب دینے پر مجبور ہوئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے گفتگو کی، انہوں نے فرمایا: میں چاہتی ہوں کہ تم لوگوں کو سمجھا کر اصلاح کی کوشش کرو، اس حکم کی تعمیل میں کعب کو کیا عذر ہو سکتا تھا، چنانچہ وہ قرآن لے کر لوگوں کو سمجھانے کے لئے نکلے اور دونوں فریق کو سمجھاتے تھے اور قرآن کی طرف بلاتے تھے۔

وفات

لیکن یہ معاملہ افہام و تفہیم سے بہت آگے بڑھ چکا تھا، اس لئے ان کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور جنگ شروع ہو گئی اور یہ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے کسی شتی کے تیر سے ہلاک ہو گئے "فَجَاءَ سَهْمُهُمْ غَرْبٌ فَقَتَلَهُ" (۱)

(۳) اُیاس بن معاویہ

نام ایاس، کنیت ابو ائملہ، نسب اس طرح ہے کہ ایاس بن معاویہ بن قرة بن

(۱) طبقات ابن سعد: کعب بن ثور: ۷/۹۳، دار صادر، بیروت

ایاس بن ہلال بن رباب بن عبیدہ بن سواۃ بن ساریہ بن ذبیان بن ثعلبہ بن سلیم بن اور بن قریبہ مزی۔

فضائل و کمالات

ایاس اس دور کے مشہور قضاۃ میں سے تھے، فقہ ان کا خاص فن تھا اس میں ان کے امتیازی اور خصوصی درجہ کی وجہ سے علی ان کو فقیہ لکھتے ہیں، اپنی فقہی کمال کی وجہ سے وہ اموی دور میں بصرہ کے عہدہ قضاء پر مامور ہوئے، ان کے تقرر کے وقت حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ ان کے پاس تشریف لے گئے، انہیں دیکھ کر ایاس رونے لگے "لَبَّيْنا اسْتَقْصَىٰ اِيَّاسٌ اَتَاكَ الْحَسَنُ فَبَكَى اِيَّاسٌ" (۱)

ایاس کو فہم و فراست، ذکاوت و دور اندیشی سے بھی وافر حصہ ملا تھا، وہ عقل و دانش کے مجسم پیکر تھے، ابن سعد ان کی فراست اور ذکاوت کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ: "كَانَ عَاقِلًا مِّنَ الرِّجَالِ فَطِنًا" (۲) ابن سیرین کے سامنے جب ان کا ذکر آتا تو فرماتے کہ: "وہ مجسم فہم ہیں" "اِنَّهُ فَهْمٌ" (۳) ان کے عہد کے لوگ کہتے تھے کہ ہر صدی میں ایک بڑا عاقل پیدا ہوتا ہے اور اس صدی کے عاقل ایاس ہیں "يُولَدُ فِي كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ رَجُلٌ تَأْمُرُ الْعُقُلُ، فَكَانُوا يَرَوْنَ اِيَّاسَ بَنَ مُعَاوِيَةَ مِنْهُمْ" (۴) ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں کہ: ان کی ذکاوت اور فطانت ضرب المثل تھی، ابو تمام کا شعر ہے:

اِقْدَامُ عُمَرَ وَفِي شُجَاعَةِ غَنَتَرٍ
فِي حُلْمِ اَحْنَفٍ فِي ذُكَا اِيَّاسِ (۵)

(۱) طبقات ابن سعد: ایاس بن معاویہ: ۷/۲۳۴، دار صادر، بیروت

(۲) طبقات ابن سعد: ایاس بن معاویہ: ۷/۲۳۴، دار صادر، بیروت

(۳) تہذیب التہذیب: حرف الالف، ۳/۳۸۳، مطبعة دائرة المعارف النعمانية

(۴) تہذیب التہذیب: حرف الالف، ۳/۳۸۳، مطبعة دائرة المعارف النعمانية

(۵) وفيات الاعيان: أبو تمام: ۱۵/۲، دار صادر، بیروت

قضاء اور فراست کے واقعات

قضاء میں مہارت بڑی حد تک ذہانت و فطانت پر موقوف ہوتی ہے، اس لئے ایاس اس دور کے ممتاز ترین قضاۃ میں شمار کئے جاتے تھے، ان کی دوراندیشی ان کی فراست و ذکاوت کے یہ واقعات ملاحظہ کیجئے۔

☆ مجاہد بن سعید کہتے ہیں کہ: میں نے شعبی سے پوچھا کہ یہ بات ضرب المثل ہے کہ قاضی شریح لومڑی سے بھی زیادہ چالاک اور حیلہ باز ہیں، اس کی اصل کیا ہے؟ انہوں نے مجھے اس کی وجہ بیان کی کہ شریح طاعون کے زمانہ میں نجف کی طرف چلے گئے اور جب یہ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک لومڑی ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی اور ان کا دھیان بٹاتی، جب اس پر عرصہ گزر گیا تو انہوں نے یہ ترکیب کی کہ ایک بانس کا ڈھانچا بنا کر اس کو اپنی قمیص پہنا دی، آستین باہر کر دی اور اپنی ٹوپی اڑھا کر اس پر باندھ دیا، جب لومڑی اپنی عادت کے مطابق آ کر کھڑی ہو گئی تو شریح نے پیچھے سے آ کر دفعۃً اس کو پکڑ لیا، اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ شریح لومڑی سے بھی زیادہ چالاک اور حیلہ باز ہیں ”هُوَ أَذْهَلُ مِنَ الثَّعْلَبِ وَأَحْيَلُ“ (۱)

☆ عمر بن ہبیرہ نے ایاس بن معاویہ کو بلایا اور پوچھا: آپ قرآن پڑھ سکتے ہیں؟ ایاس بن معاویہ نے کہا: ہاں، عمر بن ہبیرہ نے کہا: فرائض کا آپ کو علم ہے؟ ایاس بن معاویہ نے کہا: ہاں، عمر بن ہبیرہ نے کہا: عجم کی تاریخ سے آپ کو دلچسپی ہے؟ ایاس نے کہا: پڑھ رکھی ہے، عمر بن ہبیرہ نے کہا: عرب کی تاریخ پڑھی ہے، قاضی ایاس نے کہا: ہاں پڑھی ہے، عمر بن ہبیرہ نے کہا: میری تمنا ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ بحیثیت معاون مقرر کروں، ایاس نے کہا: میرے اندر تین خصلتیں ہیں اور ان تینوں کے ہوتے ہوئے میں منصب قضا کے لئے مناسب نہیں ہو سکتا۔

عمر بن ہبیرہ نے کہا: وہ تین خصلتیں کیا ہیں؟

ایاس نے کہا: پہلی خصلت تو یہ ہے کہ میں بد صورت ہوں جو آپ دیکھ رہے ہیں، دوسری یہ ہے کہ میرے اندر حدت (تیز مزاجی) ہے اور تیسری یہ ہے کہ میں اس ذمہ داری کے نبھانے سے عاجز ہوں۔

عمر بن ہبیرہ نے کہا: آپ بد صورت ہیں تو مجھے کوئی لوگوں کے سامنے بازار حسن قائم کرنا نہیں ہے، ”وَأَمَّا الدَّمَامَةُ لَا أَرِيدُ أَنْ أُحَاسِنَ بِكَ“ آپ اپنی عاجزی کی بات کر رہے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں، ورنہ آپ منصب قضا کے لئے بالکل موزوں ہیں اور جہاں تک آپ کی حدت اور گرم مزاجی کا سوال ہے تو کوڑا آپ کو درست کر دے گا، جانیے میں نے آپ کو قاضی بنا دیا۔

پھر عمر بن ہبیرہ نے قاضی ایاس بن معاویہ کو سو درہم عطا کئے، یہ ان کی زندگی کی پہلی کمائی تھی۔ (۱)

☆ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک شخص کے پاس کچھ مال امانت رکھوایا تھا، جب اس نے واپس مانگا تو امانت دار نے انکار کر دیا، مال کے مالک نے ایاس کی عدالت میں دعویٰ کیا، انہوں نے کہا: اس وقت لوٹ جاؤ، اس واقعہ کو پوشیدہ رکھنا، اس شخص کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ تم میرے پاس آئے تھے، دو دن کے بعد پھر آنا، اس کو لوٹا کر ایاس نے امانت دار کو بلوایا اور اس سے کہا: میرے پاس بہت سی مال آ گیا ہے، میں اس کو تمہارے پاس رکھوانا چاہتا ہوں، تمہارا گھر محفوظ ہے، اس نے کہا: ہاں، ایاس نے کہا: تو مال رکھنے کے لئے کسی جگہ کا انتخاب کر لو، اور دو بار بردار لے کر آؤ، اس گفتگو کے بعد ایاس نے مال کے مالک کو بلوایا کہ اب جا کر تم اس شخص سے اپنا مال مانگو اگر دے دے تو فہماور نہ اسکو کہنا کہ میں جا کر قاضی کو اطلاع کر دوں گا، اس شخص نے جا کر کہا کہ: میرا مال دو، ورنہ میں قاضی کو جا کر اطلاع دوں گا، یہ سن کر اس نے کل روپیہ واپس کر دیا

اور صاحب مال نے آکر قاضی کو اطلاع دے دی کہ میرا مال مجھ کو مل گیا، اس کے بعد سابق قرار داد کے مطابق وہ ایاس کے پاس روپیے لینے کے لئے آیا، انہوں نے اس کو ڈانٹ کر نکال دیا: «وَجَاءَ الْأَمِينُ إِلَى إِيَّائِيسَ لِمَوْعِدِهِ فَرَجَرَهُ وَأَشْهَرَهُ. وَقَالَ: لَا تَقْرَبِينَ يَا خَائِنُ» (۱)

☆ دو شخص قاضی ایاس کے یہاں اپنی دو چادروں کے سلسلے میں مقدمہ لے کر آئے، ان میں ایک چادر سرخ تھی اور ایک ہری، ان میں سے ایک شخص نے کہا: میں حوض میں غسل کرنے کے لئے چلا گیا اور اپنی چادر اوپر رکھ چھوڑا، اور یہ شخص آیا اور اس نے اپنی چادر بھی میری چادر کے بازو رکھی اور وہ بھی غسل کرنے کی غرض سے حوض میں داخل ہو گیا اور یہ پہلے نکل کر میری چادر لے کر چلتا بنا، میں حوض سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہوا چلا، اس کا خیال یہ ہے کہ یہ چادر اسی کی تھی، تو قاضی ایاس نے کہا: تمہاری یہاں کوئی دلیل اور بینہ ہے، اس نے کہا: نہیں، تو انہوں نے ایک کنگھا منگوایا اور اس سے دونوں کے سروں میں کنگھی کی، ان میں سے ایک کے سر سے سرخ اون برآمد ہوا اور دوسرے کے سر سے ہرا اون، تو جس کے سر سے سرخ اون نکلا اس کے حق میں سرخ چادر کا فیصلہ کیا اور جس کے سر سے ہرا اون نکلا اس کے حق میں ہری چادر کا فیصلہ دیا «فَقَضَى بِالْحُمْرِ لِلَّذِي خَرَجَ مِنْ رَأْسِهِ صُوفٌ أَحْمَرٌ، وَبِالْخَضَرِ لِلَّذِي خَرَجَ مِنْ رَأْسِهِ صُوفٌ أَخْضَرُ» (۲)

☆ ابراہیم بن مرزوق بصری کہتے ہیں کہ: ہم ایاس کے عہدہ قضاء پر مامور ہونے سے پہلے ہی سے ان کی ذہانت اور فطانت کو نوٹ کیا کرتے تھے، کہتے ہیں کہ ایک شخص آیا اور اونچی جگہ پر بیٹھ گیا اور راہ تنکنے لگا، پھر ایک شخص کو دیکھ کر اپنی جگہ سے نیچے اتر آیا اور اس کو بغور دیکھ کر پھر اپنی جگہ لوٹ آیا، ایاس بن معاویہ کے ہم

نشینوں اور مصاحبوں نے کہا: اس آدمی کے متعلق آپ کا کہنا ہے، یہ کوئی ضرورت مند معلوم ہوتا ہے، ایاس نے کہا: یہ بچوں کا معلم ہے اور اس کا کاغذ غلام کھو گیا ہے اور یہ اس کو تلاش کر رہا ہے، اس سے انہوں نے معلوم کیا تو ایسا ہی پایا، ان لوگوں نے ایاس سے پوچھا: تم نے کیوں کر اس کو اس کے مقصد کو جاننا تو ایاس نے کہا: جب اس نے اپنے بیٹھنے کے لئے اونچی جگہ تلاش کی تو میں سمجھ گیا کہ یا تو یہ بادشاہ ہو سکتا ہے اور اس کی حیثیت بادشاہ کی سی نہ تھی یا بچوں کا معلم اور استاذ ہو سکتا ہے اور یہ جب راستہ اور آنے جانے والوں کو تک رہا تھا تو میں نے غور کیا اور اچانک اپنے غلام کے مشابہ آدمی پر اس کی نظر پڑی تو اس نے اس کی آنکھوں کی کھوج شروع کی تو میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا اندھا غلام کھو گیا ہے «فَعَلِمْتُ أَنَّهُ نَظَرَ فِي وَجْهِهِ إِلَى عَيْنَيْهِ، فَعَلِمْتُ أَنَّ غَلَامَهُ أَعْوَرَ قَدْ ذَهَبَتْ إِحْدَى عَيْنَيْهِ» (۱)

☆ قاضی ایاس کہتے ہیں کہ: میں صرف ایک آدمی سے مغلوب ہو گیا، واقعہ یہ ہے کہ میں بصرہ کی عدالت میں تھا، اتنے میں ایک آدمی میرے پاس بحیثیت گواہ حاضر ہوا اور گواہی دی کہ فلاں باغیچے کا مالک فلاں آدمی ہے، میں نے اس گواہ کو جانچنا چاہا کہ وہ جس بات کی گواہی دے رہا ہے اس کی جانکاری اس کو کہاں تک ہے، چنانچہ میں نے پوچھا: اس باغیچے میں کتنے درخت ہیں؟ گواہ بولا: میرے آقا قاضی صاحب اس عدالت میں کتنے برسوں سے منصب قضاء کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں؟۔ میں نے گھبرا کر کہا: اتنے برسوں سے۔ گواہ بولا: اس چھت کی کڑیوں کی تعداد کتنی ہے؟ گواہ کے سوال کا مقصد میں سمجھ گیا اور کہا: حق تمہارے ساتھ ہے، جاؤ میں نے تمہاری شہادت قبول کی۔ (۲)

☆ قاضی ایاس بن معاویہ کی ذہانت اور فطانت کے چرچے تھے، عدالت میں بیٹھتے تو

(۱) تاریخ دمشق: ایاس بن معاویہ: ۱۰/۳۳

(۲) سنہرے فیصلے: عبدالملک مجاہد: ۱۲۱

(۱) الطرق الحکمیة: فصل فی الحکم بالفراصة: ۱/۲۵، مکتبۃ دار البیان

(۲) أخبار القضاة: ما حفظناه من قضا یا ایاس بن معاویة وفقهہ: ۱/۳۳۹

ایسے شاندار اور بے لاگ فیصلے کرتے کہ لوگ ششدر اور حیرت زدہ رہ جاتے، تاریخ نے ان کے فیصلوں کے حوالے سے متعدد واقعات بیان کئے ہیں، بڑی شخصیات کے جہاں بہت سارے مداح اور عزت و توقیر کرنے والے ہوتے ہیں وہیں حاسدین کی بھی ایک بڑی ٹولی ہوتی ہے، چنانچہ کچھ لوگوں کی بڑی تعداد وہ بھی ہوتی ہے جو ان سے حسد اور جلن کرتے ہیں اور ہر وقت ان کی کوشش یہ ہوتی ہے ان کی سبکی اور خست کا موقع ہاتھ آجائے، چنانچہ وہ ان کے عیوب تلاش کرنا شروع کی، تاکہ ان کی شخصیت داغدار ہو جائے۔

خاصی تگ و دو کے بعد ان کو ایک بات ہاتھ لگی کہ قاضی ایاس فیصلہ کرنے میں بہت جلد بازی کرتے ہیں، یقیناً یہ ایک بڑا عیب ہے جو قاضی کے شان کے منافی ہے، سنجیدگی اور منانیت کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے خوب غور و فکر کیا جائے اور اس کے بعد فیصلہ سنایا جائے ان حاسدین نے ان کے بارے میں لوگوں میں یہ شوشہ چھوڑ دیا اور رفتہ رفتہ عوام میں یہ بات مشہور ہوتی گئی کہ قاضی صاحب فیصلہ کرنے میں بڑے جلد باز ہیں۔

ادھر قاضی ایاس بن معاویہ کو بھی حاسدین کی چہ میگوئیوں کے بارے میں معلوم ہو گیا، انہوں نے بھی حاسدین کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔

قاضی ایاس نے نہایت ادب سے ان لوگوں کو مجلس میں بلایا، ان کی خوب آو بھگت کی، ان کو خوب کھلایا پلایا اور پھر گفتگو شروع کی، اس دوران اچانک انہوں نے اپنے ہاتھ کو بلند کیا اور کہنے لگے: ذرا بتانا ان انگلیوں کی تعداد کتنی ہے؟ حاضرین مجلس نے ایک نظر ان کے ہاتھ پر ڈالی اور ایک زبان ہو کر کہا: پانچ ہیں، پوری پانچ۔ قاضی ایاس نے ان کی طرف تبسم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ: ساتھیو! تم نے جواب دینے میں اس قدر جلدی کیوں کی، تم ایک دو تین چار پانچ تک گن کر تھوڑی دیر انتظار کرتے، غور کرتے اور قدرے توقف کے بعد جواب دیتے؟ وہ کہنے لگے: قاضی صاحب! اس میں انتظار اور توقف کی کیا ضرورت ہے؟ جس چیز کی گنتی ہمیں معلوم ہو، بھلا اس میں توقف کیوں کریں؟ اب قاضی ایاس نے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ ان سے

کہنا شروع کیا: جب میرے پاس مقدمات آتے ہیں، میں فریقین کی بات سننے کے بعد فوراً ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا ہوں تو پھر فیصلہ سنانے میں کیوں توقف کروں؟ اب قاضی ایاس نے اس مثال سے معترضین کو جواب دیا، اس طرح حاسدین کی چال ناکام ہو گئی اور انہیں منہ کی کھانی پڑی، اور انہیں معلوم ہوا کہ وہ فیصلہ کرنے میں عجلت اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے؛ بلکہ وہ اپنی خداداد ذہانت و فطانت کی بدولت بجلد معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور بغیر کسی تاخیر کے مقدمہ کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

☆ ایک آدمی نے حکومت کے ایک بڑے عہدیدار کے پاس ایک تھیلی بطور امانت رکھوائی اور بتایا کہ یہ دیناروں سے بھری ہوئی ہے اور خود ایک طویل مدت تک غائب رہا، جب امانت رکھوانے والا شخص طویل عرصہ اعلیٰ افسر کے پاس نہ آیا تو اس نے ایک چال چلی، وہ یہ کہ اس نے تھیلی کے نچلے حصہ سے نہایت احتیاط کے ساتھ ڈوری کاٹ دی اور اس میں سے سارے دینار نکال کر اس کی جگہ درہم رکھ دیئے، پھر تھیلی کو اسی طرح سی دیا جیسی پہلے تھی، صاحب مال پندرہ سال کے بعد اس اعلیٰ افسر کے پاس آیا اور اس نے بطور امانت رکھوائی ہوئی اپنی تھیلی طلب کی، افسر نے صاحب مال کو اس کی تھیلی واپس کر دی جو اس طرح سر بھر تھی جس طرح اس نے پندرہ سال قبل امانت رکھوائی تھی۔ جب صاحب مال نے تھیلی کھولی تو اس میں دینار کے بجائے درہم تھے، وہ یہ دیکھ کر جھنجھلا اٹھا اور بولا یہ تھیلی میری نہیں ہے، میری تھیلی میں دینار تھے، جب کہ اس میں درہم ہیں، مجھے اپنی دیناروں والی تھیلی چاہئے۔ عہدے دار نے کہا: بھئی! غور سے دیکھو، تھیلی وہی ہے جو تم نے میرے پاس رکھوائی تھی، آج تک یہ سر بند ہے، یہی تھیلی تمہاری ہے، میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا ہے، ادھر وہ شخص اس سے اصرار کرتا رہا کہ مجھے دینار چاہئے، میری تھیلی وہ ہے جس میں دینار تھے، جب بات نہیں بنی تو صاحب مال نے اس وقت کے امیر عمر بن ہبیرہ کے پاس مقدمہ دائر کر دیا، عمر بن ہبیرہ نے قاضی ایاس بن معاویہ کے پاس مقدمہ بھیج دیا۔ قاضی ایاس نے صاحب مال

سے پوچھا: نوعیت مقدمہ بیان کرو؟ صاحب مال نے عرض کیا: میں نے اس عہدہ دار کے پاس دیناروں کی تھیلی بطور امانت رکھوائی تھی، مگر یہ مجھے درہموں کی تھیلی دے رہا ہے، قاضی ایاس نے پوچھا: کتنا عرصہ پہلے؟ صاحب مال نے جواب دیا: پندرہ برس پہلے۔ اب قاضی ایاس اس عہدے دار کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ عہدے دار نے کہا: اس کی تھیلی سر بہر رکھی ہوئی ہے، قاضی ایاس نے پوچھا: کتنے برسوں سے؟ عہدے دار نے کہا: پندرہ برسوں سے۔ قاضی ایاس نے خادموں کو حکم دیا کہ اس تھیلی کا بندھن کھول کر اس کے دراہم بکھیر دو، خادموں نے حکم کی تعمیل کی اور تھیلی کے پورے دراہم بکھیر دیئے، بکھرے ہوئے دراہم میں کچھ تو دس سال پرانے سکے تھے اور کچھ پانچ سال پرانے اور کچھ اس کے آگے پیچھے سالوں کے سکے تھے، قاضی ایاس نے عہدیدار سے مخاطب ہوئے، تم نے اقرار کیا ہے کہ یہ تھیلی تمہارے پاس پندرہ سال سے تھی اور اس تھیلی کے اندر دس پانچ سال پرانے سکے بھی ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تھیلی اس پندرہ سالہ مدت میں کبھی کھلی ضرور ہے، اور اس وقت دیناروں کو دراہم سے بدلا گیا ہے قاضی ایاس کی دلیل نے مجرم کو اقرار جرم پر مجبور کر دیا اور بالآخر عہدے دار نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا: «فَأَقَرُّ بِالذَّنِّ نَبِيرٌ فَأَلَزَمَهُ إِثْمَاهَا» (۱)

☆ کسی شعبہ اور صنف کے اشخاص کا اس شعبہ سے متعلق ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم پیشہ اشخاص کی خصوصیات پر پوری نظر رکھتا ہو، ایاس اس عہد کے تمام مفتیوں اور قضاة کے محاسن و معائب سے خوب واقف تھے، حبیب بن اشہد کا بیان ہے کہ ایک شخص ایاس کے پاس ایک مقدمہ میں مشورہ کے لئے آیا کہ وہ اس میں کس کی طرف رجوع کرے تو انہوں نے کہا کہ: اگر تم اس کا صحیح فیصلہ چاہتے ہو تو عبد الملک بن یعلیٰ کے پاس جاؤ، وہ صحیح معنوں میں قاضی ہیں، اور اگر محض فتویٰ لینا ہے تو حسن بصری کے پاس جاؤ، وہ میرے اور میرے باپ کے استاذ ہیں، اور اگر صلح

مقصود ہے تو حمید الطویل کی طرف رجوع کرو، وہ اس طریقہ سے صلح کرادیں گے کہ تم سے کہیں گے کہ: تم اپنے حق کا کچھ حصہ لے لو اور کچھ چھوڑ دو اور اگر مقدمہ بازی کرنا ہے تو صالح الدوسی کے پاس جاؤ وہ تم کو رائے دیں گے کہ دوسرے کے حق سے بالکل انکار کر دو، اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ کرو اور جو لوگ موجود نہیں ہیں ان کو گواہ بناؤ: «الْجَحْدُ مَا عَلَيْكَ وَادَّاعٍ مَا لَيْسَ لَكَ وَادَّاعٍ بَيْنَهُ غُيْبًا» (۱)

☆ ایک مرتبہ قاضی ایاس بن معاویہ کی عدالت میں دو شخص آئے، ایک نے دعویٰ کیا کہ میں نے اپنے دوست کے ہاں اپنا مال امانت رکھا تھا، جب واپس لینے آیا تو اس نے انکار کر دیا کہ میرے ہاں تمہاری کوئی امانت نہیں ہے، قاضی ایاس اس کے دوست سے امانت کے بارے میں پوچھا: اس شخص نے انکار کر دیا اور کہا کہ: میرے دوست کے ہاں اگر کوئی گواہ ہو تو پیش کرے ورنہ میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں کہ اس کی کوئی امانت میرے ہاں نہیں ہے، قاضی ایاس نے محسوس کیا کہ مدعی علیہ جھوٹ بول رہا ہے اور شرعی حجت کا سہارا لے کر اپنے دوست کا مال ہضم کرنا چاہتا ہے، فیصلہ میں جلدی نہ کی، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کیں اور مدعی سے کہا: تم نے اپنا مال اپنے دوست کو کس مقام پر حوالہ کیا تھا، اس نے کہا: فلاں مقام پر میں نے اس کو دیا ہے، قاضی ایاس نے پوچھا کہ: اس مقام کی کوئی خاص علامت ہے؟ مدعی نے کہا: ہاں وہاں ایک بڑا درخت تھا، جس کے سایہ میں ہم دونوں نے پہلے کھانا کھایا، پھر جب چلنے لگے تو اپنا مال اس کے حوالہ کر دیا، قاضی ایاس نے کہا: اس وقت تم اس درخت کے پاس جاؤ، ممکن ہے کہ تمہیں اصلی واقعہ یاد آجائے کہ اپنے اس دوست کے علاوہ کسی اور شخص کو مال دیا ہو یا اس جگہ کوئی اور معاملہ ہوا ہو جو تم بھول رہے ہو، لہذا فوری اس مقام پر پہنچو اور وہاں بیٹھ کر غور کرو اور جو بات یاد آجائے واپس آ کر عدالت درخواست ہونے سے پہلے مجھ کو

اطلاع کر دینا، یہ سن کر وہ شخص تیزی سے چلا گیا، ادھر قاضی ایاس دوسرے مقدمات میں مشغول ہو گئے اور مدعی علیہ عدالت میں بیٹھا رہا، اس عرصہ میں قاضی ایاس کبھی کبھی مخفی طور پر اس کو کن آنکھوں سے دیکھ لیا کرتے تھے، جب یہ اطمینان ہو گیا کہ مدعی علیہ غافل ہو گیا ہے تو اچانک اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ کیا تمہارا وہ دوست اس مقام پر پہنچ گیا ہوگا؟ اس اچانک سوال پر مدعی علیہ بغیر سوچے سمجھے فوراً بول پڑا کہ انہیں وہ مقام تو یہاں سے بہت دور ہے، بس قاضی ایاس نے دفتر بند کر دیا اور غضبناک انداز میں کہا: اے اللہ کے دشمن! تجھ کو امانت کا انکار ہے؛ لیکن اس مقام کا علم ہے جہاں امانت حوالہ کی گئی تھی، اللہ کی قسم! تو جھوٹا اور خیانت کار ہے، اس غیر متوقع فہمائش پر مدعی علیہ کے ہوش و حواس گم ہو گئے اور وہ مجبور ہو گیا کہ امانت کا اقرار کر لیا جائے، آخر کار خیانت کا اقرار کر ہی لیا، قاضی ایاس نے اس کو قید کر دیا، جب اس کا ساتھی واپس آ گیا تو اس کا مال حوالہ کر دیا گیا، اس طرح قاضی ایاس نے اپنے خداداد ذہانت سے ایک ایسا مقدمہ حل کر دیا جس کے اسباب معدوم تھے اور حق والحق سے محروم ہو رہا تھا۔ (۱)

۱۲۰ھ میں وفات پائی، اور ان کی عمر اس وقت ۷۶ سال تھی۔

(۴) شریک بن عبد اللہ النخعی

ان کا نام شریک اور ابو عبد اللہ کنیت تھی، یمن کے قبیلہ بنو مدحج کی ایک بڑی شاخ بنو النخع سے نسبی تعلق رکھنے کے باعث نخعی کہلاتے ہیں۔ ان کی ولادت خراسان کے مشہور مردم خیز شہر بخارا میں ۹۵ھ میں ہوئی، بنو النخع بعد طلوع اسلام کے یمن سے کوفہ آ کر آباد ہو گئے، اس لئے قاضی شریک بھی تاحیات کوفہ ہی میں رہے، ان کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے نہایت بلند مقام رکھتا تھا، امام ابراہیم نخعی جیسے جلیل القدر تابعی اسی گلستان فضل و دانش کے ایک گل سرسبز تھے۔

عملی لیاقت اور علوم مرتبت

قاضی شریک کو فضل و کمال خاندانی ورثہ میں ملا تھا، فقہ و حدیث میں ان کی مہارت مسلم تھی، اس کے علاوہ فہم و دانش، ذہانت و فطانت سے بھی بہرہ وافر پایا تھا، سلاطین و وقت ان کے اکرام و تعظیم میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے تھے، کوئی علماء حدیث کی مرویات کا ان سے بڑا واقف اس وقت نہ تھا۔ (۱) ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ عالم، فقیہ، ذی فہم، ذہین اور فطین تھے ”كَانَ عَالِمًا فَهِيمًا ذَكِيًّا“ (۲) علامہ ذہبی نے بھی ان کو کثیر الروایہ اور بلند پایہ محدث قرار دیا ہے۔

فقہ میں بھی غیر معمولی کمال حاصل تھا اور اسی باعث وہ ایک طویل زمانہ تک واسطہ، اہواز اور کوفہ میں مسند عدل و انصاف کی زینت بنے رہے، علماء نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے کمال تفقہ کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

عہدہ قضا

فقہ و فتاویٰ میں ان کے کمال تبحر کی وجہ سے بہت سے سلاطین نے انہیں اپنے زمانہ خلافت میں قضا کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا، سب سے پہلے خلیفہ منصور نے ۱۵۳ھ میں انہیں کوفہ کا قاضی مقرر کیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد معزول کر دیا، اس کے بعد جب مہدی مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے قاضی شریک کو دوبارہ اس منصب پر مامور کیا ”فَعَزَلَهُ مَوْسَى الْهَادِي“ (۱) مؤرخ ابن خلکان نے اہواز کے قاضی ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ (۲)

عدل پروری

قاضی شریک کی کتاب زندگی کا اصل باب ان کے زمانہ قضا کا کردار و عمل ہے، وہ

(۱) میزان الاعتدال: شریک بن عبد اللہ النخعی: ۲/۴۷۰، دار المعرفة للطباعة والنشر، بیروت

(۲) وفيات الأعيان: القاضی شریک النخعی: ۲/۴۶۴، دار صادر، بیروت

(۳) الاعلام: شریک بن عبد اللہ: ۳/۱۶۳

(۴) وفيات الأعيان: القاضی شریک النخعی: ۲/۴۶۴، دار صادر، بیروت

اس عظیم آزمائش سے بھی بڑی خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے، اس پوری مدت میں عدل پروری، انصاف پسندی اور غیر جانبداری کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ یہ تاریخ کا مستقل اور روشن باب ہے۔

خود قاضی صاحب کے زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ:

☆ جب خلیفہ منصور نے مجھے کوفہ کا قاضی مقرر کیا تو میں وہاں گیا، والی کوفہ محمد بن سلیمان کا کاتب حماد بن موسیٰ کسی قضیہ میں ماخوذ ہو کر میرے سامنے پیش ہوا، میں نے دلائل و شواہد کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر کے جیل بھیج دیا، ایک دن ناگاہ مجھے خبر ملی کہ حاکم نے اسے رہا کر دیا ہے، میں نے سوچا کہ یہ پہلا موقع ہے، اگر اس بار ہی میں نے کمزوری کا ثبوت دیا تو پھر حالات پر قابو حاصل کرنا مشکل ہوگا۔

چنانچہ میں فوراً محمد بن سلیمان کے پاس پہنچا اور نہایت درشت لب و لہجہ میں کہا کہ: تمہیں تو میرے فیصلوں کے نفاذ میں مدد و معاون بننا چاہئے تھا نہ کہ مخالف تم نے قید سے رہا کر کے توہین عدالت کا ارتکاب کیا ہے، بخدا اگر تم نے اسے دوبارہ قید میں نہ پہنچایا تو میں امیر المؤمنین کے سامنے تمہاری حقیقت کی پول کھول کر رکھ دوں گا، یہ رنگ دیکھ کر حاکم مذکور نے فوراً اپنے کاتب کو قید خانہ میں واپس کر دیا "فَرَدَّ إِلَى الْحَبْسِ" (۱)

☆ کوفہ میں نہر فرات کے کنارے ایک خوبصورت باغ تھا جس کا مالک کوفہ کا ایک شخص تھا، اس باغ کے ساتھ ہی کوفہ کا گورنر موسیٰ کا محل تھا، موسیٰ کی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ باغ خرید لے تاکہ اس کا محل کھلا اور کشادہ ہو سکے، چنانچہ اس نے اس کے مالک کو پیش کش کی کہ وہ باغ اسے فروخت کر دے مگر اس نے انکار کر دیا۔ کچھ عرصہ گذرا، وہ شخص فوت ہو گیا، اس کے ورثاء میں چند بیٹے اور ایک بیٹی تھی، اب موسیٰ بن عیسیٰ نے ورثاء کو دوبارہ پیش کش کی کہ وہ باغ خریدنا چاہتا ہے اور اس کے لئے خطیر رقم بھی پیش کی، لڑکوں نے اپنا حصہ بیچنے پر رضامندی

ظاہر کردی، مگر بیٹی نے اپنا حصہ بیچنے سے انکار کر دیا، اس نے اپنی حصہ کے ارد گرد دیوار تعمیر کردی، وہ تمام تر غیبات کے باوجود اس کے حصہ کو فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوئی، گورنر نے ایک دن اپنے نوکروں کو حکم دیا جنہوں نے دیوار کو گرا کر اس زمین کو محل میں شامل کر دیا، ادھر اس لڑکی نے گورنر کو فہ موسیٰ بن عیسیٰ کے خلاف قاضی شریک کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی شریک نے گورنر کو حاضر عدالت ہونے کا حکم دیا، اس نے اس کو اپنی سبکی اور بے عزتی تصور کرتے ہوئے اس نے پولیس چیف کو یہ کہلا بھیجا کہ قاضی کو سمجھاؤ کہ اس نے ایک عورت کے دعوے کو بغیر کسی گواہوں کے کیسے قبول کر لیا۔ پولیس چیف حاضر عدالت ہو کر گورنر کا موقف بیان کیا، قاضی شریک نے کہا: میں نے تمہیں تو نہیں گورنر کو بلوایا تھا، اسے خود آ کر وضاحت کرنی چاہئے، تم نے اپنا مشورہ دے کر عدالت کے معاملات میں دخل اندازی کرتے ہوئے توہین عدالت کی ہے، لہذا تمہیں جیل جانا ہوگا، اس کے ساتھ قاضی نے عدالتی پولیس کو حکم دیا کہ پولیس چیف کو حوالات میں بند کر دیا جائے۔ گورنر کو جب پتہ چلا کہ پولیس چیف کے ساتھ کیا بیٹی تو اس نے قاضی کو سمجھانے کے لئے چند معززین شہر کو روانہ کیا، چنانچہ یہ وفد قاضی کے پاس آیا، گورنر کا پیغام دیا اور اس کی ناراضگی سے آگاہ کیا۔ چنانچہ قاضی شریک نے کہا کہ عدالت کی نظر میں عام و خاص برابر ہیں؛ لہذا تمہیں بھی توہین عدالت کے جرم میں جیل بھجوا یا جاتا ہے، یہ احوال دیکھ کر خود گورنر اپنی پولیس فورس کو لے کر سیدھا جیل گیا اور پولیس چیف سمیت تمام لوگوں کو رہا کر دیا۔ ادھر جیل کا نگران سیدھا قاضی شریک کے پاس آیا اور سارا واقعہ کہہ سنایا، قاضی شریک نے کہا: کہ میں نے اس عہدے کی نہ تو طلب کی تھی اور نہ تمنا، یہ تو مجھے خلیفہ نے مجبور کیا تھا اور میں نے اس شرط پر اس عہدے کو قبول کیا تھا کہ میرے ہر فیصلے کو نافذ کیا جائے گا، قاضی نے اپنے کاغذات، کتب اور اپنا ذاتی سامان اکٹھا کیا، اپنی سواری پر بیٹھے اور بغداد کا رخ کیا۔

گورنر کو جب قاضی کے شہر کو چھوڑنے کی اطلاع ملی تو بڑا پریشان ہوا، اسے خوب معلوم تھا کہ اگر خلیفہ کو سارے حالات کا پتہ چل گیا تو میری گورنری ختم ہو جائے گی، چنانچہ اس نے قاضی شریک کو کوفہ کے باہر روک لیا اور ان کی بات ماننے کے لئے تیار ہو گیا، قاضی نے کہا: میں اس شرط پر تمہاری بات ماننے کے لئے تیار ہوں کہ جن لوگوں کو تم نے رہا کیا ہے ان کو دوبارہ جیل واپس بھیجنا ہوگا اور تمہیں اس عورت کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہوگا۔

قاضی نے بیان سننے کے بعد فیصلہ سنایا، جو دیوار گرائی گئی ہے اسی طرح دوبارہ بنوائی جائے، عورت کی زمین واپس کی جائے اور اسے زمین فروخت کرنے پر مجبور نہ کیا جائے، گورنر کے فیصلہ تسلیم کرنے پر تمام قیدیوں کو رہا کرنے کا قاضی نے حکم دیا، دوسرے دن قاضی شریک گورنر کے دربار میں تشریف لے گئے، گورنر نے خیر مقدم کیا، اپنے ساتھ بٹھایا اور آنے کا مقصد دریافت کیا، قاضی شریک کہنے لگے: ”اَيُّهَا الْاَمِيْرُ! هَلْ تَأْمُرُنِي الْاَنَ بِشَيْءٍ؟“ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اگر میرے لائق کوئی کام یا خدمت ہو تو اس کو حکم دیجئے، میں اسے بجالاؤں؟ گورنر نے کہا: کل تو تم نے میری سبکی کی اور آج یہ کہہ رہے تھے، قاضی شریک نے کہا: ”فَدَاكَ حَقُّ الشَّرْعِ وَهَذَا حَقُّ الْاَدَبِ“ جو میں نے کل کیا وہ شرعی حق تھا، نافذ کرنا میری ذمہ داری تھی، جہاں تک ادب کا تعلق ہے، آپ حاکم شہر ہیں، آپ کا احترام اور عزت کرنا بہت ضروری ہے، لہذا یہ ادب کا حق ہے۔ (۱)

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

قابل ذکر بات یہ ہے کہ قاضی شریک نے اس آزمائش سے محفوظ رہنے کی حتی الامکان پوری جدوجہد کی، جب بھی حاکم وقت نے ان کو بلا کر اس عہدہ کی پیشکش کی تو انہوں نے برملا اس سے اپنے آپ کو نااہل بتا کر معذوری ظاہر کر دی، چنانچہ منصور عباسی نے ان سے کہا: ”قَدْ وَلَّيْتُكَ قَضَاءَ الْكُوفَةِ“ یعنی میں نے آپ کو کوفہ کا قاضی مقرر

کیا ہے تو فوراً عاجزی سے فرمایا: ”يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنِّيْ اِنَّمَا اَنْظُرُ فِي الصَّلَاةِ وَالصَّوْمِ فَاقْضَا الْقَضَاءُ فَلَا اُحْسِنُهُ“ (اے امیر المؤمنین! میں تو صرف نماز روزہ ہی کے امور سے واقفیت رکھتا ہوں قضاء کی ذمہ داریوں سے باحسن عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا)۔ اسی طرح جب مہدی نے انہیں یہ منصب تفویض کرنے کے لئے بلایا تو فرمایا: ”لَا اَصْلَحُ لِهَذَا“ یعنی میں اس کی صلاحیت نہیں رکھتا، لیکن بالآخر حکمرانوں نے جبر و زبردستی کی حد تک اصرار کیا تو وہ بادل ناخواستہ اس کو قبول کرنے پر تیار ہو گئے۔ (۱)

پورے زمانہ قضا میں ان کا یہ مستقل معمول رہا کہ مجلس عدل منعقد کرنے سے قبل دوپہر کا کھانا تناول فرماتے، پھر اپنے موزے میں سے ایک کاغذ نکال کر اسے بغور دیکھتے، اس کے بعد مقدمات کی پیشی کا حکم دیتے، ان کے بعض احباب کو تجسس پیدا ہوا کہ آخر اس کاغذ میں کیا لکھا ہے جسے روزانہ پابندی سے دیکھنے کا معمول ہے، چنانچہ انہوں نے دیکھا تو اس میں تحریر تھا:

”يَا شَرِيْكَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ اَذْكُرُ الصَّرَاطَ وَحِدَّتَهُ يَا شَرِيْكَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ اَذْكُرُ الْمُؤَقَّفَ بَيْنَ يَدَيْ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ“ (۲)

”اے شریک بن عبد اللہ! پل صراط اور اس کی باریکی کو یاد رکھو، اے شریک بن عبد اللہ! اس دن کو یاد رکھو جب تم خداوند قدوس کے روبرو کھڑے ہو گے“

یہ دراصل اللہ عزوجل کے سامنے ایک حلف نامہ تھا؛ تاکہ عدالت کی کاروائی کے ہر ہر موڑ پر اس ذات کبریا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین دل کی گہرائیوں میں جا گزریں رہے اور کہیں لغزش و زیادتی نہ ہونے پائے۔

نہایت ہی عبادت گزار تھے، محمد بن عیسیٰ عینی شاہد ہیں کہ میں نے قاضی شریک کی پیشانی پر سجدہ کے واضح نشانات دیکھے۔

(۵) حفص بن غیاث

حفص نام اور کنیت ابو عمر تھی، یمن کے مشہور قبیلہ مذحج کی نخع نامی ایک شاخ کوفہ میں آباد ہو گئی تھی، اسی خاندان کی بنا پر نخعی کہلائے، ان کی ولادت ۱۱ھ میں ہشام عبد الملک کے ایام خلافت میں ہوئی ”وُلِدَ حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ سَنَةَ سَبْعِ عَشْرَةَ وَمِائَةً فِي خِلَافَةِ هِشَامِ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ“ (۱) خود ان کی ہی زبانی منقول ہے ”وُلِدْتُ سَنَةَ سَبْعِ عَشْرَةَ وَمِائَةً“ کوفہ کی اس مردم خیز سرزمین سے ان کا تعلق ہے جس کی خاک سے علماء و فضلاء کی کئی نسلیں اٹھی تھیں۔

فضل و کمال

علمی حیثیت سے نہایت بلند مقام رکھتے تھے، انہوں نے مشاہیر تابعین سے کسب فیض کیا، حدیث وفقہ میں پوری مہارت کے ساتھ استغناء و بے نیازی حفظ و اتقان، سیر چشمی و فراخ دستی کا پیکر مجسم تھے، یحییٰ بن سعید القطان کا قول ہے: ”أَوْثَقُ أَصْحَابِ الْأَعْمَاشِ حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ“ (۲) امام اعش کے تلامذہ میں حفص بن غیاث سب سے زیادہ ثقہ تھے۔

خطیب بغدادی رقم طراز ہیں:

”كَانَ حَفْصٌ كَثِيرُ الْحَدِيثِ حَافِظًا لَهُ ثَبَتًا فِيهِ وَكَانَ أَيْضًا مُقَدِّمًا عِنْدَ الْمَشائِخِ الَّذِينَ سَمِعَ مِنْهُمْ الْحَدِيثَ“ (۳)
 حفص بن غیاث کثیر الحدیث، حافظ اور ثقہ تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے شیوخ سے بھی بلند مرتبہ تھے۔“

منصب قضاء

ان کی کتاب زندگی کا سب سے زریں، تابناک اور روشن صفحہ قضاء و افتاء کے

(۱) طبقات ابن سعد: الطبقة السابعة: ۳۸۹/۶، دار صادر، بیروت

(۲) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۶۸/۹، دار الغرب الاسلامی، بیروت

(۳) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۶۸/۹، دار الغرب الاسلامی، بیروت

سلسلے میں ان کی خدمات ہیں، کوفہ، بغداد میں وہ ساہلہ سال تک اس منصب کی زینت بنے رہے۔

بغداد کے مشرقی و مغربی حصوں میں ہمیشہ علاحدہ علاحدہ دو قاضیوں کا تقرر رہا کرتا تھا، سب سے پہلے ۷۱ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے انہیں شرق بغداد کے منصب قضاء پر فائز کیا تھا، اس وقت قاضی حفص کی عمر ۶۰ سال تھی، دو سال تک وہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ بغداد کے قاضی رہے، خلیفہ ان کی بڑی تعظیم و تکریم کیا کرتا تھا، اور ان کے عدالتی فیصلوں کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ان کے منصب قضاء پر فائز ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ: ابن ادریس، حفص بن غیاث اور وکیع بن جراح کو منصب قضاء پر فائز کرنے کے لئے ہارون الرشید کے ہاں لایا گیا، ابن ادریس تو لنگڑتے ہوئے آئے، پھر کہا: السلام علیکم، اور وہاں آکر بادشاہ کے سامنے گر گئے، ہارون رشید نے کہا: ان میں کوئی فضل و کمال معلوم نہیں ہوتا، وکیع بن جراح نے کہا: مجھے منصب قضاء پر فائز کیجئے، پھر اپنی شہادت کی انگلی کو آنکھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا: امیر المؤمنین! میں نے اس سے ایک سال سے کچھ نہیں دیکھا ہے، انہوں نے اس سے اپنی شہادت کی انگلی مراد لی تھی، ہارون نے سمجھا اس سے آنکھ کی خرابی مراد لیا، اور یہ معذرت کر کے وہاں سے نکل گئے، صرف حفص بن غیاث رہ گئے، انہوں نے کہا: میرے اوپر قرض بھی ہے اور میرے اہل و عیال بھی ہیں، اگر آپ مجھے اس سے بے نیاز کر دیں تو منصب قضاء کو سنبھال سکتا ہوں، چنانچہ ان کو قضاء کی ذمہ داری سونپی گئی:

”عَلَيْكَ دَيْنٌ وَلِيَّ عِيَالٍ، فَإِنْ كَفَيْتَنِي وَأَعْفَيْتَنِي وَإِلَّا وَلَّيْتُ،

قَالَ: بَلَى، فَوَلَّاهُ الْقَضَاءَ“ (۱)

حفص اپنے اس عہدہ قضا سے تین سو درہم پاتے ہیں، اپنے ان دونوں ساتھیوں پر سو سو درہم خرچ کرتے تھے ”فَكَانَ يَأْخُذُ ثَلَاثَ مِائَةٍ وَيُدْفَعُ إِلَى كُلِّ وَاحِدٍ

(۱) أخبار القضاة: حفص بن غیاث النخعی: ۱۸۳/۳

مِنْ ذِيْنِكَ مِائَةً (۱)

بے لاگ عدالتی فیصلے

☆ قاضی حفص نے ایک قرضدار مجوسی سردار کے مقدمہ میں دلائل و شواہد کی بنیاد پر اس کے خلاف فیصلہ دیا، ۲۹ ہزار کے اس قرض کا کچھ تعلق امام جعفر سے بھی تھا، اس نے خلیفہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ قاضی حفص کو معزول کر دیں؛ لیکن ہارون الرشید اس کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوا؛ بلکہ اس بے لاگ فیصلہ سے اس قدر مسرور ہوا کہ اس نے حفص بن غیاث کو تیس ہزار درہم دیئے جانے کا حکم دیا؛ لیکن پھر جب ان کی معزولی کے لئے امام جعفر کا دباؤ حد سے زیادہ بڑھا تو ہارون نے ان کو کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا، جہاں انہوں نے پوری شان سے ۱۳ سال تک اس منصب کی عزت بڑھائے رکھی۔ (۲)

قاضی حفص نے کوفہ و بغداد کو ملا کر تقریباً ۱۵ سال تک اس فرض کو انجام دیا، اس طویل مدت میں انہوں نے کبھی بھی اس اعلیٰ عہدہ کی شان سے فروتر کوئی بات نہیں کی، جرات، بے باکی، حق گوئی سے وہ زیریں دوراں مقدمات کو فیصلہ فرماتے، اس میں کسی صاحب جاہ و منصب کی کوئی پرواہ نہ کرتے اور نہ ارباب ثروت و دولت کو خاطر میں لاتے؛ بلکہ کتاب و سنت اور دلائل و نظائر کی روشنی میں جو بات قرین حق و انصاف ہوتی اسے بے باکانہ انداز میں ظاہر فرماتے۔

☆ ایک دفعہ حفص بن غیاث مسند قضاء پر بیٹھے اپنے کام میں منہمک تھے کہ خلیفہ کا قاصدان کی طلبی کا پروانہ لے کر حاضر ہوا، قاضی حفص نے اس سے کہا: مقدمات سے فارغ ہو کر آؤں گا، کیوں کہ میں عوام کا خادم ہوں، چنانچہ وہ اس وقت تک اپنے مقام سے نہ ہٹے جب تک تمام مقدمات فیصلہ نہ ہو جاتے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

ان کے خوف و خشیت کا یہ عالم تھا کہ وہ منصب قضاء کی ذمہ داریوں اور اس کی

(۱) أخبار القضاة: حفص بن غیاث النخعی: ۱۸۴/۳ (۲) سیر الصحابہ: ۱۲۴/۹، کتب خانہ نعیمیہ

نزاکت اور عند اللہ اس کے مسئول ہونے کا خوف ان کو اس قدر دامن گیر تھا کہ وہ اکثر بلک بلک کر رویا کرتے تھے کہ ایسا گراں بار فریضہ میرے ناتواں کاندھوں پر لا دیا گیا ہے، نہ معلوم اس سے کما حقہ عہدہ برآ ہوں گا یا نہیں ان ہی کا قول ہے: «لَأَنَّ يَدْخُلَ الرَّجُلُ إِصْبَعَهُ فِي عَيْنِهِ فَيَقْتُلُهَا فَيَرَى بِهَا خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَكُونَ قَاضِيًا» آدمی اپنی انگلی آنکھوں میں ڈال کر اسے نکال پھینکے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ قضاء کا کام کرے (۱)

لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ انہوں نے اس منصب قضاء کی ذمہ داریوں کو نہایت احسن اور بہتر طور پر انجام دیا، یہی وجہ ہے ان کی حیثیت کو محققین نے نہایت اجاگر کیا ہے، امام وکیع سے جب بھی کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو فرماتے: «إِذْهَبُوا إِلَى قَاضِي فَاسْأَلُوهُ» اسے قاضی سے دریافت کر لو، ولید بن ابی بدر کہتے ہیں کہ: جب قاضی حفص منصب قضاء سے سبکدوش ہوئے تو امام وکیع نے فرمایا: «ذَهَبَتِ الْقَضَاءُ بَعْدَ حَفْصٍ» (۲) سجادہ کا بیان ہے کہ حفص پر قضاوت کا خاتمہ ہو گیا «كَانَ يُقَالُ خَتَمَ الْقَضَاءِ حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ» (۳)

کسبِ حلال میں فرط احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اپنے عہدہ قضا کے دوران ایک مرتبہ پندرہ روز تک علالت کی بنا پر فرائض منصبی انجام نہ دے سکے، چنانچہ صحت یاب ہونے کے بعد سودرہم یہ کہہ کر عالم کو واپس بھیجا کہ «هَذِهِ رِزْقُ خَمْسَةِ عَشْرَةَ يَوْمًا لَمْ أَحْكَمْ فِيهَا بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ» (۴) یہ پندرہ دن کا روزینہ ہے جس میں میں نے مسلمانوں کا کوئی فیصلہ نہیں کیا، اس لئے اس رقم کو لینے کا مجھے کوئی حق نہیں۔

(۱) أخبار القضاة: حفص بن غیاث النخعی: ۱۸۶/۳

(۲) أخبار القضاة: حفص بن غیاث النخعی: ۱۸۴/۳

(۳) العبر فی خبر من غیر: ۲۴۴/۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت

(۴) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۸/۹، دار الغرب الاسلامی، بیروت

قاضی حفص بغداد وکوفہ کے (چیف جسٹس) تھے جو حکومت کا بلند ترین عہدہ ہوتا ہے، دنیا اور اس کے الوان و تتمات ان کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے، لیکن ان کی بے نیازی اور استغناء کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنے جملہ مصارف کے لئے سودرہم رکھ کر مابقیہ مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

اسی کے ساتھ وہ بہت سیرچشم اور سخی واقع ہوئے تھے، ان کا دسترخوان اس قدر وسیع تھا کہ جس میں ان کے تلامذہ کے علاوہ بہت سے مقامی و بیرونی لوگ بھی شریک رہتے تھے، مزید برآں گاہ بگاہ پوری بستی کی دعوت بھی کر دیا کرتے تھے، امام و کعب کا قول ہے کہ ”وَكَانَ سَخِيًّا، عَفِيفًا، مُسْلِمًا“ (۱)

ابوجعفر المسندی کہتے ہیں کہ: ”كَانَ حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ مِنْ أَسْحَى الْعَرَبِ وَكَانَ يَقُولُ مَنْ لَمْ يَأْكُلْ مِنْ طَعَامِي لَا أَحَدَّثُهُ، وَإِذَا كَانَ يَوْمَ ضِيَاثِهِ لَا يَبْقَى رَأْسٌ مِنَ الرِّوَّاسِيِّينَ“ حفص بن غیاث عرب کے سب سے زیادہ سخی آدمی تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میرا کھانا نہیں کھائے گا اس سے میں حدیث بیان نہیں کروں گا، جب ان کے یہاں دعوت کا دن ہوتا تو کوئی شخص اس میں شرکت سے باقی نہیں رہتا تھا۔ (۲)

اس کا نتیجہ تھا کہ پوری عمر عسرت اور تنگ دستی میں گزاری، رحلت کے وقت ان کے پاس ایک درہم نہ تھا؛ بلکہ نو سودرہم کے مقروض نکلے جو ان کے پسماندگان نے ادا کیا۔ (۳)

وفات

تاحیات ان کی یہ تمنا رہی کہ وفات کے وقت قضاة کی زنجیروں سے آزاد ہو جاؤں، خداوند قدوس نے ان کی یہ آرزو پوری فرمائی اور وفات سے دو سال قبل عہدہ

(۱) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۸/۹، دار الغرب الاسلامی، بیروت

(۲) تذکرۃ الحفاظ: الطبقة السادسة من الكتاب: ۲۱۸/۱، دار الکتب العلمیة، بیروت

(۳) تذکرۃ الحفاظ: الطبقة السادسة من الكتاب: ۲۱۸/۱، دار الکتب العلمیة، بیروت

قضا سے ان کی علاحدگی کے سامان فراہم کر دیئے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد فالج کے شکار ہو گئے، اور بالآخر امین کے عہد خلافت میں ۱۰ ذی الحجہ کو ان کی شمع حیات گل ہوئی (۱) امیر کوفہ فضل بن عباس نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (۲)

(۶) یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ

ان کا نام یحییٰ، ابوسلیمان کنیت تھی، ان کا قبیلہ لیث سے تعلق تھا۔

فضل و کمال

قرآن، وحدیث، فقہ، زبان ادب جملہ علوم و فنون کے جامع تھے۔

قرآن کے ممتاز عالم ہونے کے علاوہ حافظ حدیث بھی تھے، انہوں نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایتیں نقل کی ہیں، فقہ پر بھی ان کو کافی عبور اور درک حاصل تھا، جس کی بنا پر ان کو مرو کا عہدہ قضا ان کے سپرد کیا گیا۔

زبان و ادب پر بھی ان کو کافی عبور حاصل تھا، نحو ادب عربی زبان کے یگانہ فاضل تھے، اس کے علاوہ نہایت فصیح و بلیغ تھے۔

ان کا سب سے اہم کارنامہ جو ابداً ابداً قائم رہے گا، قرآن کو منقوٹ کرنا ہے، ابتداء میں قرآن پاک نقطوں سے خالی تھا، سب سے اول یحییٰ نے پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے نقطے لگائے۔ (۳)

بحیثیت قاضی ان ایک کا انوکھا انداز

یحییٰ خراسان کے پایہ تخت مرو کے قاضی تھے، مرو میں باقاعدہ دارالقضاء تھا، لیکن حاجت مندوں کی آسانی کے لئے وہ چلتے پھرتے، راستے گلی میں تنازعوں کا فیصلہ

(۱) طبقات ابن سعد: الطبقة الرابعة: ۳۴۶/۶

(۲) طبقات ابن سعد: ۳۶۸/۷، دار صادر، بیروت

(۳) تاریخ بغداد: حفص بن غیاث: ۸/۹، دار الغرب الاسلامی، بیروت

کردیتے تھے، یحییٰ بن موسیٰ کا بیان ہے کہ: میں نے یحییٰ بن یحمر کو بازاروں اور گلیوں میں فیصلہ کرتے ہوئے دیکھا، بسا اوقات وہ سواری پر چلتے ہوتے، اس حالت میں دو فریق آجاتے تو سواری روک کر کھڑے کھڑے فیصلہ دے دیتے:

”رَأَيْتُ يَحْيَىٰ بْنَ يَعْمُرٍ عَلَى الْقَضَاءِ مَمْزُوقًا رَأَيْتُهُ يَقْضِي فِي السُّوقِ وَفِي الطَّرِيقِ، وَرُبَّمَا جَاءَهُ الْخَصْمَانِ وَهُوَ عَلَى حِمَارٍ فَيَقِفُ عَلَى الْحِمَارِ حَتَّى يَقْضِي بَيْنَهُمَا“ (۱)

(۷) اسد بن فرات

اسد نام، کنیت ابو عبد اللہ، والد کا اسم گرامی فرات اور جد امجد کا نام سنان تھا۔ ان کا خاندان بنی سلیم بن قیس کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھا، قاضی اسد کا آبائی وطن نیشاپور (خراسان) تھا، وہ ابھی بطن مادر ہی میں تھے کہ ان کے والد ہجرت کر کے حران (دیار ابی بکر) چلے آئے ۱۴۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔

انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم امام مالک سے حاصل کی، پھر انہوں نے امام محمد کے زیر تربیت حنفی فقہ حاصل کیا، چنانچہ اگرچہ وہ مسلک مالکی تھے، لیکن منصب قضاء پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے تمام نزاعات اور معاملات کو فقہ حنفی کی رو سے فیصلہ کیا۔

منصب قضاء پر تقرر

ان کے کمال تفقہ کے باعث عہدہ قضاء پر فائز رہے، جس زمانہ میں وہ آفریقہ آئے، عبد اللہ بن غانم اس زمانہ میں قیروان کے قاضی القضاة (چیف جسٹس) تھے، وہ اسد کے قدردان اور ان کے علم و فضل کے معترف تھے، جب تک زندہ رہے، مسائل و معاملات میں انہیں سے رجوع کرتے رہے۔

ان کی وفات کے بعد ۱۹۱ھ میں ایک دوسرے اہل علم ابو محرز اس عہدہ پر سرفراز کئے گئے، پھر آفریقہ کے شیوخ و علماء نے اسد کو ممتاز عہدہ پر مامور کرانا چاہا، چنانچہ علی بن

حمید نے والی آفریقہ زیادة اللہ کے سامنے اسد کی علمی مرتبت، فضل و کمال اور شہرت کا تذکرہ کر کے اس خواہش کا اظہار بھی کیا، لیکن ابو محرز کو دولتِ اعلیٰ کے بانی ابراہیم بن اغلب نے اس عہدہ پر نامزد کیا تھا، اس لئے زیادة اللہ نے انہیں معزول کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی یہ دوسری شکل اختیار کی کہ اسد کو ۴-۲۰۳ھ میں اس عہدہ میں مساوی حیثیت سے ابو محرز کا شریک بنادیا، یہ اسلامی حکومت میں پہلی مثال تھی کہ ایک ہی عہدہ پر ایک ہی حیثیت اور اختیار کے ساتھ دو اشخاص مامور کئے جائیں۔

اسد کا یہ تقرر ابو محرز کو ناگوار گذرا، علاوہ ازیں ان دونوں میں کسی قدر علمی چشمک موجود تھی، اب یہ معاصرانہ چشمک پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی اور باہمی مسابقت کے جذبات پیدا ہو گئے اور کبھی کبھی مناظرہ و مجادلہ کی نوبت تک آجاتی، صاحبِ معالم نے ان دونوں کی علمی نوک جھونک کے واقعات کا ذکر کر کے ان کے علم و فضل کا موازنہ کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ:

”اسد ابو محرز سے علم و فضل میں زیادہ تھے اور انہیں فقہ پر بھی زیادہ عبور

حاصل تھا اور ابو محرز اگرچہ اسد سے علم و فقہ میں کم پایہ تھے، مگر بعض

اوقات (مسائل کے جواب میں) حق ان کے ساتھ رہتا تھا“

اس کے بعد ۲۰۹ھ میں منصور طبعی نے زیادة اللہ کے خلاف خروج کیا اور دار السلطنت قیروان پر قابض ہو گیا، منصور کے مستولی ہونے کے بعد قاضی ابو محرز اور قاضی اسد دونوں اس کے پاس پہنچے، اس کی مجلس میں سلطنت کے اعیان اور فوج کے ممتاز قائدین موجود تھے، منصور نے ان دونوں کے عہدہ قضا کی مناسبت سے ان کے سامنے زیادة اللہ کے مظالم بیان کئے اور دونوں کی رائے طلب کی، ابو محرز نے موقعِ محل سے خائف ہو کر اس کے بیان کی تائید کر دی؛ لیکن قاضی اسد نے صاف گوئی سے کام لیا اور نہ صرف یہ کہ منصور کی تردید کر دی؛ بلکہ اسے ظالم ٹھہرایا، یہ سن کر ایک فوجی افسر تلوار سونت کر اسد کے سر پر کھڑا ہو گیا، مگر معاملہ رفع دفع ہو گیا، اس کے بعد دونوں لوٹ آئے اور خائف رہے کہ پھر کوئی ناگوار صورت نہ پیش آئے۔

زیادۃ اللہ نے ۲۱۱ھ میں منصور پر غلبہ حاصل کر لیا اور قیروان پر قابض ہو گیا، منصور کے روبرو اسد اور محزر کی جو گفتگو ہوئی تھی وہ امیر زیادۃ اللہ کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، اسی بناء پر زیادۃ اللہ نے دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ابو محزر کو عہدہ قضا سے معزول کر دیا اور قاضی اسد اپنے عہدہ پر فائز رہے، اور اب وہ افریقہ کے تنہا قاضی القضاۃ تھے۔

پھر اس کے بعد ان کی اس صاف گوئی سے متاثر ہو کر زیادۃ اللہ نے ان کو فوج کا سپہ سالار بھی بنایا اور یہ ان دنوں عہدوں کو بحسن و خوبی انجام دیتے رہے، اور ان ہی کی قیادت میں صقلیہ فتح ہوا اور ان جنگ ہی یہ زخم ہو گئے، زخم اتنا کاری تھا کہ جانبر نہ ہو سکے، اور انہیں زخموں کی تاب نہ لا کر بمہ ربیع الآخر ۲۱۳ھ کو علم و فضل اور شجاعت و شہامت کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

(۸) محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلی الانصاری

ان کا نام محمد، کنیت ابو عبد الرحمن تھی، اپنے دادا کی طرف منسوب ہو کر عام شہرت ابن ابی لیلی سے پائی۔ ان کے جد امجد یسار رضی اللہ عنہ عظیم اور جلیل القدر صحابی ہیں، جنگ احد وغیرہ متعدد غزوات میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے، ان کے والد عبد الرحمن بن ابی لیلی بھی کبار تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں۔

علی فضل و کمال

ان کو حدیث میں سے بلند رتبہ حاصل نہ تھا، البتہ فقہ پر ان کو کامل و سترس حاصل تھا، علمی اعتبار سے یہ بلند رتبہ اتباع تابعین میں شمار ہوتے ہیں، فقہ میں ان کو شعبی سے خصوصی تلمذ حاصل تھا، ان کی محدثانہ حیثیت پر نقد و جرح کے باوجود تمام ائمہ و محققین نے ان کی فقیہانہ تیز نگاہی کا بالاتفاق اعتراف کیا ہے

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”كَانَ فِقْهُهُ ابْنُ أَبِي لَيْلَى أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنْ حَدِيثِهِ“ (۱)

محمد بن عبد الرحمن کی فقہ ہمارے نزدیک ان کی حدیث سے پسندیدہ تر ہے۔

منصب قضاء

فقہ و فتاویٰ میں غیر معمولی مہارت اور کمال کی بناء پر وہ طویل ترین مدت تک منصب قضاء پر فائز رہے، ان کے فیصلوں اور فتوؤں کو بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا، چنانچہ ساجی کا بیان ہے کہ ”كَانَ يُجَدِّحُ فِي قَضَائِهِ“

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ:

”مَا وُلِّيَ قَضَاءً أَحَدٌ أَفْقَهَ فِي دِينِ اللَّهِ وَلَا أَفْقَرَ لِكِتَابِ اللَّهِ وَلَا أَقْوَلَ حَقًّا بِاللَّهِ وَلَا أَعَفَّ مِنَ الْأَمْوَالِ مِنْ ابْنِ أَبِي لَيْلَى“ (۱) ابن ابی لیلی سے زیادہ دین کی سمجھ رکھنے والا، کتاب اللہ کو پڑھنے والا، حق گو اور مالی امور میں پاک دامن کوئی شخص مسند قضاء کی زینت نہیں دیکھا۔

سلیمان بن مسافر کہتے ہیں کہ: میں نے منصور سے ایک بار پوچھا کہ کوفہ میں اس وقت سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ اس نے فوراً جواب دیا: قاضی کوفہ محمد بن عبد الرحمن بن ابی لیلی۔

ان کے زمانہ میں اس منصب پر طویل عرصہ تک فائز رہنے کی بنا پر مفتی کوفہ اور قاضی کوفہ ان کے نام کے جزو بن گئے تھے، سب سے پہلے یوسف بن عمرو ثقفی نے انہیں قضاء کا منصب سپرد کیا تھا، پھر تقریباً ۳۳ سال تک وہ عہدہ بنی امیہ اور عہدہ بنی عباس دونوں میں اس فریضہ کو بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

رمضان المبارک ۱۴۸ھ میں علم کی یہ شمع فروزاں گل ہو گئی، وفات کے وقت بھی قاضی کوفہ تھے۔

(۹) اسماعیل بن علیہ

ان کا نام اسماعیل، ابو البشر کنیت تھی، والد کا نام ابراہیم بن مقسم اور والدہ کا نام

علیہ تھا، علیہ قبیلہ بنو شیبان کی لونڈی تھیں؛ لیکن بڑی صاحب علم تھیں، انہی کی نسبت سے اسماعیل ابن علیہ کہلائے۔

ان کے والد ابراہیم بھی غلام تھے اور کپڑے کی تجارت کرتے تھے، اس سلسلہ میں وہ برابر بصرہ آیا جایا کرتے تھے، وہاں آمد و رفت کے دوران انہوں نے علیہ بنت حسان سے شادی کر لی اور بصرہ ہی میں مستقل طور پر رہائش اختیار کر لی، اور یہیں ۱۱۰ھ میں اسماعیل بن علیہ پیدا ہوئے، ان کی والدہ فضل و کمال کے باوجود چونکہ باندی تھیں اس لئے ان کی طرف وہ اپنی نسبت پسند نہیں کرتے تھے۔

غالباً اس لئے انہوں نے اپنی کنیت ابو البشر رکھ لی تھی، مگر ابن علیہ کے مقابلہ میں یہ کنیت مشہور نہ ہو سکی۔ ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ہی سے حاصل کی اور پھر اس کے بعد ان کی والدہ ان کو ایک مشہور محدث عبدالوارث کے پاس لئے گئی کہ اس کو تمہاری طرح محدث بنانا ہے، عبدالوارث نے ان کو تمام محدثین اور ان کی مجالس کا حاضر باش بنایا۔

فضل و کمال

اسماعیل بن علیہ کو یوں تو ہر فن میں خوب مہارت تھی؛ لیکن علم حدیث میں ان کو خصوصی درک اور کمال حاصل تھا، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ: بصرہ میں اتقان و تثبت ابن علیہ پر ختم ہو جاتا ہے ”إِلَيْهِ يَنْتَهِي فِي الثَّبُتِ بِالنَّبْصَةِ“ (۱) ان کی جلالت علمی کی وجہ سے کبار محدثین بھی روایت حدیث میں ان کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث کے علاوہ ان کو فقہ پر عبور اور درک حاصل تھا، امام شعبہ انہیں ”رَجَحَانَةُ الْفُقَهَاءِ“ کہا کرتے تھے۔ (۲)

عہدہ قضاء اور اس سے معزولی کے اسباب

فقہی مہارت اور تحریر علمی کی وجہ سے متعدد عہدوں پر بھی فائز ہوئے، چنانچہ ان کو

(۱) شذرات الذہب: سنة ثلاث وتسعين ومائة: ۲/۲۸، دار ابن کثیر، دمشق

(۲) تهذيب الأسماء للنووي: باب اسماعيل: ۱۲۰/۱، دار الكتب العلمية، بيروت

سب سے پہلے بصرہ کی صدقات کا انتظام سپرد کیا گیا، پھر بغداد کے محکمہ فوجداری کے ذمہ دار بنائے گئے اور آخر میں بغداد کے منصب قضاء پر فائز ہوئے، لیکن عرصہ تک اس منصب پر قائم نہیں رہ سکے، عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی ناخوشی کا علم ہوتے ہی اس عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔

واقعہ کی تفصیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ تجارت کرتے تھے اور اس میں انہیں کافی نفع بھی تھا، لیکن یہ پیشہ جلب زر و منفعت کے لئے نہیں تھا؛ بلکہ علماء اور طلبہ کی خدمت اور ان کی دنیوی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھا، چنانچہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ خود ہی فرماتے ہیں: اگر سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، فضیل ابن السماک اور ابن علیہ رحمۃ اللہ علیہ یہ پانچ حضرات نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا۔

ابن علیہ کے قاضی ہونے کے بعد جب ابن مبارک بغداد آئے اور انہیں اس کا علم ہوا تو نہایت آزرده خاطر ہوئے اور جو تحفے وہ ابن علیہ کے پاس معمولاً بھیجا کرتے تھے انہیں موقوف کر دیا اور جب ابن علیہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تو آپ نے کوئی التفات نہیں کیا، ابن علیہ تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر واپس چلے گئے اور دوسرے دن اس مضمون کا ایک خط لکھا:

”میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے لطف و کرم کا منتظر تھا؛

لیکن آپ نے مجھ سے کلام ہی نہیں کیا، معلوم نہیں جناب کو میری کون سی

حرکت ایسی ناگوار ہوئی؟“

یہ خط پڑھ کر حضرت ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ شخص بغیر سختی کے نہیں مان سکتا اور پھر جواب میں یہ تیز و تند اشعار لکھ کر بھیجے۔

يَا جَاعِلَ الدِّينِ لَهُ بَارِيًا

يَصْطَادُ أَمْوَالَ الْمَسَاكِينِ

”اے دین کے ذریعہ غیروں کے اموال کا شکار کرنے والے“

اِحْتَلَّتْ لِلدُّنْيَا وَلَدَاتِهَا

مَحِيلَةٍ تَذْهَبُ بِاللَّيْلِ
”تو نے دنیا اور اس کی لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے ایک ایسا حیلہ
اختیار کر لیا ہے جو دین کو تباہ کر کے رہے گا“

صِرْتَ هَجْنُوًّا بِهَا بَعْدَ مَا
كُنْتُ دَوَاءً لِلْمَجَانِينِ
”پہلے تم دنیا کے مجنون کا علاج کرتے تھے، اب خود تم اس کے مجنون ہو
گئے ہو“

أَيُّنَ رَوَايَاتِكَ فِي سَرْدَهَا
لِتَرْكِ أَبْوَابِ السَّلَاطِينِ
اب بادشاہوں کے دروازے سے بے پرواہ ہو کر تمہارا روایت حدیث کرنا
کہاں گیا؟

إِنْ قُلْتَ أُكْرِهْتُ فَذَا بَاطِلٌ
زَلَّ حَمَارُ الْعِلْمِ فِي الظُّلُمِ
”اگر تم یہ کہو کہ مجھے عہدہ فضا کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تو یہ عذر سراسر
باطل ہے، اب تو یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ علم کا گدھا کیچڑ میں گر گیا“

ابن علیہ کے پاس جب عبداللہ بن مبارک کا یہ خط پہنچا تو آپ پر ایسی رقت طاری
ہوئی کہ آپ اسے پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، پورا خط پڑھنے کے بعد آپ
فوراً مجلس قضاء سے اٹھے اور ہارون الرشید کے پاس جا کر اپنا استعفاء پیش کرتے ہوئے
فرمایا: خدا کے لئے آپ میرے بڑھاپے پر رحم کیجئے؛ کیوں کہ اب میں اس عہدہ پر باقی
نہیں رہ سکتا۔

خلیفہ ہارون الرشید نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مجنون (ابن مبارک) نے
آپ کو بہکا دیا ہے، ابن علیہ نے فرمایا: بہکا یا نہیں؛ بلکہ انہوں نے تو مجھے فی الحقیقت ایک
مصیبت سے نجات دلائی ہے، اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اس سے

رستگاری عطا فرمائے، ہارون الرشید نے آپ کا استعفاء منظور کر کے آپ کو خدمت قضاء
سے سبک دوش فرمایا، حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کو اس کی اطلاع ملی تو بے انتہا خوش
ہوئے اور حسب سابق ایک تھیلی رقم کی ابن علیہ کے یہاں بھیجا۔ (۱)

امام نووی کی رائے ہے کہ یہ پہلے بصرہ کے صدقات و زکوٰۃ کے والی بنائے گئے،
پھر ہارون الرشید کے آخری دور میں بغداد کے قاضی بنائے گئے۔ (۲)

عبادت اور خوف خدا

ابن علیہ کو قرآن مجید کی تلاوت اور عبادت سے بے حد شغف، بلکہ عشق تھا، ابن
مدینی نے ایک رات ان کے ساتھ بسر کی تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت ابن علیہ نے اسی
شب میں تہائی قرآن مجید کی تلاوت کی۔

زہد و اتقاء اور احساسِ آخرت اس دور کی ایک عام خصوصیت تھی، ابن علیہ بھی ان
صفات میں زمرہ تابعین میں نمایاں تھے، حضرت ابن مبارک رحمہ اللہ کا ان کی طرف
میلان اور پھر ان کی مدد کرنا خود اس بات کا واضح ثبوت ہے، پھر ابن مبارک کی تنبیہ پر ان
کا استعفاء دینا غایت تقویٰ کی دلیل ہے، ابن علیہ بلاشبہ ”فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا
وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا“ کی مجسم تصویر تھے، ان کی خشیتِ الہی کا یہ عالم تھا کہ برسوں وہ ہنسے
نہیں، ان کے تلامذہ کا بیان ہے کہ جب سے وہ بصرہ کے والی بنائے گئے، انہیں کبھی ہنسنے
ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

وفات

جمعات کے دن ۲۴ یا ۲۵ ذی قعدہ ۱۹۳ھ کو علم و عمل کی یہ شمع فروزاں گل ہو گئی
(۳) جنازہ کی نماز ان کے صاحبزادے ابراہیم نے پڑھائی اور بغداد کے مشہور قبرستان
ابن مالک میں تدفین عمل میں آئی۔

(۱) تاریخ بغداد: اسماعیل بن ابراہیم: ۱۹۶/۷، دار الغرب الاسلامی، بیروت

(۲) تہذیب الاسماء للنووی: باب اسماعیل: ۱۲۰/۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت

(۳) شذرات الذہب: سنة ثلاث وتسعين ومائة: ۲/۲۸، دار ابن کثیر، دمشق

(۱۰) امام ابو یوسف رحمہ اللہ

نام یعقوب، کنیت ابو یوسف تھی، سلسلہ نسب ان کے جد اعلیٰ سعد بن خنبتہ سے جاملتا ہے، یہ جلیل القدر صحابی رحمہ اللہ تھے، غزوہ احد میں شرکت کی اجازت چاہی مگر کم سنی کی وجہ سے اجازت نہیں ملی، دو سال کے بعد غزوہ خندق پیش آیا تو اس میں شرکت کا شرف حاصل کیا، اس غزوہ میں انہوں نے بڑی جانبازی دکھائی، دشمنوں سے برسر پیکار تھے کہ حضور انور ﷺ کی نگاہ ان پر پڑی، فرمایا: کون ہو تو بولے: مجھے سعد خنبتہ کہتے ہیں، پھر قریب بلایا اور سر پر دست شفقت رکھا، امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ: آنحضرت ﷺ کے دست شفقت پھیرنے کی برکت ہم اب تک محسوس کر رہے ہیں "فَتِلْكَ الْمَسْحَةُ فِينَا إِلَى السَّاعَةِ" (۱)

ان کے والد ابراہیم ایک غریب آدمی تھے، اور کوفہ میں مزدوری کر کے گذر اوقات ہوتا تھا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کوفہ میں ۳۱۱ھ یا ۹۳ میں پیدا ہوئے۔ (۲)

تعلیم کا آغاز اور معاشی تنگی

ابتداءً عمر ہی سے ان کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، مگر ان کے والد اپنی غربت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ حصول معاش میں ان کا ہاتھ بٹائیں، اس وجہ سے ان کو بہت دنوں تک باقاعدہ تحصیل علم کا موقع نہ مل سکا، مگر ان کے ذوق علم اور طلب اور جستجو نے ان کو اکسایا کہ اسی تنگی و ترشی میں والد سے چھپ چھپا کر علمائے کوفہ کی خدمت میں حاضری دی جائے، کوفہ میں اس وقت فقہ و حدیث کی بہت سی مجلسیں چلتی تھیں، جن میں محمد بن ابی لیلیٰ اور امام ابو حنیفہ رحمہما کی مجالس درس کو خاص خصوصیت حاصل تھی، چنانچہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ پہلے خصوصیت سے ابن ابی لیلیٰ کی مجالس میں شریک ہوتے رہے، اور تقریباً ۸-۹ سال

تک ان سے کسب فیض کیا، اس کے بعد امام صاحب کی مجالس میں شرکت کرنے لگے اور ان کو یہ مجلس ایسی بھائی کہ پھر امام صاحب کی زندگی میں اس سے علاحدہ نہ ہو سکے۔ (۱)

عہدہ قضا

ان کی علمی لیاقت اور صلاحیت کا شہرہ چہار دانگ عالم میں عام و تمام ہے، اسلئے یہ تو محتاج بیان نہیں ہے، لیکن انہوں نے قضاء کے عہدہ کو بھی ایک طویل مدت زینت بخشی اور قضاء کا عہدہ جو حفظ و امانت، عدل پروری اور انصاف کا طالب ہوتا ہے اس کا تمام حق ادا کر دیا۔

ائمہ اسلاف کا عہدہ قضا سے انکار کے اسباب

عہد نبوی اور عہد صدیقی میں عہدہ قضا اسلامی حکومت کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا، بلکہ ہر صوبہ اور ضلع کا والی ہی قاضی ہوا کرتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب اسلامی حکومت کے حدود وسیع ہو گئے اور انتظامی اور عدالتی ضرورتوں کی بنا پر انتظامیہ اور عدلیہ کو ایک ساتھ رکھنا مشکل ہو گیا اور پھر ولایت کی بدعنوانیاں سامنے آئیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان دونوں شعبوں کو الگ کر دیا، پھر خلفائے بنی امیہ کو دین اور دین کے تقاضوں اور کاموں سے شغف باقی نہ رہا تو انہوں نے عہدہ قضا کی اہمیت کم کر دی، ایسے لوگوں کا عہدہ قضا پر تقرر ہونے لگا تو جو علم و فقہ سے تو کم مناسبت رکھتے تھے، دنیا کے لالچی، حریص اور امراء اور بادشاہوں کے خوشامد واقع ہوئے تھے، چنانچہ واقعہ ہے کہ بنو امیہ کا تیسرا فرمان روا جب وہ مصر پہنچا تو وہاں کے قاضی کو بلایا، اس وقت وہاں کے قاضی عابس تھے، اس نے ان سے پوچھا کہ قرآن یاد ہے، بولے: نہیں، پھر پوچھا: فرائض یعنی تقسیم وراثت میں پختگی پیدا کر لی ہے، جواب ملا: نہیں، مروان کو اس جواب سے حیرت ہوئی اور بولا "فَبِمَ تَقْضِي" پھر آپ فیصلہ کیسے کرتے ہیں۔ (۲)

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲۰/۱۲۳، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) کتاب الولاية: و کتاب القضاء للکندی: عابس بن سعد: ۱/۲۲۶

(۱) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲۰/۲۱۰، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب موفق

صرف یہی نہیں قاضیوں کے انتخاب میں اہل و نااہل کا بہت کم خیال کیا جاتا؛ بلکہ حکمران طبقہ قاضیوں کے فیصلوں تک میں دخل اندازی کرتا تھا، چنانچہ اموی اور عباسی دور کا مشکل سے کوئی ایسا قاضی ملے گا جس کے فیصلہ میں ارباب حکومت کی مداخلت کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش نہ آیا ہو، صرف اموی دور کے قاضی خیر بن نعیم اور عباسی دور کے قاضی حفص بن غیاث کے متعلق ان کے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ارباب حکومت نے ان کو اپنے فیصلوں کے بدلنے پر مجبور کرنا چاہا مگر حکومت سے منسلک رہتے ہوئے بھی ان کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل نہ آیا۔ یہی وجہ تھی محتاط فقہاء و محدثین حکومت کا تعاون لینے کو براہی سمجھتے تھے، اگر کسی مجبوری کی بناء پر تعاون کرتے بھی تھے تو اسے اضطراب سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

قاضی حفص فرماتے ہیں کہ: جب میری یہ حالت ہوگئی کہ مردار کھانا میرے لئے حلال ہو گیا تو اس وقت میں نے عہدہ قضا قبول کیا، قاضی شریک کو مجبوراً عہدہ قضا قبول کرنا پڑا، تو انہوں نے اس کو دین کے فروخت کرنے سے تعبیر کیا، ان کے الفاظ یہ ہیں: ”بِعْتُ دِیْنِی“ میں نے اپنے دین کو بیچ دیا۔

چونکہ وہ جانتے تھے کہ عہدہ قضا پر فائز ہونے کے بعد اس جرأت اور آزادی کے ساتھ دینی احکام کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ نہیں کر سکتے جس آزادی سے وہ عہدہ افتاء پر کر سکتے تھے، لیکن ان میں جو غیر معمولی لوگ تھے انہوں نے کسی بھی حالت میں عہدہ قضا کو قبول نہیں کیا، ان ہی لوگوں میں سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعض تلامذہ امام زفر وغیرہ ہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو بنو امیہ اور بنی عباس دونوں کا عہد حکومت دیکھا اور ان کو ان دونوں عہدوں میں یہ لقمہ تر پیش کیا گیا؛ لیکن انہوں نے اس کو کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کیا، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مصلحت کی بناء پر اس عہدہ قضا کو قبول کیا۔ مگر کبھی انہوں نے حق و عدل کی روش سے سرمو انحراف نہیں کیا، اس کی وجہ سے ان کو کئی دفعہ جیل بھی جانا پڑا، ان کے عہدہ قضا کے قبول کرنے کی مزید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے ذریعہ سے وہ اسلامی نظام اور ان

قوانین کو نافذ کرنا چاہتے تھے جو امام صاحب، اور ان کی وفات کے بعد خود انہوں نے اور ان کے احباب نے کتاب و سنت کی روشنی میں مستنبط کئے تھے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے عہدہ قضا کی مدت

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ عہدہ قضا پر کتنے دن مامور رہے اس میں اختلاف ہے، ایک مرتبہ خود انہوں نے اپنے شاگرد سے بیان کیا کہ: میں ۱۷ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں (یعنی عہدہ قضا پر) سب سے پہلے مہدی کے وقت قاضی مقرر ہوئے اور ان کی وفات ۱۸۲ھ میں عہدہ قضا کی حالت میں ہوئی تو اگر ان کے تقرر کا ۱۵۹ھ ماننے ہیں تو قضا کی مدت ۲۲-۲۳ برس ہوتی ہے۔

زمانہ قضا کے چند واقعات

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ تین عباسی خلفاء کے دور میں قاضی رہے، مہدی، ہادی اور ہارون رشید، مہدی نے ان کو صرف بغداد کے مشرق کا قاضی بنایا تھا، مگر خلیفہ ہادی کے زمانہ میں وہ پورے بغداد کے قاضی بنادئیے گئے۔

☆ ایک باغ کے معاملہ میں خلیفہ ہادی اور کسی عام آدمی میں اختلاف ہو گیا، ہادی نے حکم دیا کہ معاملہ قاضی کے روبرو پیش کیا جائے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے شہادتیں گزریں جن سے باغ ہادی کا ثابت ہوتا تھا، لیکن امام نے انہی شہادتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ خفیہ تحقیقات کیں، جس سے معلوم ہوا کہ باغ خلیفہ کے مخالف فریق ہی کا ہے، جس کے خلاف عدالت میں شہادتیں گزر رہی ہیں، امام صاحب نے مقدمہ کو اس وقت تو ملتوی کر دیا، ہادی سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ مقدمہ میں آپ نے کیا فیصلہ کیا، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ شہادتیں تو آپ کے موافق ہیں، مگر مدعا علیہ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا ہے کہ مدعی (خلیفہ) سے حلف لے لی جائے، ہادی نے پوچھا: تو آپ کی کیا رائے ہے، کیا آپ مدعی کا حلف اٹھانا صحیح سمجھتے ہیں، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: قاضی ابن ابی لیلی رحمۃ اللہ علیہ کی تو یہی رائے ہے، ”قَدْ كَانَ ابْنُ أَبِي لَيْلَى يَرَاهُ“ (امام ابو یوسف کا یہ منسلک نہیں تھا) اسکے بعد

ہادی نے کہا کہ: اچھا تو باغ مدعالیہ کے حوالہ کر دیجئے۔ (۱)

اسی طرح کا ایک فیصلہ انہوں نے ہارون الرشید کے خلاف بھی دیا تھا، مگر اس میں ان سے ذرہ سی غلطی ہو گئی تھی، جن کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا، واقعہ یہ ہے کہ سواد عراق کے ایک بوڑھے نے ہارون کے خلاف یہ دعویٰ دائر کیا کہ فلاں باغ میرا ہے؛ لیکن خلیفہ نے اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے، اتفاق سے یہ مقدمہ اس روز پیش ہوا جس روز خود ہارون الرشید فیصلے کے لئے بیٹھا ہوا تھا، قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فریقین کے بیانات اور ان کے دعویٰ ہارون کے سامنے پیش کر رہے تھے، جب اس مقدمہ کی باری آئی تو انہوں نے خلیفہ کے سامنے اس کو پیش کیا اور کہا کہ: آپ کے اوپر دعویٰ ہے کہ آپ نے فلاں آدمی کا باغ زبردستی لے لیا ہے، مدعی یہاں موجود ہے، حکم ہو تو حاضر کیا جائے، بوڑھا سامنے آیا تو قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: بڑے میاں! آپ کا دعویٰ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے باغ پر امیر المؤمنین نے ناحق قبضہ کر لیا ہے، جس کے خلاف دادرسی چاہتا ہوں، قاضی نے سوال کیا: اس وقت وہ کس کے قبضہ اور نگرانی میں ہے، بولا: امیر المؤمنین کے ذاتی قبضہ میں ہے، اب قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ہارون رشید سے مخاطب ہو کر کہا کہ: دعویٰ کے جواب میں کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں، ہارون نے کہا: میرے قبضہ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں اس شخص کا حق ہو، نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے، قاضی نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد مدعی سے پوچھا کہ تمہارے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل بھی ہے، کہا: ہاں خود امیر المؤمنین سے قسم لی جائے، ہارون نے قسم کھا کر کہا کہ: یہ باغ میرے والد مہدی نے مجھے عطا کیا تھا، میں اس کا مالک ہوں، بوڑھے نے یہ سنا تو اس کو بہت غصہ آیا اور یہ بڑبڑاتا ہوا عدالت سے نکل گیا، جس طرح کوئی شخص آسانی سے ستو گھول کر پی جائے اسی طرح اس شخص نے آسانی سے قسم کھالی (استقہ کا نہ سویق) ایک معمولی آدمی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہارون کا چہرہ غصہ سے متمتا اٹھا، یحییٰ برکی نے ہارون کو خوش کرنے کے لئے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ:

نے دیکھا اس عدل و انصاف کی نظیر دنیا میں مل سکتی ہے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تحسین کی، کہا کہ: مگر انصاف کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ (۱)

اس واقعہ میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے انصاف کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، مگر پھر بھی آخر وقت تک ان کو جب اس واقعہ کا خیال آتا تو فرماتے تھے: میں اپنے اندر سخت کوفت محسوس کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا جواب دوں گا؟ لوگوں نے کہا کہ: آپ نے انصاف میں کیا کوتاہی کی اور آپ اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے کہ ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا، فرمایا: لوگوں نے نہیں سمجھا کہ مجھے کس خیال سے تکلیف ہوتی ہے، پھر افسوس کے لہجہ میں فرمایا کہ: مجھے تکلیف اور کڑھن اس کی ہے کہ میں ہارون رشید سے یہ نہ کہہ سکا کہ آپ کرسی سے اتر جائیے جہاں آپ کا فریق کھڑا ہے وہیں ایک فریق کی حیثیت سے آپ بھی کھڑے ہو جائیے، یا اجازت دیجئے کہ اس کے لئے بھی کرسی لائی جائے "فَأَقُولُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! أَنْتَ عَلَى كُرْسِيِّ وَهُوَ عَلَى الْأَرْضِ، فَيَدْعِي لَهُ بِكُرْسِيِّ فَيَجْلِسُ عَلَيْهِ" (۲)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے جب خلفاء کی پرواہ نہیں کی تو وزراء و ارکان حکومت کی پرواہ کیا کرتے، چنانچہ انہوں نے متعدد وزراء اور خواص حکومت کی شہادتیں رد کر دیں، ایک بار علی بن عیسیٰ وزیر مملکت نے کسی معاملہ میں شہادت دی، تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے قبول نہیں کیا، یہ ایک وزیر کی توہین تھی، اس نے معاملہ ہارون رشید کے سامنے پیش کیا، ہارون نے امام صاحب سے دریافت کیا تو فرمایا کہ: میں شہادت اس لئے رد کر دی کہ میں نے اپنے کانوں سے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں تو خلیفہ کا عبد اور غلام ہوں اور جب یہ غلام ہیں تو غلاموں کی شہادت معتبر نہیں، بعض روایتوں میں ہے کہ: انہوں نے کہا کہ: یہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے؛ اس لئے میں ان کی شہادت رد کرتا ہوں۔ (۳)

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/۱۳۶، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/۲۲۳، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۳) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/۲۲۳، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

☆ ایک مرتبہ ایک شخص نے مامون رشید پر بیس ہزار درہم کا وعدہ کیا، مامون رشید کو عدالت میں حاضر ہونا پڑا، نوکروں نے اس کے لئے عدالت میں قالین بچھا دی، قاضی القضاۃ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیکھ کر نوکروں کو حکم دیا کہ وہ قالین اٹھا کر رکھیں اور کہا کہ عدالت میں دعویٰ کرنے والا اور ملزم دونوں برابر ہیں، کسی کے ساتھ امتیازی برتاؤ نہیں کیا جاسکتا، مامون نے جب قاضی کی یہ حق پرستی دیکھی تو ان کی تنخواہ بڑھادی، اب ہر آدمی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جس دور میں ایسے ہمت والے قاضی ہوں اور ایسے انصاف پسند بادشاہ ہوں تو عام لوگ کتنی امن و چین کی زندگی بسر کرتے ہوں گے؟۔ (۱)

قاضی القضاۃ عہدہ کی ابتداء

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مہدی کے عہد خلافت میں بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے، خلیفہ ہادی کے زمانہ میں بھی اسی عہدہ پر تھے، ہارون الرشید کے ہاتھوں میں خلافت کی باگ ڈور آئی تو سال بھر تک تو اس نے ان کو اسی حیثیت میں رکھا، مگر اس کے بعد تمام ممالک محروسہ کا قاضی القضاۃ بنادیا ”كَانَ إِلَيْهِ تَوَلِيَةُ الْقَضَائِ فِي الْأَقَاقِ مِنَ الشَّرْقِ وَالْغَرْبِ“ (۲)

خود امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”قَوْلَانِي قَضَاءَ الْبِلَادِ كُلِّهَا“ (۳) ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسماً اور تبرکاً قاضی نہیں تھے، بلکہ کہنا چاہئے کہ حکومت کے محکمہ عدلیہ کے پورے انچارج یا بالفاظ دیگر وزیر عدل و قانون تھے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس عہدہ کو جس کی کوئی قیمت نہ تھی اس قدر باوقار عہدہ بنادیا تھا، اس کی تائید ابو الولید الطیالسی کی روایت سے ہوتی ہے: ”هَذَا هُوَ الْوَزِيرُ وَقَاضِي الْقَضَاءِ“ یہی وہ شخص ہے جو وزیر اور قاضی القضاۃ ہے۔ ہارون بھی ان کا احترام بجالاتا

(۱) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ۱۹۸، بحوالہ عدل و انصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۶۰

(۲) شذرات الذهب: ۲۹۳/۱ دارالکتب العلمیہ، بیروت

(۳) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/۲۱۱، طبع: دائرة المعارف النظامیہ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

تھا، ان کو ہر وقت دربار میں باریابی کی اجازت تھی، ان کی سواری باب خلافت سے اندر چلے جانے کے باوجود بھی سواری سے نہیں اترتے تھے، حریم خلافت کا پردہ اٹھایا جاتا اور ان کی سواری اندر چلی جاتی۔ جب ہارون کا سامنا ہوتا تو وہ خود سلام میں سبقت کرتا اور ان کا اعزاز و اکرام کرتا۔

علالت اور وفات

موت سے کچھ دن پہلے بیمار ہوئے، ان کو بیمار ہونے سے پہلے ہی اپنی موت کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا، وہ برابر کہا کرتے تھے کہ ۷۱ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا اور ۷۱ برس دنیا کے کاموں میں، اب میرا وقت قریب ہے، موت سے پہلے وصیت کی کہ میرے مال میں سے ایک ایک لاکھ درہم اہل مکہ، اہل مدینہ اور اہل کوفہ پر تقسیم کر دیا جائے، اس کے بعد وراثت تقسیم ہو۔ (۱)

علالت کے ایام میں ان پر کچھ عجیب رقت طاری تھی، عہدہ قضا کی ذمہ داریوں کو انہوں نے جس دیانت سے انجام دیا، اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے، لیکن آخر وقت میں وہ کہتے تھے کہ: کاش! میں فقر و فاقہ کی حالت میں اس دنیا سے چلا جاتا اور عہدہ قضا قبول کرتا، پھر بھی میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے قصداً کسی پر ظلم کیا ہے اور نہ کسی فریق کی پاسداری کی ہے اور نہ میری خواہش ہوئی کہ فلاں فریق کامیاب ہو اور فلاں نہ کامیاب ”وَلَا أَحْبَبْتُ خَصْمًا عَلَى خَصْمٍ“ (۲) جس روز ان کی وفات ہوئی، ان کی عجیب کیفیت تھی، اور زبان پر یہ کلمات جاری تھی:

”بارالہا! تو جانتا ہے کہ میں نے کسی فیصلہ میں جو تیرے بندوں کے درمیان تھا، خود رائی سے کام نہیں لیا اور نہ خلاف واقعہ فیصلہ کیا، ہمیشہ میری کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو وہ تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت

(۱) مناقب الامام الاعظم للکوردی: ۲/۱۲۵، طبع: دائرة المعارف النظامیہ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/۲۲۳، طبع: دائرة المعارف النظامیہ بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

کے موافق ہو، جب کسی مسئلہ میں دشواری پیش آتی تھی تو میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے اور تیرے درمیان واسطہ بناتا تھا، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ احکام کو خوب سمجھتے تھے، اور عداوہ کبھی حق کے دائرے سے باہر نہیں جاتے تھے، یہ بھی زبان پر تھا کہ: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ پاک دامن رہا اور کبھی ایک درہم جان بوجھ کر حرام کا نہیں کھایا۔ ”جَعَلْتُ بَيْنِي وَبَيْنَكَ اَبَا حَنِيفَةَ (۱) اُنِّي عَلِمْتُ اَنَّهُ لَمْ يَكُنْ فِي عِلْمِكَ اَحَدًا اَعْلَمُ بِهِ مِنْهُ“ (۱)

ان کی وفات کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا، خصوصیت سے ہارون رشید بہت غمگین تھا، جنازہ نکلا تو مشایعت کی اور خود نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے مقبرے خاص میں دفن کرایا (۲) اس سے فارغ ہوا تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: تمام اہل اسلام کو چاہئے کہ ان کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کریں یعنی حادثہ ایک شخص کا نہیں، ایک خاندان کا نہیں؛ بلکہ پوری ملت کا ہے۔

تقویٰ و خشیت الہی

اللہ کا خوف اور اس کا ڈر اس کے رگ و پے میں سرایت کیا ہوا تھا۔ علی بن عیسیٰ کہتے ہیں:

”میں ایک بار ایسے وقت میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا کہ مجھے گمان تھا کہ وہ آرام گاہ میں ہوں گے اور ملاقات نہ ہو سکے گی، میں نے اطلاع کرائی تو فوراً بلا لیا، دیکھا کہ ایک علاحدہ کمرے میں لنگی باندھے بیٹھے ہیں اور ان کے گرد کتابوں کا انبار ہے، میں نے کہا: میں تو سمجھتا تھا کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: دیکھو اس کمرے کے چاروں طرف یہ الماریاں ہیں، ان میں کتابیں

اور کاغذات کے بہت سے پوٹ رکھے ہوئے ہیں، یہ تمام میرے فیصلوں کی نظیریں ہی، قیامت کے دن جب مجھ سے باز پرس ہوگی کہ تم نے فیصلے کس طرح کیے تو خدا کے حضور اس کے جواب میں یہی پیش کروں گا۔ ”هَذِهِ كُلُّهَا قَضَايَا قَضَيْتُ بِهَا وَأَنَا مُتَحَيِّجٌ إِلَى اَعْدَاءِ لَهَا جَوَابًا اِذَا سُئِلْتُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ (۲)

(۱۱) امام محمد شیبانی

محمد نام، ابو عبد اللہ کنیت، شجرہ نسب کچھ اس طرح ہے، محمد بن الحسن الفرقد الشیبانی۔ ان کے والد دمشق کے ایک گاؤں حرستا کے رہنے والے تھے، ترک وطن کر کے یہ سلسلہ ملازمت عراق آئے اور وہیں ایک گاؤں ”واسطہ“ میں سکونت اختیار کر لی، امام محمد یہیں ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ واسطہ میں ابھی عمر کے چند سال گزرنے پائے تھے کہ ان کے والد وہاں سے شامی لشکر کے ساتھ کوفہ چلے آئے اور پھر وہیں مستقل بود و باش اختیار کر لی، کوفہ اس وقت علم و فن کا مرکز اور علماء و مشائخ کا گہوارہ تھا، علمی اعتبار سے اسے تمام ممالک اسلامیہ میں ”ام البلاد“ کی حیثیت حاصل تھی، اسی مادر علمی کی آغوش میں امام محمد نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور اسی ماحول میں انہوں نے نشو و نما پائی، سب سے پہلے حسب روایت قرآن کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ادب و لغت کی ابتداء کی گئی، ادب اور لغت کی تعلیم سے فراغت کے بعد کوفہ کے بڑے بڑے شیوخ کے درس میں شریک ہونے لگے، فطری استعداد و صلاحیت اور کوفہ کے علمی ماحول نے کم سنی ہی میں انہیں ایک جوہر قابل بنادیا۔ (۲)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں آمد اور ان سے شرف تلمذ

ابھی تیرہ چودہ برس کے ہی تھے کہ ایک مسئلہ دریافت کرنے کی غرض سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ مسئلہ یہ تھا کہ اگر نابالغ عشاء کی نماز پڑھ کر

(۱) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲/۲۲۳، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۲/۱۴۶، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۱) مناقب الامام الاعظم للموفق: ۲۴۱، والکردری: ۲/۱۴۵، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدر آباد ۱۳۲۱ھ

(۲) تاریخ بغداد: ۱۴

سو جائے اور اسی رات میں وہ بالغ ہو جائے تو کیا وہ عشاء کی نماز دہرائے گا، امام صاحب نے اثبات میں جواب دیا، یہ سوال چونکہ انہوں نے اپنے متعلق کیا تھا، اس لئے وہاں سے فوراً اٹھے، وضو کیا اور مسجد کے ایک گوشہ میں جا کر عشاء کی نماز دہرائی، امام صاحب نے یہ دیکھ کر حاضرین سے فرمایا کہ انشاء اللہ یہ لڑکا رشید ہوگا "إِنَّ هَذَا الصَّبِيَّ يَفْلَحُ" (۱)

گویا یہ ایک معمولی واقعہ تھا؛ لیکن یہی واقعہ تحصیل فقہ اور امام صاحب سے ان کی عقیدت و تلمذ کا سبب بن گیا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقہ تلمذ میں داخل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا، امام صاحب نے اپنے دستور کے مطابق شریک درس ہونے کے لئے حافظ قرآن ہونے کی شرط ان کے سامنے رکھی تو پھر وہ ایک ہفتہ کے بعد اپنے والد کے ساتھ امام صاحب کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے قرآن حفظ کر لیا ہے، "فغاب سبعة أيام"، ثم جاء وقال حفظته " (۲) اس کے بعد انہوں نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، امام صاحب نے ان سے پوچھا کہ: یہ مسئلہ تم کسی سے سن کر دریافت کر رہے ہو یا تمہارا طبع زاد ہے، امام محمد رحمہ اللہ نے کہا: یہ سوال خود میرے ذہن میں آیا ہے، امام صاحب رحمہ اللہ نے ان سے فرمایا کہ تم تو بڑے لوگوں جیسا سوال کرتے ہو تم برابر میرے حلقہ درس میں آتے رہو، اس کے بعد امام محمد رحمہ اللہ مستقل طور پر امام صاحب کے سلسلہ تلامذہ میں داخل ہوئے اور ہمیشہ سفر و حضر میں ان کی صحبت میں رہا کرتے، ان کی حیات تک کسی دوسرے حلقہ درس میں نہیں گئے، امام ابو حنیفہؒ سے ان کو صرف چار سال استفادہ کا موقع ملا، پھر امام صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے بعد امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرف رجوع کیا جو امام صاحب کے محبوب اور سب سے زیادہ ذی علم تلامذہ میں سے تھے، اور ان کے حلقہ درس میں فقہ کی تکمیل کی، اور بجز چند آخری سالوں کے بہت کم ان سے علاحدہ رہے۔ (۳)

(۱) مناقب الامام الاعظم للمکرمی: ۱۵۵/۲، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للمکرمی: ۱۵۵/۲، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۳) مناقب امام محمد، تذکرۃ الحفاظ

عہدہ قضا سے انکار

اسلاف امت میں بہت سی ہستیاں ایسی گذری ہیں جنہوں نے حکومت کے کسی بھی عہدہ کو قبول کرنے کو پسند نہیں کیا اور نہ امراء و سلاطین کی قربت اور نزدیکی ہی کو گوارہ کیا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ ان کو امراء و سلاطین کے دباؤ میں فیصلے کرنے پڑتے تھے، جو دینی حمیت اور غیرت کے مغائر تھا، اما ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو جب خلیفہ منصور نے عہدہ قضا پیش کیا تو یہ کہہ کر اس ذمہ داری سے سبکدوشی اختیار کر لی تھی کہ "میں اس عہدہ کی صلاحیت نہیں رکھتا، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کچھ مصلحتوں سے عہدہ قضا کو قبول کیا تھا، انہیں عہدہ قضا کے انکار کرنے والوں میں امام محمد رحمہ اللہ، عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ اور امام زفر رحمہ اللہ بھی شامل تھے، امام محمد رحمہ اللہ اس بارے میں اس قدر سخت اور شدید واقع ہوئے تھے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے جب عہدہ قضا قبول کیا تو انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن بعد میں کچھ احوال ایسے پیش آئے کہ امام محمد رحمہ اللہ نے عہدہ قضا کو قبول کیا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے عہدہ قضا اس لئے قبول کیا تھا کہ اس منصب پر فائز ہو کر امام کے مستنبط کردہ مسائل کی ترویج و اشاعت کا کام کیا جائے، اس لئے ان کی خواہش تھی کہ امام محمد بھی اسی کا زکی تکمیل کے لئے عہدہ قضا قبول کر لیں، اتفاق سے اسی زمانہ میں "رقہ" میں قاضی کے تقرر کا مسئلہ درپیش ہوا اور اس سلسلہ میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے امام محمد رحمہ اللہ کے انتخاب کا مشورہ دیا، امام محمد رحمہ اللہ اس وقت کوفہ میں تھے، کوفہ سے بغداد بلائے گئے، چنانچہ وہ بغداد آئے اور پہلے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے پاس گئے اور ان سے اپنے انتخاب کی وجہ دریافت کی کہ کوفہ اور بصرہ میں تو ہمارے مسلک کی اشاعت اور ترویج ہو چکی ہے، اگر آپ شام میں چلے جائیں تو وہاں بھی اس کی ترویج کا ذریعہ پیدا ہو جائے گا، امام محمد رحمہ اللہ نے اس مصلحت کو اپنے انتخاب کے لئے پسند نہیں کیا اور کہا کہ: اس میں براہ راست مجھ سے گفتگو کرنی چاہئے تھی، اس گفتگو کے بعد امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ان سے یحییٰ برکی کے پاس چلنے کے لئے کہا، دونوں صاحب یحییٰ برکی کے پاس گئے، امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے یحییٰ سے کہا کہ: محمد بن حسن رحمہ اللہ سامنے موجود

ہیں، ان سے (عہدہ قضا کے) معاملات طے کر لیجئے، کیجی نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ عہدہ قضا قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ (۱)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے عہدہ قضا قبول تو کر لیا؛ لیکن یہ بات چونکہ ان کی طبیعت اور ضمیر کے خلاف تھی اور اس کا ذریعہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس میں اس قدر شدت اختیار کی کہ ان کے یہاں آمد و رفت بھی ترک کر دی، اور مشہور ہے کہ وفات کے بعد ان کے جنازہ میں شرکت بھی نہیں کی۔ (۲)

دوسری روایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہارون رشید نے خود ان کو اس عہدہ کے لئے منتخب کیا تھا، جب امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم ہوا تو وہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے اور اپنے گزشتہ تعلقات کو یاد دلا کر فرمایا کہ مجھے اس آزمائش میں نہ ڈالئے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ان کو لے کر تبحی کے پاس گئے، اس نے ان کو ہارون رشید کے پاس بھیج دیا اور اس طرح مجبور ہو کر انہیں یہ عہدہ قبول کر لینا پڑا۔ (۳)

بے لاگ فیصلہ اور عہدہ قضا سے برطرفی

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ عہدہ بادل ناخواستہ قبول کیا تھا، ان کی خواہش کو اس میں ذرہ برابر دخل نہ تھا، اس لئے وہ جب تک اس عہدہ پر فائز رہے بڑی دیانت داری سے بلا کسی رو و رعایت کے اس کے فرائض انجام دیتے رہے، انہوں نے کبھی اپنے فیصلہ میں خلیفہ وقت یا ارکان دولت کی پرواہ نہ کی، چنانچہ ان کے قاضی ہونے کے کچھ ہی روز بعد تبحی بن عبد اللہ کی امان کا قصہ دربار میں پیش ہوا، ہارون نقض عہد کر کے تبحی کو سزا دینا چاہتا تھا؛ لیکن اس ارادہ کی تکمیل کے لئے قضا کے فیصلہ کی ضرورت تھی، چنانچہ تمام قضا دربار میں بلائے گئے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے، ہارون نے سب سے پہلے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ: کیجی بن عبد اللہ کو جو امان دی جا چکی ہے وہ صحیح ہے

اور اس امان کا نقض اور کیجی کا قتل کسی طرح جائز نہیں ہے، ان کے بعد ہارون بن حسن بن زیاد سے مخاطب ہوا، انہوں نے کچھ صاف جواب نہ دیا، پھر اس نے ابو النضر بن وہب بن وہب سے دریافت کیا، انہوں نے ہارون کی مرضی کے مطابق جواب دیا، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ پر عتاب شاہی نازل ہوا اور وہ عہدہ قضا سے برطرف کر دیئے گئے اور انہیں افتاء سے بھی روک دیا گیا۔ ”وَمَنْعَهُ عَنِ الْفَتْوَى“ (۱)

قید و بند

غالباً اسی فتوے کے سلسلہ میں استاد کی سنت کے مطابق انہیں قید و بند کی مشقت اٹھانی پڑی، مناقب کردری میں محمد بن سلام (امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد) کا بیان ہے کہ:

”طَلِبَ مُحَمَّدٌ لِّلْقَضَاءِ فُحِّسَ وَوُكِّلَ بِهِ قَرِيبٌ حَتَّى لَا يَطْلُعَ أَحَدٌ وَلَا يَدْخُلُ عَلَيْهِ أَحَدٌ، وَضِيقٌ فِي السِّجْنِ الْفِقْهُ، فَرَشَوْتُ السُّجَانَ رِشْوَةً عَظِيمَةً وَدَخَلْتُ عَلَيْهِ بِكَيْسٍ مِنَ الدَّزَاهِمِ“ (۲)

امام محمد فیصلہ کے لئے بلائے گئے اور پھر قید کر دیئے گئے اور ان کو قید تنہائی دے دی گئی، گویا علم فقہ کے افادہ کو محبوس کر دیا گیا، میں نے دربان کو کچھ دے دلا کر ان کے پاس ایک تھیلی درہم لے کر پہنچا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں ام جعفر (ہارون کی بی بی) کو کوئی جانداد وقف کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے وقف نامہ لکھنے کی درخواست کی، انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ مجھے فتویٰ دینے سے روک دیا گیا ہے، ام جعفر نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے معاملہ (غالباً پابندی اٹھالینے کے بارے میں) ہارون سے گفتگو کی، ہارون نے انہیں فتویٰ کی اجازت دے دی اور پھر ان کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ قاضی القضاة کا عہدہ پیش کیا، (۳) جس پر وہ غالباً آخر وقت تک فائز رہے۔

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۱۶۵/۲، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۱۶۵/۲، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۳) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۱۶۵/۲، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۱۶۵/۲، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

(۲) تاریخ بغداد: امام ذہبی، ترجمہ امام محمد

(۳) مناقب الامام الاعظم للکردری: ۱۶۵/۲، طبع: دائرة المعارف النظامية بحیدرآباد ۱۳۲۱ھ

وفات

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قاضی القضاۃ ہونے کے کچھ ہی دن بعد ہارون کو کسی ضرورت سے ”رے“ جانا پڑا، امام محمد کو بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا، اسی مقام پر ۱۷۹ میں ۵۸ برس کی عمر میں امام فقہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اتفاق سے کسائی مشہور امام نجو بھی اس سفر میں ہارون کے ساتھ تھے، انہوں نے بھی اسی دن یا دو دن کے بعد انتقال کیا، ہارون کو ان دونوں ائمہ فن کے پے در پے انتقال کا بڑا رنج ہوا اور اس نے غایت افسوس میں کہا کہ: فقہ ونحو دونوں کو میں نے ”رے“ میں دفن کر دیا ”كَفَنْتُ الْيَوْمَ اللَّغَّةَ وَالْفِئَّةَ“ (۱) حیل طبرک جو رے کا مشہور قلعہ ہے اسی میں امام فقہ کو سپرد خاک کیا گیا۔

جرات و حق گوئی

آپ کے صحیفہ اخلاق کا ایک نمایاں باب جرات و حق گوئی بھی تھا، جب بھی حق بات کے اظہار کا موقع آ جاتا تو آپ اس میں کسی کی رو رعایت اور مد اہنت نہیں کرتے تھے، سچی طالبی کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہارون نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش کی کہ اس کی مرضی کے مطابق فتویٰ دے دیں؛ لیکن انہوں نے اس کے شاہانہ دبدبہ کی پرواہ کئے بغیر پوری جرات کے ساتھ حق کا اظہار کیا۔

ایک روز امام محمد رحمۃ اللہ علیہ دوسرے علماء کے ساتھ ہارون کے محل میں بیٹھے ہوئے تھے، اتفاق سے اس وقت ہارون رشید بھی آ گیا، تمام حاضرین اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے؛ لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی، تھوڑی دیر بعد ہارون نے امام محمد کو تخلیہ میں بلایا، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اندر گئے تو ہارون نے ان سے کہا: بنو تغلب (نصاری) کو نقض عہد کر کے میں قتل کرانا چاہتا ہوں، امام محمد نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں امن دے دی ہے، اس لئے نقض عہد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہارون نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو پتسمہ (عیسائی بنانا) نہ کریں؛ لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: انہوں نے پتسمہ کے

باوجود انہیں امان دی تھی، اس پر ہارون نے کہا کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان سے جنگ کا موقع نہیں مل سکا، امام محمد نے فرمایا: اگر ایسا ہے تو اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سے جنگ کرنی چاہئے تھی؛ حالاں کہ ان لوگوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بلا شرط صلح کی تھی، اس پر ہارون بہت خفا ہوا اور ان کو محل سے باہر نکلوایا، بعض روایتوں میں ہے کہ جب لا جواب ہو گیا تو اس نے پوچھا کہ: میرے آنے پر آپ میری تعظیم کے لئے کیوں کھڑے نہیں ہوتے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ یہ خدام کا کام ہے، علماء کے درجہ سے یہ چیز فروتر ہے، آپ کے ابن عم (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لئے باادب کی طرح کھڑے رہیں تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ (۱)

ایک مرتبہ ہارون رشید نے کسی شخص کے بارے میں امان لکھوائی، غالباً اس خیال سے دوسرے سے لکھوائی کہ ضرورت کے وقت اس سے انکار کی گنجائش نکل سکے، چنانچہ اس نے اس امان کے بارے میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے فتویٰ پوچھا کہ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے نہیں لکھا ہے، دوسرے سے لکھوایا ہے، تو کوئی شخص اگر قسم کھائے کہ وہ کوئی خط یا تحریر اپنے ہاتھ سے نہ لکھے گا؛ لیکن اگر دوسرے سے لکھوائے تو اس کی قسم ٹوٹے گی یا نہیں، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ذکاوت سے مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ لیا، فرمایا کہ وہ قسم کھانے والا شخص عوام میں ہے تو جب تک وہ نیت نہ کرے اس کی قسم نہ ٹوٹے گی؛ لیکن اگر بادشاہ ہے تو قسم ضرور ٹوٹ جائے گی، اس لئے کہ بادشاہ کے حکم سے جو چیز لکھی جائے گی وہ بادشاہ کی ہی ہوگی، اس پر ہارون رشید بہت برا فروختہ ہوا۔

انہیں تمام واقعات اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی حق گوئی اور بے باکی اور حق کی حمایت میں امراء اور سلاطین کی پرواہ بالکل نہ کرنے کی وجہ سے ہارون رشید کو یہ شبہ ہوا کہ ہمارے خلاف آئے دن جو طالبیوں کی سازش ہوا کرتی ہے، اس میں امام محمد کا ہاتھ ہے،

چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ان کی کتابوں کا جائزہ لیا جائے کہ ان میں اس قسم کے باغیانہ خیالات تو نہیں پائے جاتے، امام محمد کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے محمد بن سماعہ سے جو ان تمام واقعات میں ان کے ساتھ تھے، کہا کہ: فوراً گھر پر جا کر میری کتابوں کو محفوظ کرلو، ورنہ ہوسکتا ہے کہ ایسی کوئی چیز ان میں شامل کر دی جائے جو ان میں موجود نہ ہو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد جب ہارون کے سامنے یہ کتابیں پیش ہوئیں تو ان میں بجز حضرت علی ؓ کے فضائل کی حدیثوں کے اور کوئی چیز نہیں ملی، اس پر ہارون رشید نے کہا کہ: اس سے زیادہ تو ان کے فضائل ہمارے پاس موجود ہیں۔

(۱۲) سوار بن عبد اللہ

اپنے علم میں ممتاز، حق کے معاملہ میں جری اور کار قضا میں مضبوط کردار ادا کرنے والے ہیں، قاضی بھی رہے، امیر بھی، طبیعت میں غیر معمولی قناعت تھی، ان کے صاحبزادے عبد اللہ بن سوار نے ان سے پوچھا: ہم لوگ زیادہ دولت مند ہیں یا امیر المؤمنین؟ انہوں نے حکیمانہ جواب دیا: مال کے اعتبار سے امیر المؤمنین اور غناء نفس کے اعتبار سے ہم لوگ۔

عہدہ قضا اور اصلاحات

منصب قضا پر آتے ہی انہوں نے پوری شدت سے کام لیا، امین اور نائبین مختلف کاموں کے لئے مقرر کئے، ان کی تنخواہیں مقرر فرمائیں، اوقاف کا بندوبست اپنے ہاتھ میں لیا، مختلف اموال کے وصی اور نگرانوں کے کام کی نگہداشت کے لئے اپنی طرف سے عہدہ دار مقرر فرمائے، مقدمات اور متعلق کاموں کے لئے طویل فائلیں تیار کرائیں، اور ایسے اموال جن کے مالکوں کا پتہ نہیں ہوتا انہیں اپنی نگرانی میں لیا، ایسے مال کا نام ”حشریہ“ رکھا، مزاجاً بردبار تھے، خیر کی تلاش میں رہتے، غصہ بہت کم آتا، گفتگو میں بڑی حکمت تھی، مسائل کو سلجھانے اور مفاہمت کرانے کا خاص سلیقہ تھا۔ (۱)

☆ بصرہ میں ایک نہر تھی جسے ”نہر ابن عمر“ کہا جاتا تھا، خلیفہ منصور نے اسے بند کر دینا چاہا، حضرت سوار ایک وفد لے کر منصور کے دربار میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ: امیر المؤمنین! اگر آپ ایک لاکھ انسانوں کو پیاس سے مار دینا چاہتے ہیں تو نہر بند کر دیں، میں آپ کو اہل بصرہ سے ڈراتا ہوں، خلیفہ نے کہا: تم مجھے بصرہ والوں سے ڈراتے ہو، میں سپہ سالار کو بھیج کر ان کے آخری سے آخری آدمی کو ختم کر دوں گا، سوار نے کہا: حضرت! میرا وہ مقصد نہیں تھا جو آپ نے سمجھا، میں آپ کو یتیم کی بددعا سے، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں سے ڈراتا ہوں، خلیفہ منصور اپنے ارادہ سے باز آ گیا اور اسی وقت انہیں بصرہ کا قاضی مقرر کیا۔

☆ ایک دفعہ سوار ابو جعفر المنصور کے یہاں گئے اور اس کے دست بوسی کئے بغیر بیٹھ گئے، ابو جعفر کو چھینک آئی اس نے الحمد للہ نہیں کہا تو سوار نے بھی اس کا جواب نہیں دیا، پھر اس کو چھینک آئی تو اس نے الحمد للہ کہا تو سوار نے چھینک کا جواب دیا، پھر سوار وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور ابو جعفر ان کو تکتا رہ گیا ”فَأْتَبَعَهُ أَبُو جَعْفَرٌ بَصْرَةَ“ (۱)

☆ ایک دفعہ عقبہ بن سلم الہنائی بصرہ کے گورنر نے ایک شخص سے موتی لے لیا جس کو اس نے سمندر سے حاصل کیا تھا اور اس کو قید کر دیا، اس شخص کی بیوی سوار بن عبد اللہ کے پاس مقدمہ لے کر آئی، اس نے کہا: میں اللہ پر بھروسہ کرتی ہوں، پھر قاضی پر، امیر عقبہ بن مسلم نے میرے شوہر کو گرفتار کر لیا ہے اور اس کا موتی اس سے چھین لیا ہے، اور اسے جیل میں قید کر دیا ہے، چنانچہ سوار نے اس بات کی حقیقت جاننے کے لئے امیر کے پاس کارندہ بھیجا اور یہ کہلا بھیجا کہ اگر یہ بات درست ہے تو اس آدمی کو رہا کر دو اور اس کا موتی اس کے حوالے کر دو، عقبہ کو جب پیغام پہنچا تو اس نے اس کو ٹھکرا دیا، اور سوار کو بری بری گالیاں دیں، چنانچہ کارندے نے ساری تفصیلات سوار کو بتا دیں، تو سوار نے یہ کہلا بھیجا کہ اگر تم اس

آدمی کو رہانہ کرو گے اور اس کا موتی اس کے حوالہ نہ کرو گے تو میں خود تمہارے پاس سفید کپڑے زیب تن کر کے آؤں گا، اور تمہیں بغیر کسی ہتھیار اور فوج کے تباہ و تاراج کر دوں گا، اور تمہارا ایسا انجام کروں گا لوگ ایک مدت تک اس کا چرچا کریں گے، ”وَلَا قُتِلَتْكَ قِتْلَةً يَتَحَدَّثُ النَّاسُ بِهَا“ جب عقبہ کے مصاحبوں نے اس درشت کلام اور سخت لب و لہجہ کو سنا تو اس کو سمجھایا کہ قاضی کی بات مان لی جائے۔ (۱)

(۱۳) قاسم بن معن

نام قاسم، کنیت ابو عبد اللہ اور اسم گرامی معن تھا، مخزن علم کوفہ کو ان کی وطنیت کا شرف حاصل ہے، ان کے جد امجد حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شخصیت آسمان صحابیت کا وہ کوکب تاباں تھی جس پر پوری اسلامی تاریخ فخر کرتی ہے، وہ نہ صرف قرآن وحدیث اور اصول و فرائض وغیرہ میں یگانہ روزگار تھے؛ بلکہ فقہ میں ایک مستقل مکتب فکر کے بانی بھی تھے، جس کی اساس پر بعد میں فقہ حنفی کا فلک رفعت محل تعمیر ہوا، قاضی قاسم نے اپنی اس آبائی وراثت سے خوب وافر حصہ پایا تھا۔

فضل و کمال

علمی اعتبار سے ان کا مرتبہ اور مقام نہایت ہی بلند تھا، جملہ علوم و فنون پر انہیں کامل دسترس حاصل تھا، حدیث، فقہ، تاریخ و رجال، زبان و ادب میں ان کا عبور مسلم خیال کیا جاتا تھا، امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں۔ ”كَانَ مِنْ أَرْوَى النَّاسِ لِلْحَدِيثِ وَالشَّعْرِ وَأَعْلَمُهُم بِالْعَرَبِيَّةِ وَالْفِقْهِ“ (۲) وہ حدیث، فقہ اور عربیت کے بہت بڑے واقف کار تھے۔ ”كَانَ إِمَامًا عَلَامةً ثِقَةً قَاضِي الكُوفَةِ“ (۳)

ابن ناصر کہتے ہیں کہ وہ امام، علامہ، ثقہ اور کوفہ کے قاضی تھے۔ علامہ یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ:

”إِنَّ الْقَاسِمَ مِنَ الْمُحَدِّثِينَ وَالْفُقَهَاءِ وَالزُّهَادِ وَالثَّقَاتِ وَلَمْ يَكُنْ بِالكُوفَةِ فِي عَصْرِه نَظِيرُهُ وَلَا أَحَدٌ يُخَالِفُهُ فِي شَيْءٍ يَقُولُهُ“ (۱)

”بلاشبہ قاسم بن معن محدثین، فقہائے، زہاد اور ثقات کے زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں، اور کوفہ میں اس زمانے میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی اور نہ ان کے قول کی مخالفت کرنے والا کوئی شخص تھا۔“

اگر قاضی قاسم اپنی تبحر علمی اور فضل و کمال کی وجہ سے امامت اور اجتہاد کے درجہ پر فائز تھے؛ لیکن چوں کہ انہوں نے ایک عرصہ تک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہم نشینی کا شرف حاصل کیا تھا اور وہ ان کی علمی ژرف بینی اور نکتہ رسی سے بے حد متاثر تھے، اس لئے بیشتر امور میں ان ہی کے مسلک کے پیرو تھے، اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے، ”كَانَ فَقِيهًا فِي رَأْيِ أَبِي حَنِيفَةَ وَلَقِيَهُ“ (۲) ایک مرتبہ ان سے کسی نے دریافت کیا کہ: آپ خود کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے غلاموں میں شمار کرنا پسند کریں گے، برجستہ فرمایا:

”مَا جَلَسَ النَّاسُ إِلَى أَحَدٍ أَنْفَعُ مِنْ مَجَالِسَةِ أَبِي حَنِيفَةَ“ (۳)

”امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے زیادہ نفع بخش کسی اور کی مجلس نہیں“

عہدہ قضا

فقہ و افتاء میں غیر معمولی مہارت کے باعث کوفہ کے عہدہ قضا پر بھی ایک طویل عرصہ تک مامور رہے، ان کے جد امجد حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی کامل دس سال

(۱) معجم الأدباء: القاسم بن معن المسعودی: ۵/۲۲۳۲، دار الغرب الإسلامي، بیروت

(۲) معجم الأدباء: القاسم بن معن المسعودی: ۵/۲۲۳۲، دار الغرب الإسلامي، بیروت

(۳) اخبار القضاة، القاسم بن معن: ۱۶۷/۳

(۱) اخبار القضاة: سوار بن عبد اللہ بن قدامة: ۵۷/۲

(۲) تذكرة الحفاظ: الطبقة الخامسة من الكتاب: ۱/۵۷، دار الكتب العلمية، بیروت

(۳) شذرات الذهب: ۱/۲۷۹، دار الكتب العلمية، بیروت

تک کوفہ کے قاضی اور افسر خزانہ رہ چکے تھے، جب قاضی شریک نخعی کی معزولی کے بعد یہ آبائی وراثت قاسم کے ہاتھوں میں آئی تو انہوں نے اس فرض کو ایسی شان و شوکت اور احتیاط و انصاف کے ساتھ انجام دیا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے دور کی یاد تازہ ہو گئی۔

خلیفہ منصور کے زمانہ میں اس عہدہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور پھر ہارون الرشید کے عہد تک برابر اس پر مامور رہے۔

ایشار و تبرع

استغناء اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ اپنے طویل زمانہ قضاء میں کبھی مشاہرہ اور اجرت لینا پسند نہ کیا اور تاحیات تبرعاً یہ خدمت انجام دی، علامہ ابن سعد رقم طراز ہیں:

”وَلَيْ قَضَاءُ الْكُوفَةِ وَلَمْ يَرْزُقْ عَلَيْهِ شَيْئًا حَتَّى مَاتَ“ (۱)

”وہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے اور زندگی بھر اس کا مشاہرہ نہیں لیا“

جب ان کی خدمت میں تنخواہ پیش کی جاتی تو اس کو فوراً مستحقین میں تقسیم کر دیتے اور اس میں سے ایک حبة اپنے استعمال میں نہ لاتے۔

یزید بن تگبی کہتے ہیں:

”كَانَ الْقَاسِمُ يُقَسِّمُ أَرْزَاقَهُ إِذَا جَاءَتْهُ وَلَا يَسْتَحِلُّ أَنْ يَأْخُذَ رِزْقًا“ (۲)

”امام قاسم کے پاس جب تنخواہ آتی تو اس کو تقسیم کر دیتے تھے اور کوئی

مشاہرہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے“

حالت مرض میں فریضہ قضاء کی ادائیگی

اس تبرع و بے نیازی کے باوجود منصب قضاء کی منصبی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں سرمو کوتاہی نہ کرتے؛ یہاں تک کہ شدید علالت و نقاہت کی حالت میں بھی مجلس عدالت منعقد کرتے اور پوری حاضر دماغی کے ساتھ عدالتی فیصلے نافذ کرتے، ابن کناسہ بیان

(۱) معجم الأدباء: القاسم بن معن المسعودی: ۲۲۳۱/۵

(۲) أخبار القضاة: القاسم بن معن: ۱۷۷/۳

کرتے ہیں کہ: قاسم سخت بیماری کے عالم میں بھی عدالت میں بیٹھے تھے ”كَانَ يَحْكُمُ الْحُكْمَ وَهُوَ عَلِيلٌ“ (۱)

شرافت و نجابت

فطری شرافت، نرم خوئی اور بلند ظرفی ان کی شخصیت کے خاص جوہر تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اس واقعہ کا نقل کر دینا کافی ہے:

ایک شخص نے اپنے مکان کی چھبہ اتنا نیچا لگوا رکھا تھا کہ اس سے راہ گروں کو دقت پیش آتی تھی، لوگوں نے اس معاملہ کو قاضی قاسم کی بارگاہِ عدل و انصاف میں پیش کیا، قاضی موصوف نے اس کے انہدام کا فیصلہ صادر کیا، اس پر مالک مکان نے بغیر کسی رو و رعایت کے قاضی سے کہا کہ: ”پھر آپ نے کیوں اپنے مکان میں سر راہ روزن کھلوا رکھے ہیں؟ فرمایا: اس سے کسی راگیر کو زحمت نہیں ہوتی اور نہ سوار یوں کی آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے“ اس کے بعد فوراً اپنے بعض خدام کو حکم دیا کہ وہ جا کر پہلے ان کے مکان کے روزن بند کر دیں اور پھر بعد میں اس شخص کے چھبہ کو منہدم کریں؛ تاکہ پھر آئندہ کوئی شخص اس معاملہ میں انہیں شرمندہ نہ کر سکے۔ ”فَأَهْدِمُ فِي مَنْزِلِي أَوَّلًا، ثُمَّ أَهْدِمُ فِي مَنْزِلِهِ“ (۲)

خلیفہ کے نزدیک قدر و منزلت

ان کے علم و فضل اور ایشا و قربانی سے خلیفہ ہارون رشید بے حد متاثر تھا، بعض مفسد قاضی قاسم کے خلاف برابر ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے اور خلیفہ کو ان کے خلاف برا بیچتے کرنے کی کوشش کرتے؛ لیکن وہ کسی بات پر کان نہ دھرتا۔

ایک مرتبہ ہارون ”حیرہ“ گیا اور چالیس دن تک وہاں مقیم رہا؛ لیکن قاضی قاسم بن معن اس سے ملنے نہ آئے، اس پر وزیر فضل نے خلیفہ سے کہا کہ: حضور آپ چالیس دن سے یہاں آئے ہوئے ہیں، اس عرصہ میں تمام شرفاء اور قضاة آپ کے دربار میں

(۱) أخبار القضاة: القاسم بن معن: ۱۷۸/۳

(۲) أخبار القضاة: القاسم بن معن: ۱۷۷/۳

حاضر ہوئے، مگر آپ نے خیال نہ فرمایا کہ قاسم بن معن ابھی تک نہیں آئے، یہ سن کر خلیفہ نے نہایت ترش لب و لہجہ میں جواب دیا۔

”مَا أَعْرِفُنِي أُمَّي شَيْءٍ تُرِيدُ، تُرِيدُ أَنْ أَعْرِزَ لَهُ، (وَاللَّهِ لَا أَعْرِزُ لَهُ) (۱)
”مجھے معلوم نہیں کہ تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں قاسم کو معزول کر دوں، نہیں بخدا میں ایسا نہیں کر سکتا“

وفات

۱۷۵ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کے ہمراہ مقام رقعہ کی طرف روانہ ہوئے، درمیان میں مقام راس العین میں پہنچ کر پیغام اجل آگیا اور محبوب حقیقی سے جا ملے، احمد بن کامل نے ان کا سنہ وفات ۱۸۸ھ بتلایا ہے؛ لیکن بقول مرزبانی اول الذکر ہی صحیح ہے۔ (۲)
خواجہ غلام الثقلین۔ وکیل (م ۳/۹/۱۹۱۵ء):

وہ وکالت کرتے تھے؛ لیکن ایک آزاد منش مزدور کی طرح، اگر مہینے کے پہلے چند روز میں ماہوار خرچ کے لائق فیس مل جاتی تو وہ باقی سارا وقت اپنے قومی اور علمی کاموں میں لگا دیتے، عدالت میں دکان لگا کر نہ بیٹھتے، بارہا ایسا ہوا کہ ان کے پاس گاؤں سے مقدمہ والے آتے اور انہیں وکیل کرنا چاہتے؛ لیکن اکثر وہ ان فریقوں کو بلا لیتے، انہیں مقدمہ بازی کے خطروں سے آگاہ کرتے اور ان کا اعتماد حاصل کر کے خود ہی بغیر ایک پیسہ لئے جھگڑے کا فیصلہ کر دیتے۔ (خواجہ غلام السید الدین)

علی گڑھ کالج میں ان سے پہلے اور غالباً ان کے بعد بھی، کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا اور معلومات اتنی وسیع ہو اور جو کام کرنے میں ایسا انتھک ہو۔ (مولوی عبدالحق)

علمی لحاظ سے ہمارے طلبہ میں کوئی طالب علم غلام الثقلین جیسا نہیں ہوا۔ (کالج پرنسپل، سر تھیوڈور بک)

(۱) اخبار القضاة: القاسم بن معن: ۱۸۰/۳

(۲) معجم البلدان: ۲۰۰/۶

کالج کے زمانے سے ان کا معمول تھا کہ تقریباً ہر روز یا انگریزی یا فارسی کی ایک کتاب ختم کر دیتے تھے اور اس شغف میں اکثر کھانا بھول جاتے تھے (خواجہ غلام السید الدین)

ان کا انتقال، قرآن سنتے ہوئے ہوا۔ (۱)



(۱) سب کے لئے، مولف ابن غوری: ۹۳

مسلمان حکمرانوں اور قضاۃ کے دیگر عدل گستری اور صدق و امانت کے واقعات

☆ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور خالد بن زید جہنی روایت کرتے ہیں دونوں نے بیان کیا کہ: ایک اعرابی آیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دیجئے، اس کا فریق مخالف کھڑا ہوا اور عرض کیا: ٹھیک ہے ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دیجئے، اعرابی نے کہا کہ: میرا بیٹا اس کے یہاں مزدور تھا، اس نے اس کی بیوی سے زنا کیا، لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تیرے بیٹے کو سنگسار ہونا چاہئے، میں نے اپنے بیٹے کو سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر چھڑا لیا، پھر میں نے علم والوں سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا تیرے بیٹے کو ایک سو کوڑے لگنے چاہئیں اور ایک سال کے لیے جلا وطن ہونا چاہئے، نبی ﷺ نے فرمایا: تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دوں گا، لونڈی اور بکریاں تو تجھے واپس کی جاتی ہیں اور تیرے بیٹے کو ایک سو کوڑے پڑیں گے اور ایک سال کے لیے جلا وطن ہوگا اور ایک آدمی سے آپ ﷺ نے فرمایا: اے انیس کل تو اس شخص کی بیوی کے پاس جا اگر (وہ زنا کا اقرار کرے تو) اس کو سنگسار کر دے ﴿فَإِنْ اعْتَرَفْتَ فَأَرْجُمْهَا﴾ چنانچہ انیس نے صبح کے وقت جا کر اس کو سنگسار کر دیا۔ (۱)

☆ قاضی امیر حکم کی شہادت کو رد کرتا ہے

سعید بن عبد الرحمن الداخل نے قاضی ابن بشیر کی خدمت میں ایک مقدمہ میں

اپنی طرف سے ایک آدمی کو نائب بنا کر بھیجا، دراصل سعید بن عبد الرحمن کے قبضہ میں ایک تحریر تھی، جس میں چند صاحب اثر لوگوں کے دستخط تھے، دستخط کنندگان میں سے سارے لوگوں کی وفات ہو چکی تھی، صرف امیر المؤمنین حکم اور ایک آدمی زندہ تھا، یہ دوسرا آدمی سعید بن عبد الرحمن کے حق میں لکھی گئی تحریر کی گواہی تو دیتا تھا، مگر کچھ دنوں بعد اس کی بھی موت واقع ہو گئی، ادھر تحریر سے متعلقہ مقدمہ وقت کے ساتھ ساتھ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن سعید بن عبد الرحمن یہ نوشتہ دیوار لے کر امیر حکم کے پاس گیا اور اس کے عہدہ امیر کے دستخط دکھائے جو اس نے اپنی خلافت سے پہلے اپنے باپ کے عہد حکومت میں کئے تھے، سعید بن عبد الرحمن نے امیر کو یہ نوشتہ دیوار بطور یاد دہانی دکھلایا، تاکہ قاضی کے پاس جب نوشتہ دیوار جائے تو وہ اسے نافذ کرے اور اس کو باطل قرار دینے سے گریز کرے۔

امیر حکم اپنے چچا سعید بن عبد الرحمن سے کہا کہ: چچا جان! ہم اب شہادت کے دینے کے قابل نہ رہے، ہم دنیوی چاہت میں جس طرح ٹوٹ پڑے ہیں اس سے آپ بخوبی واقف ہیں، اس لئے ہماری شہادت قبول نہ کی جائے گی، اس لئے مجھے رسوا نہ کیجئے، سعید بن عبد الرحمن نے حکم کی تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سبحان اللہ! بھلا قاضی کی کیا مجال کہ وہ آپ کے حکم کو رد کر دے، الغرض حکم نے چچا کا اصرار دیکھ کر قاضی کے سامنے شہادت دینے کا وعدہ کر لیا، چنانچہ اس نے مشہور زمانہ دو فقیہوں کو بلایا، ایک کاغذ پر اپنی شہادت کا مضمون قلم بند کیا اور اس پر مہر لگا کر فقیہوں کو دے دیا، پھر گویا ہوا، آپ دونوں میرا یہ نوشتہ لے کر قاضی کی خدمت میں جائیں، دونوں فقیہ حکم کی تعمیل میں قاضی کی عدالت میں اس وقت پہنچے، جب وہ عدالت کی کرسی پر گواہوں کے بیانات سننے کے لئے جلوہ افروز ہوا، جب انہوں نے خلیفہ کا خط قاضی کے ہاتھ میں دیا تو اس نے خط کا مضمون پڑھا اور پھر فقیہوں کی بات سن کر گویا ہوا۔

میں نے آپ دونوں کا مقصد سن لیا، اب آپ لوگ بخیر و عافیت اللہ کی حفظ و امان

میں واپس جاسکتے ہیں۔

اتنے میں سعید بن عبد الرحمن کا نائب حاضر ہوا اور پورے اعتماد کے ساتھ قاضی سے یوں مخاطب ہوا: آپ کے پاس امیر کی شہادت بھی پہنچ چکی ہے، اب اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟ قاضی نے نائب سے وہ نوشتہ دیوار لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کہا: ”میرے نزدیک یہ شہادت قابل قبول نہیں، میرے پاس کوئی عادل شاہد لے کر آؤ“ یہ فیصلہ سنتے ہی نائب گھبرا سا گیا اور جلدی سے سعید بن عبد الرحمن کی خدمت میں پہنچا اور حقیقت حال سے آگاہ کیا، جب سعید بن عبد الرحمن کے کانوں سے قاضی کا فیصلہ سنا تو گویا کہ اس کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی، فوراً سواری پر بیٹھا اور امیر حکم کی خدمت میں پہنچ کر یہ واویلا کرنے لگا۔

”ہماری سلطنت چلی گئی، ہمارا رعب و دبدبہ زائل ہو گیا، اس قاضی کی یہ مجال کہ آپ کی شہادت کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دے“ سعید نے امیر کو مزید اکساتے ہوئے کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکومت سونپی ہے اور اپنے بندوں کے امیر کے طور پر منتخب فرمایا ہے اور مسلمانوں کے جان و مال کا نگہبان بنایا ہے، یہ قاضی اس لائق نہیں ہے کہ اسے آپ یہ اہم منصب سونپیں۔ سعید کا طویل کلام سن کر امیر گویا ہوا: ”چچا جان! کیا میں نے اس قضیے میں کسی شک کا اظہار کیا ہے؟ قاضی ایک نیک و صالح آدمی ہے، اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اس کو حق بات سے نہیں پھیر سکتی، جو اس پر واجب تھا اس نے کیا، اور وہ چور دروازہ بند کر دیا جس سے بمشکل داخل ہوا جاسکتا تھا، اللہ تعالیٰ قاضی کو جزائے خیر دے، یہ سن کر سعید کو غصہ آ گیا اور وہ کہنے لگا: میرے حق میں آپ کی طرف سے یہی کچھ کہنے کو رہ گیا ہے۔

امیر نے جواب دیا: ”نَعَمْ قَدْ قَضَيْتُ الَّذِي كَانَ لَكَ عَلَيَّ وَلَكِنَّ وَاللَّهِ! أَعَارِضُ الْقَاضِيَّ قِيَمًا احْتِاطًا لِنَفْسِهِ وَلَا أَخُونُ الْمُسْلِمِينَ فِي قَبْضِ يَدٍ مِّثْلِهِ“ ہاں میرے اوپر آپ کا حق بتا تھا اسے میں نے پورا کر دیا اور اللہ کی قسم! قاضی نے اپنے آپ کو جس احتیاط سے محفوظ رکھا ہے، میں اس کے بارے میں اس کے آڑے نہیں آؤں گا اور نہ اس قسم کے (خود دار اور اچھے) لوگوں کو (حق بات سے)

روک کر مسلمانوں کے حق میں خیانت کا مرتکب ہوں گا“۔ (۱)

☆ گورنر کے سامنے اس کا بیٹا کوڑے کھاتا ہے:

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مصر کے حاکم تھے، مصر کا ایک آدمی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

اے امیر المؤمنین! میں ظلم سے آپ کی پناہ لینے آیا ہوں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: تم نے ایسے آدمی کی پناہ حاصل کی ہے جو تمہیں پناہ دے سکتا ہے، مصری بولا: میں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کیا، میں اس سے آگے بڑھ گیا تو وہ مجھے کوڑے سے مارنے لگا اور کہنے لگا: میں شریف خاندان کا بیٹا ہوں، یہ شکوہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصر کے حاکم حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ تشریف لائیں، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے کے ساتھ امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے پوچھا: مصری کہاں ہے؟ وہ سامنے آیا اور کہنے لگا: یہ کوڑا لے اور مار، امیر المؤمنین کا حکم ملتے ہی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے پر کوڑا برسائے لگا اور امیر المؤمنین کہتے جا رہے تھے، شریف خاندان کے بیٹے کو مارو، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: مصری نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو کوڑے لگائے اور اللہ کی قسم! بہت مارا اور ہم اس کی پٹائی چاہتے بھی تھے؛ لیکن مصری برابر مارے جا رہا تھا، حتیٰ کہ ہماری خواہش ہوئی کہ اب اس کی پٹائی بند ہو جائے، پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مصری سے فرمایا: کوڑا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی چندیا (گنجے سر) پر بھی لگاؤ“ مصری نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان کے بیٹے نے میری پٹائی کی ہے اور میں اس سے قصاص لے لیا، پھر امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عمرو رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

”تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا رکھا ہے جب کہ ان کی ماؤں نے

انہیں آزاد جنا تھا“ (مَذْكُورٌ تَعْبُدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدْتُمُھُمْ
أُمَّھَا تُھُمْ أَحْرَارًا)۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”یا امیر
المؤمنین! لم أعلم ولم یأتنی“ اے امیر المؤمنین! مجھے اس
معاملے کی کچھ خبر بھی نہیں اور نہ یہ میرے پاس شکایت لے کر آیا تھا“ (۱)

☆ مجھ سے اپنا بدلہ لے لو

احنف بن قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: ہم چند لوگ ایک عظیم الشان خوشخبری
سنانے کے لئے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو
انہوں نے دریافت کیا، آپ لوگوں نے کوئی جگہ قیام فرمایا؟ ہم نے عرض کیا: فلاں جگہ،
امیر المؤمنین ہمارے ساتھ ہمارے پڑاؤ کی طرف چلنے لگے جہاں ہم نے اونٹوں کو بھی
باندھ رکھا تھا اور اونٹوں کی حالت یہ تھی کہ مسلسل بھوک کی شدت سے وہ کمزور ہو چکے تھے
اور کئی دنوں کے سفر نے انہیں تھکا دیا تھا، اونٹوں کی حالت زار دیکھتے ہی امیر المؤمنین
گویا ہوئے: کیا تمہیں سوار یوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر نہیں لگتا، کیا تمہیں اس
بات کی خبر نہیں کہ ان چوپایوں کے بھی تمہارے اوپر حقوق ہیں؟ تم نے ان اونٹوں کو
راستے میں کچھ آرام کے لئے کیوں نہ چھوڑ دیا، تاکہ یہ زمین کی نباتات کھا لیتے؟

ہم نے عرض کیا: امیر المؤمنین! عظیم فتح و کامرانی کی خوشخبری لے کر ہم تیزی کے
ساتھ بھاگتے دوڑتے آپ کی خدمت میں چلے آئے ہیں، تاکہ آپ اور دیگر مسلمانوں
کو اس خوشخبری سے خوشی ہو اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو، یہی وجہ ہے کہ ہم لوگوں نے راستے میں
اپنی سوار یوں کو روکنا گوارا نہیں کیا، امیر المؤمنین ہماری باتیں سن کر لوٹ گئے اور ہم بھی
ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے، اسی دوران میں ایک آدمی شکایت لے کر حاضر ہو گیا
اور کہنے لگا! امیر المؤمنین! فلاں شخص نے مجھ پر ناحق ظلم و زیادتی کی ہے، آپ اس کے
خلاف میری مدد کریں۔

امیر المؤمنین نے اپنا کوڑا بلند کیا اور اس کے سر پر دے مارا فرمانے لگے:

”تَدْعُونَ عُمَرَ، حَتَّى إِذَا شَغَلَ فِي أُمُورِ الْمُسْلِمِينَ أَتَيْتُمُوهُ وَقُلْتُمْ:
أَغْشَيْنِي، أَغْشَيْنِي“ عجب تماشا ہے کہ تم لوگ (خالی اوقات میں) عمر کے سامنے اپنا قضیہ
پیش نہیں کرتے ہو، مگر جب عمر مسلمانوں کے اہم معاملات کو سلجھانے میں مصروف ہو جاتا
ہے تو پھر تم آکر کہنے لگتے ہو کہ میری مدد کرو، میری مدد کرو۔

چنانچہ وہ آدمی خود کو ملامت کرتے ہوئے واپس ہو گیا، امیر المؤمنین نے فوراً ہی
اس آدمی کو واپس بلانے کا حکم دیا، جب وہ واپس آیا تو آپ نے اپنا کوڑا اس آدمی کے
آگے ڈال دیا اور کہنے لگے: ”اقتص“ مجھ سے بدلہ لے لو، وہ کہنے لگا: نہیں، میں بدلہ
نہیں لوں گا؛ بلکہ میں اسے اللہ کے لئے اور آپ کے لئے چھوڑتا ہوں، امیر المؤمنین نے
فرمایا: ایسا نہیں ہوگا، یا تو تم اللہ کے لئے درگزر کرو اور اس کا بدلہ اسی سے مانگو، بصورت
دیگر مجھ پر چھوڑ دو (پھر ایسی صورت میں تمہیں مجھ سے قصاص لینا پڑے گا) وہ کہنے لگا:
نہیں نہیں، میں اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے معاف کرتا ہوں، اس کے بعد امیر
المؤمنین وہاں سے چل پڑے اور گھر پہنچے، ہم لوگ بھی آپ کے ہمراہ تھے، آپ نے دو
رکعت نماز ادا فرمائی اور خود کو مخاطب کر کے کہنے لگے:

”ابن الخطاب! تو ایک خاکسار و متواضع آدمی تھا تو اللہ تعالیٰ نے تجھے
اعلیٰ مقام و مرتبے سے نوازا، تو گم گشتہ راہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے تجھے ہدایت
کی روشنی سے آشنا کیا، تو ایک ذلیل انسان تھا تو اللہ تعالیٰ نے تجھے عزت
و اکرام بخشا اور پھر لوگوں پر حکمراں بنایا، مگر جب ایک آدمی اپنے اوپر ظلم
کرنے والے کے خلاف تجھ سے تعاون طلب کرنے کے لئے حاضر ہوا
تو تو نے اس کی پٹائی کر دی، ذرا بتا کہ کل قیامت کے روز تو اپنے
پروردگار کو کیا جواب دے گا؟“ احنف بن قیس کا بیان ہے: امیر
المؤمنین نے یہ کہہ کر اپنے اوپر اس طرح ملامت کی کہ مجھے یقین ہو گیا
کہ آپ پوری دنیا والوں میں اس وقت سب سے بہتر ہیں“ (۱)

☆ مظلوم کی بددعا سے بچو

جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اہل کوفہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے سعد رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تو عمر رضی اللہ عنہ نے سعد کو معزول کر دیا، اور عمار رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کا حاکم بنایا ان لوگوں نے (سعد رضی اللہ عنہ کی بہت سی) شکایتیں کیں، یہاں تک کہ بیان کیا کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، تو عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بلا بھیجا اور کہا: کہ اے ابواسحاق! یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، انہوں نے کہا سنو! اللہ کی قسم! ان کے ساتھ میں نے ویسی نماز ادا کی ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہوتی تھی، چنانچہ پہلی دو رکعتوں میں زیادہ دیر لگاتا تھا اور اخیر کی دو رکعت میں تخفیف کرتا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اے ابواسحاق! تم سے یہی امید تھی، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص یا چند شخصوں کو سعد رضی اللہ عنہ کے ہمراہ کوفہ بھیجا، تاکہ وہ کوفہ والوں سے سعد رضی اللہ عنہ کی بابت پوچھیں (چنانچہ وہ گئے) اور انہوں نے کوئی مسجد نہیں چھوڑی کہ جس میں سعد رضی اللہ عنہ کی کیفیت نہ پوچھی ہو اور سب لوگ ان کی عمدہ تعریف کرتے رہے یہاں تک کہ بنی عباس کی مسجد میں گئے تو ان میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا، اس کو اسامہ بن قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے کینیت اس کی ابوسعہ تھی اس نے کہا کہ سنو! جب تم نے ہمیں قسم دلائی تو مجبور ہو کر میں کہتا ہوں کہ سعد رضی اللہ عنہ لشکر کے ہمراہ جہاد کو خود نہ جاتے تھے اور غنیمت کی تقسیم برابر نہ کرتے تھے سعد (یہ سن کر) کہنے لگے کہ دیکھ میں تین بددعائیں تجھ کو دیتا ہوں اے اللہ! اگر یہ تیر بندہ جھوٹا ہو نمود و نمائش کے لئے اس وقت کھڑا ہوا ہو تو اس کی عمر بڑھا دے اور اس کو فقر میں مبتلا کر، اور اس کو فتنوں میں مبتلا کر دے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس کے بعد جب اس سے (اس کا حال) پوچھا جاتا تھا تو کہتا ایک بڑی عمر والا بوڑھا ہوں، فتنوں میں مبتلا مجھے سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی۔ عبدالملک (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے اس کو دیکھا ہے، اس کی دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر بڑھاپے کے سبب سے جھک پڑی ہیں، وہ راستوں میں لڑکیوں کو چھیڑتا ہے، ان پر دست درازی کرتا ہے "فَأَكَارَ أَيُّتُهُ بَعْدُ قَدْ سَقَطَ حَاجِبَاهُ عَلَى عَيْنَيْهِ مِنَ الْكِبَرِ وَأَنَّهُ لَيَتَعَرَّضُ لِلْجَوَارِحِ فِي الطَّرِيقِ يَغْمِزُهُنَّ" (۱)



ہرمزان ایرانیوں کے ایک لشکر کا سردار تھا، ایک مرتبہ مغلوب ہو کر اس نے جزیہ دینا بھی قبول کیا تھا؛ مگر پھر باغی ہو کر مقابلے پر آیا، آخر شکست ہوئی اور گرفتار ہوا اس حالت میں امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ تاجر صرغ سر پر تھا، دیباچ کی قبازیب تن کئے ہوئے تھا، کمر سے صرغ تلوار آویزاں تھی اور بیش بہا زیورات سے آراستہ تھا، امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اس وقت مسجد نبوی میں تن تنہا سوئے ہوئے تھے، آپ نے اپنی پگڑی کو تکیہ بنا لیا تھا، ہاتھ میں کوڑا تھا۔

ہرمزان بحیثیت قیدی امیر المؤمنین کی خدمت میں لایا گیا تھا، آہستہ آہستہ لوگوں کا ازدحام ہوتا گیا، لوگوں میں کاننا پھوسی سے امیر المؤمنین کی آنکھیں کھل گئیں، دیکھتے ہوئے گویا ہوئے، یہ ہرمزان ہے، لوگوں نے بتایا ہاں، ہرمزان کو لانے والے وفد نے کہا: امیر المؤمنین! یہ اہواز کا حاکم ہے، آپ اس سے تبادلہ خیال کریں، امیر المؤمنین نے فرمایا: جب تک یہ اپنے اس لباس میں رہے گا، میں اس سے تبادلہ خیال نہیں کر سکتا، چنانچہ ہرمزان نے اپنے جسم سے زرق و برق لباس اتارا اور معمولی لباس میں آ گیا، امیر المؤمنین نے پوچھا: ”بار بار تیری بدعہدی کا تیرے پاس کیا عذر ہے“ ہرمزان گویا ہوا: مجھے خوف ہے کہ کہیں آپ میری معذرت سننے بغیر مجھے قتل کر دیں، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ڈرو مت، تمہاری معذرت ضرور سنی جائے گی، پھر ہرمزان نے پانی مانگا، پانی آیا تو اس نے پیالہ ہاتھ میں لے کر کہا: میں ڈرتا ہوں کہیں آپ مجھے پانی پینے کی حالت میں ہی قتل نہ کر دیں۔

امیر المؤمنین نے فرمایا: تم خوف نہ کھاؤ، جب تک پانی نہ پی لو گے، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا، ہرمزان نے یہ سنتے ہی پیالہ ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اس کا پانی گرا دیا اور کہا: اس شرط کے مطابق اب آپ مجھے قتل نہیں کر سکتے؛ کیوں کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کی اس چالاکی اور فریب دہی پر بہت غصہ آیا؛ لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ درمیان میں بول اٹھے اور کہا: امیر المؤمنین! یہ سچ کہتا ہے؛ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہرمزان تو نے مجھے

دھوکا دیا؛ لیکن میں تجھے دھوکا نہ دوں گا، اسلام نے اس کی تعلیم نہیں دی، ایفائے عہد اور حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہرمزان مسلمان ہو گیا، امیر المؤمنین نے دو ہزار سالانہ اس کی تنخواہ مقرر کر دی اور وہ مدینہ منورہ میں رہنے لگا۔ (۱)

☆ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ میں مظلوم کی قدر:

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ حمص کے بازار میں گھوم رہے تھے، اتنے میں ایک آدمی ان کے پاس آیا جو دھاری دار چادر زیب تن کئے ہوئے تھا، اس نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! آپ کا حکم ہے کہ جو کوئی مظلوم ہو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو؟ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہاں، وہ شخص بولا: پھر آپ کی خدمت میں دو دراز کے علاقے سے چل کر ایک مظلوم حاضر ہوا ہے، عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: تیرا خاندان کہاں ہے؟ وہ بولا: ابین (یمین کا صوبہ) سے بھی دور۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! تیرا خاندان عمر کے خاندان سے بہت دور ہے، یہ کہہ کر اپنی سواری سے فوراً اتر گئے اور پوچھا: تیرے اوپر کیسا ظلم ڈھایا گیا ہے؟ پر دیسی نے کہا: میری غلہ اگانے والی زمین پر ایک آدمی نے ناجائز قبضہ جمالیا ہے اور مجھے اس سے یکسر بے دخل کر دیا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا قضیہ سن کر عمرو بن محمد کو لکھا کہ وہ اس مظلوم کی داستان اور شہادت سننے اور جب اس کا حق ثابت ہو جائے تو اسے واپس دلا دے، یہ خط لکھ کر اپنی مہر لگا دی، جب پر دیسی نے واپسی کے لئے اٹھنا چاہا تو عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے کہا: ٹھہر جاؤ، تم دو دراز علاقے سے حاضر ہوئے ہو، راستے میں تمہارا کتنا زاد سفر خرچ ہوا ہے، یا سواری پر تمہاری کتنی لاگت آئی ہے اور کتنے کپڑے بدلنے پڑے ہیں؟ ان سب کا حساب لگایا گیا تو لاگت پندرہ دینار پہنچی، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اسے یہ رقم دے کر روانہ کیا۔ (۲)

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا مدعی کے ساتھ حسن برتاؤ

☆ ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ حمص کے بازاروں میں تاجروں کا جائزہ

لینے اور بھاؤ معلوم کرنے کے لئے گھوم رہے تھے کہ اچانک ایک آدمی ان کے پاس آکھڑا ہوا، اس نے قطر کی بنی ہوئی دھاری دار چادریں اپنے اوپر ڈال رکھی تھیں، اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! میں نے سنا ہے کہ آپ نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ جو کوئی مظلوم ہو وہ دادرسی کے لئے آپ کے پاس آئے۔

عمر بن عبدالعزیز نے کہا: ہاں میں نے کہہ رکھا ہے۔

آدمی: تو یہ آدمی (خود) مظلوم ہے دو دراز سے چل کر آیا ہے۔

عمر: آپ کے اہل خانہ کہاں ہیں؟

آدمی: عدن میں۔

عمر: اللہ کی قسم آپ کا گھر تو عمر کے گھر سے دور ہے، پھر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اپنی سواری سے اترے اور اس آدمی کے سامنے کھڑے ہو گئے، پوچھنے لگے: تم پر کیا ظلم ہوا ہے؟

آدمی: آپ تک رسائی رکھنے والا ایک آدمی میری زمین سلب کر لیا ہے اور اس کا مالک

بن بیٹھا ہے، عمر بن عبدالعزیز نے اسی وقت عدن کے گورنر عمرو بن محمد کو خط لکھا:

:جیسے ہی آپ کے پاس میرا خط پہنچے اس کے حامل کے مقدمہ کی گواہی طلب

کر، اگر یہ حق پر ہے تو اس کا حق دلاؤ، آدمی واپس جانے لگا تو عمر بن عبدالعزیز

نے کہا: ذرا ٹھہر جاؤ، آپ بہت دور سے ہمارے پاس آئے ہیں اور اس میں

شک نہیں کہ آپ نے اس سفر میں بہت سی رقم صرف کی ہے، نئے کپڑوں کو

بوسیدہ کیا ہے اور ممکن ہے کہ سواری کا کوئی جانور بھی اس طویل سفر کی نذر ہو گیا

ہو، پھر انہوں نے تمام چیزوں کا اندازہ لگایا تو اس کی ملکیت گیارہ دینار بنی جو

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ادا کر دی اور کہا یہ بات عام لوگوں کو بتانا کہ

کوئی مظلوم اپنی داستان ظلم سنانے اور اس سے نجات پانے کے لئے امیر

المؤمنین کے پاس آنے سے نہ گھبرائے خواہ وہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔ (۱)

☆ رشوت کا اثر و کردار:

عباسی خلیفہ مہدی کے زمانے میں عافیہ بن یزید بغداد میں بحیثیت قاضی مقرر تھے، ایک دن ظہر کے وقت اچانک قاضی صاحب خلیفہ مہدی کی خدمت میں پہنچ گئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی، خلیفہ کی اجازت سے گھر کے اندر داخل ہوئے اور سلام کے بعد عرض کیا: خلیفۃ المسلمین! وہ صندوق منگوائیں جس میں منصب قضا پر بحالی کے سلسلے میں میرا معاہدہ ہے، کیونکہ اب میں اس منصب سے مستعفی ہونا چاہتا ہوں، آپ سے گزارش ہے کہ آپ میرا استعفیٰ منظور کر لیں۔

قاضی عافیہ بن یزید کی گفتگو سے خلیفہ مہدی کو گمان ہوا کہ شاید حکومت کے کسی ذمہ دار نے قاضی کے فیصلے کو نظر انداز کیا ہے، چنانچہ پوچھ بیٹھا: کیا کسی نے آپ کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا ہے جو آپ منصب قضا سے مستعفی ہونا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: اس قسم کی کوئی بات نہیں، خلیفہ نے کہا: ”پھر آپ کے منصب قضا سے سبکدوش کیوں چاہتے ہیں؟ قاضی صاحب کہنے لگ: امیر المؤمنین! بات دراصل یہ ہے کہ ایک ماہ قبل دو آدمیوں نے میرے پاس مقدمہ دائر کیا تھا، مقدمے کی نوعیت بڑی ہی پیچیدہ تھی، ہر دو فریق کے پاس واضح ثبوت اور شہادت موجود تھی، فیصلہ سنانے میں دیر لگ سکتی تھی؛ کیوں کہ دونوں فریقوں کے دلائل پر غور و فکر اور نتیجے تک پہنچنے کے لئے خاصا وقت درکار تھا، چنانچہ میں نے مقدمہ سننے کے بعد اس امید میں فریقین کو واپس بھیج دیا کہ وہ باہم مصالحت کر لیں گے اور یوں ان کا مقدمہ حل ہو جائے گا، اس مدت میں دونوں فریقوں میں سے ایک کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ مجھے پکی ہوئی تازہ کھجوریں زیادہ مرغوب ہیں، چنانچہ اس نے بہت ہی عمدہ کھجوریں اکٹھی کیں اور میرے دربان کو بھاری رقم رشوت دے کر کھجوریں مجھ تک پہنچانے کو کہا، میں نے اتنی عمدہ کھجوریں کبھی نہیں دیکھی تھیں؛ لیکن جب دربان نے کھجور کا طبق میری خدمت میں حاضر کیا تو میں نے اسے کوڈانٹ ڈپٹ کر طبق واپس کروا دیا، دوسرے دن جب دونوں فریق عدالت میں حاضر ہوئے تو وہ دونوں میری نگاہ میں یکساں نظر آ رہے تھے۔ ”فَهَذَا يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! وَلَمْ أَقْبَلْ“

فَكَيْفَ يَكُونُ حَالِي لَوْ قَبِلْتُ“ امیر المؤمنین! ہدیہ قبول نہ کرنے کے باوجود میری یہ حالت ہوگئی (کہ عدم مساوات کا تیر میری نگاہ میں چھ گیا) پھر اگر میں نے ہدیہ قبول کر لیا ہوں تو کیا ہوتا؟ (لامحالہ مجھے ناحق فیصلہ کرنا پڑتا)۔

امیر المؤمنین! حیلے بہانے سے شیطان میرا دین اور میری عاقبت برباد کر سکتا تھا؛ کیونکہ ہر انسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے اور لوگ اس کے پھندے میں پھنس کر تباہ و برباد ہو رہے ہیں؛ لہذا اے امیر المؤمنین! آپ مجھے اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بدلہ دے گا، مجھ سے اس سلسلے میں درگزر کریں، اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت کرے گا۔ (۱)

☆ حجاج کے سامنے دو ٹوک جواب

حجاج بن یوسف ثقفی نے ابن فہال کے بھائی کو گرفتار کروایا اور کہا کہ: میں تجھے ضرور قتل کروں گا، قیدی نے عرض کیا: آخر سبب کیا ہے؟

حجاج نے کہا: تیرے بھائی قطر نے میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا، قیدی نے جواب دیا، میرے پاس امیر المؤمنین کی جانب سے لکھا ہوا ورق ہے کہ میرے بھائی کی غلطی کی سزا مجھے نہیں دی جائی گی، حجاج بن یوسف بولا: لاؤ مجھے دو۔

قیدی نے کہا: میرے پاس امیر المؤمنین کے خط کے علاوہ آسمانی خط بھی ہے، پھر کہنے لگا: میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ”وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى“ (۲)

کوئی آدمی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

حجاج اس کے دندان شکن جواب سے تعجب میں پڑ گیا اور اس کی راہ چھوڑ دی۔ (۳)

☆ عدل ہی ملک ہے:

خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں کسی حاکم نے ایک آدمی کی جاگیر پر ناجائز قبضہ کر لیا، وہ آدمی خلیفہ کے دربار میں شکایت لے کر گیا اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت

رکھے اے امیر المؤمنین! میں اپنی حاجت بیان کروں یا کوئی مثال دوں؟ خلیفہ نے کہا: حاجت سے پہلے کوئی مثال ہی بیان کرو۔ وہ آدمی گویا ہوا:

بچے کو جب کسی ناپسندیدہ بات کا سامنا ہوتا ہے تو ماں سے بڑھ کر کوئی دوسرا اس کا مددگار نہیں ہوتا، جب کچھ ہوش مند ہوتا ہے تو اپنے باپ سے شکایت کرتا ہے؛ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ماں سے زیادہ اس کا باپ اس کا مددگار ہو سکتا ہے، پھر جب جوان ہو جاتا ہے تو اپنی شکایت حاکم کے پاس لے جاتا ہے؛ کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کے مقابلے میں حاکم زیادہ طاقت ور ہے، پھر جب اس کی عقل میں اضافہ ہوتا ہے تو اپنا مسئلہ سلطان کے دربار میں پیش کرتا ہے؛ کیوں کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سب لوگوں سے زیادہ طاقت ور ہے؛ لیکن جب اسے بادشاہ کے دربار میں بھی انصاف نہیں ملتا تو پھر اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

مجھے بھی ایک مصیبت آپڑی ہے اور شکایت لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ آپ سے زیادہ طاقت ور اس روئے زمین پر کوئی نہیں، اگر آپ نے میرے ساتھ انصاف کر دیا تو ٹھیک ورنہ میں انصاف کے لئے اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا، خلیفہ منصور نے کہا: ہم تمہارے ساتھ انصاف ہی کریں گے، اس نے بتایا کہ آپ کے فلاں حاکم نے میری زمین پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے، خلیفہ نے اپنے حاکم کو جاگیر واپس کرنے کا حکم دیا اور اس کو لکھا کہ اس آدمی کے لئے اسباب راحت مہیا کرو اور اس کی معیشت کو تیشی بخش بناؤ۔ (۱)

☆ حاکم وقت گواہی مسترد

قسططنیہ کی سلطنت عثمانیہ کا دار الحکومت، آج کا استنبول ہے، جہاں عدالت لگی ہوئی ہے، قاضی شمس الدین محمد حمزہ عدالت کی کرسی پر براجمان ہیں، مقدمہ پیش ہوا، قاضی نے گواہان کی فہرست دیکھی، اس کے اندر حاکم وقت سلطان بایزید کا نام بھی شامل ہے، سامنے دیکھا تو وہ گواہوں کے کٹھڑے میں کھڑا ہے۔

اچانک قاضی نے فیصلہ سنایا، سلطان بایزید کی گواہی کو مسترد کیا جاتا ہے؛ کیونکہ گواہ قابل اعتبار نہیں، عدالت میں سناٹا چھا گیا، حاکم وقت کی گواہی ناقابل قبول، لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ سلطان بایزید نے آگے بڑھ کر قاضی کو مخاطب کیا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے گواہی کے قابل کیوں نہیں سمجھا گیا؟ قاضی نے حاکم کی حیثیت اور ہیبت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا، ”گواہ باجماعت نماز ادا نہیں کرتا؛ اس لئے اس کی گواہی ناقابل قبول ہے“ قاضی نے حاکم وقت کی گواہی کو مسترد کر کے اسلام کے عدالتی نظام کے وقار کو مزید جلانے کی کوشش اور ثابت کر دیا کہ کرسی عدالت پر بیٹھ کر چھوٹے اور بڑے میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔

حاکم نے فیصلہ سنا اور اس کے سامنے گردن جھکا دی، اپنی کمزوری کا اعتراف کیا، حکم دیا کہ فی الفور میرے محل کے سامنے ایک خوبصورت مسجد بنائی جائے۔ اس مسجد کی اگلی صف اپنے لئے مخصوص کی اور اس کے بعد نماز باجماعت سے غفلت کا کبھی مرتکب نہیں ہوا۔

☆ غصے میں فیصلہ نہ کریں

موسیٰ بن اسحاق نیشاپور اور اہواز میں قاضی رہے، یہ بہت فصیح اللسان اور تبحر عالم تھے؛ مگر انہیں کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا گیا، ایک مرتبہ ایک خاتون ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی۔ ”قاضی صاحب! آپ کے لئے دو آدمیوں کے درمیان غصے کی حالت میں فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ قاضی صاحب نے پوچھا: کیوں؟ خاتون نے عرض کیا؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”لَا يَقْضِي الْقَاضِي بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضَبَانٍ“ قاضی غصے کی حالت میں دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے، یہ سن کر قاضی موسیٰ بن اسحاق مسکراتے لگے۔ (۱)

☆ ایک چوکیدار کی فرض شناسی

ابو العباس سفاح کا ولی عہد اس کا بھائی ابو جعفر منصور تھا، جب وہ طلب علم کے

لئے ادھر ادھر پھرا کرتا تھا تو ایک دن ایک منزل پر اترا جہاں ہر آدمی سے دو درہم محصول لیا جاتا تھا، چوکیدار نے کہا: جب تک آپ محصول ادا نہ کریں گے، یہاں قیام پذیر نہیں ہو سکتے، منصور نے کہا: میں بنو ہاشم میں سے ہوں اور ابو العباس کا بھائی ہوں، محصول سے درگزر کرو، اس نے کہا: حکم حاکم سے مجبور ہوں، منصور نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹوں میں سے ہوں، چوکیدار نے کہا: جو آئین ہے اس کے خلاف کس طرح عمل کر سکتا ہوں؟ منصور نے کہا: میں قرآن مجید جانتا ہوں، عالم، فقیہ اور ماہر فرائض ہوں، دو درہم کیا میں ہزار ہزار درہم کا ایک نکتہ بیان کروں گا، چوکیدار نے کہا: یہ سب صحیح ہے؛ لیکن آئین سلطنت میں کسی کے ساتھ رواداری نہیں ہے، اس لئے مجھے اس معاملے میں معذور سمجھو۔

ایک ادنیٰ چوکیدار اپنے فرائض کی بجا آوری میں اس شخص کا جو بنو ہاشم میں سے ہے، عالم اور فقیہ ہے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد خلیفہ بننے والا ہے، کوئی لحاظ نہیں کرتا۔ (۱)

☆ سلطان محمود کا بے مثال انصاف:

سلطان محمود ہندوستان کا ایک نامور بادشاہ گذرا ہے، اس کا ایک بھانجا تھا، اس کا ایک شادی شدہ عورت سے ناجائز تعلق تھا، اس کے خاوند نے بہت داد فریادی؛ لیکن کسی نے نہ سنی، قاضی، وزیر اور امیر کوئی بھی شہزادے کے مقابلے میں اس غریب کی نہ سنتا تھا، آخر وہ شخص جرات و ہمت کر کے خود سلطان تک پہنچا اور نہایت دلیری سے اپنے دکھ درد کی تمام داستان بیان کی، سلطان نے اس کو اطمینان دلایا اور کہا: میں تمہارا انصاف کروں گا؛ مگر اس راز سے کسی کو آگاہ نہ کرو اور اگر وہ پھر تمہارے مکان پر آئے تو سیدھے میرے پاس پہنچو۔

بادشاہ نے دربانوں کو بھی تاکید کر دی کہ جب یہ شخص آئے تو فوراً مجھے خبر کر دو، خواہ میں کسی بھی حال میں ہوں، غرض جب شہزادہ حسب عادت گیا اور اس شخص کو اس کے مکان سے باہر نکال کر اس کی بیوی کے پاس جا بیٹھا تو اس نے سلطان کو خبر کر دی، سلطان

خود آیا اور سارا ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنے بھانجے کا سرتلووار کے ایک ہی وار سے الگ کر دیا اور تھوڑے وقفے کے بعد پانی مانگا اور دو نفل ادا کئے۔ (۲)

☆ ایک مرتبہ ایک سوداگر نے سلطان محمود سے اس کے لڑکے شہزادہ مسعود کی شکایت کی اور کہا کہ میں پردیسی ہوں اور مدت سے اسی شہر میں پڑا ہوں، گھر جانا چاہتا ہوں؛ لیکن نہیں جاسکتا؛ کیوں کہ شہزادہ نے مجھ سے ساٹھ ہزار دینار کا سودا خریدا ہے اور قیمت ادا نہیں کرتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ شہزادہ مسعود کو قاضی کے سامنے بھیجا جائے، محمود کو سوداگر کا یہ واقعہ سن کر بہت رنج ہوا اور مسعود سے کہلا بھیجا کہ یا تو سوداگر کا تصفیہ کر دے یا اس کے ساتھ کچہری میں قاضی کے سامنے حاضر کر کے شرعی حکم جاری کیا جائے، جب سلطان کا حکم پہنچا تو اس نے فوراً اپنے خزانچی سے پوچھا کہ خزانہ میں کس قدر رقم موجود ہے؟ اس نے عرض کیا: بیس ہزار دینار، شہزادے نے یہ رقم سوداگر کو دے کر بقیہ رقم کے لئے تین دن کی مہلت مانگو اور سلطان کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ میں بیس ہزار درہم اس وقت ادا کر دیئے ہیں اور تین دن میں بقیہ ادا کر دوں گا، سلطان نے کہلا بھیجا کہ میں کچھ نہیں جانتا جب تک تم سوداگر کے دینار ادا نہیں کرو گے میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا، مسعود کو جب یہ خبر ملی تو وہ ادھر ادھر سے قرض لے کر دوسری نماز کے وقت تک ساٹھ ہزار دینار نقد سوداگر کو ادا کر دیئے۔ (۲)

☆ ایک مرتبہ ایران کے کسی علاقے کو محمود نے فتح کر کے زیادہ دن نہیں گزرے تھے، سوداگروں کا ایک قافلہ لوٹ لیا گیا، اس قافلہ میں بڑھیا کا ایک لڑکا بھی تھا، بڑھیا نے جب محمود سے اس کی شکایت کی تو اس نے کہا: وہ علاقہ بہت دور ہے اس لئے انتظام بہت مشکل ہے، بڑھیا بھی بہت ہمت والی تھی، اس نے جواب دیا کہ جب تم کسی علاقہ کا انتظام نہیں کر سکتے تو نئے نئے ملک کیوں فتح کرتے ہو؟

محمود نے جب بڑھیا کا جواب سنا تو وہ بہت شرمندہ ہو گیا، بڑھیا کو روپیے دے کر رخصت کر دیا؛ لیکن اس علاقہ کا ایسا انتظام کیا کہ سودا گروں کے قافلوں کو لوٹنے کی پھر کوئی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ (۱)

☆ قاضی محمد بن بشیر کی بے باکی:

عباس بن عبد اللہ بن مروان القرشی امیر کے خاص دربانوں میں سے تھا جو تقریب اور خصوصیت اس کو حاصل تھی وہ کسی اور کو میسر نہ تھی، ایک شخص نے اس کے خلاف جائیداد غیر منقولہ کا مقدمہ قاضی محمد بن بشیر کی عدالت میں دائر کیا جب عباس قرشی کو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے اس کے خلاف فیصلہ کیا ہے تو وہ امیر الحکم کے پاس آیا اور شکایت کی اور برا بھلا کر قاضی کو معزول کرنے کو کہا، ساتھ ہی قاضی صاحب کی اور بھی شکایتیں کی، امیر نے کہا: اگر تو سچا ہے تو قاضی صاحب کے گھر جا کر ان سے خارج اوقات عدالت میں مل، اگر وہ تجھے تنہا اپنے پاس آنے دیں تو ہم تجھ کو سچا مانیں گے اور انہیں موقوف کر دیں گے، قرشی اس شان کے ساتھ قاضی صاحب کے گھر گیا کہ اس کے ہمراہوں کی کثرت کی وجہ سے راستہ چلنا دشوار تھا، قرشی نے قاضی صاحب کے گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا، ایک بوڑھیا باہر نکلی، قرشی نے اپنا نام بتا کر اندر آنے کی اجازت چاہی، قاضی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے بڑھیا سے کہا کہ: اس سے کہہ دو کہ اگر کوئی حاجب ہو تو مسجد میں جہاں اہل مقدمہ بیٹھتے ہیں وہاں بیٹھو اور میرے آنے کا انتظار کرو، تمہارے اندر آنے کی کوئی ضرورت نہیں، قرشی نے اندر آنے کے لئے اصرار کیا؛ مگر قاضی صاحب کے یہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی، جاسوسوں نے الحکم کو اس کی اطلاع دی تو وہ اس خبر سے بہت خوش ہوا۔ (۲)

☆ نور الدین کا اپنے امراء کے خلاف عدالتیں قائم کرنا

نور الدین کے قیام دمشق کے زمانہ میں اس کے بہت سے امراء وہاں آباد ہو گئے

(۱) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: ۲۶۳/۱، عدل و انصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۹۲

(۲) عدل و انصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۹۵

تھے اور انہوں نے املاک و جائیداد حاصل کر لی تھی اور اپنے پڑوسی زمینداروں اور مالکان زمین پر بڑی زیادتیاں کرتے تھے، قاضی کمال الدین کی عدالت میں استغاثوں اور عموؤں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، قاضی صاحب امراء کی کوئی رعایت نہ کرتے اور ان کے مقابلہ میں بے لاگ انصاف کرتے تھے؛ لیکن امیر الامراء اسد الدین کے جاہ و اقتدار کی وجہ سے اس کے خلاف کاروائی کرنے میں انہیں دشواری پیش آتی تھی، انہوں نے نور الدین کو ادھر تو وجہ دلائی، اس نے امراء کے مقدموں کی سماعت کے لئے دارالعدل کے نام سے ایک عدالت قائم کی اور اس میں خود بیٹھنا شروع کیا، اسد الدین کو معلوم ہو گیا کہ یہ اہتمام صرف اس کی وجہ سے کیا گیا ہے، اس نے اپنے تمام ماتحت امراء بلا کر ان سے کہا کہ میرے علاوہ قاضی کمال الدین کو اور کسی امیر سے مزاحمت کا خطرہ نہیں ہے اور یہ عدالت صرف میری وجہ سے قائم ہوئی ہے، اگر تم میں سے کسی کے باعث مجھ کو عدالت میں حاضر ہونا پڑے تو اس کو سولی پر چڑھا دوں گا اور جن جن لوگوں کے ساتھ تمہارے تنازعات ہوں ابھی جا کر ان کا فیصلہ کر لو اور جس قیمت پر بھی ہو سکے مدعیوں کو راضی کر لو خواہ اس میں میری کل املاک میرے ہاتھ سے نکل جائے، امراء نے کہا: اگر ان کو اس کی خبر ہو جائے گی تو وہ مطالبہ میں بڑی زیادتی کریں گے، اسد الدین نے کہا: کچھ بھی ہو میرے کل املاک ہاتھوں سے نکل جانا میرے لئے اس سے زیادہ آسان ہے کہ نور الدین مجھ کو ظالم سمجھے اور زمرہ عوام میں شامل کر دے، اس حکم پر تمام امراء کو اپنے اپنے فریق کو رضامند کرنا پڑا اور دارالعدل میں اس کے خلاف ایک مقدمہ بھی پیش نہ ہو سکا، دو تین دن عدالت میں بیٹھنے کے بعد نور الدین نے کمال الدین سے کہا کہ اسد الدین کے خلاف کوئی مدعی نظر نہیں آتا، اس وقت کمال الدین نے پورا واقعہ بیان کیا، یہ سن کر نور الدین سجدہ شکر بجالایا اور کہا کہ: خدا کا شکر ہے کہ میرے ساتھی خود انصاف کر لیتے ہیں اور اس کے لئے ان کو میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ (۱)

☆ بادشاہ کا بہنوئی قید خانے میں:

سیف الدین نامی ایک عرب امیر ہندوستان کے ایک بادشاہ کے پاس آیا، اس کی نہ صرف مہمان نوازی اور خاطر داری کی؛ بلکہ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ نے اپنی بہن فیروزہ کی شادی اس غریب الدیار امیر کے ساتھ کر دی، شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور بادشاہ نے اسے جاگیر میں گجرات اور کھمبایت (جو ناگڈھرن کچھ وغیرہ) کے علاقے دیئے؛ لیکن اس بدو نے اس نعمت عظمیٰ کی قدر نہ کی، بیس دن کے بعد جب محل شاہی میں جانے لگا تو بلا اطلاع اندر جانے کا قصد کیا کہ میں بادشاہ کا بہنوئی ہوں، میرے لئے ادب اور اطلاع کوئی معنی نہیں رکھتے، دربان نے منع کیا تو دربان کے سر کے بال پکڑ کر باہر گھسیٹا، امیر نے دربان کو زور سے لٹھی رسید کی حتیٰ کہ خون نکل آیا، دربان اسی عالم میں بادشاہ کے پاس آیا اور سارا واقعہ بیان کیا، بادشاہ تھوڑی دیر تک عالم سکوت میں رہا اور کہا یہ جرم ایسا سنگین ہے کہ بادشاہ بھی معاف نہیں کر سکتا، قاضی کے پاس جاؤ اور اپنا مقدمہ پیش کرو، قاضی کمال الدین شہر کے رئیس القضاۃ تھے، ان کے پاس مقدمہ گیا، انہوں نے ساری کیفیت سنی اور چونکہ امیر سیف الدین کو اپنے فعل سے انکار نہ تھا، اس لئے اسے رات بھر قید میں رکھا، شہزادی فیروزہ جو امیر کی بیوی اور بادشاہ کی بہن تھی، بھائی کے خوف سے قید خانے میں بچھونا اور کھانا تک نہ بھیجا، دوسرے دن دوپہر کو قاضی نے اس کی رہائی کا حکم دیا۔ (۱)

☆ بادشاہ کے سامنے ایک بیوہ کی بے باکی:

سلطان ملک شاہ سلجوقی ایک مرتبہ اصفہان کے جنگل میں شکار کھیل رہا تھا، کسی گاؤں میں قیام ہوا، وہاں ایک غریب بیوہ کی گائے تھی جس کے دودھ سے اس کے تین بچوں کی پرورش ہوتی تھی، سلطان کے لشکریوں نے اس گائے کو ذبح کر کے خوب کباب اڑائے، غریب بڑھیا کو خبر ہوئی تو وہ بدحواس ہو گئی، لشکریوں کے اس نامناسب فعل پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا، ان کے آگے کوئی لاوارث بیوہ کی فریاد سننے کو تیار نہ تھا، ساری

رات اس نے پریشانی میں کاٹی۔

صبح ہوئی، دل میں خیال آیا کہ کوئی نہیں سنتا تو نہ سے، کیا بادشاہ بھی نہ سنے گا جس کو اللہ نے غریبوں کو ظالموں سے نجات دینے کے لئے اتنی بڑی سلطنت دی ہے؟ بادشاہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی، معلوم ہوا کہ بادشاہ فلاں راستے سے شکار کو نکلے گا، چنانچہ اصفہان کے مشہور نہر کے پل پر جا کر کھڑی ہو گئی، جب سلطان پل پر آیا تو بڑھیا نے ہمت اور جرأت سے کام لے کر کہا:

اے الپ ارسلان کے بیٹے! میرا انصاف اس نہر کے پل پر کرے گا یا پل صراط پر؟ جو جگہ پسند ہوا انتخاب کر لے، بادشاہ کے ہمراہی یہ بے باکی دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے، بادشاہ گھوڑے سے اتر پڑا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عجیب و غریب اور حیرت انگیز سوال کا اس پر خاص اثر ہوا ہے، بڑھیا سے کہا: پل صراط کی طاقت نہیں ہے، میں اسی جگہ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں، کہو کیا کہتی ہے، بڑھیا نے اپنا سارا قصہ بیان کیا، بادشاہ نے لشکریوں کی اس ظالمانہ حرکت پر افسوس کا اظہار کیا اور ایک گائے کے عوض اس کو ستر گائیں دلائیں اور مالا مال کر دیا اور جب اس بڑھیا نے کہا: تمہارے عدل و انصاف سے میں خوش ہوں اور میرا اللہ خوش ہے، تب وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ (۱)

☆ بادشاہ کو کوئی گواہ نہیں مل سکا

قاضی ابو حازم (یہ بغداد کے قاضی تھے، ۳۱۶ھ میں وفات ہوئی) کو ایک مرتبہ خلیفہ معتضد باللہ (۲۷۹ھ-۲۸۹ھ) نے پیغام بھیجا کہ فلاں شخص کی طرف جس پر کئی لوگوں نے دعویٰ کر کے اپنا اپنا مال لے لیا ہے، میرا بھی کچھ مال نکلتا ہے، مجھے بھی مدعی سمجھئے اور میرے دعوے پر غور کر کے میرا حصہ بھی مجھے دلوائیئے۔

قاضی نے جواب میں کہلا بھیجا کہ قضا کی ذمہ داری میری گردن پر ڈال کر اب آپ یہ فرماتے ہیں کہ بغیر گواہوں کے آپ کے دعوے کو مان لیں، یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ آپ گواہ پیش کیجئے؟

خلیفہ نے کہلا بھیجا کہ فلاں اور فلاں میرے دو معزز گواہ ہیں، قاضی نے جواب دیا: وہ گواہ آپ کے نزدیک معزز ہوں گے؛ تاہم جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ بموجب احکام شرع وہ شہادت کے قابل ہیں، آپ کے دعوے کو نہیں مان لیتا، نہ ان کی شہادت قبول کر سکتا ہوں، خطیب بغدادی، ابن عسا کرنے ابو الحسین النخعی سے اس سلسلے میں جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں: ”فَإِنْ زُكِّيَا قَبِلْتُ شَهَادَتَهُمَا وَإِلَّا أَمْضَيْتُ مَا قَدْ ثَبَتَ عِنْدِي“ وہ دونوں گواہ آکر میرے پاس شہادت دیں، میں ان کی تفتیش کروں گا، اگر وہ شہادت کے قابل ہوئے تو میں ان کی شہادت قبول کروں گا بصورت دیگر میں ثابت شدہ مقدمہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

خلیفہ کے گواہوں نے جب سنا کہ عدالت میں ہم پر خوب جرح ہونے والی ہے تو انہوں نے شہادت دینے سے انکار کر دیا اور قاضی ابو حازم نے خلیفہ کے مقدمے کو خارج کر دیا اور خلیفہ کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ (۱)

☆ جھوٹا مقدمہ

مروان بن حکم کے دور خلافت میں اروی بنت اویس نامی خاتون نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ پر مقدمہ دائر کیا، حضرت سعید رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے، مقدمہ یہ تھا کہ انہوں نے اروی کی زمین کے ایک ٹکڑے پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے، مقدمہ مرواؤ کے پاس گیا، اس نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو بلوایا، یہ اس وقت خاصے بوڑھے ہو چکے تھے، مقدمہ پیش ہوا تو انہوں نے کہا کہ: میں اس کی زمین پر کیسے قبضہ کر سکتا ہوں جب کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ۔

مروان کہنے لگا: اے صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بتائیے کہ آپ نے کیا سنا ہے؟ کہنے لگ: :: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ أَخَذَ شَيْئًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا يُطَوِّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ“ جس شخص نے کسی کی بالشت برابر زمین بھی ظلم سے قبضہ کی تو قیامت کے دن ساتوں زمینوں کو طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔

مروان نے کہا: اس حدیث کے سننے کے بعد کسی دلیل، گواہ یا حجت کی کوئی ضرورت نہیں، مقدمہ خارج کر دیا اور فیصلہ دیا کہ سعید پر ناجائز مقدمہ بنایا گیا ہے، جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ سعید رضی اللہ عنہ صحابی رسول تھے، ان کی عمر کے اس حصے میں اہانت ہوئی تھی اور انہیں عدالت میں طلب کیا گیا تھا، ہاتھوں کو آسمانوں کی طرف اٹھا کر فرمایا: ”اللَّهُمَّ إِنْ كَانَتْ كَاذِبَةً فَعَمَّ بَصَرُهَا وَاقْتُلْهَا فِي أَرْضِهَا“ اے اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اس کو اندھی کر دے اور اس کو اسی کی زمین میں ہلاک کر دے، چنانچہ مرنے سے پہلے وہ عورت اندھی ہو گئی، ایک دن اپنی زمین میں پھر رہی تھی کہ اچانک ایک گڑھے میں گر کر مر گئی۔ (مسلم: تحريم الظلم و غضب الارض، حدیث: ۱۶۱۰)

رعایا کی مصلحت کے لئے بیٹے کی قربانی!

عبداللہ کے بعد ۹۱۲ء میں اس کا پوتا عبدالرحمن سوم ہسپانیہ کا حکمران ہوا، خلیفہ عبدالرحمن کے دو بیٹے تھے، الحکم اور عبداللہ، دونوں قابل اور ممتاز تھے؛ لیکن بادشاہ نے الحکم کو اپنا ولی عہد قرار دیا۔

ابن عبدالدار، عبداللہ کا ایک اولوالعزم رفیق تھا، اس کو خلیفہ سے اس امر کی شکایت تھی کہ اس نے اسے قاضی القضاة کا عہدہ نہیں دیا تھا، عبدالدار نے عبداللہ کو بہکایا اور اسے بغاوت پر آمادہ کیا، چنانچہ ایک نحس ساعت میں خلیفہ اور الحکم دونوں کو قتل کرنے کی خوفناک سازش کی گئی، عبدالرحمن کو بھی خبر ہو گئی، اس نے ایک معتبر سردار کو کافی فوج کے ساتھ روانہ کیا، شہزادہ اپنے رفیق عبدالدار کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا، جب خلیفہ کے سامنے پیش ہوا تو اس سے پوچھا:

کیا اس وجہ سے آزرده ہو کہ تم خلیفہ نہیں ہو؟ شہزادے نے کوئی جواب نہ دیا؛ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، بادشاہ کے حکم سے دونوں الگ الگ کمروں میں بند کر دیئے گئے، عبدالدار ات ہی رات خودکشی کر کے مر گیا۔

ادھر شہزادہ عبداللہ بن عبدالرحمن کے بارے میں اس کے اپنے باپ نے فیصلہ دیا

کہ اسے قتل کر دیا جائے، جب عبد اللہ کے قتل کا فیصلہ ہوا تو اس کے بھائی الحکم نے جو ولی عہد تھا اور اپنے بھائی سے بڑی محبت رکھتا تھا، رحم کی سفارش کی، بادشاہ نے سفارش نا منظور کی اور اپنا تاریخی فیصلہ کچھ اس طرح سنایا: تمہاری سفارش اور التجا بجا ہے، میں بھی یہی چاہتا ہوں اور اس کی موت کو ٹھنڈے دل سے دیکھنا گوارہ نہیں کرتا؛ لیکن میں خلیفہ ہوں، مجھے آئندہ کا خیال بھی رہنا چاہئے، اس کے دل کی خلش کبھی نہ جائے گی، میرے بعد تم دونوں ہمیشہ لڑتے رہو گے، تم دونوں کا انجام تو جو ہو سو ہو؛ لیکن رعایا تباہ و برباد ہو جائے گی، کتنی مائیں اپنے بچوں کو روئیں گی، کتنی عورتیں بیوہ ہوں گی اور کتنے بچے یتیم ہو جائیں گے، ملک میں قحط سالی اور فصلوں کی تباہی دائمی بدامنی پیدا کر دے گی، جب ان باتوں کی طرف میرا خیال جاتا ہے تو کانپ اٹھتا ہوں، اس لئے ہزار ہالگوں کو بے خانماں، ہزاروں عورتوں کو بیوہ اور ہزاروں بچوں کو یتیم کرنے کے بجائے بہتر ہے ایک ہی شخص کا جو بانی فساد ہے، خاتمہ کر دیا جائے۔

میں اپنے اس نوجوان فرزند کو بہت روؤں گا اور جب تک زندگی ہے روتا رہوں گا؛ لیکن اے الحکم! نہ تمہارے آنسو، نہ میرا رونا اور نہ میرے تمام خاندان کی سفارشیں میرے اس بد قسمت بیٹے کو اس صریح جرم کی سزایابی سے بچا سکتی ہیں۔ چنانچہ عبد اللہ اسی شب کو قتل کر دیا گیا اور دوسرے دن اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوا، یہ واقعہ ۹۴۹ء کا ہے۔ (۱)

☆ ایک بار ہیبت خان نے جو سلطان بلبن کے نہایت معتبر غلاموں میں سے تھا، اقطاع اودھ کی جاگیریں رکھتا تھا، ایک شخص کو حالت مستی میں مار ڈالا، اس کی بیوی سلطان غیاث الدین بلبن کے پاس فریاد لائی، سلطان نے ہیبت خان کو طلب کر کے پانچ سو درے لگوائے اور عورت سے کہا: ہیبت خان آج تک میرا غلام تھا؛ لیکن آج سے تو اس کی مالک ہے، تجھے اختیار ہے چاہے تو مار ڈالے، چاہے معاف کرے، بمشکل تمام ہیبت خان نے بیس ہزار روپیئے دے کر اس عورت کو راضی کیا اور نجات پائی۔ (۲)

☆ ایک بیوہ کی آزادانہ فریاد:

دولت عباسیہ کا تاجدار مامون الرشید جس نے نوشیرواں کے عدل اور حاتم کی سخاوت کی یاد تازہ کر دی تھی سلطنت بغداد پر جلوہ افروز ہے، شہزادہ عباس، مامون الرشید کا بڑا لڑکا طائفۃ النمل کے قریب شکار میں مصروف تھا کہ اس کی نظر ایک حسین و جمیل، خوب رو عورت پر پڑی جو ایک چشمے سے پانی کا گھڑا بھر رہی تھی۔ اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر کہا: تو کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے، کیا ایسے غیر آباد مقامات پر بھی جہاں پہاڑ اور جنگلوں کے سوا کچھ نہیں ہے، حسن جنم لے سکتا ہے؟ شہزادہ کی بات پر غیور عورت کے تیور بدل گئے، اس کا چہرہ غصہ سے متمما گیا، چنانچہ اس نے سپاہیوں سے کہا کہ اس عورت کا حسب نسب معلوم کر کے اس کو میری جانب سے پیغام نکاح دو، چنانچہ سپاہی حکم کی تعمیل میں عورت کے حسب و نسب کا پتہ کر آئے کہ عورت خاندان براء مکہ سے تعلق رکھتی ہے، نام مغیرہ بنت ازار ہے، وہ دو بچوں کی ماں اور حسین بن موسیٰ کی بیوہ ہے، اس کے عزیز واقارب میں سے اب کوئی زندہ نہیں ہے، صرف دو معصوم بچے ہیں، نکاح کا پیغام اس عورت کے لئے قیامت سے کم نہ تھا، وہ آپے سے باہر ہو گئی، کہنے لگی: ہارون ہماری جانیں تباہ کر چکا ہے، اب مامون ہماری عزت کے درپے ہے، لیکن عباس یاد رکھے کہ اس کی شہزادگی کو اس ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کی دہلیز پر دونوں ہاتھوں سے مسل دوں گی۔ چنانچہ عباس نے اس عورت کو دو گھنٹے کی مہلت دے کر اس کو گھر سے نکل جانے کو کہا، مغیرہ یہ پیغام سن کر دروازے پر آئی اور قاصد سے کہا: عباس اس وقت کو بھول جائے جب میرے دادا جعفر کا سرا کے دادا ہارون کے سامنے رکھا گیا اور اس بے گناہ قتل نے آل براء مکہ کو دو، دو دانوں کو محتاج کر دیا؛ لیکن برکلی بیبیاں عباسی مظالم کو جس شکل سے برداشت کرتی آئی ہیں، تاریخ اس کو فراموش نہیں کر سکتی، اتنا کہہ کر مغیرہ ایک سفید چادر سر پر ڈال کر دونوں بچوں کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی۔

ایک طویل مدت کے بعد یہ مغیرہ جس پر کہ ضعیفی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے مامون کے دربار میں حاضر ہوئی اور کہا کہ ایک بیوہ کا مکان صرف اس لئے کہ وہ اپنی عصمت کی

محافظ تھی، سلطنت عباسیہ کو مبارک ہو؛ لیکن مامون الرشید! ایک دن اس بادشاہ کو بھی منہ دکھانا ہے جس کی سلطنت کبھی فنا نہ ہوگی، ایک ظالم کے خلاف تیرے پاس فریاد لائی ہوں، انصاف کرو اور داد دے، مامون الرشید نے عورت سے کہا: اس ظالم کا نام بتا کہ وہ کون ہے؟ عورت نے ہنس کر کہا: شہزادہ عباس جو تخت شاہی پر آپ کے برابر بیٹھا ہے، مامون کا چہرہ اتنا سنتے ہی غصے سے سرخ ہو گیا، اس نے چوہدار کو حکم دیا کہ عباس کو اس عورت کے برابر کھڑا کر دے؛ تا کہ مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی امتیاز نہ رہے، شہزادہ عباس خاموش تھا اور ہر سوال کے جواب میں رک رک کر ایک آدھ بات کہہ دیتا، مغیرہ دھڑلے سے اپنی داستان سنائے جارہی تھی، اس نے کہا: ”عباس! یہ صحیح ہے کہ تو مامون الرشید کا لڑکا اور سلطنت کا مالک ہے؛ لیکن یہ ہاتھ منتظر تھے اس وقت کے کہ اگر تو اپنی دھن میں آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچتا تو تیری گردن مروڑ کر رکھ دیتے، آلِ برا مکہ کی دولت عباسیوں نے پامال کر دی؛ مگر ہماری عصمت وہ دولت ہے کہ ہم عباسیوں کو اس پر قربان کر دیں گے۔“

وزرائے سلطنت مغیرہ کی جرأت پر متعجب ہوئے اور کہا: یہ بے باکی آداب شاہی کے خلاف ہے، ادب سے گفتگو کرو، مامون نے کہا: اس کو مت روکو، یہ حق رکھتی ہے کہ جو کچھ اس کے منہ میں آئے کہے، یہ صرف اس کی صداقت ہے جس نے اس کی زبان کو تیز اور اس کے حوصلے بلند کر دیا ہے اور عباس کی کمزوری ہے جس نے اس کو گونگا کر دیا ہے۔

اسی وقت پانچ تھیلیاں اشرفیوں سے بھری ہوئی اہل کاروں سے لے کر مامون الرشید نے مفیدہ کے قدموں میں ڈال دیں اور نہ صرف اس کا مکان واپس کیا؛ بلکہ ایک عالی شان محل ”قصر عباس“ مغیرہ کو عطا فرما کر درخواست کی کہ وہ شہزادے کا قصور معاف کر دے۔ (۱)

☆ سلیمان اعظم سلاطین عثمانیہ میں سب سے بڑا اور با عظمت حکمران تھا، ۲۶ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اس کو عدل و انصاف کا بڑا خیال تھا اور انصاف کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہ کرتا تھا، اس کے داماد پاشا کا واقعہ سلیمان اعظم کی عدل کا بہترین ثبوت ہے، فرہاد پاشا کو فوراً معزول کر دیا، بعد میں فرہاد پاشا کی بیوی جو

سلیمان اعظم کی بیٹی تھی، بڑی التجا کے بعد اس کو دوبارہ والی بنادیا؛ لیکن جب فرہاد پاشا نے وہی ظلم اور انانصافی کا طریقہ اختیار کیا تو سلیمان نے نہ صرف اس کو معزول کر دیا؛ بلکہ قتل کر دیا۔ (۱)

☆ ایک فیصلہ

ایک سوداگر کی تھیلی جس میں چار سو دینار تھے گم ہو گئی، اس نے ڈھول پٹا کر اعلان کیا کہ اس طرح تھیلی گم ہو گئی ہے، جس شخص کو مل جائے وہ لے آئے، اسے دو سو دینار کا انعام دیا جائے گا، اتفاقاً قادیان کی ایک غریب شخص کو مل گئی اور وہ اسے لے کر مالک کے پاس انعام کی امید میں پہنچ گیا، لیکن سوداگر اپنی تھیلی کو دیکھ کر بد نیت ہو گیا اور اس غریب آدمی سے کہنے لگا: اس تھیلی میں نہایت قیمتی موتی بھی تھا، کیا وہ بھی اس کے اندر ہے؟ وہ آدمی بڑا گھبرایا اور سمجھ گیا اب یہ مجھے دھوکہ دے رہا ہے اور انعام نہ دینے کے لئے جھوٹ بولنے لگا ہے، اب ان دونوں میں جھگڑا ہو گیا، آخر یہ دونوں لڑتے ہوئے فیصلہ کے لئے قاضی کے پاس پہنچے، قاضی نے اس غریب سے موتی کے بارے میں پوچھا: تو وہ قسم کھا کر کہنے لگا کہ تھیلی میں مجھے دیناروں کے سوا کوئی چیز نہ ملی، اب قاضی نے سوداگر سے پوچھا: بتاؤ وہ موتی کیسی تھی؟ سوداگر نے الٹی سیدھی باتیں کیں، کچھ صحیح نہ بتا سکا، قاضی نے سمجھ لیا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے اور جھوٹ سے مقصد اس کا یہ ہے کہ اپنے اعلان کے مطابق اسے انعام نہ دینا پڑے، قاضی نے کہا: میرا فیصلہ سنو، اے سوداگر! اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ میری تھیلی گم ہو گئی ہے جس میں دینار تھے اور موتی بھی تھی اور یہ آدمی جو تھیلی لایا ہے اس میں موتی نہیں ہے؛ لہذا میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تھیلی تمہاری ہے ہی نہیں، لہذا تم اپنی گمشدہ تھیلی کے لئے پھر سے اعلان کراؤ، ممکن ہے تمہاری گمشدہ تھیلی تمہیں مل جائے اور تم کا مران و بامراد ہو جاوے، بہر حال یہ تھیلی تمہاری نہیں ہے، پھر قاضی نے اس غریب آدمی سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ تھیلی چالیس روز تک احتیاط سے رکھو، اگر اس کا کوئی دوسرا عویدار پیدا نہ ہو تو یہ تمہاری ہے۔ (۲)

(۱) سلاطین ہند اول: عدل و انصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۸۱

(۲) سچی حکایات: ۷۸۴، عدل و انصاف کے حیرت انگیز واقعات: ۱۰۸

☆ قاضی منذر کا فیصلہ

خلیفہ عبدالرحمن نے قرطبہ میں ایک مکان اپنی ضرورت کی وجہ سے خریدنا چاہا، وہ مکان یتیم بچوں کی ملکیت میں تھا اور وہ یتیم بچے قاضی منذر کی نگرانی میں تھے، جب قاضی کے پاس اس مکان کی خریداری کا پیغام پہنچا تو قاضی صاحب نے فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور خلیفہ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ یتیموں کی جائیداد اسی وقت منتقل ہو سکتی ہے جب ان میں تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط پوری۔ (۱) کوئی سخت ضرورت لاحق ہو، (۲) جائیداد کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو (۳) ایسی قیمت ملتی ہو کہ جس کے لینے میں یتیموں کا آئندہ فائدہ مقصود ہو، فی الحال ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط موجود نہیں اور ملازمین سرکار نے جو قیمت اس مکان کی تجویز کی ہے وہ بہت کم ہے، خلیفہ یہ پیغام سن کر خاموش ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ قاضی بغیر قیمت بڑھائے نہ مانے گا، چنانچہ قاضی نے فوراً مکان کو منہدم کروا دیا، اس کے بعد ملازمین شاہی نے دو گنی قیمت دے کر اس زمین کو خرید لیا، خلیفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے قاضی کو بلا کر مکان منہدم کرانے کا سبب دریافت کیا، قاضی منذر نے کہا: جس وقت میں نے مکان منہدم کرنے کا حکم دیا تھا اس وقت میرے پیش نظر قرآن کی یہ آیت تھی: «فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا» (۱) خلیفہ یہ سن کر خاموش ہو گیا اور اس روز سے قاضی منذر کی اور زیادہ عزت کرنے لگا، اس واقعہ سے خلیفہ اور قاضی دونوں کی پاک باطنی کا ثبوت ملتا ہے۔ (۲)

☆ سلطان جلال الدین ایک روز شکار کو نکلے تو ان کو ایک دیہاتی ملا جو رو رہا تھا، پوچھا: کیوں روتے ہو؟ اس نے کہا: میرے پاس تربوز تھے جو میری کل پونجی تھی، تین لڑکوں نے وہ تربوز مجھ سے چھین لئے، سلطان نے کہا: میرے لشکر میں چلے جاؤ اور وہاں فلاں مقام پر جا کر بیٹھ جاؤ، میں شام کو واپس آؤں گا اور تمہیں خوش حال کر دوں گا، چنانچہ وہ دیہاتی لشکر میں گیا اور سلطان کے بتائے ہوئے

مقام پر بیٹھ گیا، سلطان جب لشکر میں آیا تو اپنے ملازمین سے کہا: مجھے تربوز کی خواہش ہے، لشکر اور خیمہ میں پتہ لگاؤ شاید مل جائے، ملازموں نے ادھر ادھر پتہ لگایا تو ایک ملازم تربوز لے کر آ گیا، سلطان نے پوچھا: یہ تربوز کہاں ملا؟ اس نے بتایا: فلاں حاجب کے خیمہ میں تھا، سلطان نے حکم دیا کہ اس حاجب کو حاضر کرو، چنانچہ وہ حاضر ہوا، سلطان نے اس سے پوچھا کہ: یہ تربوز کہاں سے لیا؟ اس نے بتایا کہ: کچھ لڑکے لائے تھے، سلطان نے کہا: ان لڑکوں کو حاضر کرو، وہ حاجب گیا اور یہ سوچا کہ معاملہ سنگین معلوم ہوتا ہے، لڑکے کہیں قتل ہی نہ کر دیئے جائیں، ان لڑکوں کو بھگادیا اور سلطان سے کہہ دیا کہ وہ لڑکے بھاگ گئے، سلطان نے اس دیہاتی سے پوچھا: کیا یہی وہ تربوز ہے جو تجھ سے چھینا گیا، اس نے کہا: ہاں، تو اس سے کہا: اس حاجب کو لے جاؤ، یہ ہمارا غلام ہے، ہم تجھے بخشے ہیں، اس لئے کہ اس نے لڑکوں کو حاضر نہیں کیا جنہوں نے تمہارے تربوز چھینے تھے اور خدا کی قسم! اگر تو نے اسے چھوڑ دیا تو میں تیری گردن اڑا دوں گا، چنانچہ دیہاتی نے اس حاجب کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آیا، اب حاجب نے اپنے آپ کو آزاد کرنے پر اس سے تین سو دینار پر سودا طے کر لیا اور اسے تین سو دینار دے کر اس کے بچے سے آزاد ہو گیا، پھر وہ دیہاتی سلطان کے پاس آیا اور کہا: حضور! جو غلام آپ نے مجھے دیا تھا وہ میں نے تین سو دینار میں بیچ دیا ہے، سلطان نے کہا: تم اس سودے پر خوش بھی ہو؟ وہ بولا بڑی خوشی ہوئی، فرمایا: اچھا جا قیمت اپنے قبضہ میں کر اور سلامتی کے ساتھ رخصت ہو جا۔ (۱)

☆ بادشاہ سکندر لودھی کا فیصلہ:

سلطان سکندر انصاف کرنے میں حد درجہ کوشش کرتا تھا اور خاص فراست و دانائی سے کام لے کر حقیقت تک پہنچتا تھا، چنانچہ صاحب طبقات الکبریٰ نے ایک دفعہ بیان کیا کہ گوالیار کے دو غریب آدمی جو بھائی بھائی تھے، مفلسی سے تنگ آ کر فوج میں شامل ہو گئے،

ایک لڑائی میں انہیں دو لعل مل گئے، ایک اس دولت پر قانع ہو کر گھر جانا چاہتا تھا اور دوسرا اس کے بعد بھی قسمت آزمائی پر مصر تھا، جب ایک بھائی گھر جانے لگا تو دوسرے بھائی نے لعل اس کے سپرد کئے اور کہا کہ: میری بیوی بچوں کو دے دینا، جب یہ گوالیار واپس آیا تو اس نے اور چیزیں تو دیں؛ لیکن لعل نہ دیا، جب مالک واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے استفسار کیا، اس نے انکار کیا، الغرض یہ معاملہ میان بھورا تک پہنچا جو دربار سکندر لودھی کے امراء کبار میں سے تھا، انہوں نے گواہ طلب کئے، خائن بھائی نے ایک قمار خانہ سے دو جھوٹے گواہ پیش کئے اور میاں بھورا نے ان گواہوں پر اعتبار کر کے فیصلہ کر دیا کہ لعل بیوی سے وصل کر لینا چاہئے، یہ غریب بہت پریشان ہوئی، سیدھا آگرہ جا کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچی، بادشاہ نے فریقین اور گواہوں کو طلب کیا، یہاں بھی وہی صورت پیش آئی، بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ لعل اس عورت کو نہیں دیا گیا؛ لیکن وہ گواہوں کی موجودگی میں کوئی خلاف حکم نہیں دے سکتا تھا، آخر کار اس نے سوچ کر گواہوں سے پوچھا: جب تمہارے سامنے اس عورت کو لعل دیا گیا ہے تو تم نے اسے ضرور دیکھا ہوگا، انہوں نے کہا: ہاں ہم نے دیکھا تھا، یہ سن کر بادشاہ نے موم کا ایک ٹکڑا ان دونوں کو دیا اور کہا: جاؤ الگ الگ اس لعل کی صورت، مقدار، موم کے ذریعے ظاہر کرو، جب دونوں بنا کر لائے تو ایک کا بنا ہوا نمونہ دوسرے سے بالکل مختلف تھا اور لعل کی ہیئت و صورت سے کچھ مناسبت نہ تھی، بادشاہ نے گواہوں کو دھمکایا تو انہوں نے سارا حال بیان کر دیا جس سے حقیقت واضح ہو گئی۔ (۱)

☆ سلطان شمس الدین عادل اور فاضل شخص تھا، اس کے مآثر میں لکھا ہے کہ رد مظالم اور مظلوموں کی داری میں بہت سخت تھا، عام تھا کہ جس پر کوئی ظلم ہو وہ رنگے ہوئے کپڑے پہن کر پھرے؛ تاکہ بادشاہ فوراً پہچان لے، کیوں کہ ہندوستان میں لوگ عموماً سفید رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں اور رات کے واسطے یہ تجویز کی کہ اپنے دروازوں کے برجوں پر سنگ مرمر کے بنے ہوئے دوشیر رکھ کر ان دونوں کے گلے میں زنجیر ڈال رکھی تھی، جب مظلوم آکر زنجیر ہلاتا تو فوراً بادشاہ کو خبر

ہو جاتی تھی اور وہ فی الفور اس کے مقدمہ کا فیصلہ کرنے آ جاتا۔ (۱)

☆ امیر کابل عبدالرحمن کا فیصلہ:

ضلع پشاور کے دو شرکتی اس غرض سے کابل گئے؛ تاکہ وہاں گوشت کی تجارت کریں، قلیل عرصہ میں انہوں نے دو تین ہزار روپیہ کمالیا، اپنے وطن جانے کا ارادہ کیا، دونوں شرکتی اپنے منافع کی رقم لے کر اپنے وطن کی طرف چل پڑے، جلال آباد کے قریب پہنچ کر انہوں نے ایک ناپینا کو دیکھا جو راستہ کے کنارے ایک بڑے درخت کے نیچے صدا لگا رہا تھا، افسوس کہ گردش دوراں نے سب کچھ چھین لیا؛ حتیٰ کہ آنکھوں کی نظر چھین لی، کیا ہی اچھا ہوتا اگر ایک مرتبہ تھیلی پر روپیہ رکھنے کا موقعہ میسر آ جائے، بار بار اندھا یہی جملہ دہرا رہا تھا، دونوں شرکتی اس کے قریب پہنچ گئے اور اندھے سے دریافت کیا بھائی تم زمانہ کی گردش سے نالاں کیوں ہو؟ اندھے نے کہا: میں اس علاقہ کا ممتاز شخص تھا، میری بہت سے جائیداد تھی؛ لیکن قسمت نے پلٹا کھایا کہ میری آنکھوں کی بینائی بھی ساتھ لی گئی، مجھے اس بات کا بہت شوق ہے کہ اس مفلسی میں اگر اپنا نہیں تو دوسرے کا کمایا ہوا نقدان ہاتھوں میں ایک لمحہ کے لئے رکھ کر اپنے دل کو تسکین دوں، دونوں شرکتی نے یہ سمجھا کہ یہ اندھا ہے، جائے گا کہاں؟ اپنے روپیوں کی تھیلی ایک لمحہ کے لئے اس کو دینے میں کیا حرج ہے؟ انہوں نے یہ تھیلی اسے دی، تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنی تھیلی کا مطالبہ اندھے سے کیا تو اس نے کہا: کیسی تھیلی؟ واپسی کیسی؟ ان کے اصرار پر بھی اندھے نے تھیلی واپس نہ کی، پھر وہ کہنے لگا: میں نے تمام عمر یہاں بیٹھے بیٹھے گذاری دی، پیسہ پیسہ جمع کیا، تم کہاں سے بد بخت ڈاکو یہاں پہنچ گئے، ان دونوں نے اپنے پیسہ زبردستی چھین لینے کی کوشش کی تو اندھے نے زور زور سے چلانا شروع ڈاکو! ڈاکو کوئی مدد کو آئے، محلہ والے وہاں پہنچ گئے، ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا، انہوں نے اس کو دربار میں پیش کیا، امیر عبدالرحمن دربار میں حاضر تھا، بادشاہ نے پہلے اندھے کا بیان سنا، پھر ملزموں کی داستانِ مظلومی سنی، پھر حکم دیا کہ ایک کڑا ہی لے آؤ اور اس میں پانی ڈال کر خوب گرم کرو، یہ سن کر دونوں شرکتی بے چارہم گئے،

جب پانی خوب گرم ہو گیا تو بادشاہ نے غضبناک ہو کر کہا: روپیوں کو کھول کر پانی میں ڈال دو، بادشاہ مسند قضا سے اٹھا اور کڑا ہی کے پاس آ کر گرم گرم پانی کی سطح بغور دیکھ کر واپس چلا گیا، حکم ہوا کہ کڑا ہی کا پانی گرا کر روپے شراکتی کے حوالے کر دیا جائے، پھر نابینا کو مناسب سزا دینے کا حکم دیا، قاضی نے جرأت کر کے فیصلہ کی تفصیل سننے کی خواہش کی تو بادشاہ نے کہا: جن دو شخصوں کو ملزم ٹھہرایا گیا تھا اور درحقیقت وہ بالکل بے گناہ تھے، انہوں نے گوشت فروخت کر کے روپیہ جمع کیا تھا؛ کیوں کہ پانی کی سطح پر چربی کے پگھلے ہوئے ذرات ظاہر ہوئے جس سے یہ ظاہر ہوا کہ ان گوشت فروشوں کے ہاتھ کا میل ہے جو ان کے ہاتھوں پر گوشت کی چربی کی وجہ سے پڑتا تھا، وہ روپیوں کو بھی لگ گیا ہوگا، تجربہ کیا تو صحیح نکلا، بادشاہ کے اس فیصلہ سے حاضرین دربار بے حد خوش ہوئے۔ (۱)

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا





علم فلکیات میں مسلمانوں کے کارنامے

عہد بنی امیہ کے اختتام تک مسلمان دوسری قوموں کے علم ہیئت سے بالکل نااہل تھے، سب سے پہلے سندھ میں سنسکرت کی فلکیاتی تحریر ”ہر گنٹر“ کا ترجمہ ”زیہ الارکند“ کے نام سے ہوا تھا، جس کی بنیاد پر قندھار میں ”زیج الہند“ اور ”زیج الجامع“ مرتب کی گئی تھی، اس کے بعد ۷۴۲ء میں سنسکرت سے اور ترجمہ ”زیج الہرفن“ کے نام سے ہوا، ۱۵۴ھ/۷۷۱ء میں سندھ کے راجہ کی طرف سے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے دربار میں ایک سفیر اپنے ساتھ سنسکرت کتاب ”مہاسدھانت“ کا ایک نسخہ لایا، جس کا موضوع علم ہیئت تھا، خلیفہ نے ”محمد بن ابراہیم فزاری“ کو حکم دیا کہ وہ اس کتاب کا ترجمہ عربی میں کرے، الفزاری نے کتاب کے ترجمے میں ہندی سفیر اور ایک مسلم سائنسدان ”یعقوب بن طارق کی مدد سے عربی مسودہ تیار کیا، جس کا نام ”السندھند الکبیر“ رکھا گیا، علم ہیئت کے موضوع پر یہ عربی زبان میں پہلی کتاب تھی، غالباً ۷۹۰ء میں الفزاری نے ایک فلکیاتی جدول عربی تقویم کے مطابق تیار کی جو ”زیج علی سن العرب“ کے نام سے مشہور ہوئی، دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں ”یعقوب بن طارق“ نے دو کتابیں ”ترکیب الافلاک“ اور ”کتاب الہلال“ تحریر کیں، مزید برآں انہوں نے ”زیج محلول فی السندھند لدرجۃ درجۃ“ کے عنوان سے ایک زیج بھی تیار کی، اسی زمانے میں مسلمان ایرانی علم ہیئت سے بھی واقف ہوئے، ایرانیوں کے پاس پہلوی زبان میں ایک فلکیاتی جدول ”زیک شترو وایار“ موجود تھی، جسے ”یزدگرد سوم (المقتول: ۶۵۱ء) کے عہد میں شائع کیا گیا تھا، مسلمانوں نے اس کا عربی ترجمہ ”زیج الشاء یاز یج الشہریار“ کے عنوان سے کیا۔

پھر سن ۲۱۲ھ/۸۲۸ء میں بغداد کے ریاضی داں حجاج بن یوسف مطر (المتوفی: ۱۲۴/۸۲۹ء) نے المجسطی کا عربی ترجمہ کیا جو پہلے ترجمہ سے بہتر تھا، تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں مشہور طبیب حنین بن اسحاق (۸۰۹=۸۷۳ء) نے المجسطی کا ایک اور ترجمہ کیا جس کی تصحیح کا کام بعد میں بغداد کے ریاضی داں ثابت بن قرہ الحرانی نے انجام دیا، مجسطی کے یہ ترجمے شامی اور یونانی زبانوں سے کئے گئے تھے، علم ہیئت سے متعلق دوسری یونانی کتابوں اور جدولوں کے ترجمے بھی اسی زمانے میں ہوئے، اس طرح تیسری صدی ہجری کے وسط تک مسلمانوں کے پاس علم ہیئت کے موضوع پر ہندی، ایرانی، یونانی اور شامی زبانوں کا وہ سارا ورثہ آپہنچا جسے دنیا کی مہذب قوموں نے صدیوں میں جمع کیا تھا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں عملی طور پر اس فن میں کارنامے انجام دینے کے لئے افلاک اور اجرام سماوی کے مشاہدے کے لئے مناسب آلات کی مدد سے ترصید کا عمل جنوب مغربی ایران کے مقام جندی نیشاپور میں شروع کیا، ”خلیفہ مامون الرشید“ کے عہد (۱۹۸=۲۱۸/۸۱۳=۸۳۳ء) میں بغداد کے محلہ شناسیہ شاہی حکم کے مطابق نو مسلم انجیر ابوطیب سند علی کی سرپرستی میں ایک رصد گاہ تعمیر کی گئی، مامون ہی کے عہد خلافت میں دمشق کے جبل قاسیوں پر ایک اور رصد گاہ کا قیام عمل میں آیا جس کے سربراہ حکیم یحیی بن منصور (المتوفی: ۱۲۴ھ/۸۲۹ء) مقرر کئے گئے، ان دو رصد گاہوں کے علاوہ بغداد کے تین ماہرین ہیئت احمد بن موسیٰ بن شاکر، محمد بن موسیٰ شاکر، اور حسن بن موسیٰ بن شاکر نے دریائے دجلہ کے کنارے باب الطاق میں اپنے مکان کے اندر ایک رصد گاہ قائم کر رکھی تھی، یہ تینوں آپس میں بھائی بھائی تھے، چوتھی صدی ہجری دسویں صدی عیسوی میں سلطان شرف الدولہ (۳۷۶=۳۷۹ھ/۹۸۶=۹۹۶ء) نے بغداد میں ایک رصد گاہ تعمیر کرائی، جس میں عبدالرحمان الصوفی، ابوالوفاء محمد بن احمد البوزجانی اور احمد الصاغانی کام کرتے تھے۔

مصر میں فاطمی خلیفہ الحاکم کو فلکیات سے دلچسپی تھی، ان کے دور میں قاہرہ کی وہ

رصد گاہ پایہ تکمیل کو پہنچ گئی جس کی تعمیر کا کام ان کے والد نے شروع کیا کرایا تھا، مصر کے سب سے عظیم ہیئت داں ابوالحسن علی بن عبدالرحمن بن احمد بن یوسف صدنی المعروف بہ ابن یونس نے اسی رصد گاہ میں فلکیات پر بڑی اہم تحقیقات انجام دیں۔

سلجوقی سلاطین میں جلال الدین ملک شاہ (۴۶۵ھ = ۱۰۷۲ء / ۴۸۵ھ = ۱۰۹۲ء) نے رے میں ایک رصد بنوائی تھی جس میں عمر خیام (۴۳۰ھ = ۱۰۳۸ء / ۱۱۳۲ء) کی نگرانی میں فلکیات پر تحقیق کی جاتی تھی، بغداد کی تباہی کے ایک سال بعد ہلاکو خان (المتوفی: ۱۲۶۵ء) نے آذربائیجان میں مراغہ کے مقام پر ایک رصد گاہ تعمیر کی، جس کے نگران نصیر الدین طوسی تھے، اس کے بعد ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں تیموری شہزادہ الغ بیک (المتوفی: ۸۵۲ھ / ۱۴۴۹ء) اور الکاشی (المتوفی: ۸۳۳ھ / ۱۴۲۹ء) جیسے عظیم سائنسدان کام کرتے تھے، سمرقند کی رصد گاہ کی پیروی عالم اسلام کے دوسرے شہروں میں بھی کی گئی، صرف ہندوستان میں جے پور، جین، دہلی، متھرا اور بنارس میں پانچ رصد گاہوں کا قیام عمل میں آیا مسلمانوں نے اہم رصد گاہ استنبول میں قائم کی جو ۹۸۳ھ / ۱۵۷۷ء اور ۹۸۵ھ / ۱۵۷۷ء کے درمیان تعمیر ہوئی، ان رصد گاہوں کے علاوہ اسلامی دنیا کے مختلف شہروں میں بھی چھوٹی چھوٹی رصد گاہیں تھیں، جہاں ماہرین فلکیات پر کام کرتے تھے۔

اسپین میں مسلمانوں نے اشبیلہ میں ایک مینار تعمیر کرایا جو مینار اور رصد گاہ دونوں کا کام دیتا تھا، اسپینی ہیئت داں جابر بن ابی الفلح (پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی) نے اسی رصد گاہ میں یونانی تصنیف المجسطی کی اصلاح کا کام انجام دیا تھا۔

ان رصد گاہوں میں مسلمانوں نے فلکیاتی جدولیں مرتب کیں جنہیں زیچ کا نام دیا گیا جو فارسی لفظ سے ماخوذ ہے، پہلے جندی شاپور کی رصد گاہ کے مشاہدات کی بنیاد پر احمد نہاوندی نے ”الزیج المشمول“ تحریر، مامون کے عہد میں بغداد اور دمشق کی رصد گاہوں میں کی گئی تحقیقات کی بنیاد پر حکیم یحییٰ بن منصور ”الزیج الممتحن“ کے نام سے ایک مصدقہ فلکیاتی جدول مرتب کی جو ”زیچ مامونی“ بھی کہلاتی ہے، قاہرہ کی رصد گاہ میں ابن یونس نے ”زیج الحاکمی“ مرتب کی، رے کی رصد گاہوں میں عمر خیام نے

ایک زیچ تیار کی جو ”زیچ ملک شاہی“ کے نام سے معروف ہے، مراغہ کی رصد گاہ میں نصیر الدین طوسی کی نگرانی میں جو زیچ تیار ہوئی وہ ”زیچ ایلخانی“ کے نام سے مشہور ہوئی، سمرقند کی رصد گاہ میں کاشی اور قاضی زادہ رومی نے ”زیچ سلطانی“ کے نام سے ایک فلکیاتی جدول مرتب کی جو ”زیچ سلطانی“ کہلائی، الکاشی نے بھی ایک زیچ اپنے طور پر تیار کی تھی جو ”زیچ الخاقانی“ کے نام سے معروف ہوئی۔

مسلمانوں نے علم ہیئت پر اتنی کچھ کتابیں لکھی اور جدولیں تیار کی جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہیں، صرف کندی نے جو اصل میں فلسفی تھا ہیئت پر بتیس کتابیں تصنیف کی تھیں، مسلمانوں کی یہ کتابیں مشرق و مغرب کے کتب خانوں میں مخطوطات کی شکل میں پڑی ہوئی ہیں، یورپ والوں کی وساطت سے ابھی تک جو کچھ سامنے آیا ہے وہ پورے سرمائے کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے۔

بہر حال مسلمانوں نے جن قوموں سے علم ہیئت اخذ کیا تھا، ان کے یہاں اس کی حیثیت زیادہ تر نظری علم کی تھی، یونان کے علم کا ہر طرف شہرہ تھا؛ لیکن افلاک و نجوم کا مشاہدہ کرنے کے لئے ان کے پاس چند معمولی آلات تھے، مسلمانوں نے سب سے پہلے آلات سازی، آلات تنصیب اور ان کے استعمال کے طرف توجہ دے کر ہیئت کو سائنسی بنیادوں پر کھڑا کیا، الفزاری پہلے شخص ہیں جنہوں نے اصطرلاب تیار کیا، محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اصطرلاب اور اصطرلاب سازی کے موضوع پر دو کتابیں قلم بند کیں، علی بن عیسیٰ الاطرلابی نے اس آلے کی تاریخ تصنیف کی، جابر بن سنان نے رصد کا ایسا آلہ ایجاد کیا، جس نے زاویوں کی پیمائش منٹوں تک کی جاسکتی تھی، اس آلے کو کروی اصطرلاب (Spheical Astrolabe) نام دیا گیا، اصطرلاب کے فن پر مختلف علماء نے کتابیں تحریر کیں، اس کی سب سے ترقی یافتہ شکل ”الزرقالی“ ایجاد کی، جس کا نام ”صحیفہ زرقالیہ“ پڑا اس کی ایجاد علم ہیئت میں بجائے خود ایک ایسا کارنامہ تھا جو مشرق و مغرب کی فلکیاتی تاریخ میں موضوع بحث بن گیا تھا۔ علی بن عیسیٰ الاطرلابی نے ایک اور آلہ سدس (Sextabant) ایجاد کیا جس سے کم سے فاصلہ کی پیمائش کی جاسکتی تھی،

اس کے علاوہ مسلمانوں نے ثالث (Triquetrun) تگونی آلے، عکس ساز آلے، آنکھ کے پہناوے، مزولے (Quaradrant) اور زاویہ گیر (Dioptra) بنائے، صحیح اور درست پیمائش کے لئے ابن سینا نے آج کے ورنیر کی طرح ایک آلہ تیار کیا، وقت کی پیمائش کے لئے مسلمانوں نے کئی طرح کی گھڑیاں ایجاد کیں، گھڑی میں پنڈولم کا استعمال بھی پہلے انہوں نے کیا۔

مسلمانوں کی رصدگاہوں کی تنظیمی خصوصیات اور آلات کی فوقیت کا اعتراف انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار (D.PINGREE) بھی ان الفاظ میں کیا ہے ”موخر زمانے کی مسلم رصدگاہوں مراغہ، سمرقند اور استنبول سے ہمسایہ ملک زیادہ متاثر ہوئے، یورپ کے علم ہیئت میں ان رصدگاہوں کے بار آور اثرات بڑے ہیں، ان اداروں کے متعدد آلات اور تنظیمی خصوصیات کو نایکو براہے کی رصدگاہوں واقع ۱۵۷۶ء (uraniborg) اور ۱۵۸۴ء (Stjernborg) میں اپنایا گیا۔ (۱)

فلکیات کے موضوع پر مسلمانوں نے بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں، ان میں سے کم و بیش سو کتابیں ایسی ہیں جو ہیئت کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں، یورپ والے انہیں کتابوں کی بدولت اس علم سے روشناس ہوئے، ابتدائی دور کے مصنفین میں الفرغانی کی تصنیف ”المدخل إلى علم هیئۃ الأفلاک“ اس لحاظ سے بڑی اہم تصنیف ہے کہ یہ صدیوں تک یورپ میں مستند ترین مآخذ مانی گئی۔ ول دوران رقم طراز ہیں:

”ان میں ایک سائنس دان ”ابو الفرغانی / الفرغانی (نواح: ۸۶۰ء) ماوراء النہر کے رہنے والے ہیں تھے انہوں نے فلکیات کے موضوع پر ایک کتاب تحریر کی جو یورپ اور مغربی ایشیاء میں سات سو سال تک مستند ماخذ رہی۔“ (۲)

۱۔ ابواسحاق ابراہیم بن جندب: ۱۵۷ھ/۷۷۶ء

ابراہیم بن جندب اجرام فلکی کے مشاہدے میں مہارت رکھتا تھا، اس نے فلکیات (Astronomy) میں تحقیقات کیں، علم نجوم میں بھی ماہر تھا اور ایک صناع بھی تھا، چنانچہ اجرام فلکی کے مشاہدے کے لئے اس نے اپنے ذہن و دماغ سے ایک آلہ ”اصطرلاب“ ایجاد کیا، اس کے ذریعہ فاصلہ کی پیمائش بھی کی جاسکتی تھی۔

یہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، بغداد میں تعلیم حاصل کی، آٹھویں صدی عیسوی میں سلطنت عباسیہ کے قیام کے بعد علم ہیئت کی تحقیق و مطالعہ کا آغاز کیا، خلیفہ منصور اور خلیفہ ہارون رشید نے علوم و فنون کی طرف پوری توجہ کی۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابراہیم بن جندب نے علم ہیئت کے مطالعہ کے ذریعے اجرام فلکی کا مشاہدہ کیا، جلدی ہی وہ فلکیات (Astronomy) میں مشاہدے کے ذریعے نئی نئی تحقیقات کرنے لگا۔

وہ دنیا کا پہلا عالی دماغ نجومی (astrologer) تھا، ماہر صناع میکا نک (mechanic) ہونے کے سبب اس نے چاند تاروں اور اجرام فلکی کے صحیح مشاہدے کے لئے ایک نیا آلہ ایجاد کیا۔ اس انوکھے آلہ کو ”اصطرلاب“ کا نام دیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ دور بین کا موجد ابراہیم بن جندب تھا، جس کے جدت پسند دماغ نے مشاہدات فلکی کی ضرورت کے پیش نظر ”اصطرلاب“ ایجاد کیا، جو مدتوں آبرو و بیڑوں میں رائج رہی، گیارہویں صدی عیسوی میں ہسپانیہ کا نامور سائنس داں ابواسحاق بن یحییٰ نقاش الزرقانی نے اس ”اصطرلاب“ کو مزید ترقی دی، اس نئی ایجاد کا نام صحیفہ زرقانیہ رکھا جو بعد میں (Sphacia) کے نام سے یورپ کے آبرو و بیڑوں میں مدتوں استعمال ہوتی رہی، آج اہل مغرب گلیلو (۱۵۶۴ء-۱۶۴۲ء) کو دور بین کا موجد کہتے ہیں، جس نے اصطرلاب کو ترقی دے کر نئی شکل دی۔

”اصطرلاب“ ایک قسم کی دوربین (telescope) تھی، اس دوربین کے

ذریعہ بآسانی چاند تاروں کا مشاہدہ کیا جاسکتا تھا اور ان کے فاصلے کی پیمائش کی جاسکتی تھی۔
اصطربلاب کی بناوٹ اس طرح تھی کہ اس کی دونلکیاں تھیں، ایک نلکی اپنی جگہ پر
نصب یعنی فٹ رہتی تھی اور دوسری نلکی اوپر کی جانب جاسکتی تھی اور دائیں بائیں حرکت کر
سکتی تھی، یہ نلکیاں ایک اونچے (stand) یعنی تپائی پر لگادی گئی تھیں، عجائباتِ فلک کے
مشاہدے کے لئے یہ سیدھی سادی دور بین تھی۔ (۱)

حقیقت یہ ہے کہ اس دور بین کا موجد ابراہیم بن جندب تھا، اس لئے جدت پسند
دماغ نے ضرورت سے مجبور ہو کر ایک نئی چیز بنائی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔

گلیلیو (۱۵۶۴ء-۱۶۴۲ء) جس کو دور بین کا موجد کہا جاتا ہے، اس نے
اس تصور کو لیا اور اصطربلاب کو ترقی دے کر ایک ایسا آلہ بنایا جس میں دیگر سہولتیں پیدا کر
دی تھیں۔ (۲)

۲۔ عباس بن سعید الجوهری: ۲۲۹ھ/۸۴۷ء

عباس بن سعید الجوهری مامون الرشید کا غلام تھا، مامون اس کو بہت چاہتا تھا
اور اپنے پاس رکھتا تھا، الجوهری نے علم ہیئت میں مہارت پیدا کر لی تھی، اس لئے اپنے
مالک کو ایک رصد گاہ تعمیر کرنے پر آمادہ کیا، مامون نے اس کی خواہش کے مطابق
دو رصد گاہیں تعمیر کرا دیں جس کے منتظم بھی منصور تھے۔

مامون نے عباس کو آزاد کر دیا تھا، مگر اس نے اپنے آپ کو مامون سے علاحدہ کرنا
پسند نہیں کیا اور پوری زندگی شاہی محل میں گذاردی، اور یہ مامون کے مقربین میں سے تھا۔

اس نے ہی رصد گاہ کے لئے آلات کی صنعت پر توجہ کی اور اس نے آلات تیار
کئے اور آلاتِ رصدیہ کی صنعت میں کمال پیدا کیا۔

مامون الرشید کے حکم سے دو رصد گاہیں ایک بغداد میں ”شامہ“ کے مقام پر،
دوسرے ملک شام میں ”دمشق“ کے قریب ”قاسیون“ میں تعمیر ہوئیں، دونوں رصد
گاہوں کے لئے آلاتِ رصدیہ کو لقب کرنا اور ان کی دیکھ بھال الجوهری کے ذمہ تھا،

الجوهری تعمیرات کا نگراں بھی تھا۔ (۱)

۳۔ علی بن عیسیٰ اصطربلابی: ۲۲۴ھ-۸۶۴ء

علم ہیئت کا ماہر اور ہونہار صنّاع تھا، زمین سے اجرامِ فلکی یعنی چاند، تاروں
اور سورج کے درمیان کا فاصلہ کتنا ہوگا، اس کی پیمائش کا طریقہ ایجاد کیا، اور آلہ سدس
(sextant) تیار کیا جس سے کم سے کم فاصلہ معلوم کیا جاسکتا ہے، یہ کمپاس کی شکل کا
دائرہ نما ایک آلہ ہے اور آج بھی زیر استعمال ہے اسے ورنیئر اسکیل (Vernier scale)
کہتے ہیں، اہل یورپ نے سولہویں صدی میں یہ آلہ تیار کیا، ۸۶۴ء میں وفات پائی۔

علمی خدمات اور کارنامے

علی بن عیسیٰ اصطربلابی علم ہندسہ (جامیٹری) سے خصوصی لگاؤ رکھتا تھا، اس نے
مشاہدے اور تجربہ کے بعد یہ معلوم کرنا چاہا کہ ستاروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہوگا اور ان
کے اجرامِ فلکی کا زمین سے کتنا فاصلہ ہوگا۔

چنانچہ اس نے بڑی دماغی کاوش کے بعد سدس (sex tant) ایجاد کیا، سدس
کمپاس ہی کی شکل کا دائرہ نما آلہ ہوتا ہے، اس پر زاویے اور درجے بنے ہوئے ہوتے
ہیں، اس میں درجوں سے نیچے منٹوں تک زاویے کی پیمائش کی جاسکتی ہے، یہ بہت نازک
کام ہوتا ہے۔ یہ آلہ اصطربلاب میں نصب ہوتا ہے، چوں کہ اصطربلاب کی صنعت میں
کافی ماہر تھا، اس لئے اصطربلابی کے لقب سے مشہور ہوا۔

اجرامِ فلکی کی تحقیق کرنے والا دور بین سے دیکھتا ہے اور سدس سے فاصلہ معلوم
کرتا ہے، موجودہ زمانے میں یہ کام ورنیئر اسکیل (Vernier scale) سے لیا جاتا
ہے، ورنیئر سے کم سے کم فاصلہ معلوم کر سکتے ہیں، اور اس کی پیمائش کر سکتے ہیں، ورنیئر کو
ایک فرانسیسی انجینئر اصطربلابی کے صدیوں کے بعد یعنی سولہویں صدی میں ایجاد کیا
تھا۔ (۲)

۴۔ جابر بن سنان حرانی ۲۶۱ھ/۹۲۵ء

جابر بن سنان حرانی مشاہدہ افلاک سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا، وہ ایک اچھا صنّاع بھی تھا، مشاہدہ افلاک کے سلسلے میں اس نے آلاتِ رصدیہ تیار کئے، اس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ مشاہدہ کے وقت فاصلہ معلوم کیا جاسکتا تھا، یہ آلہ کروی اصطرباب کے نام سے موسوم ہے (Spherical Astrolober)

جابر بن سنان حران کا باشندہ تھا، اپنے وطن میں تعلیم پائی اور مطالعہ میں مصروف ہو گیا، آلاتِ رصدیہ سے اسے لگاؤ تھا، وہ بغداد آ گیا اور پوری زندگی یہیں گزاری، یہاں اس کے خاندان نے کافی علمی کام کئے اور شہرت حاصل کی۔

علمی خدمات اور کارنامے

جابر ایک ہوشیار صنّاع اور آلاتِ رصدیہ کا ماہر تھا، علمِ ہیئت پر اس نے کافی کام کئے، مشاہدہ افلاک میں جو وقتیں پیش آتی تھیں، جابر نے ان کے حل کی تلاش میں رہتا تھا، آخر بڑی کدو کاوش اور تجربے کے بعد ایک آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ فاصلہ کی صحیح پیمائش کی جاسکے، اس مفید آلہ کا نام اصطرباب (Spherical Astrolober) رکھا، کروی اصطرباب میں یہ کمالِ صناعی تھی کہ زاویے کی پیمائش منٹوں میں کی جاسکتی تھی۔

۵۔ ابو عبید اللہ محمد بن جابر البنانی ۳۰۵ھ-۹۲۹ء

محمد بن جابر البنانی علمِ ہیئت کا ماہر تھا، اس عظیم ہیئت داں نے زمین کی گردش اور سورج سے متعلق تحقیق کی، اس نے بہت سی نئی باتیں دریافت کیں۔

جابر البنانی بھی حران کا باشندہ تھا، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی اور پھر علم و فن کی کتابوں کے ذریعہ مشاہدے میں مصروف ہو گیا، آخر میں وہ حران سے نکل کر بغداد کے قریب آباد ہو گیا۔

جابر نہایت ذہین تھا، ساتھ ہی محنتی اور مستقل مزاج تھا، ذہین اور محنتی جابر نے سائنس میں بڑی لگن سے کام کر کے اس فن میں کافی اضافہ کیا اور وہ بہت جلد بغداد میں

اچھا ریاضی داں اور سائنسدان کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔
علمی خدمات اور کارنامے

جابر البنانی نے اپنی تحقیقات کا مرکز سورج اور زمین، نیز چاند اور تاروں کو بنایا، اس نے زمین کی گردش اور سورج کی رفتار سے متعلق تحقیق کی، جابر نے انحرافِ دائرۃ البروج (Inclination Of Ecliptic) کی صحیح پیمائش کی یعنی سورج کی گذرگاہ کا جھکاؤ $33,1/2$ درجے نہیں ہے؛ بلکہ 32 درجے اور 35 منٹ ہے۔

جابر نے ثابت کیا کہ سورج کی گردش زمین کے جس مدار (Orbit) پر گھومتی ہے، وہ دائرہ کی طرح گول نہیں؛ بلکہ بیضوی شکل کا ہے، جس کے دو مرکز ہیں، سورج ان میں سے ایک مرکز پر ساکن ہے، اس وجہ سے زمین کی گردش کے دوران ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں سورج زمین سے سب سے زیادہ فاصلہ پر آ جاتا ہے۔

فلکیات کے شعبہ میں البنانی کی کی خدمات اور دریافتیں بہت اہم ہیں، انہوں نے اپنے مشاہدات کا سلسلہ 262 ھ/۸۷۷ء سے لے کر 306 ھ/۹۱۸ء تک جاری رکھا، انہیں مشاہدات کی روشنی میں انہوں نے مشہور عالم یونانی ہیئت داں بطلمیوس کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح کی اور ان کے بتائے گئے غلط تخمینوں کی جگہ درست اور صحیح یا کم از کم آج کی تسلیم شدہ مقداروں سے بڑی حد تک قریب قیمتیں دریافت کیں، جن کی چند ایک مثالیں یہ ہیں:

۱۔ بطلمیوس نے اوج شمس (Apogee) اور سورج کے خروج مرکز (Eccentricity) کو غیر تغیر پذیر قرار دیا تھا، البنانی نے ان کی تصحیح کر کے ثابت کیا کہ یہ دونوں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ بطلمیوس نے راس السرطان اور راس الجدی کی تقدیم (Precesion) کی قیمت سو سال میں ”ایک درجہ“ دریافت کی تھی، ثابت بن قرہ نے یہ مقدار ”چھیاسٹھ سالوں میں ایک درجہ“ معلوم کی، البنانی نے ثابت بن قرہ کی بتائی گئی مقدار کی تصدیق کر کے بطلمیوس کی غلطی واضح، یہ تصدیق شدہ مقدار ”اقرب

۳۔ ”إلى الصواب“ ہے، اصل مقدار ”بہتر سال میں ایک درجہ ہے“۔
بطلموس نے سال اعتدالی کا طول 365 دن 5 گھنٹے 55 منٹ 12 سکینڈ بتایا تھا،
یہ اصل مقدار 6 منٹ 28.7 سکینڈ زیادہ ہے، البنانی نے سال اعتدالی کا طول
365 دن 5 گھنٹے 46 منٹ 24 سکینڈ دریافت کیا جو اصل سے صرف 2 منٹ
اور 24.7 سکینڈ کم ہے۔

۴۔ بطلموس نے سورج کے مدار کے لئے خروج مرکز کی قیمت آج کل کی زبان کے
مطابق 0208.0 معلوم کی تھی، چوں کہ خروج مرکز بھی تغیر پذیر ہے، اس لئے
اس وقت اس کی مقدار 0 1 7 5.0 تھی، بطلموس کی مقدار اصل
0 0 3 3.0 زیادہ تھی، البنانی نے یہ مقدار آج کی بول چال کے مطابق
017326.0 معلوم کی تھی جب کہ آج کے حساب سے ۰۸۸ء میں البنانی کے
مشاہدے کے وقت یہ مقدار 016771.0 رہی ہے، البنانی کی دریافت کردہ
قیمت اصل قیمت سے صرف 000555.0 زیادہ ہے۔

۵۔ بطلموس نے طریق الشمس (Ecloptic) کے جھکاؤ کے زاویہ کی قیمت
203-51-20 دریافت کی تھی، البنانی نے یہ مقدار 35-230 بتانچو
درست اور صحیح ہے۔

۶۔ بطلموس نے سورج کے سالانہ گرہن کو ناممکن بتایا تھا، البنانی کے نزدیک یہ ممکن
ہے۔

مزید برآں البنانی پانچ سیاروں کی حرکت کے حالات درج کئے، نیاچاند دیکھنے اور
چاند گرہن کی مقدار معلوم کرنے کے طریقے بتائے، سورج اور چاند کے ظاہری قطر کی پیمائش
اور ماہ شمسی اوجی (Anomalestic Month) میں سورج اور چاند کے تغیر پر روشنی
ڈالی، فلکیات میں انہوں نے دوسری دریافتیں کی ہیں ان کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

یورپ اور امریکہ کے اہل قلم بھی ان کی تعریف کرتے ہیں، ول دوران نے ان
کے مشاہدات کے لئے ”دوسری اور درستی کے لحاظ سے غیر معمولی“ کے الفاظ کہہ کر ان کی

مہارت کا اعتراف کیا ہے۔ (۱)

فلپ کے ہٹی کہتے ہیں:

”البتانی ایک حقیقی محقق تھے، انہوں نے بطلموس کی متعدد غلطیوں کی تصحیح
کی، چاند اور دوسرے سیاروں کے مداروں کے متعلق تخمینوں کو درست
کیا، انہوں نے سورج کی سالانہ گرہن کے امکان کو ثابت کیا اور زیادہ
صحت کے ساتھ طریق الشمس کے جھکاؤ کی مقدار معین کی، نیز انہوں
نے رویت ہلال کا تعین کرنے کے لئے بنیادی نظریات پیش کئے“ (۲)

جابر نے علم ہیئت سے متعلق نقشے (Tables) تیار کئے اور ان نقشوں کے
مطابق زیچ تیار کی (Astronomical Table) اسے زیچ البنانی بھی کہتے ہیں۔
جابر علم ریاضی کا بھی ماہر تھا، اس نے علم ریاضی میں نئی نئی دریافتیں کیں، علم
المثلث یعنی ٹرگنومیٹری میں اس کی دریافتیں نہایت صحیح تھیں۔

جابر نے زاویوں کے جیب (Sinces) کا صحیح نقشہ بنایا اور دیگر نسبتوں کے
ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں بعض اہم مسافتیں دریافت کیں، اس نے زاویوں کے
ظل التمام (Contangents) کے نقشے سب سے پہلے تیار کئے اور ان کو رواج دیا۔
دنیا میں تین ریاضی داں سب سے بڑے سمجھے گئے ہیں، ان میں الخوارزمی
اور البنانی بھی ہے۔

جابر نے علم ہیئت پر اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر زیچ البنانی مرتب کی
تھی، یہ زیچ یورپ اور جرمنی میں بار بار شائع ہوئی، زیچ البنانی کا سب سے بڑا پہلے ترجمہ
۱۱۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ (۳)

۶۔ ابوالحسن علی بن عبدالرحمن یونس صوفی ۳۹۵ھ - ۱۰۰۹ء

ابن یونس صوفی عالی دماغ محقق تھا، یہ رے میں پیدا ہوا، اس کی تعلیم اور اساتذہ

(۱) The age of faith.p.242 (۳) موسوعة علماء العرب والمسلمین: ۸۹

(۲) History of conflict between religion and science.p.116

کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نے تحقیق مطالعہ اور مشاہدے کے ذریعے بہت سے علمی کام انجام دئے، اس دانشور نے المعز، عزیز اور حاکم تین سلاطین کا دور حکومت دیکھا، اور ہر ایک کی قدردانی اور حوصلہ افزائی سے وہ مستفید ہوا۔ سائنس ایکاڈمی کے تحت قاہرہ میں ایک بلند پایہ رصد گاہ بھی قائم کی گئی تھی، اس رصد گاہ کے انتظامات نہایت باقاعدہ تھے اور ماہرین کی جماعت یہاں مطالعہ میں ہمہ وقت مصروف رہتی تھی۔

عالی دماغ ابن یونس صوفی علم ہیئت کا زبردست ماہر تھا، اس نے مطالعہ افلاک میں بڑی ہی دلچسپی لی اور اس کی بعض حیرت انگیز دریافتیں صحیح تھیں۔ وہ آج بھی صحیح تسلیم کی جاتی ہیں، اور آج کے سائنسدانوں نے اسے تحسین و آفرین کہا۔

انہوں نے بویہ سلاطین سے وابستہ رہ کر لگ بھگ ساکن سیاروں کے موضوع پر یہ کتاب تحریر کی ”صور الکواکب الثابتة“ اس میں ۴۸ جہر مٹوں کے علاوہ بعض اہم ستاروں کی تفصیل دی گئی ہے، یہ کتاب مصور ہے، اس میں انسانوں اور حیوانوں کی شکلوں میں آسانی برج دکھائے گئے ہیں، کتاب میں متعدد نقشے اور جدولیں شامل ہیں، ستاروں کے وقوع، جسامت اور رنگت کے بارے میں مصنف نے حقیقی مشاہدات بر مبنی معلومات فراہم ہیں، کتاب میں چمک کے لحاظ سے جو درجہ بندی کی گئی ہے، اسے بعد کے ہیئت دانوں نے بھی سراہا ہے، ”صور الکواکب الثابتة“ سے یورپ کے ماہرین فلکیات نے کافی استفادہ کیا ہے، تیرہویں صدی قشتالہ کے الفانسودہم نے اپنی کتاب مرتب تو ”صور الکواکب الثابتة“ ان کے زیر مطالعہ تھی، پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں اسے وی آنا اور یورینو برگ کی رصد گاہوں میں مستند آخذ کا مقام حاصل تھا، کتاب کا لاطینی ترجمہ تیرہویں صدی سے پہلے کیا گیا تھا، ۸۱۳۱ء میں اسے فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا، یہ کتاب بلاشبہ فلپ کے ہٹی کے الفاظ میں: ”رصدی ہیئت کا شاہکار ہے“ (۱)

علمی خدمات اور کارنامے

ابن یونس صوفی نے مشاہدات فلکی سے جو حیرت انگیز نئی دریافتیں کیں، ان میں سے انحراف دائرة البروج (Inclination of the Ecliptic) کا اہم مسئلہ ہے اس نے اپنی تحقیق اور مشاہدے سے انحراف دائرہ البروج کی قیمت ۲۳ درج ۳۵ منٹ نکالی، جو آج کے دور میں دریافت شدہ قیمت کے بالکل مطابق ہے۔ ابن یونس صوفی نے اپنی تحقیق سے دوسری بات جو دریافت کی وہ یہ تھی کہ اوج شمس (Suns longitude) کا طول فلکی (۸۶) (longitude) درج اور (۱۰) منٹ قرار دیا، موجودہ زمانے کی مصدقہ قیمت بھی اسی قدر ہے۔

تیسری اہم دریافت اس کی استقبال اعترا لین (Prectssion of Equinozts) کی صحیح قیمت معلوم کرنا ہے، اس نے استقبال اعترا لین کی صحیح قیمت (۵۱~۲) سکینڈ (ثانیہ) سالانہ دریافت کی، استقبال اعترا لین کا مسئلہ تو کہیں زیادہ نازک ہے۔

لیکن ابن یونس صوفی کی مہارت تامہ نے اس مشکل ترین مسئلہ کو بھی حل کر لیا، موجودہ زمانے کی دریافت شدہ قیمت اس سے معمولی زیادہ ہے، یعنی (۷۷) (۵۳) (ثانیہ) یہ کوئی فرق نہیں۔ استقبال اعترا لین کی صحیح دریافت سے زمین کے محور کی حرکت کا پتہ چلتا ہے۔ (۱)

۷۔ احمد بن محمد بختانی ۴۳۳ھ - ۱۰۲۴ء

علم ہیئت کا ماہر، گردش زمین (Rotation of earth) کا نظریہ پیش کرنے والا دنیا کا پہلا عظیم سائنسدان اس کے نظریے کے ذریعے اس با مال سائنس داں نے بہت سے مسائل کو حل کر دیا، اور قدیم نظام ہیئت کو بدل دیا، علم ریاضی میں قطع مخروطی (conic section) کے ذریعے ہندسوں تثلیث کا موجد اور با کمال ریاضی داں۔ وطن سبختان، ولادت ۹۵۱ء وفات ۱۰۲۴ء عمر ۷۳ سال۔

علمی خدمات اور کارنامے

گردش زمانے کا نظریہ: سہستانی سے پہلے اکثر مسلم سائنسداں زمین کو ساکن اور اجرام فلکی مثلاً چاند، سورج اور ستاروں کو متحرک مانتے تھے، لیکن یہ نظریہ محدود زمانے تک قائم رہا۔

مغربی سائنس دانوں میں کوپرنکس (copernicec) جو پولینڈ کا باشندہ تھا اور ۱۴۷۳ء - ۱۵۴۳ء میں گذرا ہے، کہا جاتا ہے کہ گردش زمین کا نظریہ سب سے پہلے اسی نے قائم کیا اور آج بھی لاعلمی کی بنا پر لوگ اسی مغربی سائنس داں کو مانتے ہیں۔ لیکن گردش زمین کا نظریہ کوئی نیا نہیں مسلم سائنس دانوں نے بھی اس پر بحث کی ہے، اور اس کو پرکس کے سراسر اسباب دھنا تو قطعی غلط اور سراسر نا انصافی ہے۔

قطع مخروطی کی ایجاد

علم ریاضی میں بھی احمد سہستانی ایک بلند پایہ محقق اور اس کا ماہر تھا، اسے علم ریاضی پر عبور تھا، علم ریاضی میں اس کا ایک خاص کارنامہ ہے، جس نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے وہ یہ ہے کہ ریاضی وسیع تر فن میں علم ہندسہ کی ایک شاخ جسے قطع مخروطی کہتے ہیں (conic section) کے طریقے کو دریافت کیا۔

قدیم ترین زمانے میں ریاضی داں کسی زاویے کی تقسیم با آسانی کر لیتے تھے، چار حصوں میں بھی تقسیم کر سکتے تھے، زاویے کو جیومیٹری کے عام طریقوں سے تین حصوں میں تقسیم کرنا وہ مشکل نہیں ناممکن سمجھتے تھے، اور اس میں ان کو بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

مخروط اس جسم کو کہتے ہیں، جو نیچے سے زیادہ اور چورس ہو مگر اوپر جاتے ہوئے اس کی گولائی کم ہو جاتی ہے، اور بتدریج چھوٹی ہو جاتی ہے، جیسے گاجر کی شکل ہوتی ہے۔

احمد سہستانی کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس اہم مسئلہ کو حل کر کے جسے لوگ ناممکن سمجھتے تھے اسے ممکن بنا دیا، اس نے اپنے خاص نظریے ”قطعات مخروطی“ کے ذریعے اس کا حل ڈھونڈ نکالا، اور زاویے کی ہندسوی تثلیث یعنی جیومیٹری کے ذریعے اس کو تین

مساوی حصوں میں تقسیم کرنے میں قطعات مخروطی کے ذریعے وہ کامیاب ہو گیا۔

۸۔ ابوریحان محمد بن احمد بیرونی

محمد بن احمد البیرونی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ خوارزم شہر سے باہر کے ایک دیہات کا رہنے والا تھا، اس لئے البیرونی کے نام سے مشہور ہوا۔ البیرونی کی ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق ہوئی لیکن ناداری کی وجہ سے وہ ہمیشہ پریشان رہتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے شوق اور حوصلہ بہت دیا تھا، اس لئے وہ علم کے حصول کی طرف ہمیشہ راغب رہا اور باوجود ہزار مشکلات اور مصائب کے کبھی مایوس نہ ہوا، وہ شب و روز علمی مشاغل اور تحقیق و جستجو میں مصروف رہا۔

پھر اسکی علمی قابلیت اور استعداد کا چرچا اب عوام میں ہونے لگا، پھر وہ بادشاہوں کے درباروں سے متعلق ہو گیا، اس طرح اس کی غربت اور افلاسی کے دن جاتے رہے۔

ابوریحان علوم و فنون پر مجتہد نہ نظر رکھنے والا، علم ہیئت کا ماہر، فلسفی، باکمال نجومی اور ساجیات کا ماہر، عظیم تاریخ داں اور جغرافیہ داں (Geographer) زمین کے متعلق گہری تحقیق کرنے والا دھاتوں کی کثافت اضافی معلوم کرنے والا، اور ان کے صحیح فرق کو معلوم کرنے والا، علم ریاضی کا ماہر، ریاضی کے مسئلوں کا نیا حل دریافت کرنے والا، تہا زمین کے محیط کی صحیح تحقیق کرنے والا، ماہر ارضیات (geologist) آثار قدیمہ کا پہلا ماہر (pre-historic)

خوارزم کے قریب ایک دیہات میں ۹۷۲ء میں اسکی ولادت ہوئی اور وفات ۱۰۴۹ء میں غزنی میں عمر ۷۷ سال ہوئی۔

علمی خدمات اور کارنامے

عالی دماغ البیرونی پہلا غیر ہندوستانی ہے جس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کے پرانوں اور مذہبی کتابوں مثلاً جگوت، گیتا، رامائن، مہا بھارت اور منو شاستر وغیرہ کا خود مطالعہ کر کے ان کے اقتباسات عربی زبان میں ڈھال کر اپنی کتابوں میں حوالے دیئے اور اپنی تصانیف کے ذریعے اہل ہند کے لٹریچر کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

المیرونی شب و روز علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف رہتا تھا، تصنیف و تالیف اس کا دلچسپ اور پسندیدہ مشغلہ تھا، اس نے مختلف موضوعات پر جو عملی اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں، ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے اور صفحات کی تعداد کا اندازہ ہزار سے اوپر ہے۔ المیرونی نے علم ہیئت اور ریاضی ہر ایک بہترین کتاب لکھی جس کا نام تفہیم ہے، سدس علمی کتاب میں سوال و جواب، علم ہیئت اور ریاضی کو سمجھا یا گیا۔

قانون مسعودی میں المیرونی نے علم ریاضی کے بعض اہم ترین مسئلے حل کئے ہیں، ایک جگہ اس نے ٹرگنومیٹری سے بحث کی ہے۔

ٹرگنومیٹری (trigonometry) علم مثلث کے مسئلہ کو اس طرح بتاتا ہے کہ ایک خاص نصف قطر کے دائرے کے اندر اگر ایک مساوی کی ضلاع مثلث، یا ایک مربع یا مخمس (pentagon) یعنی پانچ اضلاع، یا ایک سدس (hexagon) شش پہلی یا ایک ثمن (gon) ہیئت پہلی یا ایک معشر اس کونے والی شکل کی اضلاع بنائی جائے تو ان میں سے ہر ایک کا ضلع دائرہ کے نصف قطر کی مقدار میں کیوں کر نکالا جاسکتا ہے، المیرونی نے مثالیں دے کر ان کو حل کیا ہے۔

ایک جگہ المیرونی نظریہ کی وضاحت کی ہے جس کے تحت اس نے زاویے کے ان چھوٹے سے چھوٹے فرقوں سے جیب کی قیمتیں نکالی ہیں، اس کا یہ نظریہ عوامل (fuction) آج کے زمانے میں جس طرح لکھا جاتا ہے، اس کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے، مگر المیرونی نے اسے صرف تین درجہ تک لکھا ہے۔

علم ریاضی کی تاریخ اس کلیہ کو نیوٹن (انگلستان ۱۶۴۲ھ) اور اس کے چند ہم عصر مغربی ممالک کے ریاضی دانوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں گزرے ہیں؛ لیکن درحقیقت مسلم دور کے اس نامور سائنسداں اور علم ریاضی کے ماہر المیرونی نے آج تک سات صدیاں قبل نہ صرف اس کلیہ کو دریافت کیا تھا؛ بلکہ اس نے جدولین مرتب کر کے ان سے عملی کام بھی لیا تھا، المیرونی نے علم ریاضی میں کئی نئے دریافت کئے تھے، جو آج بھی تعلیم کئے جاتے ہیں۔

عرض البلد اور طول البلد کی دریافت

المیرونی نے قانون مسعودی میں دنیا کے مختلف شہروں کے درمیان طول البلد (longitude) کا فرق دریافت کرنے کے اصول و قواعد بتائے ہیں، ان قاعدوں میں کروی ٹرگنومیٹری (spherical trigonometry) کے بعض مسائل کا اطلاق کیا گیا ہے، یہ نہایت مشکل مسئلے ہیں جو ریاضی کے ایک طالب علم کے نقطہ نظر سے خاصے پیچیدہ ہیں۔

المیرونی نے دنیا کے مشہور شہروں کے درمیان اپنی تحقیقات کے مطابق جو طول البلد کا فرق معلوم کیا ہے، اس کی جدول یہاں پیش کیا جاتا ہے، اس نے دنیا کے شہروں کا طول البلد یہ بتایا ہے۔

لاہور: ۳۴ درجے، ۳ منٹ	جرجانیہ: ۱۰ درجے، ۱۳ منٹ
سیالکوٹ: ۳۲ درجے ۵۵ منٹ	شیراز: ۱۵ درجے، ۲۶ منٹ
پشاور: ۳۴ درجے، ۴۴ منٹ	رے: ۱۲ درجے، ۱۵ منٹ
ملتان: ۲۹ درجے	بغداد: ۲۴ درجے، ۲۰ منٹ
بلخ: ۳۰ درجے، ۲۰ منٹ	رقہ: ۳۰ درجے، ۴۱ منٹ
نیشاپور: ۹ درجے، ۲۰ منٹ	اسکندریہ: ۲۶، ۴۲ منٹ

زمین کے محیط کی پیمائش

حوصلہ مند المیرونی نے زمین کے محیط اور قطری پیمائش بھی کی تھی، مامون الرشید کے دور میں سائنس دانوں نے زمین کے محیط کو قطب تارے کے ذریعہ معلوم کیا۔ مامون دور کے سائنسدانوں کا طریقہ بہت صاف اور سادہ تھا یعنی ایک وسیع میدان میں کسی مقام پر قطب تارے کی بلندی کا زاویہ معلوم کر لو اور پھر شمال کی طرف چلے جاؤ اور ساتھ ہی ساتھ بلندی کے اس زاویے کی نئی پیمائش بھی لیتے جاؤ، یہاں تک کہ ایسے مقام پر پہنچ جاؤ جہاں یہ زاویہ پورا ایک ڈگری بڑھ جائے، اب پہلے مقام اور دوسرے مقام

کے درمیان کا فاصلہ ناپو، یہ زمین کے محیط کی ایک ڈگری کی پیمائش ہوئی۔

اب اسے (۳۶۰) کے ساتھ ضرب دو تو زمین کا محیط صحیح صحیح نکل آئے گا، اس محیط کو پانی یعنی (۱۴۱۶۳) پر تقسیم کرنے سے زمین کا محیط پورا معلوم ہو جائے گا اور پھر اس کو اگر دو پر تقسیم کر دیں تو نصف قطر معلوم ہوگا۔

البیرونی کا طریقہ جو اس نے پہلے فطری طور پر نکالا تھا اس سے مختلف تھا، اس طریقے میں پہلے زمین کا نصف قطر معلوم کیا جاتا ہے اور پھر اسے (۱۶۲) یعنی (۳) صرف وہاں استعمال کیا جاسکتا ہے جہاں وسیع میدان ہو اور اس میں ایک بلند ٹیلا ہو؛ لیکن بیرونی اپنے طریقے سے زمین کا محیط (۲۴۷۷۹) میں بتایا جو بہت حد تک صحیح ہے۔

اس نئے دور میں یعنی آج کل کی تحقیق کے مطابق زمین کا محیط (۲۴۹۷۷) میں بتایا گیا جو بہت حد تک صحیح ہے۔

اس نئے دور میں یعنی آج کل کی تحقیق کے مطابق زمین کا محیط (۲۴۸۵۸) میں ہے، اس لحاظ سے البیرونی کی پیمائش میں آج کی نسبت صرف (۷۴) میں کمی ہے اور مامونی کے مقابلے میں میں عہد مامون کی نسبت (۶۱) فی صد کی غلطی تھی؛ لیکن البیرونی کی پیمائش میں یہ غلطی صرف (۳) فی صد ثابت ہوئی، یہ غلطی اس قدیم دور کے حالات کو دیکھتے ہوئے کوئی غلطی نہیں ہے۔

البیرونی کی کتابیں اور یورپ

یورپ کے دانشوروں نے البیرونی کی قدر کی اور اس کی کتابوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

آثار الباقیہ: البیرونی کی کتاب آثار الباقیہ اصل عربی زبان ہی میں مقام لیزگ میں ۸۷۸ء میں شائع ہوئی اور پھر فوراً ہی اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۷۹ء میں لندن میں شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔

کتاب الہند: البیرونی کی ”کتاب الہند“ اصل عربی زبان میں شہر لیزگ سے

۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی اور سال بھر کے اندر ہی اس کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔

قانون مسعودی: اصل عربی میں دائرة المعارف (حیدر آباد نے شائع کیا) اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ بھی یورپ کی زبانوں میں ہو چکا ہے؛ لیکن پوری کتاب کا مکمل ترجمہ اب تک یورپ کی زبانوں میں نہیں ہو سکا، قانون مسعودی میں بہت مشکل مسائل ہیں اور فی اعتبار سے اس کا درجہ بہت بلند ہے غالباً اسی وجہ سے اس علمی کتاب کے ترجمے کی جرات کوئی نہ کر سکا۔

۹۔ ابوالفتح عمر بن خیام

عالی دماغ فلسفی اور شاعر، علم فلکیات اور ہیئت کا زبردست عالم، ماہر ریاضی داں، شمسی اور قمری تاریخوں کی تحقیق کر کے ان میں مفید اصلاحات کرنے والا، دونوں قسموں کی تاریخوں میں مطابقت پیدا کرنے کا طریقہ دریافت کرنے والا، ماہر موسمیات، شمسی مہینوں کے دنوں کا تعین کر کے درست کرنے والا، لیپ سال (leap year) کا موجد اور مصنف، وطن نیشاپور (ایران) ولادت ۱۰۳۹ء، وفات: ۱۱۳۱ء، بعمر ۹۲ سال۔

عمر خیام کا خاندان معمولی حیثیت رکھتا تھا، اس کے والد ابراہیم ایک خیمہ دوز تھے، اور خیام کے نام سے مشہور تھے، خیام کے معنی ہیں خیمہ بنانے اور سینے والے کے، یہ لفظ عمر خیام کے نام کا بھی جزو بن کر مشہور ہو گیا۔

خراسان کا پایہ تخت نیشاپور اس قدیم زمانے میں علم فن کا مشہور مرکز تھا، عمر خیام نے اسی شہر میں آنکھیں کھولیں، سمرقند، بخارا اور بلخ کے اہل علم و دانش کا طوطی بولتا تھا، عظیم الشان مدر سے قائم کئے تھے، ایسے دور میں نیشاپور متعدد درسگاہوں اور علماء کی مجلسوں کی آغوش میں خیام پل کر جوان ہوا، ریاضی، ہیئت اور فلسفہ کے سبق وقت کے نامور اساتذہ سے لئے، حکیم بوعلی سینا کا انتقال عمر خیام کی پیدائش سے دو سو سال قبل ہو چکا تھا، تاہم فضا میں اس کے علم فن کی مہک تازہ تھی، اس جید عالم اور باکمال طبیب کے لائق و نامور شاگردوں کی صحبت عمر خیام کو حاصل تھی، چنانچہ اپنی تصانیف میں اکثر بوعلی سینا کے فلسفے

اور علمی افکار سے متاثر ہو کر اسے اپنا استاد کہہ کر یاد کیا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

مطالعہ اور محنت کا عادی عمر خیام نے علم ریاضی پر بڑی قابلیت سے اپنی پہلی کتاب ”مکعبات“ لکھی؛ لیکن نوجوان عمر خیام کی طرف کسی نے توجہ نہ کی، ارباب اقتدار اور رؤسائے وطن کی اس ناقدری کے باعث ۱۰۶۶ء میں اس نے ترکستان کے دارالسلطنت سمرقند کا رخ کیا، جہاں کے ذی علم رئیس شہر ابوطاہر نے اس جوہر نایاب کی پذیرائی کی، وہ صاحب علم و فضل تھا، علمی شغف رکھتا تھا، اس کا تعلق شاہ ترکستان کے دربار سے تھا، ابوطاہر نے عمر خیام کو ایک جوہر قابلِ سمجھ کر بڑی قدر و منزلت کی، یہ ۱۰۶۶ء کا زمانہ تھا۔

امیر ابوطاہر کو بھی علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی، عمر خیام نے اپنے محسن کے علمی شوق و ذوق دور مطالعہ کو دیکھتے ہوئے علم ریاضی ۱۰۶۷ء میں اپنی مشہور تصنیف ”الجبر والمقابلہ“ مرتب کیا، یہ کتاب سات سال کی محنت میں مکمل ہوئی تھی، اور اس وقت اس کی عمر صرف اٹھائیس سال کی تھی۔

خیام نے اپنی مہارت کی بناء پر ”الجبر والمقابلہ“ میں کافی نئی نئی دریافتیں کیں، اس نے اس کتاب میں کئی نئے قاعدے بھی لکھے ہیں۔

- ۱۔ وہ کعب اور جذر جو عدد کے معادل ہو۔
- ۲۔ وہ کعب اور عدد جو جذر کے معادل ہو۔
- ۳۔ وہ عدد اور جذر جو کعب کے معادل ہو۔
- ۴۔ وہ کعب اور مال جو عدد کے معادل ہو۔
- ۵۔ وہ کعب اور عدد جو مال کے معادل ہو۔
- ۶۔ وہ عدد اور مال جو کعب کے معادل ہو۔

عمر کعب نے ان سب سوالات کو مقطوع مخروطی کے ذریعہ ثابت کیا ہے۔

عمر خیام کی کتاب ”الجبر والمقابلہ“ یورپ میں شائع ہو کر مشہور ہو چکی ہے، مولانا شبلی نعمانی نے اپنے مقالات میں عمر خیام کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نادر کتاب نے

اہل یورپ کے نزدیک خیام کو ریاضی داں اعظم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

عمر خیام کا قابلِ قدر کارنامہ الجبرے میں مسئلہ دورقنی (binomial theorem) کی ایجاد کا اصول ہے، اس مسئلہ کو سب سے پہلے عمر خیام نے دریافت کیا ہے جو اس طرح ہے:

$$+bn -$$

$$na b + a = (a + b)$$

عمر خیام کے اس الجبرے کا ۱۸۵ء میں پیرس میں woepoke نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا، کتاب ”الجبر والمقابلہ“ علم ریاضی میں الجبرے کے موضوع پر چوتھی یا پانچویں کتاب ہے، اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ڈھائی سو برس پہلے محمد بن موسیٰ خوارزمی کی دنیا کے سامنے آچکی تھی، سمرقند میں عمر خیام کی اپنے مربی ابوطاہر کی وساطت سے بہر افروز ہوا، ترکستان کے نامور وزیر نظام الملک اہل علم و دانش کا قدر داں تھا، شاہ ترکستان اور شاہ ایران میں دوستانہ روابط اور قرابت کا دوہرا رشتہ بھی قائم تھا، دس سال سمرقند میں گزار کر عمر خیام اپنے وطن نیشاپور لوٹا جہاں سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔

عمر خیام کو علم طب میں بھی دستگاہ حاصل تھی اور ملک شاہ کے دربار اس کا تعارف بحیثیت طبیب ہوا، ملک شاہ کے خور و سال بیٹے کو چچک کا مرض لاحق ہوا، شاہی طبیبوں کے علاج سے فائدہ نہ ہوا، جس سے ملک شاہ کو بہت تشویش ہوئی، ایسے میں عمر خیام کو طلب کیا گیا، شہزادہ کو اللہ نے شفا دی اور عمر خیام شاہی طبیب کے عہدہ پر مامور ہوا، اس کی شہرت علم ریاضی، ہیئت اور فلسفہ وغیرہ میں بام عروج پر تھی، بحیثیت طبیب وہ بے انتہا مقبول ہوا اور اس کی شہرت عوام و خواص میں ہوئی، ملک شاہ چوں کہ علم دوست بادشاہ تھا، عالموں اور فنکاروں کی قدر و منزلت کرتا تھا۔

ملک شاہ نے عمر خیام کو اصفہان میں نو تعمیر رصدگاہ (observatory) کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا، ایک زکثیر آلات رصد کے لئے خرچ کیا اور سات مشہور ہیئت دانوں کو تحقیق و مشاہدات کے لئے رصدگاہ میں مامور کیا۔

شمسی سال پیمائش و اصلاح

عالی دماغ حوصلہ مند عمر خیام کو اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا موقع ملا، اس نے نہایت احتیاط اور گہرائی سے اجرام فلکی کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا، بہت سی نئی دریافتیں کیں۔

علم ہیئت کے ماہرین کے اہم فرائض میں اجرام فلکی کا مشاہدہ کرنا، دن اور رات، طلوع اور غروب، شمسی سال، قمری سال اور موسم کی تحقیق کرنا شامل ہے۔

خیام نے اس رصد گاہ میں جو مشاہدات کئے اور اپنی تحقیقات سے جو نئی دریافتیں کیں، ان میں سے سب سے زیادہ اہم اور مشکل کام شمسی اور قمری سال کی پیمائش کرنا اور ان میں باہم مطابقت پیدا کرنا، شمسی سال سے مراد وہ پوری مدت اور وقت ہے جس میں زمین سورج کے گرد ایک پورا چکر کاٹ لیتی ہے۔

قدیم ترین زمانے کے یونانی حکماء سال کو پورے تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن کا مانتے تھے اور اسی سے مہینوں اور دنوں کا حساب لگاتے تھے۔

مسلم دور میں سب سے پہلے محمد بن جابر البنانی (المتوفی ۹۲۹ء) جو مشاہدہ افلاک کا ماہر تھا، اس نے شمسی سال کی تحقیق کر کے پورے ایک سال کی مقدار تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن، پانچ گھنٹے، چھیالیس منٹ اور چوبیس سکنڈ متعین کی تھی۔

عمر خیام نے بھی شمسی سال کی کمال احتیاط سے تحقیق کی اور پیمائش کے بعد پورے سال کی مقدار تین سو پینسٹھ دن، پانچ گھنٹے اور انچاس منٹ بنایا، عمر خیام کی تحقیق آج کے دور سے بہت قریب ہے اور زیادہ صحیح ہے، آج کے سائنسداں سال کی مقدار تین سو پینسٹھ دن، پانچ گھنٹے، اڑتالیس منٹ اور ۷۸ سکنڈ بتاتے ہیں۔

عمر خیام کی تحقیق جو آج سے نو برس پہلے محض علمی مہارت اور معمولی آلات کے ذریعے کی گئی تھی اور آج کے اس سائنسی دور میں جب کہ علم فن انتہائی کمال کو پہنچ گیا ہے، دونوں کی تحقیق میں صرف (۱۱ء۳) سکنڈ کا فرق پایا جاتا ہے، یہ معمولی ترین قرب کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

سرکاری مطالبات کی وصولی اور تنخواہوں کی ادائیگی

کھیتوں میں فصلیں ہمیشہ شمسی حساب سے پکتی ہیں، اس لئے ریاست کے خزانے میں شمسی حساب سے رقمیں آتی تھیں؛ لیکن ملازمین کی تنخواہیں اور دیگر اخراجات کا بجٹ قمری حساب سے تھا اور ادائیگی ہوتی تھی۔

شمسی سال کے مقابلے میں قمری سال چھوٹا ہوتا ہے، یعنی قمری سال شمسی سال پورے ایک سال میں گیارہ دن کم ہوتا ہے اور شمسی سال اتنا ہی بڑا ہوتا ہے، اس حساب سے بتیس شمسی برسوں میں تینتیس قمری سال آتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ بتیس برسوں میں ایک سال کا فرق پڑتا ہے۔

ہر تیس سال میں ایک سال بڑھ جانے سے حکومت کو ایک سال کے اخراجات کا نقصان ہوتا تھا؛ کیوں کہ سرکاری اخراجات کا تعین اور ادائیگی تو قمری حساب سے ہوا کرتی تھی، جو بتیس سال میں ایک سال کے اخراجات زیادہ ادا کرنے پڑتے تھے؛ لیکن سرکاری مالیہ اور آمدنی شمسی حساب سے ہوتی تھی، اس وجہ سے حکومت کو ایک سال کے اخراجات زیادہ ادا کرنے پڑتے اور نقصان ہو جاتا تھا، اب اس کے لئے کوئی مناسب تدبیر کرنی ضروری تھی۔

عمر خیام کا کارنامہ

عمر خیام نے شمسی اور قمری سال میں اسی فرق کو اصولی طور پر یوں دور کیا کہ سب سے پہلے حکومت سے یہ اصول منوایا کہ مذہبی اور دینی امور مثلاً حج، عیدین، رمضان وغیرہ کا تعین تو قمری حساب اور ہجری تقویم سے کیا جائے اور دیگر امور سلطنت مثلاً مالیہ کی وصولی، بجٹ کے اخراجات لائقین، بجٹ اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی وغیرہ شمسی حساب اور ایرانی تقویم سے کی جائے۔

شمسی تقویم میں اصلاح

سال میں پانچ دن ایسے آجاتے ہیں جو بڑھ جاتے تھے، اہل عرب ایسے سال کو ”کبیر“ (leapyer) کہتے تھے اور اہل ایران ”دزدیدہ“ (چرائے ہوئے دن) کہتے

تھے، اہل یورپ میں ابھی یہ شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔

خیام نے شمسی تقویم میں ایک بہت بڑی اصلاح کی اس نے ان زائد دنوں کو سال کے بارے میں مہینوں میں کھپا دیا، اس طرح کہ بعض مہینوں کو تیس دن کا اور بعض کا تیس دن کا بنادیا اور ان کا کلی مجموعہ تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن کا ہو گیا۔

لیکن (۳۶۵) دنوں کے بعد بھی سال میں قریباً چھ گھنٹے کی زیادتی آ جاتی ہے اور یہ بچ رہتا تھا، عمر خیام نے ہر چوتھے سال کے ایک مہینے میں ایک دن زیادہ کر دیا، گویا یہ چوتھا سال (۳۶۶) دنوں کا ہو گیا۔

مزید اصلاح کے لئے ۱۳۲ ویں سال کو لیپ کا سال قرار نہ دینے کا ضابطہ بنایا، آج دنیا میں عمر خیام کا اصلاح شدہ شمسی کیلنڈر رائج ہے جو اس کے کمال علم کی روشن دلیل ہے۔

مزید اصلاح کے لئے ۱۳۲ سال کو لیپ کا سال قرار نہ دینے کا ضابطہ بنایا، آج دنیا میں عمر خیام کا اصلاح شدہ شمسی کیلنڈر رائج ہے جو اس کے کمال علم کی روشن دلیل ہے۔ عمر خیام نے اپنی زندگی کے آخری ایام فلسفے کے مطالعے اور شاعری کے مشغلے میں گزارے، وہ نہایت شوق و ظریف الطبع تھا اور حافظہ بلا کا قوی تھا۔

دو جرمن دانشوروں نے جن کا نام جیکب (Jacob) اور وائنڈمن عمر خیام کے سائنسی کارناموں اور اصلاحات پر ایک پر از معلومات مقالہ لکھا جو ۱۹۱۲ء میں جرمنی زبان کے رسالہ ”اسلام“ کی جلد سوم میں بقدر بیس صفحات شائع ہوا، عمر خیام مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبول ہوا، فریڈرک روزی کے مطابق مشرق کے کسی شاعر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ تھی، جتنی کے خیام کو فٹر جبرالڈ نے عمر خیام کی ایک سو ایک رباعیوں کا انگریزی ترجمہ کیا جو اتنے مقبول ہوئے کہ بقول سید صباح الدین عبد الرحمن ”انجیل کی عبارت کے بعد انگریزی دان کی زبان پر یہی اشعار تھے۔“

عمر خیام نے ریاضی میں ایک تہلکہ خیز کنٹری بیوشن کی، جس کو binomial coefficients کہتے ہیں، یورپ میں اس دریافت کا نام (pascal,s triangle) رکھ دیا گیا ہے۔

مذہبی رنگ اور دینی مزاج

آخری ایام کا ذکر علامہ سید سلیمان ندوی یوں تحریر فرماتے ہیں کہ: ”مرض الموت کے بعد آخری لمحوں میں وہ بوعلی سینا کی کتاب الہیات شفا کا مطالعہ کر رہا تھا، جب واحد اور کثیر کی بحث پر پہنچا تو اس پر یہ اثر ہوا کہ اٹھ کھڑا ہوا، لوگوں کو بلا کر وصیت کی، پھر نماز پڑھی، اس درمیان میں کچھ کھایا نہ پیا، آخر عشاء کی نماز پڑھ کر سجدہ کیا اور یہ طوطی خوش نوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔“

عمر خیام ۱۱۳۱ء میں انتقال کیا اور نیشاپور کے قریب گورستان میں تدفین ہوئی۔ محمد خیام کو شعر و ادب پر کمال حاصل تھا، مولانا شبلی رقم طراز ہیں: خیام کی رباعیات اگرچہ سیکڑوں، ہزاروں ہیں؛ لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں جو دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، مسئلہ جبر، توبہ و استغفار، ان میں ایک ایک مضمون کو وہ بار بار ادا کرتا ہے، لیکن ہر دفعہ اس طرح بدل کر کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سامنے خیام کی رباعی پڑھی جاتی تو وہ رو پڑتے۔ (۱)
۱۰۔ حکیم یحییٰ بن منصور (۲۱۴ھ / ۸۳۳ء)

حکیم یحییٰ بن منصور ہیئت داں اور منجم تھا اور دربار میں اسی حیثیت سے وہ بار بار ہوا، حکیم یحییٰ ایک پڑھے لکھے خاندان کا چشم و چراغ تھا، اس کے والد علم ہیئت کے ماہر تھے، علم منجم کا تعلق علم ہیئت سے ہے، اس لئے ہیئت داں نجومی بھی ہوتا ہے، اس دور میں عوام کو علم نجوم سے بڑی دلچسپی تھی، عوام چاند تاروں کے اثرات کے قائل تھے، نجومی چاند، تاروں کو دیکھ کر آئندہ پیش آنے والی باتیں بتا دیتے تھے، اس علم کو علم نجوم، علم جوتش یا انگریزی میں (astrology) کہتے ہیں۔

حکیم یحییٰ منصور نے علم نجوم میں کمال پیدا کیا؛ چوں کہ اپنے فن کا ماہر تھا، دربار میں خوب عزت پائی۔

علمی خدمات اور کارنامے

سائنس کی دنیا میں مامون الرشید کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ایک عظیم رصدگاہ (observatory) بغداد میں شامہ کے مقام پر تعمیر کرائی اور دوسری رصدگاہ ملک شام میں دمشق کے قریب قاسیون کے بلند اور مسطح میدان میں تعمیر کرائی۔ اسی تعمیر میں باکمال ہیئت دانوں کی ایک جماعت مقرر تھی جو سب کی نگرانی کرتے تھے، ان میں حکیم یحییٰ منصور بھی تھا، بغداد کی رصدگاہ دو برس میں کام کرنے لگی، ہر قسم کے آلات مثلاً اصطرلاب وغیرہ نصب تھے، ماہرین کی جماعت حکیم یحییٰ منصور بھی تھا۔ قاسیون (دمشق) کی رصدگاہ جب تیار ہوئی تو حکیم یحییٰ منصور کا تقرر صدر کی حیثیت سے وہاں ہو گیا، حکیم یحییٰ منصور اور ماہرین کی جماعت نے وہاں فلکیات کا مطالعہ اور مشاہدہ شروع کر دیا۔

حکیم یحییٰ منصور نے چاند اور بعض دیگر سیاروں کے متعلق چند نئی دریافتیں کیں، ستاروں کے متعلق زیچ (Astronomical tables) سب سے پہلے تیار کی، جس کا نام زیچ مامونی رکھا، یہ زیچ فلکیات سے متعلق پہلی کتاب ہے۔

۱۱۔ (ابومحمود) حامد بن الخضر الجندی (۳۹۱ھ-۱۰۰۰ء)

ابومحمود حامد بن الخضر الجندی کے حالات زندگی بہت کم دستیاب ہیں، نصیر الدین طوسی کے بیان کے مطابق اس کو خان کا لقب حاصل ہوا تھا، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جندی ماوراء النہر کے دریائے سیر پر واقع قصبہ خندہ کے خواتین میں سے تھا، کچھ مدت تک اس کو بویہ حکمران فخرالدولہ کی سرپرستی حاصل رہی۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابومحمود حامد بن الجندی نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

۱۔ رسالہ فی المیل و عرض البلد (طریق الشمس کا جھکاؤ اور علاقوں کے عرض البلد دریافت کرنے کے بارے میں رسالہ)۔

۲۔ جیومیٹری پر ایک کتاب۔

۳۔ فی عمل الآلة العالمة (یا الآلة الشاملة) جامع آلہ کے طریقہ استعمال میں کتاب۔ نصیر الدین طوسی کے مطابق الجندی نے قانون الہیبت (یعنی کروی مثلثوں سے متعلق مسئلہ جیب زاویہ sine theorem) دریافت کیا، جس نے لاؤ (menelaus) کے قانون کی جگہ لی، دسویں صدی کے سائنس دانوں مثلاً ابوالوفاء اور ابونصر بن علی بن عراق نے بھی مسئلہ جیب زاویہ کی دریافت کا دعویٰ کیا تھا۔ طوسی اپنی کتاب ”شکل القطاع“ میں مسئلہ جیب زاویہ کے لئے الجندی کے حل کا ذکر کیا ہے۔

جیومیٹری میں الجندی نے تمام ثبوت کے ساتھ یہ دریافت کیا کہ وہ مکعب مقداروں کا مجموعہ ایک مکعب مقدار نہیں ہو سکتا۔

سارٹن لکھتے ہیں: ”الجندی جو ماہر فلکیات کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، انہوں نے ثابت کیا کہ دو مکعب عددوں کا مجموعہ مکعب عدد نہیں ہو سکتا“ الجندی نے یہ قاعدہ دسویں صدی میں پیش کیا تھا، مگر اہل مغرب نے اسے فرمٹ (سترھویں صدی) سے منسوب کر کے (Theorem of fermat) کے نام سے مشہور کر دیا۔

فخرالدولہ کی زیر سرپرستی الجندی نے قصبہ رے کے مضافات میں واقع ایک پہاڑی پر جس کا نام ”جبل طروق“ تھا، طریق الشمس (ecliptic) جھکاؤ کی پیمائش کا ایک آلہ تعمیر کیا، اس آلے کو السدس الفخری کا نام دیا گیا، اس آلے کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے۔

۴۰ ہاتھ اونچی دیواریں خط نصف النہار کے متوازی تعمیر کی جاتی ہیں، جنوبی دیوار کے قریب ایک محراب دار چھت میں تین انچ قطر کا ایک شگاف رکھا جاتا ہے، اس سوراخ کے ۴۰ ہاتھ تک گھڑھا کھودا جاتا ہے۔

دونوں دیواروں کے درمیان لکڑی کی بنی ہوئی قوس، جس کا زاویہ ۶۰ ڈگری اور قطر ۴۰ ہاتھ ہے رکھی جاتی ہے، یہ قوس تانبے کے پتروں سے ڈھانپی ہوتی ہے اور اس پر درجوں کے نشانات لگائے جاتے ہیں، قوس کا ہر درجہ ۶۰ منٹ میں اور ہر منٹ مزید

دس حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

چوں کہ چھت کی شگاف داخل ہونے والی سورج کی شعاعیں ایک مخروطی شکل بناتی ہیں، اس لئے قاعدہ کا مرکز معلوم کرنے کے لئے ایک آلہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ آلہ جو ایک دائرہ پر مشتمل ہوتا ہے اور جس کے دو قطر ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتے ہیں، مخروطی شکل کے قاعدہ پر منطبق ہوتا ہے، مخروط کی حرکت کے ساتھ ساتھ اس کو بھی حرکت دی جاتی ہے؛ یہاں تک کہ اس کا مرکز خط نصف النہار پر آجائے، شاقول اور ارتفاع شمس کے درمیان بننے والی قوس سورج کے ارتفاع کے جیب مستوی (cosine) کے برابر ہوتی ہے۔

ابو محمود حامد الخضر الجندی ۱۰۰۰ء میں فوت ہوا۔

۱۲۔ عباس بن فرناس (۲۷۷ھ-۸۸۷ء)

عباس ابن فرناس اپنی اختراعات اور ایجادات کی بدولت بہت بڑی شہرت حاصل کی، اہل مغرب کو مشرقی علوم سے روشناس کرایا، وہ پورے ہسپانیہ میں واحد شخص تھا جو تحلیل ابن احمد کی علم عروض سے متعلق تصنیف سمجھتا تھا۔

ابن فرناس عراق کا سفر کیا اور وہاں علمی وادبی حلقوں اور اداروں کو دیکھا، واپسی پر وہ اپنے ساتھ فلکیات کی مشہور کتاب ”سند ہند“ بھی ہسپانیہ لے آیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابن فرناس سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اڑنے کی کوشش کی اس نے اڑنے کے لئے ایک غلاف تیار کیا، جس میں پر اور مصنوعی پروں کے ساتھ ایک بلند چٹان سے کود پڑا؛ لیکن اس کی پرواز زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو سکی، نیچے اترتے ہوئے وہ زخمی ہو گیا۔

عباس ابن فرناس اپنے گھر میں ایک سیارگاہ بنائی تھی جس میں چاند ستاروں اور بجلی کی گرج وچمک کا مصنوعی ماحول پیدا کیا گیا۔

عباس ابن فرناس نے ایک خاص قسم کی گھڑیال بنایا اور اسفیر یعنی کرہ فلکی کی بھی

ایجاد کیا۔ بلور کو ہی (rock crystal) کی دریافت بھی اسی نے کی، جن کتابوں میں اس کی اختراعات و ایجادات کا ذکر کیا گیا تھا، وہ اب اصل صورت میں دستیاب نہیں، ایک حوالہ کے مطابق ”المقبس“ کے مصنف نے ابن فرناس کے کئی تذکرے اور اشعار شامل تحریر کئے، اسی مآخذ کے مطابق اس گمشدہ کتاب ”یعین المقبس“ کا ایک مخطوطہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے، مشہور مؤرخین ابن سعید اور مقری کے مطابق ”وہ اندلس میں بلور کو ایجاد (دریافت) کرنے والا پہلا سائنسدان تھا، اس بیان سے بہت سی باتیں اخذ کی جاسکتی ہیں؛ لیکن اتنا ضرور ہے کہ بلور کاٹنے کا طریقہ ابن فرناس ہی نے متعارف کرایا، اس سے یقیناً بلا دشرقیہ (خصوصاً مصر) کو کو انز کی برآمد پر بہت اثر پڑا ہوگا، کیوں کہ اب یہ حقیقت سامنے آگئی تھی کہ بلور کو وہیں کاٹ کر استعمال میں لایا جاسکتا ہے جہاں سے یہ نکالا جاتا تھا، اس دریافت کے باوجود شیشہ سازی کی صنعت پر کوئی اثر نہ پڑا۔

اس نے ہوا میں اڑنے کا تجربہ کیا، اس مقصد کے لئے پروں والی ایک مشین بنائی جس کی مدد سے ذرا سا اڑنے میں کامیاب ہو گیا، اس نے وقت معلوم کرنے کا ایک آلہ بھی بنایا جو مشقال کہلاتا ہے، عباس بن فرناس نے اپنے گھر میں کائنات کا ایک ماڈل بنایا تھا، جس کے متعلق ”المقری“ کے الفاظ ہیں:

”اس نے اپنے گھر میں ہیئت آسمانی بنائی تھی، جس میں ستارے ابر، برق، رعد معلوم ہوتے تھے، اس کے ماڈل کو آج کے دور میں (Planetarium) کہا جاتا ہے۔ (۱)

اس مشہور سائنس دان عباس ابن فرناس کا انتقال ۸۸۷ء میں ہوا۔ (۲)

۱۳۔ (ابوالحسن) عبدالرحمن بن عمر الرازی (۳۷۷ھ-۹۸۶ء)

امام ابو الحسن عبدالرحمن بن عمر الرازی ہے؛ لیکن الصوفی کے نام سے زیادہ

(۱) اسلام۔ سائنس اور مسلمان: ۲۷۲

(۲) عظیم مسلم سائنسدان: ۳۵۴-۳۵۵

معروف تھے، ۲۹۱ھ/ ۹۰۳ء کو پیدا ہوئے، اور ۳۷۶ھ-۳۸۶ء میں ایران میں فوت ہوئے، حالات زندگی کی تفصیلات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایران اور بغداد میں بویہ سلطنت کے حکمرانوں کے ساتھیوں میں تھے، خصوصاً عضد الدولہ کے ساتھ اس کا تعلق نہایت ہی دوستانہ تھا، الصوفی کی چند تحریروں میں عضد الدولہ کے علاوہ حکمران خاندان کے مزید تین بادشاہوں کے نام بھی ملتے ہیں۔

علمی خدمات اور کارنامے

ساکن ستاروں کا مشاہدہ اور ان کی تفصیلات کو بیان کرنے میں الصوفی کو بڑی شہرت حاصل تھی، اس موضوع پر اس نے اپنی تحقیقات اور مشاہدات کو اپنی کتاب ”کتاب صور الکواکب الثابتہ“ میں قلمبند کیا اور اسے عضد الدولہ کے نام منسوب کیا۔

اس کتاب میں الصوفی بطلموس کی مرتب کردہ ستاروں کی زنج کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے اور ساتھ ہی اپنے مشاہدات کے اختلافی یا اضافی نتائج کو شامل کیا ہے، الصوفی کی یہ کتاب بطلموس کے مشاہدات و خیالات پر پہلا تبصرہ ہونے کے باعث اسلامی علم ہیئت میں صدیوں تک مستند تسلیم کی جاتی رہی، حتیٰ کہ اس کے اثرات قرون وسطیٰ کے مغربی سائنسی علوم پر بھی پڑے، ان دونوں مغرب میں الصوفی کو ”ایزوفی“ (azopi) کے نام سے جانا جاتا تھا۔

سائنسی نقطہ نظر سے الصوفی کی ”کتاب صور الکواکب الثابتہ“ اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں قرون وسطیٰ کے بیشتر ہیئت دانوں کی تحقیقات کے برعکس ستاروں کے حقیقی مشاہدات پر مبنی گراں قدر تحریریں موجود ہیں، جب کہ ازمینہ وسطیٰ کے اکثر فلکیات داں بطلموس کی زنج میں درجہ خطوط طول البلد میں ہی صرف مستقل مقداروں کو جمع کرتے اربوں بطلموس کی ترتیب شدہ تفصیلات کو جوں کا توں دہرا دیتے تھے۔

الصوفی کی اس کتاب کا ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں کئی صدیوں سے

رانج ستاروں کے عربی ناموں کی قطعی کوکبی تطبیق دی گئی ہے، اس سے قبل یہ عربی نام صرف لسانیات کی تحریروں میں ملتے تھے؛ لیکن اس میں ستاروں کی قطعی تطبیق شامل نہ تھی، الصوفی نے فلکیات کی رو سے تطبیق قائم کرنے کی بہت کوشش کی، اگرچہ اسے ہر مرتبہ کامیابی نہ ہوتی، تطبیق کے مسئلے پر اس کی تحقیق کو بعد میں آنے والے ہیئت دانوں نے معیار بنایا؛ حتیٰ کہ اس کا اثر جدید کوکبی اصطلاحات پر بھی پڑا۔

الصوفی کی ایک مفصل تصنیف کا نام ”کتاب العمل بالاصطرلاب“ ہے، دوسری کتابوں کے انگریزی عنوانات یہ ہیں:

introduction to the science of astrology

book on the use of the celestial.

بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ الصوفی نے چند فلکیاتی آلات بھی ایجاد کئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس کا بنایا ہوا چاندی کا ایک سماوی کرہ ۱۰۴۳ء کے لگ بھگ مصر میں محفوظ تھا۔ (۱)

۱۴۔ (ابوعبداللہ) محمد ابن عیسیٰ المہابانی (۲۶۷ھ-۸۸۰ء)

المہابان کا پورا نام ابوعبداللہ محمد ابن عیسیٰ المہابان ہے، وہ ایران کے ایک علاقہ جس کا نام ماہان ہے میں پیدا ہوئے، اسی نسبت سے وہ ماہانی کہلائے، انہوں نے زیادہ عرصہ بغداد میں گزارا، تاریخ پیدائش کا کوئی یقینی حوالہ نہیں، البتہ ۸۶۰ء کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

المہابانی کی زندگی کے بارے میں ہماری معلومات کا بڑا ذریعہ وہ اقتباسات ہیں، جو المہابانی کی ایک غیر معروف تصنیف سے تعلق رکھتے ہیں، یہ اقتباسات ابن یونس کی ”جدول عالمی“ میں المہابانی ہی کی کسی نامعلوم کتاب سے لئے گئے ہیں، اس کتاب میں ابن یونس ایسے مشاہدات بیان کرتا ہے جو المہابانی نے ۸۵۳ء اور ۸۶۶ء کے درمیانی عرصے میں بیان کئے، یہ مشاہدات اجرام فلکی کا قرآن (دو اجرام فلکی کا ملنا) اور سورج

اور چاند گرہن سے متعلق تھے، اس میں الماہانی چاند گرہن کے حوالے سے بتاتا ہے کہ اس نے اس گرہن کے شروع ہونے کا وقت اصطرباب جیسے آلہ کی مدد سے معلوم کیا ہے اور اس کی صحت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے تین مسلسل چاند گرہنوں کے شروع ہونے کا وقت اپنے حساب سے نکالا اور پھر گرہن کے اوقات سے اس کا مقابلہ کیا تو صرف نصف گھنٹے کا فرق تھا، یعنی چاند گرہن اس کے اندازے کی نسبت آدھ گھنٹہ بعد میں شروع ہوا۔

الماہانی زیادہ تر حساب کے میدان میں تحقیق کا کام کیا، خیام کے خیال میں الماہانی ہی وہ پہلا سائنسدان ہے جس نے ارشمیدس کے ایک اہم مسئلے کا حل الجبرے کے اصولوں کے مطابق نکالنے کی کوشش کی، یہ مسئلہ ایک کمرے کو کسی مستوی کے ذریعے ایسے حصوں میں تقسیم کرنے سے متعلق تھا جن کے حکم آپس میں دی گئی نسبت کے مطابق ہوں، یہ مسئلہ کروں اور بیلنسوں سے متعلق اس کے ایک رسالہ میں بیان کیا گیا ہے۔

الماہانی نے اقلیدس کی کتاب ”اولیات“ کی پہلی، پانچویں، دسویں اور تیرہویں فصلوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں، ان میں سے پہلی فصل میں دیئے گئے چھبیس مسئلوں پر لکھی جانے والی شرح نہیں ملی، یہ مسئلے ایسے تھے جنہیں کسی مہمل میں تحویل کے بغیر ثابت کیا جاسکتا ہے، اسی طرح دسویں فصل جو غیر ناطق نسبتوں سے متعلق تھی، کی شرح کا ایک حصہ، تیرہویں فصل کی غیر معروف عبارتوں کی وضاحت اور تین مختلف رسالے، فصل پنجم بھی اس وقت نایاب ہے، چونکہ فصل پنجم جو تناسب کے نظریے سے متعلق ہے، ترکیبی انداز میں لکھی گئی تھی اور اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ تناسب کا اصول کیوں کرو جود میں آیا، اس لئے عرب ریاضی داں اس کی تعریف نمبر ۵ جو بنیادی نوعیت کی ہے سے بالکل غیر مطمئن تھے؛ تاہم انہوں نے اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا اور اسے ایک سائنسی اصول کے طور پر تسلیم کر لیا، رفتہ رفتہ انہوں نے (egibmultiple) کی اقلیدسی تعریف کو (anthyphairitic pre-eudoxian) تعریف سے بدل دیا، یہ تعریف قدروں (magnitudes) کا مقابلہ ان کے کسر مسلسل میں پھیلاؤ کے لحاظ سے کرتی تھی

الماہانی کے رسالے میں انتہی فریک تصورات صاف صاف انداز میں بیان کئے ہیں، اس سلسلے میں وہ ثابت بن قرہ کا حوالہ بھی دیتا ہے، الماہانی کے خیال میں نسبت ”دورقوں کا ایسا باہمی طریقہ عمل ہے جس میں اقلیدس کے مشترک مقسوم علیہ اعظم کے معلوم کرنے کے طریقے سے ان کا موازنہ کیا جائے“ اس کے نقطہ نظر سے اگر اس عمل میں سامنے آنے والی حاصل تقسیم کے دو سلسلے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں تو رقموں کے یہ دو جوڑے باہم متناسب ہوں گے، النیری نے بعد میں بعینہ یہ نظریہ پیش کیا، ان میں سے کسی بھی نظریے کا اقلیدس کی اس تعریف سے متعلق قائم نہیں ہوتا جو سب سے پہلے ابن الہیثم نے پیش کیا تھا۔ (۱)

۱۵۔ نصیر الدین الطوسی ابو جعفر (۶۷۳ھ/۱۲۷۷ء)

یہ عظیم ریاضی داں اور ماہر ہیئت گذرا ہے، نصیر الدین طوسی کی ولادت طوس ملک خراسان کے ایک شہر میں ہوئی، اس نے اپنے استاذ ابن یونس کمال الدین یونس سے علوم اور فلسفہ کی تکمیل کی، ایک ہمہ داں محقق اور نجومی کی حیثیت سے اس کی شہرت جلد ہی فارس تک پھیل گئی اور کوہستان کے اسماعیلی گورنر نے ناصر الدین عبدالرحمن ابن علی منصور نے اس کو آخر کار اغواء کر کے الموت روانہ کر دیا، جہاں ایک مدت تک اسے بدرجہ مجبوری قیام کرنا پڑا، آخر کار ۱۲۵۶ء میں منگولوں کے فاتح ہلاکو خاں نے اسے وہاں سے آزادی دلائی، بعد ازاں وہ ہلاکو کا مشیر اور وزیر اور اوقاف کا محافظ مقرر ہوا، ہلاکو کے انتقال کے بعد اس کے جانشین اب کے زمانے میں بھی اس کا یہ اثر و رسوخ قائم رہا؛ یہاں تک کہ ۲۶ جون ۱۲۷۴ء میں اس نے بغداد میں انتقال کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

علم فلکیات میں نصیر الدین طوسی کی شہرت اس تحقیق کی بدولت ہے جو انہوں نے رصدگاہ مراغہ میں کی ہے، بغداد میں نویں صدی میں عباسی خلیفہ مامون الرشید کا قائم کردہ ”بیت الحکمۃ“ اور قاہرہ میں گیارہویں صدی عیسوی میں فاطمی خلیفہ الحکم فلکیاتی رصدگاہ مشرقی علوم و فنون اور فلکیاتی تحقیق کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس رصدگاہ میں بہترین آلات

مہیا کئے گئے تھے اور اس کے لئے بغداد سے لوٹ کر ۴۰۰ کتابیں فراہم کی گئیں تھیں۔
طوسی ”تذکرہ“ کے موجد مانے جاتے ہیں، پندرہویں، سولہویں صدی میں یہ
آلہ مغرب میں بہت زیادہ مقبول تھا۔ مسلم سائنسداں نے اجرام فلکی کے مشاہدہ کے لئے
مختلف قسم کے آلات بنائے، مراغہ کی فلکیاتی رصدگاہ میں مختلف مقاصد کے لئے چھلوں
سے بنائے ہوئے مختلف قسم کے آلات بنائے، ان میں اسے ایک جس کا زیادہ استعمال
ہوتا ہے پانچ چھلوں پر مشتمل تھا، جب الفانسو کاسٹیلانے اگلے گوں بنانا چاہا تو اس وقت
بہترین سمجھا گیا تو عربوں سے اس کی ضروری معلومات حاصل کیں۔

مراغہ کی فلکیاتی رصدگاہ میں جو خالص فلکیاتی تحقیق ہوتی، وہ دو عہد تک جاری رہی
اور اس کے نتیجے میں ”الزج والجان“ جسے خانی تقویم بھی کہتے ہیں عالم وجود میں آئی،
مشرقی ممالک اور خصوصاً چین میں وہ بہت مقبول ہوئی، نصیر الدین الطوسی نے یہ تقویم
بارہ سال کی محنت شاقہ کے بعد ۷۲۷ء میں مرتب کی، علوم ریاضی میں بھی نصیر الدین بیش
بہا تصانیف چھوڑیں، خصوصاً جیومیٹری اور علم مثلث میں اس کی تصنیف اعلیٰ درجہ کامیاب
ہوئی، انہوں نے حساب اور الجبرا میں بھی کتابیں لکھیں، جن میں ”الجبر والمقابلہ“ بہت
مشہور ہے۔

علم فلکیات میں اس کی مشہور تصنیف ”کتاب تذکرۃ الناصر“ ہے جس میں فلکیات
کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے، مشرقی مغربی زبانوں میں اس کی متعدد تفسیریں اور تبصرے لکھے
ہیں۔ اس کے علاوہ بھی نصیر الدین نے علم فلکیات پر کئی اور کتابیں لکھی ہیں، ان میں
”زبدۃ الحی“، ”کتاب التحصیل فی النجوم“، ”غروب و طلوع“، ”سیارہ“،
”رات دن“، ”سورج اور چاند“ اور ”چاند کا حجم اور ان کے درمیان فاصلہ“ وغیرہ وغیرہ قسم
کی بارہ کتابیں لکھی ہیں۔

نصیر الدین الطوسی کی علم ہیئت و معرفت کا سرچشمہ کتاب ”تذکرۃ فی علم
الہیئت“ ہے، جس کا لاطینی ترجمہ (figure) کے عنوان سے چودھویں صدی میں کیا
گیا، اس کتاب میں الطوسی نے بہت سی پرانی، فرسودہ تھیوریز پر کڑی تنقید کی، نیز اس

نے اپنا تیار کردہ ماڈل (planetary molder) پیش کیا، کوپرنیکس نے اپنا اس
سے ملتا جلتا ماڈل پانچ سو سال بعد پیش کیا، الطوسی نے مراغہ (آذر باعجان) میں
۱۲۶۲ء میں رصدگاہ تعمیر کی، جس میں علانہ سائنسی آلات کے ایک بارہ فٹ لمبا قواڈرنٹ
(Quadrant) اور ایک (Azimuth) تھا، جسے اس نے خود تیار کیا تھا، اس نے
بارہ سال کی دیدہ ریز شب و روز کی محنت کے بعد ستاروں کی (زیچ الخانی) تیار کی، جس
میں ۹۹۰ ستاروں کی کیٹلاگ تھی، کتاب ”تذکرۃ فی علم الہیئت“ میں اس نے
چاند اور کروں کی حرکت (مرکری اور ونس) پر بطلمیوس کے فرسودہ نظریات کو رد کر کے
ایک جدید سسٹم تجویز کیا، جس کے مطابق کروں کے مدار بیضوی بنتے تھے، اس کو بنیاد بنا
کر جوہانس کیپلر (heliocentric) نے اپنا جدید نظریہ (یعنی آفتاب کا مرکزی ہونا)
پیش کیا تھا۔ (۱)

جدید محققین جیسے ایڈورڈ کینیڈی اور آٹونیو گے برگر نے تسلیم کیا ہے کہ کوپرنیکس
(وفات ۱۵۴۳ء) نے جدید اسٹرانومی کی جو عمارت تعمیر کی تھی وہ صرف اقلیدس کی
کتاب ”عناصر“ اور جالینوس کی کتاب ”المجسطی“ کے مطالعہ سے ہی ممکن نہ ہوئی تھی، بلکہ
اس میں دو تھیوریز کا بہت دخل تھا، یہ تھیوری کوپرنیکس سے تین سال قبل اسلامی ممالک
میں وضع کی گئی تھی جن کا مقصد یونانی علم ہیئت کی اصلاح تھا۔ تھیوری آف نصیر الدین کا
نام tusi couple بھی ہے، جسے عالم بے بدل نصیر الدین الطوسی نے ۱۲۷۷ء میں
وضع کیا تھا، اس تھیوری کی وضاحت کے لئے انٹرنیٹ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، جہاں
اس موضوع پر معلومات کا بیکراں ذخیرہ موجود ہے، مختصر یہ کہ یہی تھیوری کوپرنیکس نے
سولہویں صدی میں اپنی شاہکار کتاب میں پیش کی اور جہاں الطوسی نے اپنی ڈایا گراما
میں ”الف“ لکھا تھا، کوپرنیکس نے اسے ”A“ لکھا، جہاں الطوسی نے ”ب“ لکھا تھا اس
نے ”B“ لکھا اور ہو بہو یہ ڈایا گرام پیش کیا۔

اس سلسلہ کی دوسری تھیوری کا نام الازدی ہے تھیوریوم al urdi ہے جو محی الدین

الازدی (وفات ۱۲۶۶ء) نے ۱۲۵۰ء میں پیش کیا تھا، حیرانگی کی بات ہے کہ یہی تھیورم کو پرنیکس کی کتاب میں تین سو سال بعد نظر آتا ہے، طرفہ یہ کہ الازدی نے یہ تھیورم ایک نئے تصور کی صورت میں پیش کر کے اس کا حسابی ثبوت بھی پیش کیا، جب کہ پرنیکس نے اس کا ثبوت پیش نہیں کیا۔

مسلمان ریاضی دانوں کو اقلیدس کے پانچویں مفروضے کو دریافت کرنے کا بہت شوق تھا، اس ضمن میں نصیر الدین الطوسی نے ایک جیومیٹرک کنسٹرکشن دریافت کیا، الطوسی کی اس دریافت کو نیوٹن سے پہلے، برطانیہ کے عظیم ریاضی داں جان والس (۱۷۰۳-۱۶۱۶) نے اپنی ریسرچ میں استعمال کیا، اس کے بعد ایک اور ریاضی داں (۱۶۳۳-۱۶۶۷) sacchri نے بھی استعمال کیا، مگر کسی نے بھی اس کا کریڈٹ الطوسی کو نہ دیا۔ (۱)

۱۶۔ ویجن بن رستم الکوهی (ابوہل القوی) (۳۹۱ھ-۱۰۰۰ء)

ابوہل ویجن ابن رستم طبرستان کے پہاڑی علاقہ القوہی یا کوہی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے یہاں حاصل کی، پھر بغداد کا رخ کیا، مشہور بویہی خلیفہ عضد الدولہ اور اس کے بعد اس کے جانشین شرف الدولہ نے القوہی کی بہت عزت افزائی کی اور سائنسی تحقیقات کے لئے مقرر کیا۔

اس کی شہرت کی ابتداء شرف الدولہ کے ۹۸۸ء میں اسے سات سیاروں کے مشاہدہ کے لئے دیگر سائنسدانوں کی ایک ٹیم کے ساتھ مقرر کرنا تھا، یہ رصدگاہ شاہی محل کے باغ میں تیار کی گئی اور اس میں القوہی ہی کے بنائے ہوئے آلات نصب کئے گئے، انہیں اس رصدگاہ کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا، جون ۹۸۸ء میں یہاں پہلی مرتبہ مشاہدہ کیا گیا، اس موقع پر ان کے علاوہ دیگر سائنسدان اور بھی تھے، انہوں نے نہایت درستگی کے ساتھ برج سرطان میں سورج کے داخل ہونے کا حساب لگایا، اس کے تقریباً تین ماہ کے بعد سورج کے برج میزان میں دخول کا مشاہدہ بھی کیا گیا۔

البیرونی نے بھی لکھا ہے کہ ۹۸۹ء میں شرف الدولہ کی وفات کے ساتھ ہی رصدگاہ کی سرگرمیاں بھی ختم ہو گئیں۔

القوہی جسے عمر خیام ایک عظیم ریاضی داں قرار دیتا ہے نے زیادہ تر جومیٹری کے میدان میں خدمات انجام دی ہیں، اس نے زیادہ تر جومیٹری کے مسائل کو حل کیا ہے جنہیں دو سے زیادہ درجے کی مساواتوں میں تحویل کیا جاسکتا ہے۔

نصیر الدین الطوسی نے ارشمیدس کی تصنیف ”کرہ اور بیلن“ کے ساتھ ایک ضمیمہ منسلک کیا ہے اور اس میں درج ذیل نو تحریر کیا ہے ”کسی دیئے گئے کرے کے برابر ایک کروڑ قطعہ بنانے کے لئے ارشمیدس کے بیان کردہ مسلوں سے مشابہ لیکن ان سے کسی قدر زیادہ مشکل مسئلہ القوہی نے ایک متساوی الجوانب ہڈولوی اور قطع مکانی کے تقاطع سے دو نامعلوم لمبائیاں تشکیل دیں اور ان شرائط پر سختی سے بحث کی جن کے تحت اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا“

”رسالة في استخراج ذی المسبوع المتساوی الاضلاع في دائرة“ میں بھی اسی صحت کو پیش نظر رکھا لیا ہے اور اس میں بیان کیا گیا طریقہ اس طریقے کے نسبت زیادہ مکمل ہے جو ارشمیدس سے منسوب کیا جاتا ہے، القوہی کے طریقے میں زاویاتی نسبت ۴:۲:۱ کی حامل مثلث معلوم کرنے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

”رساله في استخراج مساحت المجسم المکانی“ میں بھی القوہی نے ارشمیدس کی نسبت سادہ اور واضح حل پیش کیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ وہ اس موضوع پر صرف ثابت ابن قرہ کی تحریر سے متعارف تھا، اور تین مسلوں میں اس نے زیادہ مختصر اور شستہ طریقہ پیش کیا ہے، ان طریقوں میں سے کسی میں بھی ایک معین کے گرد قطع مکانی کی گردش سے پیدا ہونے والے مکانی مجسموں (paraboloids) کا حساب نہیں لگایا، یہ کام سب سے پہلے ابن الہیثم نے کیا جو ثابت اور القوہی کی تحریروں سے متاثر تھا، اگرچہ القوہی کا طریقہ نامکمل تھا؛ لیکن ابن الہیثم اس سے بے حد متاثر نظر آتا ہے۔

القوہی وہ پہلا اسکالر ہے جس کے یہاں مخروطی پرکار کا بیان ملتا ہے، اس پرکار کی

علم ریاضی میں مسلمانوں کے کارنامے

(۱) احمد بن عبد اللہ حبش حاسب (۲۱۲ھ/۸۳۰ء)

احمد عبد اللہ فن ریاضی کا ماہر تھا، وطن ایران کے کسی علاقے میں تھا مگر بغداد آگیا، ہارون الرشید کا زمانہ تھا، ہر طرف علم و فن کے چرچے تھے، اہل علم و فضل کی قدردانیوں کے سبب ہر طرف سے صاحبان علم و کمال اٹھ چلے آ رہے تھے، احمد عبد اللہ حاسب نے بھی عزت کی جگہ حاصل کر لی، حاسب نے مامون الرشید کا زمانہ بھی دیکھا۔

حاسب کو علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی اور علم حساب میں تو کمال رکھتا تھا، اس لئے ”حاسب“ کے لقب مشہور ہوا یعنی حساب کرنے والا۔

علمی خدمات اور کارنامے

احمد عبد اللہ حاسب فن ریاضی کا ماہر تھا اور علم ہندسہ میں اسے کمال حاصل تھا، اس فن میں اس نے کئی دریافتیں کیں، علم المثلث یعنی ٹرگنومیٹری (Trigonometry) کا محقق اور زاویے کی چھ مشہور نشستوں میں فصل جیب (co - tangent) کے طریقے دریافت کرنے والا گذرا ہے، اس نے قاطع (Secant) کو پہلی مرتبہ معلوم کیا اور ٹرگنومیٹری میں اسے درج کیا۔

حاسب نے علم ریاضی میں ایک بہت بڑا کام کیا کہ اس نے ٹرگنومیٹرک ٹیبل (Trigonometrical tables) بڑی تحقیق کے بعد مرتب کیا اور اسے رواج دیا، ٹرگنومیٹری ٹیبل آج بھی انجینئرنگ میں بنیادی طور پر آ رہا ہے، حاسب کا اس فن پر بڑا احسان ہے۔ (۱)

ایک ٹانگ کو مخروطی تراشوں کی ڈرائنٹل کے لئے چھوٹا یا بڑا کیا جاسکتا ہے، اس تصنیف یعنی ”رسالہ فی البرکار التام“ میں اس نے پہلے اس پر کار کی مدد سے سیدھی لائنوں، دائروں اور مخروطی تراشوں کی ڈرائینگ کے طریقے بیان کئے ہیں اور پھر اس کی تھیوری پر بحث کی ہے، آخر میں اس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اب اس کی مدد سے اصطربلاب، دھوپ گھڑیال اور اس طرح کے دوسرے آلات آسانی سے تیار کئے جاسکتے ہیں، البیرونی نے اپنے استاذ ابو نصر منصور ابن عراق سے اس کی تصنیف کی نقل طلب کی تھی اور البیرونی کی ایک تحریر میں ابن الحسین القوہی کی تصنیف کا حوالہ ملا ہے، نقل حاصل کرنے کی سعی لا حاصل کے بعد ابن الحسین نے اس موضوع پر ایک کمر تحریر قلم بند کی، القوہی عالم اسلام کا ایک مایہ ناز سائنس داں تھا۔ (۱)



(۲) حجاج بن یوسف مطر (۲۱۴ھ-۸۳۳ء)

حجاج بن یوسف مطر علم ہندسہ (جامیٹری) کا ماہر تھا، اس فن میں اس نے کمال پیدا کیا، حجاج بن یوسف دیہات کا باشندہ تھا، والدین تو کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن حجاج نے اپنے شوق اور اپنی محنت سے اچھی تعلیم حاصل کی، پھر دیہات کے تنگ دائرے سے نکل کر ۸۶ء میں بغداد گیا اور یہیں بس گیا۔

حجاج نے بغداد کے علمی ماحول سے پورا فائدہ اٹھایا اور بغداد کی علمی صحبتوں سے مستفید ہو کر اپنی قابلیت اور استعداد میں اچھا اضافہ کر لیا، حجاج نے ہارون الرشید اور مامون دونوں کا روشن دور دیکھا، مگر وہ خاموش علمی کام کرتا رہا۔

علمی خدمات اور کارنامے

حجاج ایک بلند پایہ ریاضی داں تھا، اس نے دو بنیادی کام کئے، ایک تو علم ہندسہ یعنی جومیٹری کا کام تھا اور دوسرا علم ہیئت سے متعلق تھا، اس نے ان دونوں علم کو نئے ڈھنگ سے فروغ دیا، جومیٹری میں اس نے نئے نئے انکشافات کئے اور اپنا ایک علمی حلقہ بنالیا، اس وقت علم ہندسہ میں اس کا کوئی ہمسرہ نہ تھا۔

علم ہندسہ میں ایک جامع کتاب ”مقدمات اقلیدس“ کے نام سے اس ریاضی داں نے مرتب کی، یہ ریاضی دانوں پر بہت بڑا احسان ہے۔

دوسرا کارنامہ اس کا علم ہیئت سے متعلق ہے، قدیم زمانے کی مشہور کتاب ”المجسطی“ کو اصلاح اور تصحیح کے ساتھ نئی ترتیب سے اس نے مرتب کیا اور اس کو نئے انداز سے فروغ دیا، اہل یورپ نے حجاج کی دونوں کتابوں سے فائدہ اٹھایا، ”مقدمات اقلیدس“ کا ترجمہ ملک ڈنمارک سے ۱۸۹۳ء میں شائع کیا گیا تھا، اس کی کتابیں بیسویں صدی تک مدارس کی زینت بنی رہیں۔ حجاج نے اور بھی بہت سی کتابیں ریاضی پر لکھی ہیں۔

(۳) محمد بن موسیٰ خوارزمی ۲۳۲ھ/۸۵۰ء

محمد بن موسیٰ خوارزمی علم ریاضی کا زبردست ماہر اور الجبرے کا موجد مشہور ہے، خوارزمی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہ خوارزم (خیوا) کا باشندہ تھا، لیکن اپنے

علمی شوق، اعلیٰ قابلیت اور مجاہدانہ زندگی کے سبب علمی دنیا میں وہ آفتاب و مہتاب بن کر چمکا۔

وطن میں خوارزمی بالکل غیر معروف تھا، فنی کتابوں کے مطالعے میں وہ ہمہ تن مصروف رہتا تھا، علم ریاضی میں اس نے کمال پیدا کیا، یہ سچ ہے کہ جن شخصیتوں نے دنیا کے پردے پر اپنے اعلیٰ فن اور عمدہ استعداد کا مظاہرہ کر کے ایک عالم کو فائدہ پہنچایا، ان میں اول اول نام خوارزمی کا ہی نظر آتا ہے۔

بیت الحکمت کے لئے مقالہ

عالی دماغ خوارزمی اپنے وطن سے بغداد آیا، مامون الرشید کا دور تھا اور بیت الحکمت یعنی سائنس اکاڈمی (science academy) قیام عمل میں آچکا تھا، قابل ترین حکماء علمی تحقیق اور ریسرچ میں مصروف تھے۔

حوصلہ مند خوارزمی بغداد کی علمی محفلوں سے متاثر ہوا، اس نے سائنس اکاڈمی کے ممبر بن جانے کے لئے کوششیں شروع کر دیں، اس کے جدت پسند دماغ نے ایک نیا طریقہ نکالا، خوارزمی نے علم ریاضی پر ایک گہرا مقالہ شب و روز کی دیدہ ریزی سے تیار کیا اور اس ریاضی کے مقالہ کو مرتب کر کے سائنس اکاڈمی میں بھیج دیا، خوارزمی کا یہ طریقہ آج بھی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔

خوارزمی کا مقالہ سائنس اکاڈمی میں پیش ہوا اور پسند کیا گیا، خوارزمی کو بلا یا گیا اور اس علمی مجلس میں اس سے سوالات کئے گئے اور پھر اسے سائنس اکاڈمی کا ممبر چن لیا گیا، یہی طریقہ یونیورسٹیوں میں آج بھی رائج ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

محمد بن موسیٰ خوارزمی فن ریاضی میں بہت قابل تھا، دربار میں اس کی قابلیت کا سکھ رواں تھا، مامون الرشید نے خوارزمی سے فن ریاضی پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی، خوارزمی نے پوری تحقیق کے بعد دو کتابیں مرتب کیں، ایک ”علم الحساب“ یہ کتاب علم ہندسہ میں ہے، اس میں ریاضی کے نئے نئے نکتے بیان کئے گئے ہیں

اور بہت سے نئے نئے فائدے اور اصول بتائے ہیں، مامون نے بہت پسند کیا اور انعام و اکرام سے نوازا۔

اس کتاب کے حوالے سے سارٹن لکھتا ہے:

”ان کی الجبرا ”حساب الجبر والمقابلہ“ بھی کم اہم نہیں ہے، اس میں سادہ اور درجی مساوات کے تجزیاتی حل دیئے گئے ہیں اور اس کتاب کے مصنف کو ہندسہ سے الگ الجبرا کے بانیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، انہوں نے اشکال ”اشکال“ کے ساتھ دو درجی مساوات کے ہندسوی حل بھی دیئے ہیں“ (۱)

دوسری کتاب ”الجبر والمقابلہ“ ہے، یہ اہم کتاب اپنے فن میں بے مثل ہے اور الجبرے پر بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ خوارزمی الجبرے کا موجد ہے۔ (۲)

مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ ”علم جبر ومقابلہ“ پر اسلام اول جو کتاب لکھی گئی ہے، وہ اسی عہد کے ایک مشہور عالم محمد بن موسیٰ خوارزمی نے مامون کی فرمائش پر لکھی، یہ تصنیف آج بھی موجود ہے اور اس قدر جامع و مرتب ہے کہ علماء اسلام نے جبر ومقابلہ میں سینکڑوں کتابیں نادر تصنیف کیں؛ لیکن اصل مسائل میں اس سے زیادہ ترقی نہ کر سکے“

خوارزمی نے جو اصول اور قاعدے دریافت کئے، آج بھی اسکولوں کی اعلیٰ جماعتوں اور کالجوں میں وہی قاعدے پڑھائے جاتے ہیں۔

خوارزمی کی پہلی کتاب ”حساب“ یہ بھی اپنے فن کی واحد کتاب ہے، یورپ کے دانشوروں نے علم ہندسہ کی حقیقت اور اہمیت کو اس کتاب کے ذریعہ سمجھا۔

چودھویں صدی تک یورپ میں بالکل جہالت تھی، خوارزمی نویں صدی کا دانشور

ہے، اس کی کتاب چودھویں صدی میں یورپ پہنچی تو اہل یورپ کی آنکھیں کھل گئیں۔ یورپ میں اس جہالت کے دور میں رومن ہندسے رائج تھے جو بالکل ناممکن اور غلط اصولوں پر قائم تھے، یورپ کے دانشوروں نے خوارزمی کی کتابیں دیکھ کر اپنی خرابیوں کو سمجھا اور اپنے حساب کتاب کے اصولوں کو یکسر بدل دیا، اہل یورپ نے عربی ہندسوں کو فوراً قبول کر لیا، یہ ہندسے ”عربک فیکر“ کہے جاتے ہیں (arabic figure) رومن ہندسے اور عربک فیکر کا مقابلہ کر لیجئے، ایک سو ساٹھ لکھنا ہے اور اڑتیس لکھنا ہے۔

عربی طریقہ رومن طریقہ

۱۶۰ clx

۳۸ xxxviii

دونوں قسم کے ہندسے کے فرق کو آپ دیکھ لیجئے، رومن طریقے سے جمع کرنا، تفریق اور ضرب کرنا کتنا مشکل ہوگا؛ بلکہ ناممکن؛ لیکن عربی طریقہ فطری ہے اور آسان تر ہے۔ ریاضی میں مسلمانوں کے کارناموں میں صفر کی ایجاد ہے، صفر بھی الخوارزمی نے ہی متعارف کروایا ہے، انگریزی کا (zero) عربی لفظ صفر سے ماخوذ ہے جو ”خالی“ کے معنی میں آتا ہے۔

خوارزمی کی کتابیں بہت پہلے یورپ پہنچ چکی تھیں اور ان کا ترجمہ بھی لاطینی زبان میں اس وقت ہو گیا تھا، یہ چودھویں صدی کے بعد کا زمانہ تھا، پھر اس کا انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ شائع ہوا، انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ شائع ہوا، انگریزی کا ترجمہ روزن (rozen) نے لندن سے ۱۸۳۱ء میں پہلی بار بڑے اہتمام سے چھپایا، ۸۵۰ء میں وفات پائی۔

(۳) ابوالوفاء محمد بن احمد بوزجانی ۳۹۸ھ/۱۰۱۱ء

محمد بن احمد بوزجانی تعلیم یافتہ خاندان کا ممبر تھا، اس نے ابتدائی تعلیم اپنے ماموں سے حاصل کی، علم کے فطری شوق نے اسے اور آگے بڑھایا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ۹۶۰ء

میں وہ بغداد گیا، یہاں نصاب کے مطابق اعلیٰ تعلیم ختم کی اور پھر مطالعہ اور تحقیق میں مصروف ہو گیا۔

بوزجانی کو علم ریاضی اور علم ہیئت دونوں سے کمال دلچسپی تھی، اپنے شوق سے اس نے اپنی علمی استعداد میں کافی اضافہ کیا اور ایک اچھا سائنسدان بن گیا۔

بویہ خاندان کا حکمران عضدالدولہ بڑا علم دوست تھا، اس کی قدر شناسی اور حوصلہ افزائی کے باعث احمد بوزجانی دنیاوی تفکرات سے آزاد ہو کر اپنے علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہا اور آرام سے زندگی بھی گذاری۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوالوفاء بوزجانی بڑا عالی دماغ تھا، اس کا شمار اس دور کے عظیم ریاضی دانوں میں ہوتا ہے، اس نے الجبرا اور جیومیٹری میں دائرے کے اندر مختلف ضلعوں کی منتظم کثیر الاضلاع بنانے کے مسائل قدیم زمانے میں ریاضی دانوں میں مقبول اور مشہور تھے، ان کثیر الاضلاع میں سے چھ ضلعوں کی شکلیں، آٹھ ضلعوں کی شکلیں، پانچ ضلعوں کی شکلیں اور دس ضلعوں کی شکلیں تو بنائی جاسکتی ہیں اور رائج ہیں۔

لیکن سات ضلعوں کی شکلیں جس کو علم ریاض میں منتظم سبع (regular hedtagon) کہتے ہیں، ہر ضلع کے دونوں نقاط مرکز پر $360/7$ یعنی 51.42857 درجے کا زاویہ بناتے ہیں، جس کا پرکار سے بنانا ناممکن ہے، اس لئے جیومیٹری کے ماہرین کی جملہ کوششوں کے باوجود دائرے کے اندر ایک منتظم السبع بنانے کا مسئلہ ناقابل حل سمجھا جاتا تھا۔

ابوالوفاء بوزجانی کی ذہانت نے نہ صرف اس مسئلہ کا حل دریافت کر لیا؛ بلکہ جتنا یہ مسئلہ پیچیدہ اور مشکل سمجھا جاتا تھا، اس قدر اس کا حل صاف اور سادہ بتا دیا، حقیقت یہ ہے کہ یہ بوزجانی کی ریاضی دانی میں مہارت کا کمال تھا۔

سورج کی کشش اور نئی دریافتیں

بوزجانی علم ہیئت کا بھی ماہر تھا، اس علم میں اس نے چند خاص دریافتیں کیں، اس

نے ثابت کیا کہ سورج میں کشش ہے اور چاند گردش کرتا ہے۔

اس نظریے کے تحت اس نے یہ قابل دریافت کیا کہ زمین کے گرد چاند کی گردش میں سورج کی کشش کے اثر سے خلل پڑ جاتا ہے اور اس وجہ سے دونوں اطراف میں زیادہ سے زیادہ ایک ڈگری پندرہ منٹ کا فرق ہو جاتا ہے، اسے علم ہیئت کی اصطلاح میں (Evection) یعنی چاند کا گھٹنا کہتے ہیں۔

اس اختلال قمر کے بارے میں بوزجانی نے دنیا میں پہلی بار اپنا یہ نازک نظریہ پیش کیا، یہ اس کی اہم دریافت تھی، اس نظریے کی تصدیق سولہویں صدی میں مشہور ہیئت داں ٹیکوبرائی نے کی اور اسے اہمیت دی، لیکن اہل مغرب اس دریافت کا سہرا ٹائیکوبرا کے سر باندھتے ہیں اور یہ قطعی غلط اور دھوکہ ہے، آج سے چھ سو سال قبل ابوالوفاء بوزجانی اس نظریے کو پوری تفصیل کے ساتھ ثبوت اور دلائل کے ساتھ بیان کر چکا تھا۔

تیسرا کارنامہ

بوزجانی کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زاویوں کے جیب (sine) معلوم کرنے کا ایک نیا کلیہ دریافت کیا اور اس کی مدد سے ایک درجے سے لے کر 90 درجے کے تمام زاویوں کے جیب کی صحیح قیمتیں آٹھ درجے اعشاریہ تک نکالیں، اس سے پہلے ان کی قیمتیں اتنے درجہ اعشاریہ تک نہیں نکالی جاسکتی تھیں، یہ بھی اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ (۱)

(۵) ابوالحسن علی احمد نسوی ۴۴۰ھ - ۱۰۳۰ء

علی بن احمد مقام ”نسا“ میں پیدا ہوا اور اسی نسبت سے نسوی مشہور ہوا، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور پھر ”رے“ چلا گیا، ”رے“ اس عہد میں علمی مرکز بن چکا تھا، نسوی نے اپنی عمر کا پورا حصہ اسی بارونق شہر کی محفلوں اور مجلسوں میں گزار دیا۔

یہ عہد بویہ خاندان کے مشہور بادشاہ فخرالدولہ (۱۰۱۲ء) کا تھا، فخرالدولہ علم دوست بادشاہ اور اہل علم کا قدر داں تھا۔

احمد نسوی کو علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی، اس فن میں اس نے کمال پیدا کیا، سچ تو یہ ہے کہ وہ علم ریاضی کا زبردست ماہر اور امام تھا، وطن ”نسا“ (خراسان) صحیح صحیح ولادت اور وفات نہ معلوم ہو سکی، اندازاً ۱۰۳۰ء کا عہد ہوگا۔

علمی خدمات اور کارنامے

جزر اور جذر المکعب کے طریقے کا موجد

علم حساب میں نسوی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جذر المکعب کے طریقے کا موجد کے وہ خاص طریقے معلوم کئے جو اب تک کسی کو معلوم نہ تھے، جذر اور جذر المکعب نکالنے کے طریقے موجودہ دور میں بھی رائج ہیں اور آج بھی نسوی کا دریافت شدہ طریقے ہی مستند اور بہتر مانا جاتا ہے۔

حساب ستین کی ایجاد اور اعشاریہ

نسوی کی دوسری قابل ذکر تحقیق حساب ستین ہے، حساب ستین اور حساب اعشاریہ میں مطابقت پیدا کیا، یہ اس کی ذہانت کا کمال ہے کہ حساب ستین ایجاد کر کے کئی مسائل حل کر دیئے۔

آج کل سائنس داں نسوی کے اصول پر چھوٹے چھوٹے پیمانوں کی تقسیم در تقسیم عموماً دس دس کی نسبت سے کرتے ہیں، جس کو ”اعشاریہ“ کہتے ہیں، نسوی نے یہ دونوں طریقے دریافت کر کے علم ریاضی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

وقت کی تقسیم اور اس کا پیمانہ

آج کل وقت کو خاص اہمیت حاصل ہے، وقت کی تقسیم اور اس کے لئے پیمانے کی دریافت نے آج سائنس کو کس قدر ترقی دی ہے، یہ سب احمد نسوی کا احسان ہے۔

احمد نسوی کے زرخیز دماغ نے وقت کی تقسیم در تقسیم کے لئے ایک طریقہ نکالا اور یہ طریقہ حساب ستین کا تھا، یہ وقت کی پیمائش کا معیاری طریقہ تھا، اس طریقے میں یہ خوبی بھی تھی کہ اس نے قدیم اور جدید دونوں میں مطابقت پیدا کر دی۔

مثلاً: احمد نسوی وقت کی ایک ساعت (گھنٹہ) یا زاویے کے ایک درجہ کو ساٹھ پر

تقسیم کر دیتا ہے، ساٹھ ویں حصہ کو وہ ”دقیقہ“ کہتا ہے؛ کیوں کہ ساٹھ سے تقسیم کے بعد بچا ہوا یہ حصہ خفیف اور کم رہ جاتا ہے، یعنی تھوڑا چھوٹا، دقیقہ کے لفظی معنی بھی خفیف یا تھوڑا باریک شئی کے ہیں، گویا یہ چھوٹے چھوٹے حصے ہیں جو مل کر ساعت بن جاتے ہیں۔

نسوی اس دقیقہ کو بھی دوبارہ تقسیم کرتا اور ٹکڑے بناتا ہے اور اس دقیقہ کی دوبارہ تقسیم ہوتی ہے تو چوں کہ یہ تقسیم دوسری بار عمل میں آتی ہے اور دوسرے کو عربی میں ثانیہ کہتے ہیں، اس لئے دوسری بار کی تقسیم کے حاصل کا نام ثانیہ رکھا گیا اور اس طرح ساعت کی دقیقہ اور ثانیہ دو قسمیں ہو گئیں تو گویا یہی وقت کا پیمانہ بنا۔

ازمنہ وسطیٰ میں مسلم سائنسداں کی یہ کتابیں جب یورپ پہنچیں اور وہاں کے حکماء اور دانشوروں نے مسلمانوں کے پورے علمی خزانے سے فائدہ اٹھانے کی کامیاب کوشش کی اور تمام علمی کتابوں کے ترجمے کر لئے؛ لیکن اس ترجمے میں انہوں نے عربی اصطلاحات کو قائم رکھا، انہوں نے اصطلاحات کے لئے الگ لفظ نہیں نکالا؛ بلکہ اس سے فائدہ اٹھایا۔

دقیقہ کے لئے منٹ (minute) کا لفظ وضع کیا گیا، انگریزی میں منٹ کے معنی بھی چھوٹا، خفیف یا باریک کے ہیں، یہ پہلی تقسیم تھی۔
دوسری تقسیم یعنی ”ثانیہ“ کے لئے انگریزی میں سکینڈ (second) کا لفظ بنایا گیا، یہ لفظ یعنی عدد سکینڈ، ثانی یا ثانیہ کا مرادف ہے۔

مسلم سائنسدانوں کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے وقت کی پیمائش کا طریقہ ایجاد کیا اور وہ بھی اس قدر سادہ اور آسان، ساٹھ سے تقسیم کے ذریعے سکینڈ اور منٹ کی اکائیاں وجود میں آئیں، جو وقت اور زاویے کی پیمائش میں پوری نئی اور پرانی دنیا میں رائج ہیں۔

دنیا کے آج ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ گھڑی کے ڈائل پر جو ہندسے لکھے ہیں اور منٹ (دقیقہ) اور سکینڈ (ثانیہ) ہر تقسیم میں وہ اسی مسلم سائنسداں احمد نسوی کے ذہانت کا کرشمہ ہیں۔

احمد نسوی علم ریاضی کا زبردست ماہر اور امام تھا، اس کی مشہور تصنیف ”عملی حساب“ ہے جسے اس نے بڑی دیدہ ریزی اور قابلیت سے مرتب کر کے پہلے فارسی زبان میں لکھا، پھر عربی میں اسے منتقل کر دیا۔ (۱)

(۶) الکاشی غیاث الدین جمشید مسعود الکاشی (۸۳۲ھ-۱۴۲۹ء)

ان کا اصل نام غیاث الدین جمشید مسعود الکاشی ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

الکاشی کی عربی، فارسی تصانیف کی تاریخی ترتیب پوری طرح معلوم نہ ہو سکی؛ البتہ وہ بعض کتابوں کی تکمیل کی تاریخ اور جگہ خود بیان کرتے ہیں، مثلاً اجرام فلکی کے ساز و اوران کے مابین فاصلوں کے موضوع پر اس نے کتاب ”سلم السماء“ ایران کے شہر کاشان میں ۱۴۰۷ء کو مکمل کی، انہوں نے اس کتاب کو ایک وزیر کمال الدین محمود کے نام سے معنون کیا تھا۔

اس نے سلطان سکندر کے لئے ایک کتاب مختصر علم در ہیئت لکھی۔

الکاشی کی سب سے زیادہ معروف کتاب ”مفتاح الحساب“ جو ۱۴۲۷ء میں لکھی گئی تھی، یہ ابتدائی ریاضی کی حقیقی انسائیکلو پیڈیا ہے جو طلبہ کے وسیع دائرے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں حساب دانوں، زمین کا سروے کرنے والوں، ماہرین تعمیرات، منشیوں اور تاجروں کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اپنے محتویات کے تنوع، مختلف مسائل جس میں جیومیٹری کے مسائل بھی شامل ہیں کے حل میں حساب اور الجبرا کے اطلاق اور بیان کی خوبی و صفائی میں ضخیم کتاب از منہ وسطی کے لٹریچر میں بہترین کتاب ہے، صدیوں تک یہ کتاب نصاب تعلیم میں شامل رہی۔

الکاشی کی تعریف کے مطابق علم حساب سے متعلق مقداروں کی مدد سے معلوم مقداروں تک رسائی حاصل کرنے کا نام قواعد کا علم ہے، ”مفتاح السعادة“ ایک تمہید کے بعد پانچ حصوں میں منقسم ہے، صحیح اعداد کا حساب، کسور کا حساب، فلکیاتی حساب، مستوری اشکال

واجسام کی پیمائش اور الجبرا کی مدد سے مسائل کا حل (خطی و دو درجی مساوات) اور غلط مفروضوں کا اصول کتاب میں بہت سے دلچسپ سوال اور احتیاط سے جس کی کئی مثالیں بھی ہیں۔

”مفتاح الحساب“ کے حصہ اول میں الکاشی نے صحیح اعداد کا جذر نکالنے کا عام قاعدہ بیان کیا ہے، الکاشی نے حسابی قواعد کو ہندسوں کے بجائے الفاظ میں بیان کیا ہے اور اس کا الجبرا بیانیہ قسم کا ہے، اس سلسلہ میں اس نے کسی بھی ثنائی عدد (binomial) کو کسی قدرتی قوت (power) تک بڑھانے کا عام کلیہ اور ثنائی تعاملات کو مسلسل معلوم کرنے کا جمعی قاعدہ بیان کیا ہے، اس نے نام نہاد مثلث پاسکل (poscal,s triangle) کی قیمت ۹ کے لئے بتائی ہے۔

کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں اعشاری کسور (decimal fractions) کا نظریہ قابل ذکر ہے، اس کو پہلے الکاشی نے اپنے ”رسالہ المحيطیۃ“ میں استعمال کیا تھا، یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ کسی عربی ریاضیاتی تصنیف میں اعشاری کسور لائی گئی ہو، وہ تو دسویں صدی کے وسط میں الاقلیدسی کی تصنیف ”کتاب الفصول فی الحساب الہندی“ میں بھی موجود ہیں اور ان کو کبھی کبھی چینی سائنس دان بھی استعمال کرتے رہے، فرق یہ ہے کہ الکاشی نے اعشاریہ کسور کو باقاعدہ رائج کیا جس میں کسور کا ایک ایسا نظام وضع کر دیا جائے نظام ستین (sexagesimal) میں ہے کہ؛ تاکہ جس طرح صحیح اعداد کا عمل ہے، اسی طرح کسور کا بھی رائج ہو سکے، الکاشی نے اس کو عام طور پر اعداد کی بنیاد پر اٹھایا، اس لئے یہ نظام تو لوگوں کا جانا پہچانا تھا، کتاب میں متعین اعشاری کسور کا عمل تفصیل سے بیان ہوا ہے، لیکن الکاشی دورانیت (periodicity) کا تذکرہ نہیں کرتا۔

اعشاری کسور کو ظاہر کرنے کے لئے کبھی تو وہ صحیح اعداد سے ان کو ایک عمودی لکیر سے جدا کرتا ہے یا ان کو ہندسوں کے اوپر لکھتا ہے؛ لیکن عام طور پر وہ کم سے کم قوت کا ذکر کرتا ہے، جس کی مدد سے وہ تمام دوسری قوتیں معلوم کرتا ہے، پندرہویں صدی کے

نصف آخر اور سولہویں صدی میں الکاشی کی اعشاری کسور ترکی کی، ایک حد تک رائج رہیں، اس کا ذریعہ شاید علی قوشچی بنا جس نے سمرقند میں الکاشی کے ساتھ کام کیا تھا، اور الگ بیگ کے قتل اور بازنطینی سلطنت کے زوال کے بعد وہ قسطنطنیہ میں مقیم ہو گیا، یہ کسور کہیں ایک گمنام مصنف کے بارنینی مجموعہ رسائل میں استعمال ہوئی ہیں، جس کا تعلق پندرہویں صدی سے ہے اور جس کو ۱۵۶۲ء میں وی آنا لیا گیا، اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ یورپ میں اعشاریہ کسور کے رواج میں الکاشی کے خیالات کا کچھ اثر رہا ہو۔

کتاب کے پانچویں حصے میں الکاشی سرسری طور پر اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ چار درجہ مساواتوں کے لئے مقدار نامعلوم دریافت کرنے کا طریقہ اس نے دریافت کر لیا ہے، اس کو اس نے ستر ایسے مسائل میں استعمال کیا ہے جن کو قدماء یا اس کے معاصرین ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے، اس نے اس ارادہ کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ اس موضوع پر ایک الگ کتاب مرتب کرے؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحقیق کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا، الکاشی کی تھیوری مکعب مساواتوں کی اس ہندسی تھیوری کے مماثل رہی ہوگی جو اس سے پہلے ابوالجود محمد بن لیث مرتب کر چکا تھا، یہ تھیوری کچھ یوں تھی کہ چار درجہ مساواتوں کے جذور کی اشکال بنائی جاتیں، اس کے بعد مناسب مخروطی جوڑوں کے خطوط تقطیع کے سروں کے محددات (coordinates) دریافت کئے جاتے۔

الکاشی عیاض الدین جمشید کی وفات ۱۹ رمضان المبارک ۸۳۲ء بمطابق ۲۲ جو

ن ۱۴۲۹ء کو ہوئی۔

(۷) احمد بن یوسف بن ابراہیم (۳۰۰ھ/۹۱۲ء)

احمد بن یوسف بن ابراہیم بن الدایہ المصری کو علم ریاضی کا ایک ماہر سمجھا جاتا ہے

اور وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں شہرت کی بلندیوں پر تھا۔

ان کے والد یوسف بن ابراہیم جنہیں ”الحاسب“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے،

عرب کے مشہور اور با اثر علماء میں سے تھے، بغداد ان کا آبائی شہر تھا؛ لیکن ۸۴۰ء میں بغداد کو خیر باد کہہ کر دمشق چلے گئے اور چند سال کے بعد مصر چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہے

گئے، یہی وجہ ہے کہ بغداد میں پیدا ہونے کے باوجود ”المصری“ مشہور ہوئے۔
علمی خدمات اور کارنامے

احمد کی جو تصانیف ملتی ہیں، ان میں نسبت اور تناسب پر ایک رسالہ ہے، مماثل قوسین پر ایک کتاب بطلمیوس کی ایک شرح اور اصطرلاب پر ایک تحریر شامل ہے، ان تمام کتابوں کے مخطوطات محفوظ ہیں۔

احمد کی اہم ترین تصنیف اس کا وہ رسالہ ہے جو نسبت اور تناسب کے موضوع پر لکھا گیا ہے، اس کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ جرار القرمونی (Gerard of Cremona) نے کیا، بعد میں اس کی بہت سے نقلیں تیار کی گئیں، موجودہ دور میں لاطینی ترجمے کے مسودہ کے نقول انگلستان، اسپین، آسٹریا اور اٹلی کے کم از کم گیارہ کتب خانوں میں موجود ہیں اور یورپ کے اتنے کتب خانوں میں اس کی موجودگی قرون وسطیٰ میں اس کی شہرت اور مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے، یہ تصنیف بنیادی طور پر اقلیدس کی پانچویں فصل کی شرح ہے اور اس میں اضافے بھی کئے گئے ہیں، نسبت اور تناسب سے متعلق اقلیدس کی بیان کردہ تعریفوں کو احمد نے تفصیلی اور منطقی استدلال کے ذریعہ حل کیا اور یوں ان کے دائرہ کو وسعت دی۔

احمد بن یوسف کی ریاضیاتی خدمات بھی قابل قدر ہیں، خاص طور پر اس نے جس طرح تناسبی مقداروں کی مختلف صورتوں کے حل اور انہیں کمال احتیاط سے مرتب کیا ہے، وہ اس کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، حقیقت تو یہ ہے کہ احمد کو منقسم شکل کی ان ۱۸ صورتوں کے حوالے ہی سے یاد رکھا جائے گا۔ یہ رسالہ ”رسالة فی النسبة والتناسب“ کو ہم تصنیف قرار دیتے ہوئے سارٹن نے لکھا ہے کہ اس کتاب نے لیونارڈ آف پیسا اور (Jordans Nemorarius) کے توسط سے قرون وسطیٰ کی ریاضی پر اثرات ڈالے ہیں (۱) لیونارڈو کی تصنیف (Liber abacci) میں احمد بن یوسف کے رسالے میں مذکور تناسب کی اٹھارہویں صورتوں کا حوالہ موجود ہے، اس کے علاوہ انہوں

نے احمد کے طریق کار کو بھی اپنی کتاب میں برتا ہے، احمد کو ان عظیم سائنسدانوں کی صف میں شمار کیا جاتا ہے، جنہوں نے نسبت اور تناسب کے موضوع پر تحقیق کی ہے، لاطینی دنیا میں یہ عظیمی سائنسدان (Ametus) کے نام سے مشہور رہے ہیں۔ (۱)

اس کی تاریخ وفات بھی تاریخ پیدائش کی طرح پردہ خفا میں ہے؛ لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس کی تاریخ وفات ۹۱۲ء ہے۔ (۲)

(۸) ابوالعباس الفضل بن حاتم النیریری (۳۱۰ھ/۹۲۲ء)

النیریری کا آبائی وطن نیریر ہے، جو فارس میں شیرز کے جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سے قصبہ ہے، زندگی کا ایک حصہ اس نے بغداد میں گزارا جہاں غالباً وہ عباسی خلیفہ المعتضد کی خدمت میں رہا اور اس کے لئے اس نے موسمیاتی مظاہر پر ایک کتاب ”رسالة فی احداث الجو“ لکھی جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی، اس کے علاوہ اس نے اجسام کے مابین فاصلے معلوم کرنے کے آلات پر بھی ایک کتاب لکھی جو دستیاب ہے۔

دسویں صدی کا ماہر کتاب کتابیات ابن الندیم النیریری کو ایک ممتاز ہیئت داں قرار دیتا ہے، ابن القفطی کا یہ بیان ہے کہ وہ ہندسہ اور علم ہیئت میں سربراہ اور حیثیت کا مالک تھا، مصری ہیئت داں ابن یونس کو اگرچہ النیریری کے فلکیات کے بارے میں خیالات پر اعتراض ہے، تاہم وہ ایک کامل مہندس کے طور پر اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابن الندیم اور ابن القفطی نے النیریری کی طرف آٹھ کتابیں منسوب کی ہیں، النیریری کی زیادہ شہرت اقلیدس کی کتاب ”عناصر“ کی شارح کی حیثیت سے ہے، کتاب ”عناصر“ پر اپنی شرح میں النیریری نے نسبت اور تناسب کا وہی تصور دیا ہے جو اس سے قبل المابانی نے قائم کیا تھا۔ النیریری کی تصنیف ”رسالة فی سمت القبلة“

(۱) معروف مسلم سائنسدان: ۲۲۵

(۲) عظیم مسلم سائنسدان: ۱۱۱

سے یہ علوم ہوتا ہے کہ وہ ظل زاویہ کی نسبت سے بھی واقف تھا، اور اس کو استعمال بھی کرتا تھا، اس میدان میں کسی اور کا بالخصوص جہش کا اس پر سبقت لے جانا معلوم نہیں۔

النیریری کی غیر مطبوعہ تصنیف ”اقلیدس کے معروف اصول موضوعہ کا اثبات“ (on the domonstration of the well know postulate bibiotheque nationale arabe 2467,89r-90r of uclid)

(پیرس) (مخطوطہ قومی کتب خانہ، پیرس) کامل طور پر اغانیس پر مبنی ہے، اس میں النیریری کا استدلال کچھ یوں ہے کہ چونکہ برابری فطری طور پر نابرابری اولی ہے؛ لہذا وہ خطوط مستقیم جو آپس میں فاصلہ برابر رکھتے ہیں، ان خطوط سے اولی ہیں جو فاصلہ برابر نہیں رکھتے، پس اول الذکر مؤخر الذکر خطوط کی پیمائش کا معیار ہے، اس استدلال سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ابتدائی اصول یہ ہے کہ مساوی فاصلہ پر واقع خطوط کو خواہ کتنا ہی بڑھایا جائے وہ ایک دوسرے کو قطع کریں گے، اس کے ثبوت کے لئے اس نے چار مقدمات قائم کئے، ان میں سے پہلے تین یوں ہیں۔

- ۱- مساوی فاصلہ پر واقع دو خطوط مستقیم کے درمیان کم سے کم فاصلہ کا خط دونوں خطوط پر عمود ہوگا۔
- ۲- اگر ایک خط مستقیم دو خطوط کو ملاتا ہوا کھینچا جائے اور وہ دونوں پر عمود ہو تو دونوں خطوط مساوی فاصلہ پر واقع ہوں گے۔
- ۳- دو مساوی الفاصلہ خطوط کو ملانے والے خط کی ایک جانب واقع اندرونی زاویئے دو قائمہ زاویوں کے برابر ہوں گے۔

یہ تینوں النیریری نے جو اصول المعتقد کے لئے تحریر کردہ رسالہ جو اس وقت تک موجود ہے؛ لیکن غیر مطبوعہ ہے میں لکھے ہیں، وہ ان کی اولیت کا دعوی کرتا ہے، اس رسالہ کا نام یوں ہے ”ان آلات کا علم جن کی مدد سے ہم ان اشیاء کے فاصلے معلوم کر سکتے ہیں جو ہوا میں بلند یا زمین پر قائم ہوں، نیز ہم کنوؤں اور وادیوں کی گہرائی اور دریاؤں کی چوڑائی بھی معلوم کر سکتے ہیں، البیرونی کا بیان ہے کہ اس کے علم میں النیریری واحد شخص

ہے کہ جس نے الجسطی کی شرح میں زمانہ کی تاریخ معلوم کرنے کا طریقہ تجویز کیا جس کے معلوم اجزاء مختلف انواع ہوں جن کا تعلق کسی ایک ہی جنس سے نہ ہو، مثال کے طور پر کوئی ایسا دن ہے جس کی تاریخ یونانی، عربی یا فارسی مہینہ میں معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اس مہینہ کا نام معلوم نہیں؛ البتہ آپ کسی اور مہینہ کا نام جانتے ہیں جو اس نامعلوم مہینہ سے مطابقت رکھتا ہے، اس طرح آپ ایک سنہ جانتے ہیں جس سے ان دو مہینوں کا تعلق نہیں ہے یا ایک ایسا سنہ جانتے ہیں جس کے مطلوبہ مہینہ کا نام معلوم نہیں۔

الیریری نے کروی اصطراب کی ساخت اور اس کے استعمال پر اپنی کتاب ”فی الاضطراب“ کے چار مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس موضوع پر عربی زبان میں سب سے زیادہ کامل تحریر سمجھا جاتا ہے۔

ابوالعباس الفضل بن حاتم الیریری نے بغداد میں ۹۲۲ء کو وفات پائی اور بغداد

میں ہی مدفون ہوئے۔ (۱)

(۹) حسن بن موسیٰ شاکر

فن تعمیر اور ریاضی میں کمال مہارت رکھتا تھا، مامون الرشید المتوکل کے عہد میں گذرا ہے، چونکہ یہ اچھا سیول انجینئر تھا، شاہ وقت نے ایک نہر کی کھدائی کا کام اس کے سپرد کیا، یہ نہر زراعت اور پیداوار بڑھانے کے لئے استعمال کی جانے والی تھی؛ چنانچہ حسن نے ہی اس کام کو انجام دیا۔

حسن نہایت ذہین، فطین، فہیم اور حاضر جواب تھا، اس کے کئی ایک واقعات مشہور ہیں۔ ایک دفعہ مامون الرشید کے دربار میں تمام اہل علم و فضل کا مجمع تھا، ان میں حسن بھی موجود تھا، مامون الرشید کو علم اقلیدس سے خاصی دلچسپی تھی، علم ہندسہ پر بحث ہو رہی تھی، مامون الرشید کے اشارے پر خالد بن عبد الملک نے جو علم ریاضی کا ماہر تھا حسن سے کچھ سوالات کئے اور حسن کا امتحان لینا چاہا۔

حسن محنتی، حوصلہ مند اور حاضر دماغ تھا، اب تک اگرچہ اس نے اقلیدس کی کل چھ

شکلیں پڑھی تھیں، لیکن محنت اور ذہانت کی وجہ سے اس میں سوالات حل کرنے کا ملکہ پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ حسن نے سوالات کے جواب میں بڑی اچھی تقریر کی اور نہایت عمدگی کے ساتھ جواب دیا۔

پھر حسن سے نئے نئے اور مشکل سوالات علم ہندسہ سے متعلق پوچھے گئے تو اس نے ان کے جوابات صحیح صحیح دے دیئے، حسن نے اس انداز سے جوابات دیئے تھے کہ اہل دربار حیرت میں رہ گئے اور خود مامون کو بھی حسن کی قابلیت اور صلاحیت پر تعجب ہوا۔ اب حسن اور خالد المزوری میں علمی بحث چھڑ گئی، اس بحث نے طول پکڑا، حسن نئے نئے اعتراضات کرتا تھا، خالد المزوری جھلا گئے، حسن کا یہ طریقہ سوسائٹی کے آداب کے خلاف تھا کہ کسی بزرگ سے بحث کی جائے؛ لیکن مامون لطف اٹھاتا رہا۔

خالد المزوری نے ہارون الرشید سے کہا: دیکھئے حسن مجھ سے بحث کر رہا ہے، حالانکہ اس نے صرف چھ شکلیں پڑھی ہیں۔ مامون الرشید نے حسن کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ حسن پھر بحث کرنے لگا، خالد غصہ سے بھر گیا، حسن نے کہا: آپ نے سب کچھ پڑھ لیا؛ مگر آپ کا علم حاضر نہیں، آپ نئے نئے نکتے پیدا نہیں کر سکتے۔ مامون الرشید نے اب کہا: حسن تم نے ابھی چھ شکلیں پڑھی ہیں، تمہاری تعلیم ابھی نامکمل ہے، حسن اب خاموش ہو گیا اور بحث ختم ہو گئی۔

علمی خدمات اور کارنامے

حسن علم ہندسہ (جیومیٹری) میں بڑی مہارت رکھتا تھا، اسے علم فلسفہ اور ہیئت سے بھی خاصی دلچسپی تھی، اس نے کئی ایک انکشافات کئے؛ لیکن علم ہندسہ میں حسن کا خاص کارنامہ یہ ہے جو اس نے مسائل کو حل کرنے کے لئے نئے نئے طریقے اور نئی نئی دریافتیں کیں۔

اور ایک خاص قاعدہ معلوم کر لیا جیسے بیضوی اصول (ellipse) کہتے ہیں۔

(۱۰) (ابو کامل) شجاع بن اسلم (۳۱۸ھ-۹۳۰ء)

ابو کامل شجاع الدین بن محمد بن محمد بن شجاع کو ”الحاسب المصری“ (مصر کا

حساب داں) بھی کہا جاتا ہے، قدیم مسلمان جبر دانوں الخوارزمی کے بعد اسلام کے عظیم ماہرین الجبراء میں ایک نمایاں شخصیت کے مالک ہیں۔

ابن ندیم نے ”الفہرست“ میں اسے دوسرے نامور ریاضی دانوں میں شمار کیا ہے، ان ریاضی دانوں نے عملی عربی اعشاریہ عمومی حساب اور عملی جیومیٹری پر کام کیا، عبدالرحمن ابن خلدون کے مطابق ابوکامل نے الخوارزمی کی طرز پر الجبراء تحریر کیا، حاجی خلیفہ نے ابو کامل سے ایک ایسی تحریر منسوب کی ہے جو وراثتی مسائل کے جبری حل سے متعلق ہے۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابوکامل کی چودہ تصنیفات اس وقت قلمی صورت میں موجود ہیں، ان میں ایک ”کتاب الطرائف فی الحساب“ بھی ہے، جو جرمن مستشرق زوتر (suter) کے خیال میں اس کتاب کا موضوع غیر معین مساواتوں کا تکمیلی حل ہے، ابوکامل سے بہت پہلے (تقریباً پہلی صدی عیسوی میں) ڈیوفانٹوس (dio phantus) نے ان مساواتوں کی تکمیل کے لئے علقی توضیحات پیش کیں، ابوکامل کے حل ایک ترتیب وار اور سلسلے وار طریقہ کار کے تحت نکالے گئے ہیں۔

ابوکامل کی ”کتاب الخمس والمعشرۃ“ الجبرہ اور جیومیٹری دونوں کے حوالے سے دلچسپی کی حامل ہے، اس میں الجبر کے ذریعے جیومیٹری کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے، نفس مضمون پر جبریہ رنگ غالب ہے، جس میں چار درجہ مساواتوں اور غیر ناظمی سروں والے مخلوط دورخی جملوں کے حل سے بحث کی گئی ہے۔

ایک اور کتاب جو ”کتاب الطرائف فی الحساب“ سے بالکل علاحدہ اور مختلف ہے، غیر معین مساواتوں پر ابوکامل کی بہترین تحقیقات پر مشتمل ہے، اس میں مساواتوں کے حل کو صرف ہندسوں تک ہی محدود رکھا گیا ہے؛ بلکہ بیشتر حل ناظمی شکل میں دیئے گئے ہیں۔

حسابی لحاظ سے چار دلچسپ سوالات جدید ترقیم (notation) میں نیچے درج کئے جا رہے ہیں، یہ بات غور طلب ہے کہ ابوکامل نے اپنے سوالات کو لفظوں میں بیان کیا

اور اس کے اس مسودے میں حساب سے متعلق جو علامات استعمال ہوتیں وہ صرف ہندسوں پر مشتمل تھیں۔

$$x^2/8x-30 = y^2 \quad (1)$$

$$x + x^2 = y^2 \quad (2)$$

$$x - x^2 = z^2$$

$$20 + x = y^2 \quad (3)$$

$$50 - (10-x) = y^2$$

$$10 + x^2 = y^2 \quad (4)$$

$$10 - x^2 = z^2$$

”کتاب فی الجبر والمقابلۃ“ میں دیئے گئے اکثر مسائل الخوارزمی پہلے ہی حل کر چکا تھا، ابوکامل کے تجویز کردہ طریقے کے مطابق xz کا جواب نکالا جاتا ہے، اقلیدس نے مساوات $x^2 + q = px$ کو حل کرنے کے لئے x کو $p/2$ سے چھوٹا فرض کیا تھا، جب کہ ابوکامل نے اسی مساوات کو x کے $p/2$ سے چھوٹا فرض کیا تھا، جب کہ ابوکامل نے اسی مساوات کو x کے $p/2$ سے بڑا ہونے کی صورت میں بھی حل کیا۔

ابوکامل پہلا ریاضی سائنس دان ہے جس نے x^2 سے بڑی قوتوں کو آسانی سے استعمال کیا، اس نے x ”مربع، مربع، مربع مربع، مربع“ x ”مربع مکعب“ x ”مربع مربع جذر“ اور x^3 ”مربع“ نیز x^2 ”مربع“ کی قوتیں استعمال کیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابوکامل کے تجویز کردہ تسمیہ نظام کے مطابق قوت نماؤں کو جمع کیا جاتا تھا، جب کہ اس کے مقابلے میں ہندوستانی نظام تسمیہ میں x^6 کو ”مربع مکعب“ کہا جاتا ہے۔

اہل بابل نے الخوارزمی کی طرح جیومیٹری کے جبریہ پہلو پر زیادہ توجہ دی، تاہم ابوکامل نے نہ صرف الخوارزمی کے طریقے پر زیادہ انحصار کیا؛ بلکہ اقلیدس اور اسکندریہ کے ریاضی داں ہیرو سے بھی استفادہ کیا، نتیجتاً وہ ایک پیچیدہ الجبرے کو مفصل جیومیٹری

کے ساتھ یکجا کرنے میں کامیاب ہو گیا، درحقیقت ابوکامل کی تحریریں الخوارزمی کی نسبت زیادہ خالی جب کہ اقلیدس کی نسبت زیادہ علمی ہیں، اس طرح ابوکامل نے مساواتوں کے تکمیلی حل سے متعلق یونانی نظریے اور قدیم عراقی روایت کو عمل میں لا کر الجبرا کو ایک نئی جہت عطا کی۔

ابوشجاع بن اسلم ۹۳۰ء میں فوت ہوا۔ (۱)

(۱۱) حکیم ابو محمد العدلی القانی (۹۷۷ھ/۹۸۷ء)

حکیم ابو محمد العدلی القانی کی ابتدائی زندگی کے حالات کا کچھ علم نہ ہو سکا، القانی کو فلکیات سے بڑی دلچسپی تھی؛ لیکن وہ انجیرنگ کا ماہر تھا؛ لیکن وہ علم مساحت میں وہ کمال رکھتا تھا جو ریاضی کی ایک شاخ ہے۔

القانی کے دور میں محمد بن جابر البنانی دولت علم اور دولت دنیا دونوں سے مالا مال تھا، البنانی نے القانی کی صلاحیتوں کو سمجھ لیا اور اسے اپنی جماعت میں شامل کر لیا، القانی نے رصد گاہ کی تعمیر میں کئی نئے آلات ایجاد کئے اور رصد گاہ میں اسے نصب کیا، علم مساحت پر اس کی کتاب مشہور ہے، یہ کتاب علم مساحت پر دنیا کی پہلی کتاب شمار کی جاتی ہے، القانی کا نام اس وجہ سے ریاضی دانوں میں فہرست میں تیسرے نمبر پر آتا ہے۔

جس رصد گاہ میں القانی تھا، اس عظیم رصد گاہ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بغداد میں مامون الرشید کی شاہی رصد گاہ کے بعد اپنی عمدہ کارکردگی میں اس رصد گاہ کو شہرت حاصل تھی۔

حکیم القانی نے اس رصد گاہ میں عمدہ قسم کے آلات نصب کئے تھے، اس نے اپنے علم اور تجربوں کے ذریعے اجرام فلکی کے باہمی فاصلوں کو صحیح صحیح معلوم کیا، اس نے بعض غلطیوں کی اصلاح کی، القانی نے اپنے علم اور مہارت کی بناء پر ایک مکمل تاریخ بھی تیار کی۔

(۱۲) ابراہیم بن سنان (۹۳۵ھ/۹۴۶ء)

ابراہیم بن سنان ابن ثابت ابن قرہ نے بغداد کے ایک مشہور گھرانے میں آنکھیں

کھولیں، مشہور ریاضی داں ثابت بن قرہ اس کا دادا تھا، اس کا باپ سنان ابن ثابت بھی ایک ماہر ریاضی داں تھا اور اسے طب اور فلکیات میں ملکہ حاصل تھا، ابن سنان ۹۰۸ء کو پیدا ہوا، ابن سنان بھی اپنے خاندانی روایت کو بخوبی آگے بڑھایا اور ریاضی اور فلکیات کے مضامین کو نئی جہت دی۔

علمی خدمات اور کارنامے

جواں سالی کی موت کے باوجود ابن سنان نے سائنسی تحقیقات کا ایک قابل قدر ذخیرہ چھوڑا ہے اور اس کی اہمیت کو مشرق و مغرب کے تقریباً تمام سائنس داں مؤرخین نے سراہا ہے، اس کی سائنسی تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع نظر آتا ہے، جس میں دائروں کے تماس، سورج کی ظاہری حرکات، شمسی ساعتوں، اصطراب اور دوسرے فلکیاتی آلات جیسے موضوعات شامل ہیں، اس نے سایوں کا بصریاتی حوالے سے تجزیہ کیا ہے اور جیومیٹری سے بحیثیت مجموعی بحث کی ہے۔ قطع مکانی کا مسئلہ حل کرتے ہوئے ابن سنان نے اپنے دادا کی پیروی کی ہے، ثابت بن قرہ اس مسئلے کو پہلے ہی ارشمیدس سے مختلف انداز میں حل کر چکا تھا، اس کا طریقہ ہو سکتا ہے کہ اعداد کے میزان کے مترادف ہو، اس کا نقطہ نظر اس اعتبار سے ارشمیدس سے زیادہ ہمہ گیر تھا کہ اس کے طریقے میں تکمیل (integration) کے وقفوں کو مساوی ذیلی وقفوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا، ثابت کا ثبوت طویل تھا اور اس میں بیس دعاوی شامل تھے، ایک اور مسلم ریاضی دان المہانی اس سے مختصر حل پیش کر چکا تھا؛ لیکن ابن سنان اسے ناقابل قبول گردانتا تھا جیسا کہ اس نے لکھا ہے کہ المہانی کی تحقیق کو اس وقت تک میرے دادا کی تحقیق سے بہتر حیثیت حاصل رہے گی جب تک کہ ہمارے خاندان کا کوئی فرد (ابن قرہ) اس سے بازی نہیں لے جاتا، اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے نسبتاً زیادہ مختصر انداز میں ثبوت دریافت کرنے کی کوشش کی، ایک ایسا ثبوت جو مہمل میں تحویل پر انحصار کرتا ہو، ابن سنان نے اپنے ثبوت کی بنا جس دعوے پر رکھی اور جس دعوے کو وہ قبل ازیں ثابت کر چکا تھا، وہ یہ تھا کہ مربوط تحویل کے تحت رقبات کی تناسبیت غیر تغیر پذیر ہوتی ہے۔

یہ عظیم خاندانی سائنسداں بہت کم عمر پر ۳۸ سال کی عمر میں ۹۴۶ء کو بغداد میں فوت ہو گیا؛ لیکن اتنی تھوڑی عمر پانے کے باوجود اس کے علمی کارنامے بڑی بڑی عمریں رکھنے والے سائنسدانوں پر بھاری ہیں۔



انجینئرنگ میں مسلمانوں کے کارنامے

(۱) احمد بن موسیٰ شاکر (۲۴۰ھ/۸۵۸ء)

مسلم دور میں میکا نک گذرا ہے عربی میں اس فن کو ”علم الحیل“ کہتے ہیں، احمد بن موسیٰ نے اس فن میں ایک کتاب بھی لکھی۔

علم ہیئت اور ریاضی اس زمانے میں بہت مشہور ہوئیں، کیمیا پر بھی کام ہوا، لیکن میکا نیات پر اس وقت تک کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی تھی، قدیم سائنس داں ارشمیدس کے سوا اور کوئی یونانی دور میں نہ تھا، احمد بن موسیٰ نے اس فن میں حیرت انگیز ایجادات کیں۔ احمد نے گرچہ فلسفہ و حکمت کی تعلیم حاصل کی؛ لیکن صنعت و حرفت سے بہت دلچسپی تھی، اس نے صناعی کے فن میں کمال پیدا کیا۔

علمی خدمات اور کارنامے

احمد جدت پسند تھا اور اس کا ذہن و دماغ صناعی کی طرف راغب تھا، مطالعے اور تجربے کے بعد وہ میکا نک انجینئر بنا اور یہ دنیا کا پہلا میکا نک انجینئر تھا۔

ہارون الرشید نے جو گھڑی تحفے میں شاہ فرانس کو بھیجی تھی، اس گھڑی کے صناعتوں کا ذکر کہیں تاریخ میں محفوظ نہیں رہا، کہا جاتا ہے کہ یہ گھڑی احمد کی ایجاد ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ احمد نے نازک نازک مشینیں ایجاد کیں، وہ ایک اچھا سیول انجینئر بھی تھا اور علم ریاضی کا بھی ماہر تھا۔

احمد نے میکا نیات (علم الحیل) پر ایک اچھی کتاب لکھی، اس فن میں یہ دنیا کی پہلی کتاب مشہور ہے۔

مؤرخ ابن خلکان لکھتا ہے کہ: ”علم الحیل“ احمد بن موسیٰ شاکر کی ایک عجیب کتاب ہے جو نادرباتوں پر مشتمل ہے، یہ ایک جلد ہے، میں نے اس کو بہترین مفید کتاب

پایا ہے۔

(۲) ابوطیب سند بن علی ۲۲۴ھ/۸۶۴ء

سند بن علی باکمال ریاضی داں، اچھا سول انجینئر اور دھاتوں کا بڑا ماہر تھا، سند بن علی بغداد میں پیدا ہوا اور یہیں تعلیم پائی، اس علمی ماحول میں اس نے ترقی کی اور بلند ترین درجہ حاصل کیا، وہ نہایت سنجیدہ، متین اور علم نواز تھا۔

علمی خدمات اور کارنامے

خلیفہ متوکل کا عہد تھا، اسے زراعت سے دلچسپی تھی، اس نے ایک نہر کی تیاری کا حکم دیا، نہر کا کام جب تکمیل کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں، خلیفہ متوکل سخت ناراض ہوا اور کہا کہ: اگر غلطی نکلی تو ذمہ دار انجینئروں کو اس جرم کی سزا میں اس نہر کے کنارے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا اور ان کی جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔

خلیفہ نے ابوطیب سند بن علی کو مامور کیا کہ تحقیقات کریں، سند بن علی معاملہ کی اہمیت کو سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کی سزا نہایت سخت دی جائے گی، تحقیقات کے بعد اس نے اپنی رپورٹ اس طرح مرتب کی کہ غلطی ظاہر نہ ہونے پائی اور انجینئروں کی جان بچی۔ سند بن علی دھاتوں کا ماہر بھی تھا (metalur) اس نے بہت سے قیمتی دھاتوں پر تجربہ کئے اور ان کا صحیح وزن معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کیا، اس نے دھاتوں میں کثافت اضافی (Specific gravity) کی تحقیق کی، جس سے کھرے اور کھوٹے کا صحیح صحیح پتہ چلایا جاسکتا تھا، کثافت اضافی کے نظریے نے دھاتوں کی صنعت میں انقلاب پیدا کر دیا، وہ آلات رصدیہ کا بھی ماہر تھا، سند بن علی ”بیت الحکمۃ“ کا ممبر بھی تھا اور سائنس کے عناصر رابعہ میں وہ بھی شامل تھا۔

(۳) ابو حاتم مظفر اسفرازی

علم طبعیات کی شاخ علم میکانیات (mechanics) اور ماسکونیات کا باکمال ہنرمند، علم ریاضی کا ماہر، دھاتوں کی قدر پہچاننے والا (metalurgist) قیمتی دھاتوں کا صحیح صحیح وزن معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کرنے والا، ایک ایسی نازک ترازو کا موجد

جس سے سون اور دیگر قیمتی دھاتوں میں ملاوٹ کا صحیح پتہ چل جائے، ملاوٹ کا چارٹ تیار کرنے والا، باکمال دانشور، وزن کی ابتدائی اکائی اوقیہ (اونس) اور درہم (اڈرام) قیمتی دھاتوں اور اشیاء کے استعمال کا موجد، وطن، ولادت اور وفات کی صحیح تاریخیں معلوم نہ ہو سکیں۔

اندازاً ۱۰۶۷ء میں وفات ہوئی۔

علمی خدمات اور کارنامے

ابو حاتم مظفر اسفرازی علم ریاضی اور ہیئت کا ماہر تھا اور اس نے کئی نئی دریافتیں کیں، علم ہیئت اور ریاضی کے ماہر عمر خیام نے ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں ایک اچھی رصد گاہ اصفہان میں قائم کرائی تھی، اس رصد گاہ کی نگرانی اور کام کے لئے بہت سے سائنسدانوں اور ماہر انجینئروں کی جماعت مقرر کی تھی، ان میں ایک مظفر اسفرازی بھی تھا، یہ علم ہیئت کا ماہر اور اچھا صناعت تھا، اس میں اور بھی بہت سی کئی خوبیاں تھیں۔

ہر رصد گاہ (observatory) میں آلات رصدیہ کو بہت اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ آسمان کے عجائبات کا مشاہدہ کرنا آسان نہیں ہے، اس کام کے لئے آلات کا صحیح ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

ملک سلجوقی کی مذکورہ رصد گاہ اپنی عمدہ کارکردگی کے لحاظ سے مشہور ہے، اس رصد گاہ میں آلات رصدیہ کا انچارج ابو حاتم اسفرازی تھا، وہ ایک جدت پسند اور ماہر انجینئر تھا۔ اسفرازی علم طبعیات (physics) سے خاص دلچسپی رکھتا تھا، وہ علم طبعیات کی وہ دو مشہور شاخوں میکانیات (mechanics) اور ماسکونیات (hyrostatics) میں دست گاہ کامل رکھتا تھا۔

ایک نازک ترازو کی ایجاد

اسفرازی ایک اچھا صناعت تھا، اس کے جدت پسند دماغ نے ایک انوکھے ڈھنگ کی ترازو ایجاد کی، اس نازک ترازو کی خوبی یہ تھی کہ اس کے ذریعہ سونا اور چاندی بنی ہوئی اشیاء اور زیورات میں ملاوٹ کا صحیح صحیح اندازہ چل سکتا تھا، یعنی سونا خالص ہے یا اس میں

کچھ ملاوٹ ہے، اگر ملاوٹ ہے تو دوسری دھات کس قدر ہے۔

اسفرازی کی یہ ایجاد کردہ ترازو کثافتِ اضافی (Specific gravity) کے اصول پر مبنی تھی

سونا اور چاندی نیز دیگر دھاتوں کا صحیح وزن معلوم کرنے کے لئے مسلم ماہرین ایک خاص اصول سے کام لیتے تھے، مثلاً سونے کی کثافت اضافی (۱۹ ی ۳) ہوتی ہے، اور باقی دھاتیں اس سے ہلکی ہوتی ہیں، اب سونے میں اگر چاندی یا تانبا جو کھوٹ کے طور پر ملا دیتے ہیں، یہ دھاتیں سونے سے ہلکی ہوتی ہیں، پس ملی ہوئی دھات کے سبب سونے کی بنی ہوئی اس چیز کی کثافتِ اضافی (۱۹ ی ۳) نہیں ہو سکتی؛ بلکہ کم ہو جاتی ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس سونے میں کتنی ملاوٹ ہے۔

اور اگر ملاوٹی دھات کی نوعیت معلوم کر لی گئی تو یہ بھی پتہ چل سکتا ہے کہ اس شے میں اس قدر سونا ہے اور اتنی ملاوٹی دھات ہے۔

کثافتِ اضافی معلوم کرنے کا طریقہ

کثافتِ اضافی معلوم کرنے کے لئے دو تجربے کرنا ضروری ہے، ایک تجربہ تو یہ ہے کہ اس شے کا عام وزن صحیح معلوم کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس شے کا وزن پانی کے اندر صحت کے ساتھ دریافت کیا جائے اور پھر پانی میں اس کے وزن کی ٹھیک ٹھیک کمی نکالی جائے، اسفرازی نے اس سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کیا تھا مثالوں کے ذریعہ اس کی تشریح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فرض کیجئے کہ سونے کے ایک زیور کا عام وزن (۸۰) اوقیہ ہے اور پانی میں اس کا وزن (۷۵) اوقیہ ہے، یعنی پانی میں اس کے وزن کی کمی بقدر (۵) اوقیہ ہو جاتی ہے۔ اب اس زیور میں خالص سونے کے ساتھ کچھ حصہ چاندی بھی بطور کھوٹ کے ملی ہے، یہاں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس زیور میں کتنے اوقیہ خالص سونا اور کتنی چاندی ہے۔

سونے کی کثافتِ اضافی (۱۹-۳) اور چاندی کی کثافتِ اضافی (۱۰-۵) پہلے سے معلوم ہے، اس لئے اس مثال کے ذریعہ علمِ ریاضی کے اس سوال کو آسانی حل کیا

جاسکتا ہے۔

مظفر اسفرازی کی ترازو ایک قسم کی ماسکونی ترازو تھی، جس کے ذریعہ دی ہوئی شے کا عام وزن پھر پانی میں اس کا صحیح وزن معلوم کیا جاسکتا تھا اور دونوں حاصل تفریق سے پانی میں اس کے وزن کی کمی نکالی جاسکتی تھی۔

دھاتوں میں ملاوٹ کا چارٹ

اسفرازی کے زرخیز دماغ نے بہت سی نئی باتیں پیدا کیں، اس نے سینکڑوں تجربے کر کے سونے میں چاندی کی ملاوٹ کے بہت سارے چارٹ تیار کئے، یہ اس کی مہارت کا کمال تھا، اس چارٹ میں چارخانے تھے۔

پہلا خانہ: اس شے کا وزن

دوسرا خانہ: پانی میں اس کے وزن کی کمی

تیسرا خانہ: سونے کی مقدار کا وزن

چوتھا خانہ: سونے کی مقدار کا وزن

اس نے سونے میں ملاوٹ اور چاندی میں ملاوٹ، کے سلسلے میں سینکڑوں دھاتوں سے متعلق چارٹ بڑی محنت سے تیار کیا تھا، ان چارٹوں کا تیار کرنا نہایت مشکل اور صبر آزما کام تھا، اس کام میں اسفرازی نے اپنی عمر کے کئی سال صرف کئے تھے۔

انوکھی ترازو کی ایجاد اور چارٹ نے صنعتی اور کاروباری دنیا میں بہت سہولتیں پیدا کر دی تھیں۔

اونس، ڈرام

مسلم دور میں تاجروں اور دانشور مختلف اشیاء کو وزن کرنے کے لئے ان دو اکائیوں کا استعمال کرتے تھے، درہم اور اوقیہ۔

چھوٹی چھوٹی اور قیمتی دھاتوں کا وزن کرنا ہوتا تو یہی دو معیار مانے جاتے تھے، اس کا رواج مسلم دور سے آج تک اس سائنسی زمانے میں بھی جاری ہے۔

جب یہ علمی خزانے اسلامی ممالک سے یورپ کی طرف منتقل ہونے لگے تو یہ وزن

بھی وہاں پہنچے، چونکہ یہ نہایت مناسب اور موزوں تھے؛ اس لئے ان کو دانشوران یورپ نے بحسنہ باقی رکھا، کوئی فرق نہیں کیا اور آج بھی ان کا چلن ویسا ہی ہے۔

اوقیہ = اونس بن گیا درہم = ڈرام بن گیا

اس نئے دور میں آج بھی ہسپتالوں میں اونس اور ڈرام کا استعمال ادویہ کو تولنے کے لئے نہایت کثرت سے ہوتا ہے کہ ان کے بغیر کام نہیں چل سکتا، لیکن یہ ہمارے ڈاکٹر اور تاجر شاید ہی جانتے ہوں کہ ان کے روزانہ کے استعمال میں آنے والا یہ وزن اونس اور ڈرام کیا ہے اور کس دور کی یادگار ہے

(۴) (ابو عباس) احمد بن محمد کثیر فرغانی (۲۳۳ھ - ۸۵۷ء)

زمین کے محیط کی پیمائش کرنے والوں کی جماعت کا ممبر تھا، طغیانی ناپنے کا آلہ ایجاد کیا، دھوپ کی گھڑی پیش کی، اس نے دھوپ گھڑی (sun dial) ایجاد کی۔ علم ہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا، جوامع العلوم کتاب مرتب کی، اس کتاب کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

احمد کثیر فرغانی علم ہیئت کا ماہر، کامیاب سول انجینئر اور اچھا صانع تھا۔ احمد کثیر شہر فرغانہ (ترکستان) میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بغداد آ گیا، تعلیم مکمل کی اور مطالعہ میں مصروف ہو گیا، یہاں کے علمی ماحول میں اس کے جوہر کھلے، اس نے بہت اچھی استعداد پیدا کر لی، مامون الرشید کا زمانہ تھا۔

علمی خدمات اور کارنامے

بغداد علم فن کا مرکز بن گیا تھا، ہر علم فن کے قابل ترین لوگ وہاں موجود تھے۔ مامون الرشید علمی ذہن و دماغ رکھتا تھا، اس کے ذہن میں آیا کہ زمین کے محیط کی صحیح پیمائش کی جائے، چنانچہ اس نے انجینئروں کی ایک جماعت مقرر کی، اس جماعت نے غور و فکر کے بعد کچھ اصول اور قاعدے بنائے اور طریقہ کار متعین کئے، ماہرین کی اس جماعت کا صدر احمد کثیر فرغانی تھا، شہر کوفہ کے شمال میں ایک وسیع میدان اس کام کے لئے موزوں سمجھا گیا، اس میدان کو دشت بخار کہتے تھے، اس میدان میں دو

مقامات رقبہ اور تدرک کو منتخب کیا گیا، جملہ آلات اور سامان وہاں مہیا کر دیا گیا۔ زمین کے محیط یعنی گھیر کی صحیح پیمائش کے لئے طریق کار طے کیا گیا کہ پہلے اصطرلاب اور سدس (sextants) اور دیگر آلات کی مدد کی سے قطب تارے کی بلندی زاویے کے ذریعے معلوم کی جائے، پھر ایک مقررہ فاصلے تک آگے بڑھ کر قطب تارے کی بلندی کی پیمائش کی جائے اور اب دونوں کے فرق کو معلوم کر لیا جائے، اس طرح زمین کے محیط کی پیمائش معلوم ہو جائے۔

ماہرین نے پیمائش شروع کی اور حساب کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ زمین کا گھیر میل ہے، مامون الرشید بہت خوش ہوا، بیت الحکمۃ کے ممبروں میں فرغانی بھی تھا، اسے بھی کام کا کافی موقع ملا۔

موجودہ زمانے میں جب کہ ہر طرح کی سہولتیں ہیں، نئے نئے آلات ہیں، زمین کے محیط یعنی گھیر کو میل مانا جاتا ہے، مسلم دور کی پیمائش اور آج اس نئے دور کی پیمائش میں بقدر (151) کا فرق ہے، یعنی کل غلطی صرف (6) فیصد پائی جاتی ہے، یہ غلطی کوئی غلطی نہیں ہے۔

فرغانی کو صناعی میں بھی کمال حاصل تھا، اس نے کئی اہم چیزیں ایجاد کیں، طغیانی ناپنے کا آلہ: اس آلہ کے ذریعے دریا کے پانی کا صحیح اندازہ ہو جاتا تھا اور معلوم ہو جاتا تھا کہ سیلاب آنے والا ہے یا نہیں، یہ آلہ دریا میں نصب کر دیا جاتا تھا۔

دھوپ کی گھڑی

دوسری چیز جو بہت ضروری تھی، وہ دھوپ کی گھڑی (sun dial) تھی، جس سے دن میں وقت کا صحیح اندازہ ہو جاتا تھا۔

فرغانی نے کئی کتابیں مرتب کیں، مشہور کتاب اس کی ”جوامع علم النجوم“ ہے، اس کتاب کا پہلا لاطینی ترجمہ بارہویں صدی عیسوی میں شائع ہوا، پھر دوسرا ترجمہ جرمنی میں ۱۵۳۷ء میں چھپا اور تیسرا ترجمہ فرانس کے دانشوروں نے ۱۵۴۶ء میں شائع کیا۔ (۱)

عظیم مسلمان فلاسفر

بعض مغربی مصنفوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے یونان کی فلسفیانہ کتابوں کے صرف ترجمے کئے ہیں؟ اپنی طرف سے اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا، اس غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلم فلسفے کے اصل مآخذ ان لوگوں کی رسائی سے باہر ہیں اور اپنی عدم رسائی کا اعتراف کرنے کے بجائے یہ حضرات مسلم فلسفے کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں، فرانس کے مورخ موسیو سید یوان کی غلط بیانی کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یورپ والے کہتے ہیں کہ عربی فلسفہ کوئی چیز ہی نہیں، عرب فلسفہ کو کیا جانیں؟ لیکن یہ کہنے والے اس لئے معذور مانے جاسکتے ہیں کہ ان بیچاروں کو عربوں کے علمی مشاغل اور دماغی کارناموں کا علم ہی نہیں، فلسفیان یورپ ذرا غور سے کام لیں اور اپنے ہی یہاں کی علمی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ان کو بے آسانی معلوم ہو سکے گا کہ قرونِ متوسطہ میں یورپ کے مدارس جن فلسفی کتابوں کا درس دیا کرتے تھے، وہ سب فلاسفہ عرب کی تالیفات سے خوشہ چیں ہو کر تالیف ہوئیں تھیں“ (۱)

(۱) (ابو یوسف) یعقوب بن اسحاق کندی (۲۵۴ھ-۸۶۸ء)

ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی، فلسفی، شاہانِ عرب کا سپوت اور خاندانِ کندی کا نونہال تھا اور اس کا باپ اسحاق بن صباح تینوں خلفائے عباسیہ مہدی، ہادی اور رشید کے زمانے میں کوفہ کا امیر رہا، سلیمان بن حسان کا بیان ہے کہ: مسلمانوں میں کندی کے سوائے کوئی فلسفہ نہ تھا، اس کی مراد شاید یہ ہوگی کہ یہ فلاسفہ اسلام میں پہلا فلسفی تھا۔

کندی نے اپنی تالیفات میں بالکل ارسطو کا انداز اختیار کیا ہے، اکثر فلسفے کی کتابوں کی شرح لکھی ہے، مشکل مقامات کی توضیح و تلیخیص کی ہے، پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے جس سے اس کی ترجمے کی اعلیٰ استعداد کا پتہ چلتا ہے۔

کندی کی اکثر و بیشتر تالیفات فلسفے میں ہیں اور ارسطو کے فلسفے کا شارح ہونے کی حیثیت سے عربوں میں کندی ہی کو شرفِ تقدم حاصل ہے، اس کی یہ شرحیں ان کتابوں میں جو ہم کو دستیاب ہوئیں، مغلہ ان کے ایک کتاب ”فی قصد ارسطالیس فی العقلات“ ہے اور دوسری ارسطو کی تصنیفات کی ترتیب ہے جس میں اس نے ارسطو کی کتابوں کی تعداد ان کی ترتیب اور ان کے اغراض اور ان چیزوں سے بحث کی ہے جو فلسفے کے حصول کے لئے ضروری ہیں۔

اس وقت کندی کی کم و بیش پندرہ کتابیں محفوظ ہیں، ان میں ان کی پہلی تصنیف ”کتاب الفلسفة الأولى فی مادون الطبعیات والتوحید“ اس لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ اس میں انہوں نے فلسفے کا دفاع کیا ہے، دوسرے تین رسالوں میں ثابت کیا ہے کہ عالم نہ صرف مکان؛ بلکہ زمان میں بھی محدود ہے، ان کے پانچ رسالے وہ ہیں جن میں روح اور عقل پر بحث کی گئی ہے، ان کی دوسری تحریروں میں فلسفیانہ مسائل مثلاً تخلیق، سلسلہ علل، جواہر خمسہ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، کندی نے اگرچہ ارسطو اور افلاطون کے افکار پر زیادہ انحصار کیا ہے مگر بعض مقامات پر انہوں نے یونانی حکماء سے اختلاف بھی کیا ہے۔

انہوں نے افعالِ باری، ماہیت عقل، توحید، علم کی اقسام، روح، عقل فعال جیسے موضوعات پر بحث کر کے فیلسوف العرب کا لقب پایا۔

مغربی مفکرین نے کندی کی علمی خدمات کو سراہا ہے، راجر بیکن کا کہنا ہے کہ کندی اور انب الہیثم مریات میں شہرت کے لحاظ سے بطلموس کے ساتھ طبقہ اول میں شمار ہوتے ہیں، غیر ولیمو کاردانو (Girolamo cardano) نے کندی کا شمار تاریخ کے ان بارہ عظیم ترین ذہین افراد میں کیا ہے، جن کی مثال ابتدائے آفرینش سے سولہویں صدی

عیسوی تک دنیا پیش کرنے کا سر رہی ہے۔

ول دوران ان کی عبقری شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Like so many thinkers in that condident heyday of Muslim mind, he was an omnivorous polymath studying everything, writing 265 treatises about everything-arithmetic, geometry astronomy, merteoroglogy, geography, physics, politics, music, medicine philosophy.

”مسلم ذہن کے اس پر اعتماد و عروج دوسرے مفکرین کی طرح وہ ہمہ داں و ہمہ جہت مفکر تھے، جو ہر موضوع کا مطالعہ کرتے تھے اور جنہوں نے تقریباً ہر موضوع حساب، جیومیٹری، فلکیات، موسمیات، جغرافیہ، طبیعیات، سیاسیات، طب، فلسفہ، وغیرہ پر قلم اٹھا کر ۲۶۵ رسالہ تحریر کئے ہیں۔“

کندی کی وصیتیں

طیب کو چاہئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہے، اور مریض کی جان کو خطرے میں نہ ڈالے، کیوں کہ اس کا کوئی بدل ممکن نہیں، جس طرح تم یہ کہنا پسند کرتے ہو کہ خدائے تعالیٰ مریض کی صحت و عافیت کا سبب ہے، اسی طرح سمجھ لو کہ اس کی موت کا سبب بھی وہی ہے۔

اس کا ایک قول یہ بھی ہے ”عقل ہمیشہ اپنی علمیت کو محدود سمجھتا ہے، اسے تواضع اختیار کرتا ہے اور جاہل خود کو تمام علوم کا مخزن سمجھتا ہے، اس وجہ سے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔“

قول ”لا“، یعنی ”نہیں“، بلاؤں کو پھیر دیتا ہے اور قول ”نعم“، یعنی ”ہاں“، نعمتوں کو زائل کر دیتا ہے، گانا سننا گویا سرسہ کی بیماری ہے، کیوں کہ انسان اس کی وجہ سے آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور بے دریغ پیسہ صرف کرتا ہے اور چند روز میں مفلس اور قلاش ہو کر انتہائی رنج و مصیبت میں جان دیتا ہے۔

ایک ملا سے مقابلہ

یعقوب ایک فلسفی تھا، اس کے فلسفیانہ نظریات تھے، تنگ نظر ملا ایسے لوگوں کو بے دین سمجھتے ہیں، ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا، شہر بلخ کے ایک ملا کو سخت غصہ آیا، اس نے کندی کے فلسفیانہ نظریات اور خیالات کو دین و مذہب کے خلاف سمجھا، وہ بلخ سے اپنی پارٹی کے ساتھ بغداد آیا اور یعقوب کے خلاف سخت تقریریں کرنے لگا۔

بلخی ملا نے یعقوب کے ناک میں دم کر دیا اور ان کی جان کے لالے پڑ گئے؛ لیکن سنجیدہ اور فراخ دل یعقوب نے دربار میں ذرا شکایت نہ کی؛ بلکہ عافلانہ طریقہ اختیار کیا یعنی اس بلخی ملا کو اپنے یہاں دعوت دی اور عزت سے بلایا۔

یعقوب کندی نے بلخی ملا کی خوب قدر و منزلت کی، بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور پھر اسے سمجھایا کہ دین و مذہب اور سائنس و فلسفہ میں کوئی جھگڑا نہیں، نہ تضاد ہے، دین و مذہب ایک خدائی نظام زندگی ہے، وہ پاکیزہ زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے اور فلسفہ اور سائنس تو انسان کی عقلی دوڑ ہے، انوکھے خیالات و نظریات ہیں، قرآن پاک بھی عقل سے کام لینے اور تفکر و تدبر پر زور دیتا ہے، لہذا ہمیں عجائبات عالم پر غور کرنا اور عقل سے کام لینا چاہئے، ہم قدرت کے اسرار کو کہاں تک سمجھ سکتے ہیں، سوچنا چاہئے۔

اس کے علاوہ یہ ماہر علم طب اور نجوم بھی تھا۔

(۲) حکیم ابونصر محمد بن فارابی (۲۳۸ھ/۹۵۰ء)

حکیم ابونصر محمد بن فارابی فلسفی، ریاضی داں اور ہر علم و فن میں کامل دست گاہ رکھنے والا دانشور تھا، دنیا نے صرف چار اعلیٰ ترین دماغ رکھنے والے اور جامع شخصیتیں پیدا کی

ہیں، ان میں ایک فارابی تھا، ابونصر فارابی عالی دماغ سائنس داں اور عظیم مفکر تھا، دنیا نے اسے معلم ثانی کا خطاب دیا، وہ کائنات کا محقق اور تہذیب و معاشرت اور علم اخلاق کا نکتہ داں تھا۔

فارابی اپنے ذاتی شوق اور محنت سے علم و فن کا گہرا مطالعہ کیا اور کمال پیدا کیا، اس نے کبھی عیش و آزادی کی زندگی نہ گذاری، ہمیشہ محنت کا عادی رہا، ترکی لباس کا وہ پابند رہا، سر پر ایک لمبی ٹوپی رہتی تھی، اپنی یہ وضع کبھی نہ بدلی۔

علمی خدمات اور کارنامے

فارابی نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کی تعداد اقطبی نے ۱۷۳ اور حاجی خلیفہ نے ۱۱۴ بتائی ہے، ان میں تقریباً پچاس کتابوں کا تعلق فلسفہ اور منطق سے ہے، انہوں نے احصاء العلوم کے نام سے انسائیکلو پیڈیا تصنیف کیا، جس میں لسانیات، منطق، ریاضی، طبوعات، کیمسٹری، معاشیات اور سیاسیات کے علوم کے بارے میں معلومات کا خزانہ جمع کر دیا، فلسفہ میں انہوں نے ارسطو کو اپنا ہیرو مانا اور ان کی کتابوں کی تشریح میں رسالے لکھے۔

منطق میں فارابی نے کئی کتابیں تحریر کیں، ان میں انہوں نے اس فن کے ضروری مباحث پر روشنی ڈالی، قیاس اور برہان کو زیر بحث لایا اور مشکل مقامات کی وضاحت کی۔

فارابی نے افلاطون اور ارسطو کی طرح سیاسیات پر توجہ دی، انہوں نے رسالہ ”رسالہ فی آراء اهل المدينة الفاضلة“ اور ”سیاسة المدينة“ کے عنوانوں سے دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ فارابی نے فلسفہ یونان کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، یہ کام ان سے پہلے کندی نے شروع کیا تھا۔

فارابی کا فلسفہ اخلاق

فارابی علم اخلاق اور معاشرت پر بڑے اچھے انداز میں بحث کرتا ہے، حکماء میں فارابی پہلا شخص ہے جس نے حیوانات پر غور کیا اور بتایا کہ انسان اشرف المخلوق کیوں ہے

؟ انسان کی زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے اور وہ عظیم مقصد سعادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، سعادت یعنی عمدہ اور پاکیزہ خیالات و نظریات اور اعمال صالحہ کو ”مکارم اخلاق“ کہتے ہیں، سعادت کی تکمیل مکارم اخلاق کا نام ہے۔

علم کیا ہے؟ اور طالب علم کسے کہتے ہیں؟

فارابی علم کی تعریف کرتا ہے، علم اللہ کا نور اور دل کی روشنی ہے

علم کون حاصل کر سکتا ہے؟

ایک طالب علم با کمال اور عالی دماغ اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ اپنے دل میں سچا شوق اور سچی لگن رکھتا ہو اور وہ تندرست اور اچھے مزاج کا ہو، وہ عمدہ اخلاق و عادات کا پابند ہو، غور کرنے اور سوچنے کا دل ہو، سچا طالب علم وہ ہے جو دیانت دار، مستعد اور محنتی ہو، وہ وقت کا پابند ہو، قناعت پسند ہو، صاف ستھری سادہ اور پاکیزہ زندگی گذارتا ہو۔

فارابی آگے لکھتا ہے:

انسان علم کو روزی حاصل کرنے کا ذریعہ ہرگز نہ بنائے۔

انسان کو پورا کمال انسانیت صرف اچھے علم اور اچھے عمل سے ہی حاصل ہو سکتا ہے،

یعنی اس کے اخلاق و عادات اچھے ہوں، شیریں زبان ہو اور عمل بھی اچھا ہو۔

عادت اور اس کا مقصد

ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں؛ لیکن کیوں؟ فارابی عبادات پر عالمانہ اور سائنٹفک انداز میں بحث کرتا ہے، یہ اعمال جو روز ہم ادا کرتے ہیں، یہ معاشرہ یعنی سوسائٹی میں لوگوں کو متنبہ اور خبردار کرتے رہتے ہیں، یہ برائیوں سے بچا لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں یہ اعمال مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یہ دیانت داری اور حسن اخلاق وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں، ان عبادات سے بندوں کے ایمان میں تازگی آ جاتی ہے، ان میں اخوت، مروت اور محبت کے شریفانہ جذبات ابھرتے ہیں، ان کے خیالات اور عقائد پاکیزہ ہوتے ہیں۔

یہ سب سوسائٹی کے اجتماعی نظام کو قائم اور مستحکم رکھتی ہیں اور صحت مند معاشرہ کی

نشوونما میں معاون ہوتی ہیں۔

موجوداتِ عالم

فارابی موجوداتِ عالم پر فلسفیانہ انداز میں بحث کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ: موجوداتِ عالم یعنی یہ دنیا اور اس کی سب چیزیں، ان سب کی وہ پہلے تین قسمیں بتاتا ہے، جمادات، نباتات اور حیوانات، پھر ان کے بارے میں وہ عالمانہ انداز میں گفتگو کرتا ہے۔

فارابی حیوانات کو حیاتیات کے نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے (حیاتیات biology) اس حیاتیات کی وہ قسمیں بتاتا ہے اور اسے زندگی کا ارتقاء کہتا ہے کہ یہ اس کا نظریہ ہے یعنی وہ مخلوق جو جان رکھتی ہیں اور ان میں زندگی ہے، وہ جامد اور ساکت نہیں ہے، وہ متحرک ہیں، اس طرح کہ ان میں عاقل ہیں جیسے انسان اور غیر عاقل جیسے جانور۔

انسان عاقل ہے اسے اشرف مخلوق کا درجہ دیا گیا ہے، اس میں ارتقاء بھی جاری ہے، (دماغی ارتقاء) قدرت نے اس میں ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں، وہ غور و فکر کرے گا اور پھر آگے بڑھے گا، چنانچہ یہ عمل جاری ہے، دماغی ارتقاء اس کے تجربات کی بنیاد پر جاری ہے اور جاری رہے گا۔

اشرف مخلوق انسان کا ارتقاء

انسان عاقل ہے اور اللہ نے اسے علم جیسی عظیم ترین نعمت سے نوازا ہے، ”علم

الإنسان ما لم يعلم“

انسان اپنی ضروریات کے حصول اور بہترین حالات کی تکمیل کے لئے اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے، وہ معاشرہ اور سوسائٹی سے الگ نہیں رہ سکتا، وہ اپنی سماجی زندگی ہی میں اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

فارابی انسانوں کی اجتماعی زندگی کے ارتقاء کی تشکیل کا تصور اس طرح پیش کرتا ہے، انسان کی سماجی زندگی کے ارتقاء کی تشکیل۔

انسان اپنی اجتماعی زندگی میں طبعاً خاندان کی تشکیل کرتا ہے یہ پہلا اجتماع ہے۔

کئی خاندان مل کر جب باہم ان میں تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، قبیلہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، خاندانوں کا دوسرا اجتماع قبیلہ ہے، جو کئی خاندانوں کا مجموعہ ہے اور پھر اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر کئی قبائل باہم مل جاتے ہیں تو یہ تیسرا اجتماع قوم کہلاتا ہے، یہ بہت بڑا اجتماع اور ارتقاء کی تیسری منزل ہے۔

خاندان کی طاقت محدود ہوتی ہے، قبیلہ طاقتور ہوتا ہے اور اپنی طاقت کے ذریعہ وہ ایک خطہ زمین پر قبضہ کر لیتا ہے اور پھر بہت سے قبائل مل کر جو ایک قوم بن جاتے ہیں، ایک وسیع علاقہ پر قابض ہو جاتے ہیں، وہ اپنا ایک نظم و ضبط قائم کر لیتے ہیں، یہ سب اجتماع اپنے افراد کی جملہ ضرورتوں کو مہیا کرتے ہیں ان کی حفاظت کرتے ہیں، یہ فطری اور طبعی تقسیم ہے، ان کے نام یہ ہیں، پہلا اجتماع گاؤں ہے، دوسرا قصبہ اور ان سب سے بڑا شہر، شہر کی اجتماعی زندگی نہایت وسیع ہوتی ہے، اس لئے وہ بڑے بڑے چشمے اور دریا کے کنارے آباد ہوتا ہے، خاندان، قبیلہ اور قوم یہ تین قسمیں آبادی کی ہو جاتی ہیں۔

قوم کامل ترین انسانی اجتماع ہے

قوم اپنا الگ اور منفرد مزاج رکھتی ہے، ہر قوم دوسری قوم سے عادات و اطوار، اندازِ غور و فکر میں الگ ہوگی، ان کے خیالات و نظریات معاشرتی زندگی اور زبان سب باتیں الگ الگ ہوں گی، یہاں تک کہ شکل و صورت میں بھی اقوام عالم ایک دوسرے سے الگ نظر آئیں گی۔

قوم پر آب ہوا کے ہونے والے اثرات

خاندان ابتدائی وحدت ہے، یہ معاشرہ کا ناقص اجتماع ہے، گاؤں نسبتاً بڑا اجتماع ہے، مگر یہ بھی نامکمل اجتماع ہے، محدود ہے، ذرائع زندگی محدود ہیں۔

تیسرا اجتماع سب سے بڑا اور مکمل اجتماع ہے، یہ اجتماع شہر کا اجتماع ہے، مدینہ عربی میں اور انگریزی میں سیٹی (city) کہتے ہیں، اس تیسرے اجتماع میں ہر فرد کو ہر قسم کی مناسب سہولتیں حاصل ہوتی ہیں، جملہ ضروریات زندگی کی تکمیل کے سامان مہیا ہوتے ہیں، تہذیب و ثقافت کے نوک و پلک یہاں سنورتے ہیں، اس لئے معاشرہ یعنی

سماج کی نشوونما اور صحت مند ترقی کے لئے شہر بہترین جگہ ہے یہ مکمل اجتماع ہے، یہاں ہر طرح کے ذرائع ہیں جن سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

شہر کے بھی درجے ہیں، بعض شہر کے لوگ طبعاً زیادہ شریف، تعلیم یافتہ اور ذرائع کے سبب زیادہ تجربہ رکھتے ہیں، اس طرح آداب زندگی اور اخلاق میں بھی فرق ہو جاتا ہے، زمین اور آب و ہوا کے اثرات نہ ہوتے ہیں۔

شہروں میں زندگی کا ہر پہلو نمایاں اور واضح ہوتا ہے، ہر قسم کے لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں، ان میں مسائل و معاملات کے سلسلے میں خیالات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے، ہر قسم کے تجربے ہو جاتے ہیں، صلاحیتیں ابھرتی ہیں، جدت پسند دماغ اور حوصلہ مند افراد نئے نئے نظریے قائم کرتے ہیں، زندگی کا ہر پہلو نشوونما پاتا رہتا ہے اور یہ ارتقاء برابر جاری رہتا ہے، جس سے انسانیت کو فروغ حاصل ہوتا رہتا ہے اور تہذیب و تمدن کو ترقی کا موقع ملتا رہتا ہے۔

فارابی گاؤں اور شہر کی تنظیم پر آگے لکھتا ہے:

”شہروں میں محلہ ہوتے ہیں، اور یہ سب مجھے باہمی تعاون کی بنیاد پر شہری آبادی کی تکمیل کرتے ہیں، گویا یہ محلے شہر کے جزو ہیں اور انتظامی حیثیت رکھتے ہیں، شہر ایک جسم اور محلہ دیگر انتظامات اس کے ضروری حصے اور اعضاء ہیں جن سے شہر سجانے کی تکمیل ہوتی ہے۔“

گاؤں اور دیہات کم تر درجیوں کی جگہیں ہیں، دیہات شہری اجتماع کے لئے قائم ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ دیہات کی حیثیت اب شہر کے خادم کی حیثیت ہو جاتی ہے، جو شہری ضرورتوں کو ایک حد تک مہیا کرتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

انسان، اعلیٰ تمدن اور معاشرت

فارابی ایک محقق اور مفکر کی طرح حیاتیات پر بحث کرتے ہوئے سماجیات پر گفتگو

کرتا ہے، وہ علم تمدن اور معاشرت پر بحث کرتا ہے:

”انسان اشرف مخلوق ہے؛ لیکن وہ اپنے ماحول اور اپنے نفس کے

حالات سے مجبور ہو کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، اعلیٰ اور ادنیٰ تمدن رکھنے والے انسان اور ادنیٰ تمدن کے انسان اعلیٰ تمدن رکھنے والے بلند ترین سماج کے لوگ ہیں، وہ زندگی کا شعور رکھتے ہیں۔“

فارابی کہتا ہے:

”اعلیٰ تمدن رکھنے والے شریفانہ اور صحت مند سماج میں وہ لوگ ہیں جو شریف، نیکوکار اور میل ملاپ رکھنے والے ہر حال میں خوش اور مطمئن ہیں، وہاں ہر شہری میں باہم محبت اور مروت کا جذبہ پایا جاتا ہے، ان کا نظریہ زندگی عام انسانی برادری کی صلاح و فلاح ہے۔“

اس اعلیٰ تمدن سماج میں صرف شریف اور نیکوکاروں کو بلند درجہ حاصل ہوتا ہے اور وہاں لوگوں کی عزت اور ان کا احترام ان کے قول و فعل کے سبب کیا جاتا ہے۔

فارابی اب کم تر درجے یعنی غیر متمدن سماج کے لوگوں کے بارے میں بیان کرتا ہے:

”غیر متمدن اور کم تر سماج کے لوگ وہ ہیں جن میں ادب اور شائستگی کوئی چیز نہیں، ان میں زندگی کا شعور نہیں پایا جاتا، وہ لوگ صرف اپنی غرض اور اپنے مطلب ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، ایسے سماج میں ان ہی باتوں کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔“

ایسے کم تر سماج کے لوگوں کی زندگی کا مقصد بس یہ ہوتا ہے کہ اپنی پوری طاقت اور قوت صرف دولت اور روپیہ حاصل کرنے اور جمع کرنے پر صرف کیا جائے، ایسے لوگ دولت اور روپیہ سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں، اس لئے وہ بخیل بھی ہوتے ہیں، وہ لوگ اچھی شہرت کے کوئی معنی نہیں سمجھتے۔

(۳) ابن سینا

فارابی کے بعد مشرق کے مسلمانوں میں سب سے بڑے فلسفی ابن سینا ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ وہ فارابی سے زیادہ مشہور ہیں، ان کا میدان شہرت اگرچہ طب رہا ہے،

مگر فلسفہ میں ان کی مہارت عام طور پر مسلم ہے؛ بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ بہ نسبت طبیب ہونے کے فلسفی زیادہ تھے۔

ابن سینا نے ارسطو کی مابعد الطبعیات کا مطالعہ چالیس مرتبہ کیا تھا؛ مگر یہ کتاب ان کے لئے تب بھی ناقابل فہم رہی، آخر میں انہوں نے مابعد الطبعیات پر فارابی کی شرح لکھ ڈالی اور اس کی مدد سے اسے سمجھنے کی کوشش کی، کتاب جب سمجھ میں آگئی تو وہ اس قدر خوش ہوئے کہ شکرانے میں گلی میں جا کر خیرات تقسیم کی۔

ابن سینا فلسفہ میں ارسطو کی عظمت کے قائل تھے، انہوں نے یونانی فکر کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی اسی طرح کوشش کی، جس طرح ان سے پہلے کندی اور فارابی کر چکے تھے؛ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ ابن سینا اپنے پیشروؤں کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، فلپ ہٹی کا بیان ہے:

“The harmonisation of greek philosophy with islam began by al- kindi, an arab was continued by al- farabi, a Turl and compgeted in the Esat by ibn- sina, a persian (1)

”یونانی فلسفہ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کا عمل کندی نے شروع کیا جو عرب تھے، فارابی نے اسے جاری رکھا جو ترک تھے اور مشرق میں ان سینا نے اسے مکمل کیا جو ایرانی تھے“

ابن سینا نے اپنا فلسفہ ”الشفا“ میں بیان کیا ہے، جو بڑی ضخیم کتاب ہے؛ بلکہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگار کے الفاظ میں غالباً اپنی قسم کی ضخیم ترین کتاب ہے جو کبھی ایک شخص نے تصنیف کی ہو۔

ول دوران کے بیان کے مطابق اٹھارہ جلدوں پر محیط اس جناتی کتاب میں

ریاضی، فزکس، فلسفہ، دینیات، معاشیات، سیاسیات اور موسیقی کے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں۔

موصوف کا بیان ہے:

A vicenna's shifa and Qanun mark the apex of medieval thought, and constitute one of the major syntheses in the history of mind (1)

”ابن سینا کی ان تصنیفات ”الشفا“ اور ”القانون“ عہد وسطی کے فکر و فلسفہ کے نکتہ عروج کی علامات ہیں، یہ دونوں کتابیں فکری تاریخ کے بڑے نظاموں میں سے ایک نظام کے اجزائے ترکیبی ہیں۔“

ابن سینا کے افکار نے اہل یورپ کو بہت متاثر کیا، ان کی کتاب ”الشفا“ کا ترجمہ بارہویں صدی میں لاطینی میں کیا گیا، جس سے ان کے فکر کا چرچا یورپ کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا، ان کے خیالات نے عیسائی فلسفی اور ماہر دینیات سینٹ آگسٹائن کے خیالات سے میل کھایا اور وہ عہد وسطی کے عیسائی متکلمین خاص کر فرانسیسیں درس گاہوں کے جزو ترکیبی بن گئے، مغربی مفکرین میں راجر بیکن ان سے بہت متاثر ہوئے وہ اپنی تصنیف (opus majus) میں بار بار ابن سینا کی تعریف کرتے ہیں اور انہیں ارسطو کے بعد فلسفے کا بادشاہ اور رہنما (The prince and leader of philosophy) قرار دیتے ہیں۔

بیکن اور لاطینی مغرب کے علماء پر ابن سینا کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ول دوران لکھتے ہیں:

”انہوں نے گہرے اثرات مرتب کئے، اسپین میں ابن رشد اور موسی بن میمون نے انہیں کے افکار سے اپنا فلسفہ آراستہ کیا اور لاطینی عیسائیت

کے عظیم متکلمین کو بھی انہیں سے تقویت ملی، یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ البرٹ اعظم اور طاس اکویناس نے ان سے کتنا زیادہ مواد لیا ہے، راجر بیکن انہیں ارسطو کے بعد سب سے بڑا فلسفی کہا کرتے تھے، خود طاس اکویناس جب احترام کے ساتھ ان کا نام افلاطون کے ساتھ لیتے تھے تو یہ صرف رسمی آداب نہیں تھے“ (۱)

(۴) امام غزالی رحمہ اللہ

آپ کا اسم گرامی ابو حامد محمد بن محمد بن غزالی رحمہ اللہ ہے، عام طور پر آپ کو غزالی سے منسوب کرتے ہیں، آپ اپنے زمانے کے علمائے کلام میں نہایت مرتبت رکھتے ہیں اور مذہب شافعی کے ائمہ میں سے ہیں، آپ کی ولادت خراسان کے ایک شہر طوس میں ۵۴۰ھ ۱۰۵۸ء میں ہوئی، ابتداء میں آپ نے اپنے ہی شہر میں علوم کی تحصیل کی، اس کے بعد مزید تکمیل کے لئے نیشاپور کا قصد کیا، بچپن میں آپ میں اعلیٰ ذکاوت اور غیر معمولی نجابت کے آثار نمایاں تھے، علم کلام اور فنون فلسفہ میں آپ کے کمالِ تبحر کی وجہ سے سلطان شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک نے آپ کی جانب خاص طور پر توجہ کی اور مدرسہ نظامیہ جس کو اس نے بغداد میں قائم کیا تھا، آپ کو تفویض کیا، اس وقت امام غزالی کا سن پینتیس برس کا تھا اور اس زمانے کے علماء میں آپ کا خاص مرتبہ تھا، کچھ برس بعد آپ نے مدرسہ نظامیہ کو چھوڑ دیا اور حج کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے مکہ مکرمہ کا رخ کیا، اس مقدس فرض سے فارغ ہونے کے بعد دمشق و بیت المقدس اور اسکندریہ کی جامع مسجدوں میں درس دیتے رہے، جب آپ اسکندریہ میں تھے اور یوسف بن تاشقین امیر مراکش سے (جو امراء مرا بطین میں سے تھا) ملنے کے لئے مغرب کا رخ کرنے ہی کو تھے کہ ناگاہ یوسف کے مرنے کی خبر پہنچی، اس لئے طوس کی طرف لوٹے اور حیاتِ فکری کے لئے خود کو وقف کر دیا اور صوفیانہ زندگی گزارنی شروع کی اور بہت سی کتابیں تالیف کیں، جن کی غایت دوسرے ادیان اور فلسفے پر دین اسلام کی فضیلت ظاہر کرنی تھی، اس

بناء پر آپ کا لقب فخر الاسلام اور زین الدین تھا۔

آپ کی کتابوں میں سب سے مشہور ”احیاء علوم الدین“ ہے جو علم کلام اور اخلاق کی زبردست کتاب ہے، یہ چار ابواب پر منقسم ہے، پہلے میں شعائر مذہبی سے بحث کی گئی ہے، دوسرا ان قوانین سے متعلق ہے کہ جو حیاتِ دنیوی کے حالات سے مختص ہیں، تیسرے ان مہلکات سے بحث کی ہے جن کا ازالہ ضروری ہے اور چوتھے ان منجیات کا ذکر کیا ہے جن کا اکتساب لازمی ہے۔

اس کے بعد آپ نے تالیف کا کام چھوڑ کر نیشاپور کی طرف لوٹے، تاکہ مدرسہ نظامیہ کی تنظیم کر سکیں، پھر طوس کا رخ کیا اور صوفیوں کے لئے ایک خانقاہ بنوائی اور آخری ایام عبادت اور غور و فکر میں گزارے اور ۵۰۵ھ ۱۱۱۱ء میں رحلت فرمائی۔

امام غزالی رحمہ اللہ اور فلسفہ

امام غزالی فلسفہ اور فلسفیوں پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”دہریئے سب سے قدیم فلسفی ہیں، انہوں نے ایک ایسے صانع کا انکار کیا جو مدرسہ عالم اور ذی علم و ذی قدرت ہو، ان کا خیال یہ ہے کہ عالم بنفسہ ازل سے موجود ہے، اس کا کوئی صانع نہیں“۔

ہمیشہ نطفہ سے حیوان اور حیوان سے نطفہ پیدا ہوتا ہے، اب تک ایسا ہی ہوتا رہا اور آئندہ بھی اسی طرح ہوتا رہے گا۔

دوسرا گروہ طبعیین کا ہے، اس گروہ کے مباحث زیادہ تر علمِ طبعیات اور حیوانات کی تشریح کے بجائے عجائبات سے متعلق ہوتے ہیں اور اعضائے حیوانات کی تشریح کے علم میں بھی بہت کچھ غور و خوض کرتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ روح فانی ہے اور پھر زندہ نہیں ہوتی، انہوں نے آخرت، جنت، دوزخ، قیامت اور حساب کا بھی انکار کر دیا اور بے لگام ہو گئے اور بالکل خواہشاتِ نفسانی میں منہمک ہو گئے۔

تیسرا گروہ غزالی کہتے ہیں کہ: لہیین کا ہے اور یہ متاخرین سے ہیں، جیسے سقراط جو افلاطون کا استاذ ہے اور افلاطون جو ارسطو تالیس کا استاذ ہے اور ارسطو ہی نے ان کے

لئے منطق کو ترتیب دیا اور تمام علوم میں کانٹ چھانٹ کی، ان میں جو خامیاں تھیں، ان کو رفع کیا اور جو علوم ابتدائی منزل میں تھے انہیں مرتبہ کمال تک پہنچایا، ان الہیین نے پہلے دو گروہوں (طبیعیہ اور دہریہ) کی تردید کی اور ان کی کمزوریوں کو ظاہر کیا اور ان خرابیوں کو ظاہر کیا جن کی طرف دوسروں نے توجہ نہیں کی تھی، اس کے بعد ارسطو طالیس نے افلاطون اور سقراط اور ان سے قبل کے الہیین کی پوری پوری تردید کی؛ یہاں تک کہ ان سب سے برأت حاصل کر لی۔

یہ عجیب بات ہے کہ امام غزالیؒ نے فلاسفہ یونان خاص کر ارسطو کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ فلاسفہ اسلام کی ان کی اتباع کی وجہ سے مذمت کی ہے اور فرمایا کہ ”فلاسفہ اسلام میں کسی نے ان دو شخصوں یعنی فارابی اور ابن سینا کی طرح ارسطو کے ترجمہ کا کام نہیں کیا اور ان کی یہ رائے ابن رشد کے ظہور سے پہلے کی ہے۔

جب امام غزالیؒ نے علوم فلسفہ پر غور و فکر کرنے سے فراغت حاصل کی اور ان میں سے جو کچھ لینا تھا لے لیا اور جن چیزوں کو چھوڑنا تھا چھوڑ دیا تو اس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کمال مقصود کے لحاظ سے فلاسفہ کے علوم ناکافی ہیں، پس انہوں نے مذہب تعلیمی (یعنی باطنیہ) اور اس کی خرابیوں پر بحث کی۔

بہر حال آخر میں غزالی نے اس مسلک کی جانب توجہ کی جو قدرت نے ان کی خلقت میں رکھا تھا اور وہ طریقہ صوفیاء ہے، انہوں نے اس کی طرف اپنی پوری ہمت کے ساتھ توجہ کی، رذائل اور مذموم صفتوں سے پاک و صاف کرنے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ اس کی ایسی حالت ہو جائے کہ قلب غیر اللہ کے خیالات کو بھلادے، امام غزالی کے خیال کے مطابق علم عمل سے آسان ہے، پس انہوں نے صوفیاء کی کتابیں پڑھیں اور ان کے رسائل کا مطالعہ کیا جن میں سے اہم کتب ابی طالب کی، حارث محاسبی اور جنید، شبلی اور بسطامی کے منقولات ہیں اور جن امور کی تحصیل ممکن تھی، ان کو غزالی نے مطالعہ اور سماع کے ذریعے سے حاصل کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ صوفیاء کی اہم خصوصیات وہ ہیں جن کا حصول صرف مطالعے سے ممکن نہیں؛ بلکہ ذوق، حال اور صفات کے بدلنے پر

موقوف ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ حقیقت میں تندرست سیر اور سرمست ہے، ان دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، جو کوئی بھی صوفیاء کی حقیقت پر بحث کرے اس کو یقینی طور پر اس امر کا علم ہوگا کہ یہ لوگ صاحبِ حال ہیں نہ کہ صاحبِ مقال۔

امام غزالی اپنی تصانیف کے بدولت قرون وسطیٰ میں لاطینی مغرب میں بہت مقبول ہوئے، ان کی وفات کے بعد تیس پینتیس برسوں کے اندر ہی ان کی کچھ کتابوں کا لاطینی ترجمہ کیا گیا، ان کی تصنیف ”المقاصد الفلاسفہ“ نے یورپ کو بہت متاثر کیا، بارہویں صدی کی ابتداء میں اس کا ترجمہ ان کتابوں کے ساتھ کیا گیا جو پہلے پہل ترجمہ ہوئی تھی۔

امام صاحب کی درسی تصنیف ”المنقذ من الضلال“ کا لاطینی ترجمہ بارہویں صدی کے نصف اول کے دوران ڈومینک گندی سالیو (D omini c 1150=1130:gundisalvaus) نے کیا تھا، اس کتاب کا موازہ مشہور عیسائی منصف سینٹ آگسٹائن (St . Augustine) کی شہرہ آفاق کتاب اعترافات (Confessions) سے کیا گیا۔

اہل مغرب نے امام غزالی کی کتابوں سے بڑی دلچسپی لی، ان کی کتاب ”مقاصد الفلاسفہ“ کے عبرانی اور لاطینی ترجمے ہوئے، لاطینی ترجمہ ۱۵۰۶ء میں ویش میں چھاپا گیا، ”تہافۃ الفلاسفہ“ کا ترجمہ عبرانی میں کیا گیا، ”المنقذ من الضلال“ کا ترجمہ بارہویں صدی میں چھاپا گیا، اس کا فرانسیسی ترجمہ ۱۸۴۲ء میں پیرس سے اور انگریزی ترجمہ ۱۹۰۹ء میں لندن سے شائع ہوا، امام غزالی کی ایک اور تصنیف ”مشکاۃ الانوار“ انگریزی ترجمے میں لندن سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی

(۵) ابن باجہ (۵۳۳ھ)

ابن باجہ کا نام ابو بکر محمد بن یحییٰ اور لقب ابن صالح یا ابن باجہ ہے، قرون وسطیٰ کے مغربی علماء اسلام اس کو (ayempace) از مپاس کے نام سے جانتے ہیں، یہ اندلس کے مشہور علماء میں سے ہے، اس نے طب، ریاضیات اور فلکیات میں ناموری

حاصل کی، موسیقی اور خاص کر عود کے بجانے میں کمال رکھنے کی وجہ سے وہ فارابی کے مشابہ ہے، اس کی وفات سرقصہ میں گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوئی، جب سن بلوغ کو پہنچ گیا تو ۱۱۱۸ء میں اس نے اشبیلہ کا رخ کیا اور یہاں سکونت اختیار کر لی اور منطق کی کتابوں کی تالیف کے لئے خود کو وقف کر دیا، ان میں سے ایک کتاب اسکوریال کے کتب خانے (۶۰۹ عدد کے تحت) موجود ہے اور اس نے اس کی تدوین سے چوتھی شوال ۵۱۲ھ میں فراغت حاصل کی۔

ابن باجہ کے اشبیلہ منتقل ہونے کا سبب تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں، ممکن ہے کہ وہ فونس اول کے مدینہ سرقصہ کو (۲۱۵ ی) میں فتح کرنے کے بعد اشبیلہ کی جانب ہجرت کرنے پر مجبور ہوا، بہر حال دوسرے عرب مہاجرین کی طرح ابن باجہ نے بھی ہجرت کی اور ایک عرصے تک یہاں مصروف رہا، اس کے بعد اس نے غرناطہ کا رخ کیا اور وہاں کچھ زمانے تک مقیم رہا، اسکے بعد مغرب کی طرف کوچ کیا اور امرائے مراہطین کے ہاں ایک خاص رسوخ اور عزت حاصل کر لی۔

ابن باجہ نے ۵۳۳ھ بمطابق ۱۱۳۸ء میں وفات پائی، اس وقت بالکل نوجوان

تھا۔

ابن باجہ کی تالیفات کا ابن ابی صبیحہ نے ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض طب، ریاضیات اور حکمت پر ہیں اور بعض طبعیات، حوادث پر جو ارسطو کی بعض کتابوں کی شروحات ہیں، چند کتابیں ہدایہ اور نہایہ ہیں، ایک کتاب حیوانیات پر ہے، البتہ ایسی کتابیں جن کی تکمیل نہیں ہوئی اور جن کا ابن طفیل نے ذکر کیا ہے، اکثر منطق پر ہیں، اس کو ریال کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں، اس طرح اس کا ایک رسالہ نفس ہے اور ایک ”تدبیر موحد“ ہے۔

ایک رسالہ اتصال پر ہے اور ایک رسالہ وداع ہے، جن میں ان عوامل سے بحث کی گئی ہے، جو انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور عقل کو فکر کی جانب متوجہ کرتے ہیں، اس کے ساتھ وجود اور علم کی غرض و غایت کی بھی تشریح ہے اور ان دونوں مقاصد تقریب فی اللہ

اور عقل فعال سے اتصال حاصل کرنا (جو خدائے تعالیٰ کی ذات ہی سے صادر ہوتی ہے) قرار دیا ہے، اس کے بعد مؤلف نے چند مبہم کلمات خلود نفس کے متعلق لکھے ہیں اور اس مذہب کی ختم ریزی کی ہے جس کی آب یاری بعد میں چل کر ابن رشد نے کیا ہے، یہ عقیدہ ”وحدة النفوس“ کا ہے۔

ابن باجہ نے رسالہ وداع ایک طویل سفر سے قبل لکھا تھا اور اس کو اپنے ایک شاگرد اور دوست کے ہاں بھیجا تھا کہ اہم مسائل کے متعلق جو کچھ بھی اس کے خیالات تھے وہ اس کے نزدیک واضح دلیل بن جائیں۔

رسالہ وداع کے مطالعہ کرنے والے پر ظاہر ہوگا کہ مؤلف کا علم اور فلسفے کے اصول کے احیاء کی جانب ایک خاص میلان ہے، کیوں کہ اس کے خیال کی رو سے یہ دونوں انسانوں کو اس کے طبعی امور کے احاطہ کرنے میں رہنمائی کر سکتے ہیں اور اس میں عقل فعال سے جو اتصال ہے اس کے علم کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

(۶) ابن رشد

ابن رشد بمقام قرطبہ ۵۲۰ھ بمطابق ۱۱۰۶ء پیدا ہوا، ابو الولید کنیت، محمد نام اور احمد بن رشد کا فرزند تھا، باپ اور دادا دونوں اندلس میں عہدہ قضاء پر مامور تھے، یہ خاندان علمی اور دنیاوی حیثیت سے ممتاز تھا، اسی ذی علم و کمال خاندان میں ذہین و ہونہار ابن رشد کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ نے اس کی خداداد صلاحیتوں اور خوبیوں کو نکھار دیا، فاضل استاذ ابی محمد بن رزق سے قرآن پاک کی تعلیم اور علم فقہ و حدیث میں کمال حاصل کیا، عقلی علوم میں استاذ ابن طفیل کے روبرو روانہ ہوئے ادب تہہ کیا، کم عرصہ میں ہی نو عمر ابن رشد کے علم و فلسفہ کا شہرہ اندلس میں پھیل گیا اور علم توحید، فلسفہ طب اور ریاضیات میں وہ اپنے وقت کا بے مثل عالم تسلیم کیا گیا، نوجوانی میں مراقش اور اسپین کے درباروں میں غیر معمولی رسوخ حاصل کیا تھا۔

امام غزالی کے شاگرد محمد بن تو مرت نے اندلس کی سلطنت و حشمت اپنی صلاحیتوں اور محنت سے حاصل کی تھی، اسی خاندان کے دو نہایت طاقتور فرماں رواں ابو یعقوب یوسف اور

اس کا بیٹا یعقوب المنصور کے درباروں میں ابن رشد کا آفتاب علم و حکمت چکا اور کئی اہم عہدوں پر مامور ہوا، اپنی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کی بناء پر ۵۶۵ء میں شہر اشبیلہ کا قاضی مقرر ہوا، اس جلیل القدر عہدے پر رہتے ہوئے اور مقدمات قضاۃ کی کثرت اور دور دراز علاقوں کی دوروں کی مصروفیت کے باوجود تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا، ارسطو کی مشہور کتاب ”الحیوان“ کی شرح لکھی اور حکیم بطلمیوس کی مشہور کتاب ”مجسطی“ کا بھی خلاصہ لکھا، دنیائے اسلام کے مشہور عالم دین امام غزالی کی دیڑھ سو سال قبل لکھی ہوئی ”تہافت الفلاسفہ“ کے جواب میں ابن رشد نے کتاب ”تہافت الفلاسفہ“ لکھی۔

ابن رشد کے علم و کمال کا شہرہ اس کے عہد میں ہی اندلس کی سرزمین اور افریقہ کے ریگستانوں سے ہوتا ہوا ممالک شرقیہ تک جا پہنچا، عوام میں اس کی مقبولیت اور خواص میں اس کی قدر و منزلت عروج پر تھی، اس کے عظیم کارناموں کا علمی چرچا زبان زد عام و خواص تھا، ایسے میں کچھ درباری علماء اور امراء میں حسد و عناد پیدا ہوا اور ابن رشد کی غیر معمولی شہرت و عزت سے اس کے دشمن ہوئے، ابن رشد کے فلسفیانہ خیالات اور عقلی دلائل ان معاصر علماء کی سمجھ میں نہ آنے پر انہوں نے کفر و الحاد کا فتویٰ دیا اور سلطان المنصور کو ابن رشد کی جانب سے بدنچہ اس عظیم مفکر اور عالم کو شہر بدر کر کے ایک گاؤں بوسنیا میں قید کر دیا۔

نظر بندی کے دوران وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے، مسلمانوں کے ساتھ یہودی طلباء بھی تھے، ابن رشد کی محبت علمی سے فیضیاب ہوئے، جن کے ذریعہ یورپ کے گوشوں میں ابن رشد کے علم و فن کا نور پھیلا، یہودی دانشوروں نے ابن رشد کی کتابوں کا عبرانی اور مغربی زبان میں ترجمہ کیا، اس کی گراں قدر علمی تفصیل و تشریح سے ارسطو کے مشکل فلسفے علمائے یورپ میں معروف ہوئے، علم طب و ریاضی میں اس کے معرکتہ الراء کارنامے علم و حکمت کی دنیا میں نئے نئے انکشافات لائے، اس کی مشہور کتاب ”الکلیات“ کا عبرانی ترجمہ آج بھی یورپ میں موجود ہے۔

ابن رشد کی بے مثال اور اعلیٰ قدر علمی کاوشوں اور فلسفوں سے عہد کے چند

حکمرانوں کی بدظنی اور بیزارگی کے باعث علمائے مشرق اس سے فیضیاب نہ ہو سکے، جب کہ مغربی ممالک میں اس کی کتابیں مقبول ہوئیں اور اہل یورپ ابن رشد کے فلسفوں اور علمی کارناموں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

تقریباً سات سال قید و بند میں رہنے کے بعد ۱۱۹۸ء میں باعزت رہا ہو کہ سلطان المنصور کے دربار کی زینت بنا اور عزت و حرمت کے ساتھ مراقش میں رہنے کے بعد ۱۱۹۸ء میں باعزت رہا ہو کہ سلطان المنصور کے دربار کی زینت بنا اور عزت و حرمت کے ساتھ مراقش میں اسے سابقہ رتبہ حاصل ہوا؛ لیکن زندگی کا سفر ختم ہو چلا تھا، ۱۱ ستمبر ۱۱۹۸ء کو یہ عظیم مفکر، طبیب، علم ریاضی اور فلسفہ کا ماہر اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

کہتے ہیں کہ: ابن رشد کی تصانیف بکثرت تھیں؛ لیکن زمانے کے نازیبا سلوک سے بیشتر قیمتی سرمایہ علمی ضائع ہو گیا، چند کتابوں کے عبرانی و لاطینی ترجمے باقی رہے، دانش وران یورپ کو ارسطو کا ترجمان مانتے تھے، یکے بعد دیگرے اس کو یورپی شاگردوں نے اول شہر طلیطہ آ کر ابن رشد کی تصانیف کو جمع کیا، شاہ جس نے بھی ان علمی کاوشوں کی قدردانی کی، بعد کے ادوار میں بہت سے فلسفیان یورپ ابن رشد کے پیرو ہوئے، حتیٰ کہ اس کی غیر معمولی شہرت سے حسد کرنے والے عیسائی علماء بھی اس کی علمی قابلیت و ذہانت کے معترف تھے۔

چرچ کے اراکین نے جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ: کلیسا کے مروجہ طریق کی عوامی مخالفت کے پیش نظر علم و حکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دیا، اور ان عیسائی علماء کو جنہوں نے ابن رشد کے علوم سے استفادہ کیا واجب سزا قرار پائے، ان سیاہ ایام میں بھی چند عیسائی دانش وروں نے چرچ کی ان سخت گیر نظریے کے خلاف پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈالی، اس طرح یورپ میں ابن رشد کے فلسفوں کو دین عیسوی کے مروجہ فکر و نظر کے برخلاف حاصل کیا، اس طرح یورپ کے ایک طبقہ میں علمی بیداری پیدا ہوئی اور وہ علوم و فنون کی جانب راغب ہوئے۔

یورپ کے اکثر شعراء نے ابن رشد کو اقلیدس، بطلمیوس اور جالینوس کی طرح

میدان علم و حکمت کا قابل تعظیم قرار دیا، عیسائیوں کا ایک فرقہ جس کا نام فرانسسکن تھا، ابن رشد کے خیال و نظریات علمی کا قائل اور معتقد تھا، سترہویں صدی تک کہتے ہیں کہ ابن رشد کو ارسطو سے زیادہ قدر و منزلت حاصل تھی، بلا دیورپ کے اکثر قدیم طلباء اس کے تلمذ پر فخر کرتے تھے۔ (۱)

(۶) ابن خلدون (۷۳۲ء تا ۸۰۸ء)

ابن خلدون جو مشرق و مغرب کے فلاسفہ تاریخ کا سرتاج ہے، بمقام تونس ۷۳۲ء پیدا ہوا اور ۸۰۸ء میں بمقام مصر وفات پائی، وہ آٹھویں صدی ہجری کے مشاہیر میں سے ہے، اس کا نام ابو زید عبد الرحمن بن محمد بن محمد خلدون ولی الدین التونسی الحضری الاشبیلی المالکی ہے۔

اس کا سلسلہ اندلسی خاندان سے ہے جو اشبیلہ سے تونس کی طرف ہجرت کی، ابن خلدون کے اجداد نے ساتویں صدی ہجری کے وسط میں اشبیلہ سے تونس کی طرف ہجرت کی، ابن خلدون کے اجداد کا نسب قبائل یمن سے بنی وائل تک پہنچتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے جد اعلیٰ نے یمن سے اندلس کی جانب تیسری صدی ہجری میں ہجرت کی۔

ابن خلدون نے تونس میں نشو و نما پائی اور وہیں علوم مروجہ کی تحصیل کی، کچھ عرصے بعد ابن خلدون کو وباء کے خوف سے تونس چھوڑنا پڑا، اس نے ہوارہ کی طرف رخ کیا اور وہاں پہنچ کر اس شہر کے حاکم ابن عبدون کے ہاں اقامت اختیار کی جس نے اس کا پر جوش استقبال کیا اور بلا مغرب کے سفر کے لئے اس کی امداد کی، ابن خلدون نے ابن بطوطہ کی طرح اوائل عمر ہی میں اکثر ممالک کی سیاحت کی ہے، ۵۵ء میں سلطان ابو عنان المرینی والی تلمسان نے اس کو اپنے یہاں فارس میں طلب کیا، اس وقت اس کی عمر تقریباً تیس سال تھی، بادشاہ نے اس کی بہت کچھ قدر و منزلت کی اور عہدہ کتابت اس کے لئے تفویض کیا، لیکن سلطان کے اس حسن سلوک سے اس کے ہم عصروں کے دل میں جو اس سے کم درجے پر تھے آتش حسد بھڑک اٹھی، انہوں نے سلطان کے ہاں اس کی

شکایت کی اور یہ الزام لگایا کہ وہ محض اپنے مکرو فریب کے ذریعے سلطان پر حاوی ہو گیا ہے، پس سلطان نے اس کو قید کر دیا، لیکن اس طرح جیسے کہ مستعمرات میں جیسے خلفاء قید کر دیئے جاتے ہیں، بالآخر ابو عنان المرینی والی تلمسان ۵۹ء میں وفات پائی، اس کے بعد وزیر ابن عمر نے ابن خلدون کو نہ صرف آزاد کر دیا، بلکہ اس کو خلعتوں سے سرفراز کیا اور اس کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آتا رہا۔

۶۰ء میں سلطان ابو سالم المرینی نے ابن خلدون کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے سرزمین فارس داخل ہوا اور اس کو اپنا پرائیویٹ سکرٹری بنالیا، ابن خلدون نے اس فریضے کو جو اس کے ذمے کیا گیا تھا بحسن و خوبی انجام دیا۔

۶۳ء میں اس نے اندلس کا رخ کیا، غرناطہ پہنچا، وہاں ابو عبد اللہ حکمراں تھا، اس نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اسے اپنے اعلیٰ محلوں میں سے ایک مکان میں رہنے دیا۔ اسی طرح مختلف بادشاہوں کے اہم مناصب پر فائز رہتے ہوئے آخر میں پھر اپنے اہل و عیال کے ساتھ تلمسان میں اقامت گزریں ہو گیا اور ان کے ساتھ بنی سلامہ کے قلعہ میں جو بنی توچین کے شہروں میں سے ہے، بود و باش اختیار کی اور وہاں چار سال تک رہا۔

اسی اثناء میں ابن خلدون نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی، اس نے پہلے مقدمے کی تکمیل کر لی، اس کے بعد بعض تاریخ کی فصولیں بھی لکھیں، یہ زمانہ تقریباً ۸۰ء اور اس کی وفات سے بیس برس قبل کا ہے، اس وقت اس کا سن پچاس برس کا تھا، اب اس کو اپنے وطن تونس جانے کا ارادہ ہوا، اس نے حاکم تلمسان سے اجازت چاہی اور ۸۰ء میں وطن پہنچا، وہاں کے بادشاہ نے اس کا خاص طور پر احترام کیا اور اس کو اپنا پرائیویٹ سکرٹری بنالیا، اور اپنی تالیف کی تکمیل پر آمادہ کیا، پھر اس نے مصر کا قصد کیا، قاہرہ میں جامع ازہر میں مالکی فقہ کی تعلیم دینی شروع کی، جب یہ خبر سلطان مصر برقوق عظیم کو پہنچی تو اس کو اپنے ہاں بلایا اور بہت آؤ بھگت کی اور اسے ۸۶ء میں مالکی مذہب کا قاضی مقرر کیا، اس نے منصب قضاء کو باحسن وجوہ انجام دیا۔

ابن خلدون نے اپنے اہل و عیال کو تونس بلوایا بھیجا کہ ان کے ساتھ قاہرہ میں گذارے، لیکن اثنائے راہ میں یہ تمام غرق ہو گئے، اس صدمہ جانکاہ نے اس کی کمر توڑ دی، چنانچہ اس نے منصب قضاء سے علاحدگی اختیار کر لی اور تدریس و تالیف کے لئے خود کو وقف کر دیا، اس حالت میں تیس برس گذارے، اس نے ۸۹۷ء میں قاہرہ سے فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے حجاز کا رخ کیا، پھر دوسرے سال مصر لوٹا اور اپنی کتاب کی تصنیف میں مشغول ہو گیا اور ۹۷۷ء میں اس کی تکمیل کر دی، اس وقت اس کی عمر ۶۵ سال تھی اور وہ پندرہ برس تک اس کام میں مشغول رہا۔

اس طرح ایک عرصہ تک مصر میں مقیم رہا، پھر بالآخر ۸۰۸ء میں اس نے وفات پائی اور وہیں کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

ابن خلدون کی تالیفات

ابن خلدون نے علماء اور مفکرین میں نہ صرف ایک کتاب کی وجہ سے شہرت حاصل کی؛ بلکہ اس کتاب کے ایک ہی جز کی وجہ سے اور وہ اس کا مقدمہ ہے، اس کی تاریخ کا پورا نام یہ ہے، ”والعبر و دیوان المبتدأ والخبر فی أيام العرب والعجم والبرین ومن عاصرهم من ذوی السلطان الاکبر“ یہ تین کتب اور رسائل و مجلدات پر منقسم ہے۔

کتاب اول: اس میں عمرانیات اور عوارض ذاتیہ سے بحث کی گئی ہے، جو اس میں عارضی ہوتے ہیں، جیسے ملک، سلطنت، کسب معاش، صنائع، علوم اور ان کے علل و اسباب، یہی کتاب اور اس کا وہ مقدمہ ہے جو مشہور عام ہے، یہ تقریباً (۴۰۰) صفحات پر مشتمل ہے، اسی نے ابن خلدون کو ایک نہایت اعلیٰ مرتبہ پر فائز کر دیا؛ کیوں کہ اس نے اس میں جدید مباحث پر روشنی ڈالی ہے جس کو اس زمانہ میں علوم اجتماعی، سیاسیات، اقتصاد سیاسی، اقتصاد اجتماعی، فلسفہ تاریخ، قانون عام وغیرہ سے تعبیر کیا ہے، ہمارے خیال میں ہیگل، جرمن فلسفی میکاو، اطالوی عالم سیاسیات گبن، انگلستانی مؤرخ بلاش ہب ابن خلدون کے تلامذہ میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

ابن خلدون آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں گذرا ہے، ان مباحث پر اس نے اس وقت اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا جب کہ اہل یورپ پردہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے، عربوں میں سے ان مسائل پر کسی نے کچھ نہ لکھا تھا، قطع نظر ان چند منتشر خیالات کے جن کو کوئی اہمیت نہیں، برخلاف اس کے ابن خلدون نے ان مباحث پر کافی شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، واقعات کا باہمی موازنہ و مقابلہ کر کے ان سے نتائج اخذ کئے اور ان علل سے بحث کی جن سے اس نے ذاتی مطالعہ یا شخصی تجربے کی بناء پر واقفیت حاصل کی تھی۔

مقدمہ ابن خلدون پر ایک نظر

مقدمے کی پہلی فصل میں زمین اور اس کے شہروں کی آبادی، انسان کے رنگ و اخلاق میں آب و ہوا کی تاثیر، تمول و افلاس کی وجہ سے آبادی کے حالات میں اختلاف اور ان آثار سے بحث کی گئی، ہم جو انسان کے بدن اور اخلاق پر مرتب ہوتے ہیں۔

یہ بحث اس مسئلے سے بہت کچھ مشابہ ہے جس کو آج علمائے یورپ نے ابن خلدون کے پانچ سو برس بعد نشو و ارتقاء کے نظریے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

دوسری فصل میں بدوی آبادی اور وحشی قبائل و اقوام پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز ان مباحث کو بھی پیش کیا ہے جو بدو و حضارہ (دیہاتی و شہری) کی طبیعتوں کے متعلق پیدا ہوتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان نسب، عصیت، ریاست، حسب، ملک اور سیاست کے اعتبار سے امتیاز کیا ہے۔

یہ بحث نظام اجتماعی کے ان قواعد کی جنس سے ہے جس کا ظہور یورپ میں انیسویں صدی میں ہوا، جس کو ہمارے معاصرین نے سوشیالوجی (عمرانیات) سے تعبیر کیا ہے۔

تیسری فصل میں دول عامہ، ملک، خلافت، سلطانی مراتب سے بحث کی ہے اور سیادت کے اسباب کے استحکام کی توجیہ کی ہے، نیز امارت کے تحفظ کے طریقے، حکومت و خلافت کے شرائط، بادشاہوں کے خصائل، بیعت کا مفہوم، ولایت عہد، سلطان کے مراتب، سلطنت کے دواوین، فوج اور اس کے اصول، جنگ کے قواعد اور سلطنت

کے عروج و زوال کے اسباب کو واضح کیا ہے۔

یہ بحث علمی اور عملی سیاسیات سے ہے، انگلستانی مؤرخ گیلن نے ایک کتاب ”دول سلطنة الانحلال وسقوط“ (the decline and fall of koman mempire) کے اسباب پر لکھی ہے، اس میں اس نے اسی ملک کو اختیار کیا ہے جس کو ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں پیش کیا تھا۔

چوتھی فصل میں شہروں، مختلف آبادیوں، ان کے تمدن اور عمارتوں اور مملکتوں سے ان کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے، اور ان امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کو بری و بحری حیثیت سے تکنی و تشکیل میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے، نیز مساجد اور مکانوں کی تعمیر سے بھی بحث کی گئی ہے، اس بحث کا تعلق ہندسہ حربیہ سے ہے۔

پانچویں فصل میں معاش اور کسب و صنائع کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتوں سے بحث کی گئی ہے، اس میں رزق اور کسب کے مسائل ہیں اور بتلایا گیا ہے کہ یہ اعمال بشری کا حاصل ہیں، اسکے بعد معاش اور اس کے اقسام و طرق اور طبیعت عمران سے اس کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے، اس میں رزق کے مختلف طریقوں مثلاً تجارت، صنعت اور ان کے مختلف اقسام کی بھی تفصیلی بحث ہے، نیز اس زمانے کے اصول صنعتوں جیسے زراعت، تعمیرات، پارچہ بانی و خیاطی اور توالد و تناسل، طب، باغبانی، موسیقی وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ وہ مباحث ہیں جن کو اس دور کے لوگ اقتصادی سیاسی اور اقتصادی اجتماعی سے تعبیر کرتے ہیں، اس فصل کے اکثر مبادیات وہ بنیادی اصول ہیں جن پر کارل مارکس کی کتاب ”رأس المال“ (das capital) پر مشتمل ہے۔

چھٹی فصل علوم اور ان کے اقسام، تعلیم اور اس کے طریقوں اور مختلف صورتوں پر مشتمل ہے، اس میں تعلیم کے مباحث اور حضارۃ سے اس کا تعلق بتایا گیا ہے، ہر علم سے انفرادی طور پر بحث کی گئی ہے، ہر ایک کی تاریخ اور اس کے شروط بتلائے گئے ہیں، جیسے علوم قرآن و حدیث، فقہ، علوم لسانیہ، طبیعیات، ریاضی، طب، ادب، تاریخ الہیات، علم

النفس، علوم نجوم، علوم سحر۔

یہ مباحث علم تربیت کے قبیل سے ہیں، جن کے ماہرین امریکہ میں ولیم جیمس اور یورپ میں اسپنسر اور ڈنیل وغیرہ ہیں، ابن خلدون کے اسلوب کے متعلق اس کتاب میں موقع کے لحاظ سے بحث کی جائے گی۔

اس مقدمے نے مفکرین یورپ کو یہاں ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے، علامہ کا ترجمہ نے اس کا پیرس کے قومی کتب کے نسخے سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے، یہ فرانسیسی ترجمہ انیسویں صدی کے نصف ثانی کے اوائل میں طبع ہوا، اس کی بعض فصول کا ترجمہ انگریزی، جرمنی، اطالوی اور ترکی زبانوں میں بھی کیا گیا، یورپ کے تمام بڑے کتب خانوں میں اس کے مطبوعہ قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔



علمِ جغرافیہ (geography)

میں مسلمانوں کے کارنامے

اسلام میں علمِ جغرافیہ کے فروغ میں عبادات اور معاملات دونوں نے اہم کردار ادا کیا ہے، فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے راستوں کی واقفیت، نماز کے قیام اور مسجد کی تعمیر کے وقت قبلہ کا تعین، امور سلطنت کی انجام دہی اور تجارتی مقاصد کے لئے مختلف بلاد و امصار کے جغرافیائی محل وقوع سے آگاہی یہ وہ اسباب و عوامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو علمِ جغرافیہ حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔

چنانچہ جب عباسی دور میں ایرانی، ہندی اور یونانی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے تو ”ثابت بن قرۃ“ (۲۲۱-۲۸۸ھ/۸۳۶-۹۰۱ء) نے یونانی جغرافیہ داں ”بطليموس“ (۹۰-۱۶۸ء) کی کتاب (Geographical. treatise) کو عربی جامہ پہنایا، اس کے علاوہ بطليموس کی دوسری کتابوں، ”مارینوس الصوری“ (حدود ۷۰-۱۳۰ء) کے جغرافیہ، افلاطون (۴۲۷-۳۴۷ ق م) کی تصنیفات طیمائوس، الآثار العلویۃ، السماء والعالم اور ”ارسطو“ (۳۸۴-۳۲۲ ق م) کی ”مابعد الطبعیات“ کے بھی عربی ترجمے کئے گئے، یونانیوں کے علاوہ مسلمانوں نے ہندی اور ایرانی جغرافیائی تصورات کا علم بھی حاصل کر لیا، جس سے وہ اس قابل ہو گئے کہ اس موضوع پر تحقیق و تصنیف کا آغاز کر سکیں۔

خليفة مامون الرشيد (۱۹۷-۲۱۸ھ/۸۱۳-۸۴۶ء) نے جغرافیہ کے موضوع پر ”صورة الأرض“ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس کے ساتھ ایک نقشہ بھی تھا، یہ

نقشہ خوارزمی سمیت ستر ماہرین نے تیار کیا تھا، ان کے بعد عہد مامونی میں ڈاک اور پرچہ نویسی نے تیسری صدی ہجری نویں صدی عیسوی میں جغرافیہ کے موضوع پر ”المسالك والممالك“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، ڈاک کا یہ ناظم مشہور جغرافیہ داں ”ابن خردادزبہ“ (المتوفی ۳۰۰ھ/۹۱۲-۹۱۳ء) تھا جسے مسلم جغرافیہ کا باوا آدم مانا جاتا ہے، ابن خردادزبہ نے یہ کتاب خلیفہ مامون الرشید کے حکم پر لکھی، تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں ”احمد بن اسحاق ابی یقوع بن واضح الکاتب البیعوبی“ (المتوفی: ۲۸۴ھ/۸۹۷ء) نے ”کتاب البلدان“ تصنیف کی، ”بیعوبی“ کے بعد ”ابن رستہ“ (المتوفی حدود ۳۱۰ھ/۹۲۲ء) نے ”الاعلاق النفسیة“ اور ”ابن الفقیہ الحمداوی“ تیسری صدی ہجری نویں صدی عیسوی نے ”کتاب البلدان“ ہی کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، چوتھی صدی ہجری کے ربع اول میں ”قدامة بن جعفر الکاتب“ (المتوفی: ۳۱۰-۹۲۲ء) ”کتاب الخراج وصنعة الکتاب“ تحریر کی، جس میں انہوں نے گیارہویں باب کے ذیل میں راستوں، ڈاک کی منزلوں اور سرحدوں کی تفصیل دی ہے، تقریباً اسی زمانے میں مشہور مورخ ”ابوالحسن علی بن حسین المسعودی“ نے اپنا سفر نامہ ”کتاب القضايا والتجارب“ کے نام سے تیار کیا، جس میں مصنف نے چشم دید واقعات و مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر وسیع اور اہم جغرافیائی مواد پیش کیا، ان کی دوسری کتابوں ”مروج الذهب و معادن الجواهر“ اور ”التنبيه والأشراف“ میں بھی ان کے سیاحت کے حالات ملتے ہیں۔

مسلم جغرافیہ نگاری میں بلخ کے مکتب فکر کو اس لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں اسلامی رنگ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے، یہ مکتب فکر ”ابوزید احمد بن سہل بلخی“ (المتوفی: ۳۲۲ھ/۹۳۴ء) کے نام پر ”دبستان بلخ“ کہلاتا ہے، ”ابوزید بلخی“ مشہور فلسفی ”ابویوسف یعقوب الکندی“ (المتوفی: ۲۵۴ھ/۸۷۳ء) کے شاگرد تھے، عراق میں آٹھ سال گزارنے کے علاوہ بلخی نے دور دراز سفر کرنے کے بعد واپس آ کر اپنے وطن میں ”صور الأقالیحہ“ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، اسے بنیاد بنا کر

نامور جغرافیہ داں ”ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی الاصطخری“ نے ”المسایلیک والمبالک“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جس میں ہر ملک کو رنگین نقشے میں دکھایا گیا تھا، اصطخری کی درخواست ”ابو القاسم محمد بن حوقل البغدادی“ (المتوفی: ۳۶۷ھ/۹۷۷ء) نے ان نقشوں پر نظر ثانی کی اور ”صورة الأرض“ کے عنوان سے ایک کتاب ۳۶۶ھ/۹۷۷ء میں قلم بندی، ”ابن حوقل“ نے اپنی کتاب میں جغرافیائی معلومات کے علاوہ نقشے بھی دیئے، تقریباً اسی زمانے میں یمنی نژاد عالم ”ابوالحسن ابن احمد الحمدانی“ (المتوفی: ۳۳۴ھ/۹۴۵ء) نے جغرافیہ کے موضوع پر ”الإکلیل“ اور ”صفة جزيرة العرب“ کے ناموں سے دو کتابیں رقم کیں، ان کے بعد مسلم جغرافیہ نگاری میں ”ابوعبد اللہ محمد بن ابی بکر المقدسی“ (المتوفی: ۳۹۰ھ/۱۰۰۰ء) نے ”أحسن التقاسیم فی معرفة الأقالیم“ لکھ کر اہم کارنامہ انجام دیا، انہوں نے اسپین کے سواد اور دراز مسلم ملکوں کا سفر کرنے کے بعد اپنے تیس سالہ تجربات و مشاہدات کو مذکورہ بالا کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔

ول دوران لکھتے ہیں:

”محمد المقدسی“ نے اسپین کے سوا تمام اسلامی علاقوں کا سفر کیا، بے شمار

نشیب و فراز دیکھے اور ۹۸۵ء میں ”أحسن التقاسیم فی صورة

الأقالیم“ تصنیف کی جو ”البیرونی“ کی ”تاریخ الہند“ سے پہلے

عرب جغرافیہ کی عظیم ترین کتاب رہی ہے“ (۱)

مقدسی کی تصنیف کے ۴۵ سال بعد ”ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی“

(۳۶۳=۴۴۰ھ/۹۷۳-۱۰۴۸ء) نے اپنی شاہکار کتاب ”تاریخ

الہند“ تصنیف کی، انہوں نے اس کتاب میں وہ اہم جغرافیائی مواد پیش کیا جو اس سے

پہلے کسی دوسری کتاب میں نظر نہیں آتا، اس کے ساتھ ہی مسلم جغرافیہ نگاری کم از کم مشرق

میں رو بہ تنزل ہونے لگی۔

اسپین میں مشہور لغوی اور جغرافیہ داں ابو عبد اللہ بن عبد العزیز البکری (المتوفی ۴۸۷ھ-۱۰۹۴ء) نے ”معجم ما استعجم من أسماء البلاد والمواضع“ کے نام سے ایک جغرافیائی لغت تیار کی، جس میں مختلف شہروں اور جگہوں کے ناموں کی املا پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسپین کے اس عظیم جغرافیہ داں نے ایک اور کتاب بھی جغرافیہ کے موضوع پر تصنیف کی جو ”کتاب المسالک والممالک“ کے نام سے معروف ہے، مسلم جغرافیہ نگاری کے لئے یہ تنزل کا دور تھا؛ مگر اس میں دو چوٹی کے جغرافیہ داں پیدا ہوئے۔

۱۔ ابو عبد اللہ محمد بن ادریسی (۴۹۳-۵۶۰ھ/۱۱۰۰-۱۱۶۵ء)

اسپین کے شہر ”سیتیہ“ میں پیدا ہوئے اور قرطبہ میں تعلیم پائی، اس کے بعد وہ صقلیہ چلے گئے، جہاں نارمن عیسائیوں نے مسلمانوں کی ۱۹۸ سالہ حکومت ختم کر کے ۱۰۹۱ء میں اپنی بادشاہت قائم کی تھی، ان کا دار السلطنت بلرم تھا، صقلیہ کے نارمن حکمرانوں نے عربی علوم و فنون کی سرپرستی کی، دربار پر عربی رنگ چھایا ہوا تھا، اہم منصبوں پر مسلمان فائز تھے، نارمن بادشاہوں میں (راجرد دوم ۱۱۰۱= Roger II ۱۱۵۴ء) بڑے علم دوست تھے، انہوں نے ادریسی کو اپنے دربار میں بلایا اور انہیں جغرافیائی تحقیق کا کام تفویض کیا، ”جے، ایچ گریس (J.H.L.Kramers) جنہوں نے اپنی ساری صلاحیت مسلمانوں کے کارناموں کو شرطیہ اور استثنائی جملوں کے انبار کے نیچے دبانے میں صرف کی ہے۔

راجرد دوم کا دربار گرچہ علماء و فضلاء کا کھنشاں تھا؛ لیکن مسلم جغرافیہ داں ادریسی اس میں سب سے روشن اور درخشاں ستارہ تھے، فلپ ہٹی کا کہنا ہے:

”راجرد دوم کے دربار کی سب سے بڑی زینت ادریسی تھے جو قرون وسطی

کے سب سے ممتاز جغرافیہ داں اور نقشہ کش تھے“ (۱)

راجرد دوم نے جغرافیائی مواد جمع کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں اپنے آدمی

روانہ کئے، جنہوں نے مختلف ممالک میں گھوم کر مواد جمع کیا، اسی مواد کی بنیاد پر ادریسی

نے ۱۱۵۴ء میں ”نزهة المشتاق فی اختراق الافاق“ تصنیف کی جسے یورپ کے

تعلیمی اداروں میں تین سو سال تک حرف آخر کی حیثیت حاصل رہی، کتاب کے طریق تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے فلپ کے ہٹی لکھتے ہیں:

”مواد کے تنقیدی تقابل میں ادریسی نے امتیازی وسیع انظری اور زمین

کی گولائی جیسے بنیادی حقائق کی قبولیت کا مظاہرہ کیا ہے۔“ (۱)

زمین کی گولائی سے مسلمان آٹھویں صدی عیسوی میں واقف ہو گئے تھے، ادریسی نے اسے مان کر اپنے پیش رو ہم مذہبوں کی تصدیق کی، جغرافیہ کے بارے میں صحیح مواد فراہم کرنے کے علاوہ ادریسی نے نقشہ کشی کے فن کو معراج کمال تک پہنچایا، انہوں نے ۱۱۵۴ء میں پوری دنیا کا ایک نقشہ بنایا جس کی خواہش راجر دوم نے کی تھی، انسائیکلو بریٹیکا کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

”ادریسی نے صقلیہ کے عیسائی بادشاہ راجر کے لئے ۱۱۵۴ء میں ایک

عالمی نقشہ بنایا، جس میں ایشیائی علاقوں کے بارے میں اس وقت تک

کے دستیاب حالات سے زیادہ بہتر معلومات دی گئی تھیں“ (۲)

ادریسی نے یہ نقشہ چاندی کا بنایا تھا اور اس میں کمال مہارت کے ساتھ دنیا کے ممالک دکھائے گئے تھے، نقشے میں پہاڑ، دریا، جنگلا و روادیاں بھی دکھائی گئی تھیں، علاوہ ازیں انہوں نے چاندی کا ایک آسمانی کرہ بھی بنایا۔

فلپ کے ہٹی ان کی تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”اس یادگاری تصنیف کے علاوہ ادریسی نے اپنے نارمن سرپرست کے

لئے ایک آسمانی کرہ اور ڈسک نما عالمی نقشہ بنایا، یہ دونوں چاندی میں

بنائے گئے تھے“ (۳)

ادریسی کی یہ تصنیف تین سو سال تک یورپ میں داخل نصاب رہی، اس کے متعدد

(۱) p.609, History of the Arabs

(۲) 11p.472, Encyclopaedia birtanica vol

(۳) History of the Arabs p.609

خلاصے تیار کئے گئے، اولین تلخیص کا عنوان ”نزهة المشتاق فی ذکر الأمصار والبلدان والجزر والمدائن والآفاق“ ہے، یہ خلاصہ عربی کی ان کتابوں میں شامل تھا جو اپنی اہمیت کی بناء پر سب سے پہلے روم کے مطبع (Medici) سے ۱۵۹۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں، اس متن کا ترجمہ ۱۶۰۰ء میں اطالوی زبان میں کیا گیا، جو ماونٹ پلیر کی یونیورسٹی میں موجود ہے، ۱۶۱۹ء میں دو مارونی راہبوں جبرئیل سیونٹا اور جونز ہسر وینٹا نے اسے لاطینی زبان میں منتقل کیا، روم سے شائع ہوئے خلاصے کے علاوہ کتاب کے دومزید عربی خلاصوں کا پتہ چلتا ہے، جن میں سے ایک ۱۸۹۳ء میں قاہرہ میں اور دوسرا بیسویں صدی کے اوائل میں تیونس میں دریافت ہوا، انیسویں صدی کے نصف اول میں کتاب کا فرانسیسی ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا۔

حالیہ برسوں کے دوران اس کتاب کا مستند اور معتبر ایڈیشن تیار کرنے کی خاطر روم میں واقع ایک معزز اطالوی ادارے کی سرپرستی میں اور معروف اطالوی ماہرین کی کمیٹی کے زیر ہدایت محققین کی ایک بین الاقوامی جماعت نے کام کا آغاز کیا ہے، ہر محقق کو کتاب کا وہ حصہ دیا گیا جس میں انہیں تخصص حاصل ہے، عملہ ادارات کا صدر مقام نیپلز یونیورسٹی (اٹلی) کا ایک ادارہ ہے، اب تک محققین کی مساعی جملہ کے نتیجے میں عربی متن اور ترجمے کے پانچ حصے نیپلز یونیورسٹی سے شائع ہوئے ہیں۔

۲۔ ابو عبد اللہ یاقوت حموی

ادریسی کے علاوہ اسلام نے اس عہد میں ایک اور عظیم جغرافیہ داں پیدا کیا، جو ابو عبد اللہ یاقوت حموی کے نام سے مشہور ہے، ان کا تعلق بغداد سے تھا، یاقوت ایک یونانی غلام تھے، جنگ میں گرفتار ہو کر ایک بغدادی تاجر کے قبضے میں آئے، نیک دل آقا نے زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ کر کے آزاد کر دیا، یہی آزاد شدہ غلام اپنے زمانے کا سب سے بڑا جغرافیہ داں بن گیا، یاقوت نے سیاحت کے دوران اپنے مشاہدے اور مطالعے کے ذریعے حاصل کئے گئے جغرافیائی مواد اور دوسری معلومات کو مجموعہ البلدان میں قلم بند کیا جو (Le strage) کے الفاظ ہیں:

”جغرافیائی معلومات کا خزانہ ہے جس کی قدر و قیمت کا جتنا زیادہ انداز لگایا جائے اس میں کسی مبالغے کا امکان نہیں ہوگا“۔ (۱)

فلپ کے ہٹی نے یاقوت حموی کو مشرق کا عظیم ترین جغرافیہ داں قرار دے کر ان کی تصنیف کے متعلق لکھا ہے:

”یہ معجم جس میں مقامات کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں، ایک اسم با مسمیٰ انسائیکلو پیڈیا ہے جو اس عہد کی تمام جغرافیائی معلومات پر مشتمل ہونے کے علاوہ تاریخ، علم الاقوام اور فطری علوم کے متعلق قابل قدر مواد فراہم کرتی ہے“ (۲)

عہد وسطیٰ کے اس عظیم جغرافیہ داں کو اپنی عبقریت اور آزادی کی وہ قیمت ادانی کرنی پڑی جو اہل ہنر کے نام ہمیشہ واجب الاداء ہوتی ہے، انہیں اپنی گزراوقات کے لئے مسودات کی نقل نویسی اور نقل فروشی کا سہارا لینا پڑا، مسودوں کی نقل اور فروخت کر کے تھوڑی سی آمدنی ہوتی تھی، یہی ذریعہ معاش تھا، انہوں نے جغرافیائی اور دوسری معلومات جمع کرنے کی خاطر دور دراز ملکوں کے سفر کئے، سفر کے دوران ”مرو“ پہنچے تو شہر کی دس لائبریریاں دیکھ کر پھولے نہیں سمائے۔ ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء میں ”خیوا“ پہنچے، وہاں حملہ آور تاتاریوں کے ہاتھوں جان کے لالے پڑ گئے، ”ابن خلکان کے بقول اسی طرح ننگے بھاگ کر جان بچاتی جیسے یوم حشر میں قبر سے اٹھائے جائیں گے، حالت فرار میں مسودات کا پلندہ سینے سے چمٹائے تھے، فارس سے ہوتے ہوئے موصل پہنچے، جہاں اپنی کتاب کا مسودہ تیار کیا، چار سال بعد حلب میں اسے پایہ تکمیل کو پہنچایا، اس کے ایک سال بعد اسی شہر میں وفات پائی، افلاس اور جہاں گردی کے نتیجے میں جو علمی سرمایہ جمع ہوا، اس کا تذکرہ ول دوران نے اسی طرح کیا ہے۔

”نقل نویسی کی حیثیت سے بمشکل گزراوقات کرنے کے دوران انہوں

نے (۱۲۲۸ء) میں معجم البلدان کے نام سے ایک ضخیم جغرافیائی معجم مکمل کی جس میں دنیا کا تقریباً سارا عہد وسطیٰ کا علم جمع کیا گیا تھا، یاقوت نے اس میں تقریباً تمام علوم ہیئت، طبیعیات، اثریات، نسلیات، تاریخ، شہروں کے محدودات اور ان کے علماء کے حالات اور تصانیف کے بارے میں معلومات درج کیں، شاید ہی زمین سے اتنی محبت کسی نے کی ہے۔ (۱)

دیگر جغرافیہ داں اور ان کے تصانیف

ادریسی اور یاقوت حموی کے بعد مشہور مورخ ابو الفداء (المتوفی: ۷۳۱ھ/۱۳۳۱ء) نے ”تقویم البلدان“ کے نام سے ایک کتاب جغرافیہ عالم کے موضوع پر لکھی، انہوں نے ساٹھ جغرافیہ دانوں کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب انہوں نے ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء میں تحریر کی، ادریسی کی تصنیف کے بعد یہ سب سے اہم تصنیف ہے، ان کے علاوہ نامور جغرافیہ دانوں میں ”زکریا بن محمد القزوينی (۶۰۰-۶۸۲ھ/۱۲۰۳-۱۲۸۳ء) ابو عبد اللہ محمد دمشقی (المتوفی: ۷۲۷ھ/۱۳۲۷ء) اور ”ابن الوردي“ (المتوفی: ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء) خاص طور پر مشہور ہیں؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلم جغرافیہ نگاری کا دور عروج ادریسی اور یاقوت حموی پر ختم ہوا ”ابو الفداء“ کی ”تقویم البلدان“ بجتے چراغ کی آخری بھڑک تھی۔

مسلمانوں کے سفر نامے اور علم جغرافیہ میں ان کا مقام

مسلمانوں کے علم جغرافیہ کے سفر ناموں کی بدولت جو قابل قدر اضافہ ہوا ہے اس کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگی، مسلم سیاحوں کے تقریباً دس سے زائد سفر ناموں کی جغرافیائی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے، ان سفر ناموں میں اس زمانے کی معلوم دنیا کے اکثر علاقوں کے متعلق بڑی قیمتی جغرافیائی معلومات موجود ہیں، عربی میں بلنسیہ کے ”ابن جبیر“ (المتوفی: ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء) کے سفر نامے ”الرحلة“ اور مراکشی نژاد جہاں گرد ”ابن بطوطہ“ (المتوفی: ۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء) کے ”تحفة النظائر فی غرائب

الأمصار وعجائب الأمصار، کو عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے، فارسی زبان میں مشہور اسماعیلی مفکر ”ناصر خسرو“ (المتوفی: ۵۶۵ھ/۱۱۶۹ء) ابن مجاور (المتوفی: ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء) النبائی (المتوفی: ۶۳۶ھ/۱۲۳۹ء) العبداری (المتوفی: ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء) الطیبی (المتوفی: ۶۹۸ھ/۱۲۹۹ء) اور التیجانی (المتوفی: ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء) ہیں۔

علم جغرافیہ کی ترقی میں مسلم تاجروں کا رول:

علم جغرافیہ کے فروغ میں مسلم تاجروں کا رول بھی بڑا اہم رہا ہے، ”مارکو پولو“ سے پہلے چین کے بارے میں بارے نام معلومات رکھتے ہیں، تیرہویں صدی میں ”مارکو پولو“ نے چین کی سیاحت کر کے اپنا سفرنامہ لکھا جس سے یورپ والے چین سے آگاہ ہو گئے، جب ول دوران کے بقول مسلمان ۴۲۵ پہلے چین کی سیاحت کر چکے تھے، تیسری صدی ہجری نویں صدی عیسوی میں ”سلیمان تاجر“ نامی ایک مسلم سوداگر نے ۸۴۰ء میں مشرق بعید کا سفر کیا تھا۔ (۱)

سلیمان کے تاثرات ’اخبار الصين والهند‘ کے عنوان سے ۲۳۵ھ/۸۵۰ء میں غالباً کسی دوسرے شخص نے قلم بند کئے، ۳۰۲ھ/۹۱۵ء میں ایک آسودہ حال شخص ’ابوزید الحسن السیرانی‘ نے سلیمان التاجر کے سفرنامے کو ”سلسلة التواریح“ کے عنوان کے تحت دوسری کتابوں کے ساتھ مرتب کر کے پیش کیا، سفرنامے میں ہندوستان کے ساحلی علاقوں کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں، یہ دنیا کی قدیم ترین تحریر ہے، جس میں لفظ ”ساخ“ کے تحت چائے کا ذکر ملتا ہے، اس کے بعد البیرونی نے ”نبذ فی أخبار الصين“ میں اس کے لئے ”جا“ کا لفظ استعمال کیا ہے، ”اخبار الصين والهند“ ہی کی بدولت باہر کی دنیا کو پہلی مرتبہ پتہ لگا کہ چین کے لوگ اس زمانے میں بھی دستخط کی جگہ انگوٹھے کا عکس (Finger print) ثبت کرتے تھے، روس کے دور دراز علاقوں کی تفصیلات کا سرچشمہ بھی ایک مسلمان ”احمد بن فضلان بن حماد“ ہیں جنہیں عباسی خلیفہ ”المقتدر باللہ“ نے بلغار کے بادشاہ کے پاس بھیجا تھا، روس کے بارے میں

معلومات کا ایک اور قدیم ذریعہ مسلم سیاح ’ابو حامد محمد المازنی‘ (۷۶۵-۷۸۵ھ/۱۰۸۰-۱۱۶۹ء) ہیں، جن کے دو سفرناموں ”المغرب عن بعض عجائب المغرب“ اور ”تحفة الألباب والنخبة الإحباب“ میں دلچسپ اور مستند مواد وافر مقدار میں موجود ہیں۔

جغرافیائی ذخیرہ علم میں جہاز ران مسلمانوں کا حصہ

جغرافیائی ذخیرہ علم میں جغرافیہ دانوں، تاجروں اور سیاحوں کی طرح مسلم جہاز رانوں نے بھی اپنی گونا گوں معلومات سے قابل ذکر اضافہ کیا ہے، مسعودی اور مقدسی جیسی عظیم جغرافیہ دانوں نے بعض ماہر جہاز رانوں کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے، مؤخر الذکر نے ایک ماہر جہاز ران سے بحر الہند کی شکل معلوم کی تھی، اسلام کی پہلی دو صدیوں کی جہاز رانی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں، تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں سلیمان التاجر کے سفرنامے اور بزرگ بن شہر یار (۲۹۹=۳۹۹/۹۱۲-۱۰۰۹ء) کی تصنیف ”عجائب الہند“ کا ذکر آتا ہے، بحری کپتان بزرگ بن شہر یار کی یہ تصنیف جہاز رانوں کی بحری مہموں کے متعلق دلچسپ کہانیوں پر مشتمل ہے، ساتویں صدی ہجری میں بحر اوقیانوس میں ”ابن فاطمہ“ کی مہم جوئی (۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء) کے متعلق بھی وہی تفصیلات ملتی ہیں، جو ابن سعید نے قلم بند کی ہیں، ان کے مطابق ابن فاطمہ مغربی افریقہ کے ساحل کے ساتھ ساتھ جبل ابیض تک پہنچ گئے، جہاز رانی کی تاریخ میں سب سے اہم شخصیت نجدی نژاد ”شہاب الدین احمد بن ماجہ“ کی ہے، جنہیں ”اسد البحر“ کہا جاتا تھا، ابن ماجہ نے نصف صدی سے زائد کا عرصہ سمندروں میں گزارا، چنانچہ بحریات اور ہیئت کے موضوع پر ان کے قلم سے اڑتیس کتابیں نکلی ہیں، جن میں کتاب ”کتاب الفوائد فی أصول البحر والقواعد“ بڑی اہمیت کی حامل ہے، یہ کتاب بحر ہند، خلیج فارس اور بحر الکاہل میں جہاز رانی کرنے والوں کے لئے خصر راہ کی حیثیت رکھتی ہے، بحریات میں مہارت تامہ کی بناء پر ابن ماجہ کا شمار عظیم ترین سائنسدانوں میں ہوتا ہے، مسلم جہاز رانی کی تاریخ میں ابن ماجہ کے بعد دوسرے اہم جہاز ران ان کے نوجوان ہم عصر ”سلیمان بن

احمد المہری، انہوں نے بحریات کے موضوع پر پانچ کتابیں تحریر کی ہیں، ان میں ”العمدة المہدیة فی ضبط العلوم البحریة“ اور ”تحفة الفحول فی تمہید الأصول“ اہم کتابیں ہیں۔

مسلم جغرافیہ دانوں سے زمین کی گولائی کا تصور عام، جن میں ابن خرداد بہ، ابو عبیدہ مسلم البلسی، ابوالقاسم مسلمة المجریطی وغیرہ تھے۔

یہی خیال فلپ کے ہٹی نے بھی ظاہر کیا ہے، گویا جغرافیہ میں مسلمانوں کی اہم خدمت یہ ہے کہ انہوں نے زمین کی گولائی کے تصور کو زندہ رکھا، اسی تصور کو لے کر کولمبس (۱۵۱۱-۱۵۰۶ء) نے بحری سفر کیا جس میں امریکہ دریافت ہوا۔

زمین کی گولائی کے تصور نے ملاحوں کے دل میں دنیا کے گرد چکر لگانے کا ولولہ پیدا کیا، خود کولمبس جب کرویت زمین سے واقف ہوا تو کس قدر حیرت کی بات ہے کہ کرسٹوکولمبس کے دل میں یہ خیال پہلے پہل ابن رشد کی کتابوں کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا، جینوا کے ملاحوں کے خیالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈریپر کہتے ہیں:

”جینوا کے ان جہازرانوں میں جو خیالات سے دلچسپی لے رہے تھے کرسٹوکولمبس بھی شامل تھا وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس موضوع کی طرف اس کی توجہ ابن رشد کی کتابوں کے مطالعے سے ہوئی،“ (۱)

صرف یہی نہیں کہ کرسٹوفر کولمبس مسلمانوں کے نظریہ کرویت زمین سے واقف ہو کر یا ابن رشد کی کتابوں کو پڑھ کر سفر پر روانہ ہوا؛ بلکہ رابرٹ بریفلٹ (Rabert Brifault) (۱۸۷۶-۱۹۴۸ء) کے مطابق مشہور مسلم سائنسدان ”ابو عبد اللہ محمد بن جابر البنانی“ کی تخلیق کی بنیاد پر ریجیو مونتینس (Regin montanus) (۱۲۶۳-۱۲۷۶ء) نے وہ نقشے تیار کئے تھے، جن کی مدد سے کولمبس کا بحری سفر ممکن ہوا۔

شامل ہے مرا خون جگر تیری حنائیں

معدنیات (Mineralogy)

میں مسلمانوں کے کارنامے

زمانہ قدیم اور عہد وسطی میں فن معدنیات کوئی منظم علم نہیں تھا، لوگ معدنیات میں اس لئے دلچسپی لیتے تھے کہ ان کے نزدیک پتھروں کے خواص سے انسانی زندگی کے واقعات متاثر ہوتے تھے، یہ تصور دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصہ میں آج بھی موجود ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ علم کی اشاعت کے بعد بھی معدنیات کے متعلق یہ خیال جوں کا توں قائم ہے، تاریخ میں جواہرات سے بادشاہوں اور امیروں کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی معدنیات زمین میں پائی جاتی ہیں؛ اس لئے جغرافیہ سے اس کا خاص تعلق ہے۔

علم معدنیات سے مسلمانوں کی دلچسپی کا آغاز اس وقت ہوا جب ارسطو کی تصنیف ”معدنیات“ کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا، آٹھویں صدی عیسوی کے دوران یہ دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی، مسلمانوں نے قیمتی جواہرات پر توجہ دے کر کتابیں لکھنے کا آغاز کیا، یہ کتابیں ”حجریات“ کہلاتی تھیں، حجریات یا معدنیات کے موضوع پر مسلمانوں نے پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں، سب سے پہلے مشہور کیمیادان ”جابر بن حیان“ (المتوفی: ۱۹۸ھ/۸۱۳ء) نے ”کیماء المعادن، کتاب جواہر الکبیر“ اور ”رسائل فی الحجر“ کے ناموں سے معدنیات کے موضوع پر تین کتابیں تصنیف کی، جن میں انہوں نے مختلف دھاتوں اور پتھروں کے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کیں، ان کے بعد ”عطارد بن محمد الکاتب“ (المتوفی: ۲۱۴ھ/۸۳۲ء) نے اپنے گھر میں پتھروں کی مختلف اقسام جمع کر کے ان کی ماہیت اور خصوصیات پر تحقیق کی، انہوں نے اپنے تجربات

ایک تصنیف ”الجواهر والأحجار“ میں قلمبند کئے، عطار د بن محمد معدنیات کے ماہر تھے، مشہور مستشرق اسٹائن شائڈر (steins chneider) نے ۱۸۷۱ء میں ایک مقالہ تحریر کیا جس میں انہوں نے کتاب کی بے حد تعریف کی (۱) معدنیات کے موضوع پر یہ عربی کی اولین تحریر ہے جو تاحال موجود ہے۔

مامون الرشید کے عہد خلافت میں ”بیت الحکمة“ کے ایک رکن ”ابوطیب سند بن علی“ (المتوفی: ۲۲۴ھ/۸۶۳ء) نے اصلی اور نقلی دھاتوں میں تمیز کرنے کے لئے معلوم کرنے کا طریقہ ایجاد کیا، جو مسلم معدنیات میں ایک اہم پیش رفت تھی، اسی زمانے میں مشہور عرب مفکر ”ابو یوسف یعقوب کندی نے معدنیات اور فود واسلحہ سازی کے موضوع پر کئی رسالے تصنیف کئے، ان میں دور سالوں کے نام ”رسالہ فی انواع الجواهر الثمينة“ اور ”رسالہ فی انواع الحجارة والجواهر“ ہیں، ان رسالوں میں انہوں نے جواہرات اور پتھروں کے اقسام پر روشنی ڈالی ہے، اسی دور میں عربی زبان کے ادیب ”ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ بصری (المتوفی: ۱۶۳-۲۵۵ھ/۸۷۰-۸۶۹ء) نے بھی معدنیات میں اپنی معلومات پر مشتمل ایک کتاب ”کتاب المعادن“ تصنیف کی، ان کے علاوہ بعض ایسی کتابوں کے نام بھی ”ابن النديم نے دیئے جن کے مصنفین کا حال معلوم نہیں ہے۔

مشہور مصنفین میں ”ابوبکر رازی“ کی تصنیف ”کتاب الأسرار“ کو خاص اہمیت حاصل ہے، رازی نے معدنیات کی مختلف قسموں پر روشنی ڈالی ہے، ”رسائل اخوان الصفا“ میں بھی معدنیات کے موضوع کو زیر بحث لایا ہے، ان میں معدنیات کے وجود میں آنے، گرمی اور سردی اور دوسرے جغرافیائی اور ارضیاتی عوامل کے ان پر اثرات اور ان کی اقسام پر سائنسی انداز میں بحث کی گئی ہے، رسائل اخوان الصفا کے مطابق اگرچہ معدنیات کی تعداد معلوم کرنا انسان کے لئے دشوار ہے، مگر ماہرین معدنیات کی نو سو قسمیں مانتے ہیں، جو ماہیت، رنگ و بو اور وزن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

معدنیات کو شیخ الرئیس بوعلی سینا نے بھی ”کتاب الأحجار“ میں زیر بحث لایا ہے، انہوں نے معدنیات اور ارضیات کے موضوع پر اس کتاب میں بڑی اہم بحث کی ہے، ول دوران نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تیرہویں صدی تک یورپی ارضیات کا اہم ماخذ تھی۔

علم معدنیات میں سب سے اہم کارنامہ ”البیرونی“ نے انجام دیا ہے، انہوں نے اس موضوع پر ”الجماہیر فی معرفۃ الجواہر“ کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی، جس میں انہوں نے بے شمار پتھروں اور دھاتوں کے طبعی اور تجارتی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے، ان کے بعد ماہر معدنیات کی حیثیت سے سب سے زیادہ شہرت ”شرف الدین ابو بکر احمد بن یوسف النقاشی (المتوفی: ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء) کو ملی، جنہوں نے معدنیات سے متعلق ’الأزهار الأفكار فی جواهر الأحجار‘، ”خواص الأحجار“ اور ”الأحجار التي توجد فی خزائن الملوك“ کے ناموں سے تین کتابیں تحریر کیں، ان میں اول الذکر ”کتاب الأزهار فی جواهر الاحجار“ خاص طور پر مشہور ہے، کتاب کے ”۱۲۵ ابواب میں ۲۴ جواہرات کے ماخذ، ان کی آزمائش اور ان کی قیمت وغیرہ کے بارے میں بڑی وسیع معلومات فراہم کی گئی ہیں، کتاب میں ان جواہرات کی طبی افادیت اور سحر و فوسوس میں ان کی اہمیت کا ذکر بھی کیا گیا ہے، التیفاشی کی کتاب کے ماخذ زیادہ تر عربی ہیں، قدیم تحریروں میں انہوں نے صرف پلانی (pliny) کی کتاب اور ارسطو سے منسوب تصنیف سے استفادہ کیا ہے۔

مشہور سائنسدانوں میں جن لوگوں نے معدنیات کو اپنی توجہ کا موضوع بنایا ہے، ان میں سب سے اہم ”نصیر الدین طوسی“ (المتوفی: ۵۹۷-۶۷۲ھ/۱۲۰۱-۱۲۷۴ء) ہیں، انہوں نے ترک منگولیائی لفظ ”تنکسوخ“ بمعنی قیمتی چیز کو جزو عنوان بنا کر معدنیات سے متعلق ایک کتاب ”تنکسوخ نامہ“ تصنیف کی، جو مسلم علم معدنیات میں البیرونی کی کتاب کے بعد سب سے اہم تصنیف ہے، طوسی نے اس کتاب میں جابر بن حیان، کندی، رازی اور عطار د بن محمد الکاتب کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے، البیرونی کی

تصنیف طوسی کا اہم ماخذ رہی ہے، طوسی ایک تصنیف ”کتاب الجواہر“ کے عنوان سے ہے، اس میں مصنف نے جواہرات کی صفات اور ان کے خواص سے بحث کی ہے۔ علم معدنیات سے متعلق دوسری اہم تحریروں میں ”محمد بن شاذان“ کی تصنیف ”کتاب الجواہر وأصنافہ“ کا تذکرہ بھی کتابوں میں آیا ہے، ان کے علاوہ علم معدنیات کے موضوع پر کام کرنے والوں میں ”محمد بن احمد المسمی“ مصنف المرشد ”ابن مسکویہ“ ”محمد بن منصور الشیرازی“ ”ابوالقاسم کاشانی“ ”شیخ علی حزین“ ”امام احمد“ اور ”یحییٰ بن محمد الغفاری“ کے نام لئے جاتے ہیں، ان لوگوں نے معدنیات کے موضوع پر کتابیں اور رسالے تحریر کئے، ”مسلمہ بن الجریطی“، ابن الجوزی، ابن اثیر، داؤد انطاکی اور متعدد دوسرے علماء نے اپنی کتابوں میں معدنیات یا جمادات کے متعلق قابل قدر معلومات قلم بند کی ہیں، یہ معلومات ان کی کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں۔

معدنیات پر طبی تحقیق:

معدنیات کے میدان میں مسلمان سائنسدانوں نے صرف پتھروں کی تاثیر اور ان کے خواص بیان کرنے تک اپنی تحقیقات کا دائرہ محدود نہیں رکھا؛ بلکہ انہوں نے تجربات اور مشاہدوں کی روشنی میں پتھروں کی صنعتی اور تجارتی افادیت کے علاوہ دواؤں میں ان کی اہمیت بھی بیان کی، انہوں نے سالہا سال تک معدنیات پر تحقیق کر کے معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیا، عطار دین کاتب نے مختلف رنگوں اور ساخت کے ٹکڑوں معدنیاتی نمونے جمع کر کے ان پر سالہا سال تک تجربات کئے، رابرٹ بریفالٹ کے بیان کے مطابق البیرونی نے معدنیاتی نمونے جمع کرنے میں چالیس سال سفر میں گزارے تھے۔ (۱)

مسلم سائنسدانوں نے دواؤں میں معدنیات کی اہمیت واضح کی ”ابومنصور موفقی بن علی ہروی“ (المتوفی: ۳۴۰ھ/۹۶۱ء) نے ”الأبنیة عن حقائق الأدوية“ مس ۱۷۵ ایسی دواؤں کے نام دیئے جو معدنیات سے تیار ہوتی ہیں، معدنیات کے اوزان

مخصوصہ (Specific Gravity) دریافت بھی مسلم سائنسدانوں کا کارنامہ ہے، ان کی اولیت کا سہرا ”ابوالطیب سند بن علی“ کے سر ہے، ان کے بعد البیرونی نے اٹھارہ قیمتی پتھروں اور دھاتوں کے اوزان مخصوصہ متعین کئے جو آج بھی درست اور صحیح ہیں۔ (۱) ول دوران نے البیرونی کے اس اہم کارنامے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”انہوں نے پتھروں کے خواص سے متعلق ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، جس میں انہوں نے کافی پتھروں اور دھاتوں کی فطری، تجارتی اور طبی افادیت بیان کی، انہوں نے اٹھارہ قیمتی دھاتوں کے اوزان مخصوصہ بیان کئے اور یہ اصول بتلا کہ کسی چیز کا وزن پانی کے اس حجم تناسب رکھتا ہے جسے وہ چیز خالی کر دیتی ہے۔ (۲)



علم طبقات الارض میں مسلمانوں کے کارنامے

علم طبقات الارض (Geology) کا تعلق معدنیات سے بڑا گہرا رہا ہے، قرون وسطیٰ میں یہ علم منظم نہ تھا؛ بلکہ جغرافیہ یا معدنیات کے ذیل میں اس کا بھی تذکرہ ہوتا تھا، مسلم سائنسدانوں نے بھی ارضیات کو معدنیات ہی کے ذیل ہی میں زیر بحث لایا ہے، ابو یوسف یعقوب کندی، مسعودی اور اخوان الصفا نے اپنے رسالوں اور تصنیفات میں زلزلوں، باد و باران اور زمین کے مختلف طبقات اور ان کی ساخت پر بڑی کارآمد معلومات فراہم کی ہیں، کندی نے پہاڑوں کی چوٹیوں کا فاصلہ معلوم کرنے کے موضوع پر ایک کتاب ”معرفة العاد قلل الجبال“ تصنیف کی، ابو بکر رازی نے زمین کی ساخت پر قلم اٹھایا، مسعودی نے بحیرہ روم مردار کے پانی، زلزلوں، سمندری لہروں اور موتیوں کا تذکرہ کیا، اخوان الصفا نے رسائل میں دریاؤں اور پہاڑوں کی ساخت پر روشنی ڈالی، نیز انہوں نے (متحجرات) دریافت کئے، حالانکہ اس زمانے میں اس کا تصور کرنا بھی محال تھا، ان کا کہنا ہے کہ متحجرات یا رکازات بحری حیوانوں کی شکلیں ہیں جو پتھر میں تبدیل ہوئی ہیں، جن علاقوں میں یہ متحجرات یا رکازات ملتے ہیں وہ پرانے زمانے میں سمندر کا حصہ تھے بعد میں خشکی میں تبدیل ہو گئے، انہوں نے آتش فشاں پہاڑوں میں لاوے کی موجودگی اور اس کے نتیجے میں زلزلوں کے وقوع پر بھی بحث کی ہے، جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ (۱)

مسلم سائنسدانوں نے معدنیات اور ارضیات کی طرح موسمیات پر بھی کارآمد بحث کی ہے، ابو یوسف یعقوب کندی نے ۵۱ کتابوں میں موسمیات، گرمیوں میں فضا کی خشکی، باد و باران، گرج، بجلی، بارش، اولوں، زلزلوں، مد و جزر اور دوسرے موضوعات پر سائنٹفک انداز سے بحث کی ابتداء کی، ان کے بعد اخوان الصفا نے رسائل اخوان الصفا میں طبیعیات کے سترہ رسالوں کے پہلے رسالے میں موسمیات کو زیر بحث لایا، انہوں نے قوس قزح اور اس کے رنگوں کی ترتیب پر بحث کا آغاز کیا، مشہور سائنسدان ابن الہیثم ”الہالة وقوس قزح“ کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی، آخری عہد عروج کے سائنسدانوں میں قزوینی نے موسمیات اور اس کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔



نباتیات (Botany)

عہدِ وسطیٰ کی ہزار سالہ مدت کے دوران مسلمانوں نے حیاتیات (Biology) کے سائنس میں واقع خدمات انجام دی ہیں؛ حالانکہ اس زمانے میں یہ علم جدید خطوط پر مدون نہیں ہوا تھا، آج اس کی ایک شاخ نباتات (Botany) کہلاتی ہے، مسلم ماہرین کے یہاں دواسازی سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے، ہر پودا یا جڑی بوٹی کسی نہ کسی مرض کی دوا ہے، اس لئے مسلمانوں نے نباتات کی طبی افادیت کے پیش نظر اسے ”الأدویۃ المفردة“ کا نام دیا ہے، چنانچہ الادویۃ المفردة کے عنوان کے ذیل میں نباتات ہی موضوع بحث بنتے ہیں۔

نباتیات پر مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری میں توجہ دی، سب سے پہلے ”جابر بن حیان“ ”کتاب الحدود“ میں نباتات اور زراعت پر بحث کرنے کی ابتداء کی، تقریباً اسی عہد میں عبد الملک اصمعی (۱۲۲-۲۱۳ھ/ ۷۴۰-۸۲۸ء) نے ”کتاب النبات والأشجار“ تصنیف کی، جس میں انہوں نے پودوں اور درختوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کیں، تیسری صدی ہجری میں حاجظ بصری ”کتاب الذرع والنخل“ کے عنوان سے ایک تصنیف قلمبند کی؛ مگر یہ تینوں کتابیں عام طور پر غیر معروف ہیں، مستشرقین ماہرین نباتیات کے ذیل میں سب سے پہلے مشہور مورخ ”ابوصحیفۃ الدینوری“ (المتوفی: ۲۸۵ھ-۸۹۵ء) کا تذکرہ کرتے ہیں، انہوں نے نباتیات کے موضوع پر ”کتاب النبات“ کے نام سے ایک تصنیف لکھی تھی، جو صدیوں تک مغربی ماہرین نباتات بالخصوص مسلم ماہرین زراعت کے لئے اہم ماخذ رہی ہے، نباتات کا موضوع رسائل اخوان الصفا میں بھی زیر بحث آیا ہے، اخوان الصفا نے نباتات کی تقسیم اور ان کے تدریجی ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے پہلی دفعہ اس کا انکشاف کیا

کہ بعض نباتات میں حس موجود ہوتی ہے۔

اسلامی مشرق کے ماہرین نباتیات میں ”ابومنصور موفیق بن علی ہروی“، عظیم محقق کی حیثیت سے مشہور ہیں، انہوں نے سالہا سال تک جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دور دراز علاقوں کے سفر کئے اور اپنے وسیع تجربات اور تحقیقات کو ”الابنیۃ عن حقائق الادویۃ“ میں جمع کر دیا، اس کتاب میں انہوں نے پانچ سو چوراسی دواؤں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، جن میں معدنیات سے تیار ہونے والی دواؤں کی تعداد پچھتر، حیوانات سے حاصل ہونے والی دواؤں کی تعداد چھیاسٹھ ہے، کتاب میں یونانی اور شامی کے علاوہ عربی، ایرانی اور ہندوستانی معلومات بھی جمع کی گئی ہیں، مصنف نے حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے نباتات کے نام اور ان کے عربی یونانی، شامی اور فارسی مترادفات بھی دیئے ہیں، بعض عالموں کے نزدیک یہ فارسی پہلی کتاب ہے۔

نباتیات کے میدان میں دوسرے اطباء نے بھی قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں، اگرچہ ان کے یہاں نباتات کا ذکر ادویہ کی حیثیت سے آیا ہے، بغداد کے ماہر امراض چشم علی بن عیسیٰ (المتوفی: ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۱ء) نے اپنی کتاب ”تذکرۃ الکحالیین“ میں آنکھ کے علاج میں کام آنے والی ایک سو سینتالیس مفرد دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے نام دیئے ہیں، انہوں نے ان پودوں کی پہچان اور ان کے خواص کے متعلق اہم معلومات پیش کی ہیں، ان کے ہم عصر مشہور طبیب شیخ بوعلی سینا نے اپنی تصنیف ”القانون فی الطب“ کی دوسری کتاب میں آٹھ سو دواؤں کی تفصیل حروف تہجی کے اعتبار سے دی ہے، کتاب کا یہ حصہ نباتیات کے میدان میں ایک وسیع اضافہ ہے، اس کے علاوہ شیخ نے کانس کے فوائد پر ایک جداگانہ رسالہ بھی تحریر کیا ہے، شیخ کے معاصر البیرونی نے اپنی تصنیف ”الصيدلیۃ فی الطب“ میں عربی حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق سات سو بیس مقالات کے تحت مفرد دواؤں کی تفصیل بیان کی ہے، ان میں پودوں اور جڑی بوٹیوں کی ایک بڑی تعداد بھی زیر بحث آئی ہے، مصنف نے یونانی، شامی، ہندوستانی، فارسی اور ایران کی دوسری زبانوں میں ان پودوں کے فنی مترادفات بھی دیئے ہیں۔

مشرق کے مقابلے میں اسپین زیادہ زرخیز ثابت ہوا ہے، یہاں کے مسلمانوں نے تاریخ نباتیات میں شاندار اوراق جوڑ دیئے ہیں، اسپین کے اولین ماہروں میں نامور طبیب ”عریب بن سعد الکاتب القرظی“ (المتوفی: ۳۵۶ھ/۹۷۶ء) کا نام آتا ہے؛ مگر بحیثیت ماہر نباتیات کے ان کی شہرت ان کی طبابت کے سامنے ماند پڑ گئی ہے، اسپین کے پہلے مشہور ماہر ابن جلیجل (المتوفی ۳۸۴ھ) ہیں جنہوں نے نہ صرف یونانی ماہر نباتیات دیسقوریڈوس کی کتاب کی اصلاح کی اور اس کی عربی شرح تیار کی؛ بلکہ ”مقالہ فی ذکر الادویۃ المفردۃ لم یذکرہا ما دیسقوریڈوس“ کے عنوان سے خود بھی ایک کتاب تحریری، اس میں انہوں نے جرّی بوٹیوں کا ذکر کیا جو دیسقوریڈوس کو معلوم نہیں تھیں، گیارہویں صدی عیسوی میں ابو الصلت نے ”الادویۃ المفردۃ“ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں کیا گیا۔

ابن جلیجل کے بعد ”الادویۃ المفردۃ“ اور دیگر عنوانوں سے مسلمانوں نے بیسیوں کتابیں لکھیں، جن میں سے بعض کے نسخے آج بھی مشرقی اور مغربی کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

اندلس کے دوسرے علماء میں سے ابن واند (المتوفی ۴۶۷ھ/۱۰۷۵ء) محمد بن ابراہیم البصال، احمد بن محمد حجاج الاشبیلی، علی اب اللونقہ، محمد بن مالک الطغتری اور ”الحاج الغرناطی“ اگرچہ ماہرین زراعت کی حیثیت سے مشہور ہیں؛ مگر ان کی تصنیفات میں نباتیات کے موضوع پر خاصا مواد موجود ہے، اسپین میں مشہور جغرافیہ نگار ”ابوعبید الکبریٰ“ نے بھی نباتیات کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں حروف تجنی کے اعتبار سے اندلس کی نباتات کا بیان ہے۔

مفکرین اسلام میں ابن باجہ (المتوفی: ۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء) نباتیات کے ماہر تھے، انہوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی تحریر کیا ہے، جغرافیہ دانوں میں ادریسی ماہر نباتیات کی حیثیت معروف تھے، انہوں نے اس موضوع پر ”الجامع لصفات اشتات النبات“ لکھی، جس میں تین سو ساٹھ پودوں کی تفصیلی دی، میکس میر ہاف

کے بقول ادریسی پودوں کے مترادفات بیان کرنے میں کامیاب ہیں، کبھی کبھی وہ بارہ زبانوں کے مترادفات دیتے ہیں، اسپین کے ماہرین نباتیات میں ”ابوجعفر محمد الغافقی“ کا نام اپنے کارناموں کی بدولت خاصا مشہور ہے، قرطبہ کے اس طبیب نے اسپین اور افریقہ کے پودوں کی ایک بڑی تعداد جمع کی اور اپنی کتاب ”الأدویۃ المفردۃ“ میں ان کی تفصیلی معلومات فراہم کیں، انہوں نے ہر پودے کے لاطینی، بربری اور عربی نام لکھے، نباتات کی تلاش و تحقیق میں اشبیلہ کے ایک عالم ابو العباس (المتوفی ۶۳۶ھ/۱۲۳۹ء) نے اٹلانٹک سے لے کر بحر قزقم تک کے سفر کئے، جرّی بوٹیوں کی تلاش میں دور دراز علاقوں کے سفر کرنے کی وجہ سے ان کا نام ابو العباس نباتی پڑ گیا، انہوں نے اپنے سالہا سال کے تجربات کا نچوڑ ”الرحلۃ النباتیۃ“ کے عنوان سے ایک کتاب میں قلم بند کیا، اس کتاب سے ان کے شاگرد ”ابن البیطار“ نے استفادہ کیا ہے۔

نباتیات کے شعبے میں ”کتاب الادویۃ المفردۃ“ کے مصنف ”رشید الدین الصوری“ (۵۷۳-۶۳۹ھ/۱۱۷۷-۱۲۴۱ء) کی تحقیقات حد درجہ قابل داد ہیں، وہ اپنے ہمیشہ ایک مصور رکھتے ہیں، جس کے پاس قسم قسم کے رنگ ہوتے تھے، رشید الدین جب جرّی بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور کوہستانی علاقوں میں جاتے تو پہلے کسی بوٹی کا خود مشاہدہ کرتے اور اس کی چھان بین کرتے، پھر اسے اپنے مصور کو دکھلاتے جو پہلے اس کے رنگ کے مطابق اس میں رنگ بھرتے، پھر اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے؛ بلکہ ہر بوٹی کو اس کے مختلف زمانوں وقت ظہور، وقت کمال، وقت طراوة اور وقت بیس میں دیکھتے، اس کے بعد ہر وقت کی تصویر الگ الگ مختلف رنگوں میں بناتے، آخری میں اسے اس کتاب میں شامل کیا جاتا جو ”کتاب الادویۃ المفردۃ“ کے نام سے مشہور ہوئی، ۱۹۵۷ء میں حکیم نیر واسطی نے رائل کالج آف فزیشنز لندن کی لائبریری میں کتاب کے مصور رنگین اوراق دکھانے والی خاتون سے اس کے ایک ورق کی قیمت دریافت کی تو جواب ملا ”انگلستان“۔

عہد وسطی کے جس عظیم سائنسداں کو نباتات کے میدان بے پناہ شہرت ملی وہ

”ابو عبد اللہ بن احمد بن البیطار“ (المتوفی: ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) ہیں، جو اسپین کے شہر مالقہ کے ایک بیطار (مویشیوں کا علاج کرنے والا) خاندان میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے اشبیلہ میں تعلیم حاصل کی اور ابو العباس اور دوسرے ماہرین نباتیات کے ساتھ رہ کر پیڑ پودوں کا علم سیکھا، ابن البیطار نے مغرب اور مشرق کے بعض علاقوں کا سفر کر کے بالآخر قاہرہ میں رہائش اختیار کی، ان کا انتقال دمشق ہوا۔

ابن البیطار نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں، جن میں ”المغنی فی الأدوية المفردة“ اور ”الجامع المفردات الأدوية والأغذية“ مشہور ہیں، آخر الذکر کتاب ”الجامع المفردات الأدوية والأغذية“ میں علاج کے لئے چودہ سو دواؤں کی تفصیل دی گئی ہے، رابرٹ بری فالٹ کی بیان کے مطابق یورپ کے ایک فاضل میسر نے اس کتاب کو محنت و جفاکشی کی یادگاری میں اقرار دیا ہے، B.Liin کہتے ہیں:

”ابن البیطار (المتوفی: ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) نے اپنی تمام دستیاب معلومات جمع کیں اور دیسقوریڈوس سے لے کر اپنے استاد ابو العباس نباتی، جن کی تصنیف الرحلة کا وہ اکثر حوالہ دیتے ہیں، تک کہ ایک سو پچاس ماہرین کے اقوال نقل ہیں، ان میں سے اکثر خاص کر الغالی کی کتابوں کا علم انہیں ثانوی ذرائع سے حاصل ہوا تھا، ”جامع“ کے ۲۳۲ مقالات کے تحت ۱۴۰۰ مختلف دواؤں اور نباتات کی تفصیل دی گئی ہے جن میں سے ۴۰۰ یونانیوں کو بھی معلوم نہ تھیں۔



علم زراعت (Agronomy)

میں مسلمانوں کے کارنامے

علم نباتیات میں ان مصنفوں کی خدمات بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں، جنہوں نے زراعت کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض نے اس فن میں قابل ذکر کتابیں یادگار چھوڑیں ہیں، اولین مصنفوں میں بغداد کے ابو بکر احمد بن عسلی ابن المختار المعروف بہ ابن وحشیہ (نواح ۳۵۰ھ) تذکرہ نگاروں کے یہاں عام طور پر معروف ہیں، حیاتیات، سمیات اور الکیمیا کے ماہر ابن وحشیہ زراعت کے موضوع پر اپنی تصنیف ”الفلاحة النبطية“ کے مصنف کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، انہوں نے اس کتاب میں پیڑ، پودوں، ذرائع، آبپاشی، موسمی حالات، شجرکاری اور دوسرے موضوعات پر بحث کی ہے، زراعت کے موضوع پر لکھی جانی والی کتابوں میں ابن مماتی (المتوفی: ۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء) کی شائع شدہ کتاب، اور عبد اللہ الغنی نابلسی (المتوفی: ۹۳۵ء - ۱۵۹۲ء) کی تصنیف ”علم الملاحاة فی علم الفلاحة“ کو زراعتی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہو رہا ہے۔

اسلامی مغرب میں علم زراعت کے موضوع پر قرطبہ، طلیہ، اشبیلہ، غرناطہ اور المیر یہ کے علماء نے کتابیں تحریر کی ہیں، ان میں ابن الوافد (المتوفی: ۴۶۷ھ/۱۰۷۵ء) خاص طور مشہور ہیں، اسپین کے ایک گمنام عالم غالباً ابن عبدون (چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی) کی تصنیف ”عمدة الطب فی معرفة لكل لبيب“ نباتات کی بہترین لغت مانی جاتی ہے اور بعض لوگ اسے ابن البیطار کی کتاب پر فوقیت

دیتے ہیں۔

قرون وسطی کے دوران سب سے زیادہ عالمی شہرت اشبیلہ کے ”ابو زکریا محمد ابن العوام الأشبیلی“ (المتوفی: ۱۱۹۰ء) کو نصیب ہوئی ہے، جن کی تصنیف ”کتاب الفلاحة“ اس موضوع پر بڑی اہم تصور کی جاتی ہے، ابن العوام نے یونانی اور عربی مآخذ سے استفادہ کرنے کے علاوہ اسپین کے معاصر علماء اقوال و تجربات سے بھی استفادہ کیا ہے، کتاب الفلاحة میں ۱۳۴ ہیں، جن میں ۵۸۵ نباتات کی تفصیل دی گئی ہے، اس کے علاوہ اس کتاب میں پچاس سے زائد میوہ دار درختوں کی کاشت کے بارے میں رہنمائی ملتی ہے، نیز اس میں درختوں میں پیوند کاری، زمین کی خصوصیات، نباتات کو لگنے والی بیماریوں اور ان کے علاج، حیوانات کی پرورش نیز مرغیوں اور شہد کی مکھیوں کو پالنے پر بحث کی گئی ہے، اس کتاب کو انسائیکلو پیڈیا میں ”اپنے موضع پر عہد وسطی کی غیر معمولی تصنیف کہا گیا ہے۔ (۱)

مسلم ماہرین زراعت کی کتابوں میں اراضی کی اقسام، کاشتکاری، آلات کشتاد زری، ذرائع آبپاشی، پھلدار درختوں کی شجر کاری، شاخ تراشی، پیوند کاری، پھلوں اور سبزیوں کی اقسام اور ان کی کاشت، مضر اور منافع بخش پودوں، اناج اور پھلوں کی ابقاء، مویشی پروری، کھاد اور زراعت سے متعلق دوسری چیزوں پر بحث کی جاتی تھی، اسپین کے مسلم ماہرین زراعت نباتاتی باغ اور آزمائشی پلاٹ ہوتے تھے جہاں وہ پودوں پر تجربے اور پیوند کاری کر کے پھلوں اور پھولوں کی نئی اقسام پیدا کرتے ہیں، پھلوں اور پھولوں کی نئی نئی قسمیں پیدا ہونے سے خود زراعتی ادب کا دامن اسماء و اصطلاحات سے مالا مال ہوا، بیسویں صدی میں مصطفی سہابی نے زراعتی لغت تیار کی تو اصطلاحات کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی، مسلمان ماہرین نے پیوند کاری کے ذریعہ پھلوں اور پھولوں کی سینکڑوں نئی قسمیں پیدا کیں، نویں صدی کی ایک تصنیف ”نزهة الأنام فی محاسن الشام“ شام کی ناشپاتیوں کی اکیس، انگوروں کی پچاس اور گلاب وغیرہ پر چھ قسموں کا بیان ہے۔

یونانیوں کی خیالی کائنات پر مسلمانوں نے ہمیشہ عملی دنیا کو ترجیح دی، انہوں نے اپنی معلومات سے کام لے زراعت اور باغبانی کو ترقی دو، کاشتکاری کے نئے طریقے رائج کئے، درختوں اور پودوں کی کاشت، ان کے نشوونم کی مدت کے تعین، پھلوں کو لگنے والی بیماریوں اور ان کے سدباب پر روشنی ڈالی، انہوں نے کھاد کے استعمال کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ ان فصلوں کی نشاندہی کی جن سے زمین کی قوت زرخیزی میں اضافہ یا کمی ہوتی ہے، نباتیات اور زراعت میں اپنی بے پناہ مہارت سے مسلمانوں نے یورپ کو لہلہاتے سبزہ زاروں میں تبدیل کر دیا، اندلس میں ان کی آمد بہاروں کے قافلوں کی آمد تھی۔

مسلمانوں نے علم زراعت و نباتیات نے یورپ کی سرزمین پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں جو اسپین اور مغرب زراعتی نظام میں آج بھی نمایاں ہیں، زراعت سے متعلق چیزوں، نباتات اور میوؤں کے ان گنت نام عربی سے ماخوذ ہیں، عربی کے الفاظ الساقیہ، الارز، الرمان اور الزعفران سے بالترتیب اسپینی الفاظ (asafron) (romania acquia) کئے گئے ہیں، البرقوق سے اسپینی لفظ (alberchigo) بنا ہے، جس سے انگریزی لفظ (apricot) لیا گیا ہے، عربی کے الفرق سے اسپینی (alberchigo) اخذ کیا گیا ہے، جس سے لاطینی کا (Peaches) بنا ہے، عربی لفظ قطن سے اسپینی (algabin) اور انگریزی (cotton) بنایا گیا ہے، انکے علاوہ مغربی زبانوں میں عربی کے الفاظ درآئے ہیں، ان میں صندل سے (sandal) آرنج سے (orange) لیلج سے (Lilae)، زنجبیل سے (Ginger) خولجان سے (clango) اور ترمیندی سے (Tamarind) ماخوذ ہیں۔ (۱)



حیوانیات (Zoology)

میں مسلمانوں کے کارنامے

مسلم سائنسدانوں نے تمام کیمیائی مادوں کو معدنیات، نباتات اور حیوانات میں تقسیم کیا ہے، ابوبکر رازی پہلے شخص ہیں، جنہوں نے مادوں کو نباتات، حیوانات اور معدنیات میں تقسیم کر کے ایک ایسی درجہ بندی قائم کی ہے جو آج تک مسلم چلی آرہی ہے، میکس میر ہاف لکھتے ہیں:

”رازی کیمیائی مادوں کو نباتات، حیوانات اور معدنیات میں تقسیم کرتا ہے، یہ وہ تصور ہے جو جدید سائنس یا آج کل کی بول چال میں انہیں کی طرف سے آیا ہے۔“

رازی کی درجہ بندی کے پیش نظر معدنیات اور نباتات کے بعد ہم نے حیوانیات کے موضوع کو لیا ہے، مزید برآں یہ علم حیاتیات کی ہی ایک شاخ ہے، اس لئے نباتات کے بعد یوں بھی اس کا تذکرہ آتا تھا، سائنس کی دوسری شاخوں کی طرح مسلمانوں نے علم حیوانات کے شعبے میں بھی درخشاں کارنامے انجام دیئے ہیں، جن کی تاریخ صحرائے عرب سے شروع ہوتی ہے، حیوان شناسی میں عرب یونانیوں کے بجائے اپنے اس ماحول کے مرہون منت ہیں، جس نے ان پر اونٹ، گھوڑے اور بکری کی اہمیت واضح کی ہے، یہ عرب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے اونٹ کو انسان سے مانوس کر کے اسے بار برداری کے لئے استعمال کیا، جو ان کی حیوان شناسی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے حیوان شناسی کو جس شخص نے موضوع بحث بنایا وہ

”ابو عبیدہ معمر بن شثی“ (۱۱۰-۲۰۹ھ/۷۲۸-۸۲۴ء) ہیں، انہوں نے حیوانات کے موضوع پر ایک سو کتابیں تحریر کی ہیں، جن میں سے پچاس صرف گھوڑے پر ہیں، ابو عبیدہ نے مختلف قسم کے حیوانوں، گھوڑوں، اونٹوں، سانپوں، بچھوؤں وغیرہ پر کتابیں قلم بند کیں، ان میں ”طبقات الفرسان، کتاب الفرس، کتاب الخیل، کتاب الحیات، اور کتاب العقارب کے نام شامل ہیں، ابتدائی دور کے ماہر حیوان شناس ”عبد الملک اصمعی“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے ماہر حیاتیات گذرے ہیں، انہوں نے حیوانیات اور نباتات کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں ”کتاب الخیل“، ”کتاب الإبل“، ”کتاب الوحوش“، ”تاب الشاة“ اور ”کتاب الخلق الإنسان“ معروف ہیں، ان کے بعد مسلمانوں میں ماہر حیاتیات کی حیثیت سے جاحظ بصری اپنی تصنیف ”کتاب الحیوان“ کی بنا پر پوری دنیا میں مشہور ہیں، انہوں نے اس کتاب میں تین سو پچاس حیوانات کے متعلق اپنی تفصیلی معلومات درج کی ہیں، کتاب میں ڈوڑے والے، رینگنے والے، ن اڑنے والے، تیرنے والے جانوروں کے بارے میں بڑی کارآمد تفصیلات فراہم کی ہیں، حیوانوں اور جانوروں کے عادات، ان کے خورد و نوش اور ان کے فوائد کے بارے میں مصنف نے بعض ایسی چیزیں بیان کی ہیں، جو اور کسی کتاب میں نہیں ہیں، جاحظ نے ارسطو کی تصنیف کا مطالعہ کر کے اس سے استفادہ کیا ہے، مگر بعض اوقات وہ ارسطو پر بہت سخت تنقید کرتے ہیں، کتاب کے مطالعے سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ انہوں نے ارسطو سے زیادہ تحقیقات پر اعتماد کیا ہے، انہیں تحقیقات کی بنا پر مصنف دنیا کے مشہور حیوان شناسوں میں شمار ہوتے ہیں، جاحظ پہلے مصنف ہیں جنہوں نے پرندوں کی نقل مکانی کا مشاہدہ کیا اور اپنی کتاب میں اس پر روشنی ڈالی، اس کے علاوہ انہوں نے جانوروں کے گوبر یا فضلے سے نوشادر حاصل کرنے کا تذکرہ کیا ہے، فلپ ہٹی جاحظ کی کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس تصنیف جس میں مصنف نے ارسطو کا حوالہ دیا ہے، میں ارتقاء،

حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت اور حیوانوں کی نفسیات سے متعلق وہ نظریات ملتے ہیں جو بعد زمانے کے انکشاف سمجھے جاتے ہیں، جاحظ اس بات سے آگاہ تھے کہ جانوروں کے فضلے سے کس طرح خشک طریقہ کشید سے اموینا (نوشادر) کی گیس حاصل کی جاسکتی ہے (۱)

مغربی مفکرین نے حیاتیات جاحظ کو عظیم حیوان شناس مانتے ہیں، بعض علماء مغرب نے انہیں ارسطو کا ہم پلہ قرار دیا ہے، یہ کتاب اس وقت کی یونانی، ایرانی، شامی اور ہندوستانی حیاتیاتی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے؛ لیکن اس کا اولین ماخذ عربوں کا علم حیوانات ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

”عرب ماہرین حیاتیات میں جاحظ (المتوفی ۸۶۸ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کی حیاتیاتی تصانیف میں کتاب الحیوان معروف ہے، جس میں اگرچہ کسی حد تک یونانی اثر ہے، مگر بنیادی طور پر وہ ایک عربی تصنیف ہے“

حیوانات کا موضوع ”رسائل اخوان الصفا“ میں بھی زیر آیا ہے، اخوان الصفا نے رسائل میں حیوانات کی درجہ بندی کر کے اس علم کے آگے بڑھایا، انہوں نے حیوانات کو مکمل اور نامکمل خانوں میں تقسیم کر کے ان کی ذیلی درجہ بندی کی، نیز انہوں نے جانوروں کی پیدائش، نشوونما اور ان کی جسمانی ساخت پر بھی بحث کی ہے، اخوان الصفا کے مطابق اس کے لحاظ سے حیوانوں میں فرق ہوتا ہے، بعض حیوانوں کے پاس ایک حس، بعض کے باس دو حواس اور بعض کے پاس دو حواس اور بعض جانور تین یا چار حواس کے مالک ہوتے ہیں۔

مفکرین اسلام میں کندی نے حیوانات کے موضوع پر کئی رسالے تصنیف کئے، جن میں ”رسالہ فی الطائر الانسی“، ”رسالہ فی تمریخ الحمام“، ”رسالہ فی النحل“، ”رسالہ فی الحشرات“ اور ”کتاب فی الخیل والبیطرة“ کے نام

آتے ہیں، ان کے بعد فارابی نے علم حیاتیات کو طبیعیات میں شمار کر کے اس کی سائنسی اہمیت اجاگر کی، ابن سینا نے حیوانات کے موضوع پر الگ سے کوئی کتاب نہیں لکھی، مگر ان کی تصنیف ”کتاب الشفا“ میں حیوانوں کی نفسیات پر بڑی اچھی بحث کی ہے، ان کے معاصر ”ابن مسکویہ“ نے ارتقاء کا نظریہ پیش کرتے ہوئے حیوانات کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

اسپین کے مفکروں میں سے ابن ماجہ نے حیوانات کے موضوع پر قلم اٹھایا، ان کے بعد ابن رشد نے ارسطو کی دو کتابوں کی شرح لکھی، یہ دونوں کتابیں حیوانات کے اعضاء اور ان کی پیدائش سے متعلق تھیں، حیوانات کے بارے میں قابل ذکر مواد فراہم کیا ہے، معروف جہاز راں بزرگ بن شہر یار نے ”عجائب الہند“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جس میں بحری ہند اور اس سے ملحقہ علاقوں کے جانوروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔؟

حیوانیات کے موضوع پر ادیبوں اور سیاحوں یا ملاحوں نے بھی معلومات فراہم کی ہیں، مشہور ادیب ”ابن قتیبہ دینوری“ ”عیون البصار“ میں حیوانیات کے بارے میں قابل ذکر مواد فراہم کیا ہے، معروف جہاز راں بزرگ بن شہر یار نے ”عجائب الہند“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں بحر ہند اور اس سے ملحقہ علاقوں کے جانوروں کا ذکر بھی کیا گیا۔

چھٹی صدی ہجری کے رابع اول میں ’شرف الزماں الطاهر المزوری‘ نے ”طبائع الحیوان“ تصنیف کی جو حیوانیات کے موضوع پر ایک اہم کتاب شمار ہوتی ہے، ساتویں صدی ہجری کے ماہرین حیاتیات ”ذکریا بن محمد القزوينی“ مشہور ہیں، ان کی تصنیف ”عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات“ حیوان شناسی کے موضوع پر عمدہ تصنیف مانی جاتی ہے، مصنف نے اس میں ایک سو تیس حیوانوں کا تذکرہ کیا ہے، انہیں مشرق کا پلینی کہا جاتا ہے، تقریباً اسی زمانے میں مشہور جغرافیہ داں اور مورخ ”شمس الدین الدمشقی“ نے ”نخبۃ الدھر فی عجائب البر

والبحر“ تصنیف کی، جس میں انہوں نے ایشیا اور افریقہ کے سمندری اور دریائی جانوروں کے بارے میں معلومات دی ہیں، اسی زمانے میں ”نور الدین محمد عوفی نے ”جامع الحکایات“ تحریر کی، جس میں انہوں نے چار ابواب حیوانیات پر روشنی ڈالی ہے، آٹھویں صدی ہجری حیاتیات کی تصنیف میں ”حمد اللہ مستوفی القزونی“ کی کتاب ”نزهة القلوب“ مشہور ہے، اس میں حیوانات کو مختلف طبقوں اور ذیلی گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، کتاب میں دوسواٹھائیس جانوروں کا تذکرہ آیا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری میں ”محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ بن علی الدمیری (۷۴۲ھ - ۸۰۸ھ / ۱۳۴۱ء - ۱۴۰۵ء) نے ”حیاء الحیوان“ کے نام سے ایک کتاب تحریر کی، یہ کتاب حیوان شناسی کے موضوع پر مسلمانوں کی سب سے اہم کتاب مانی جاتی ہے، حیاء الحیوان حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے اور اس میں نو سو اکتیس جانوروں کے نام، عادات، غذای اہمیت، حلت و حرمت، طبی افادیت، خواص اور دوسری چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، یورپ کے مؤرخین حیاء الحیوان کے مصنف الدمیری کو عربوں کا سب سے بڑا حیوان شناس مانتے ہیں، موسیو یو کا بیان ہے کہ دمیری کی کتاب یورپ میں مشہور ہے، چنانچہ یورپ والے اسے اپنے ہاں کے عالم بوفون کا ہمسر مانتے ہیں، فلپ ہٹی لکھتے ہیں:

”الدمیری میری سے عظیم عرب ماہر حیوانات ہیں“ (۱)

دمیری کی تصنیف کی اہمیت کے پیش نظر متعدد علماء نے اسے خلاصے تیار کئے، جو بیحد مقبول ہوئے، نویں صدی ہجری میں بھی حیوانات کے موضوع پر متعدد کتابیں تحریر کی گئیں، ۸۹۶ھ میں ”محمد بن عبد الکریم الصاوی“ نے ”المملکتات من عجائب المخلوقات“ و ”حیاء الحیوان“ مرتب کی، اس کتاب میں مصنف نے زکریا القزونی کی کتاب ”عجائب المخلوقات“ اور دمیری کی تصنیف ”حیاء الحیوان“ کو جمع کیا ہے۔

علم الکیمیاء (Chemistry)

میں مسلمانوں کے کارنامے

مسلمانوں میں کیمسٹری کا آغاز عہد بنی امیہ کے دوران پہلی صدی ہجری میں اس وقت ہوا جب اموی شہزادے ”خالد بن ولید“ (المتوفی: ۸۵ھ / ۷۰۷ء) نے علم کیمیا سیکھنے کے لئے ایک راہب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، حصول علم سے فراغت کے بعد خالد نے اپنی زندگی اس فن کے لئے وقف کر دی، انہوں نے اس موضوع پر چار کتابیں قلم بند کیں، جس کا ذکر ابن الندیم نے کیا ہے۔

علیم کیمیا میں خالد کے بعد حضرت امام جعفر صادق (المتوفی: ۱۴۸ھ / ۷۶۵ء) کی کیمیا داں کی حیثیت سے مشہور ہوئے، مگر تا حال اس موضوع پر کسی تصنیف کا ان کے نام انتساب ایک تحقیق طلب مسئلہ بنایا ہوا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں سب سے مشہور کیمیا داں ”جابر بن حیان“ تھے، جنہوں نے کیمسٹری کا باوا آدم کہا جاتا ہے، جابر پہلے سائنسدان ہیں، جنہوں نے تجربات کر کے علم کیمیا کو باقاعدہ سائنس کی شکل دی اور اپنے تجربات کو اپنی تحریروں میں محفوظ کر دیا، انہوں نے کیمیا کے موضوع پر ایک سو کتابیں تصنیف کیں، عہد عباسی کے ماہر زراعت ابن وحشیہ بھی کیمیا داں کی حیثیت سے مشہور ہوئے، مگر ان کی تحریروں میں غیر سائنسی مواد کی موجودگی سائنفک اسلوب کے منافی ہے۔

کیمیا داں میں یہ نظریہ عام ہو رہا ہے کہ ایک خاص عمل سے کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، ابتدائی عرب کیمیا داں بھی اس کے قائل تھے، عباسی دور

میں ”ابو یوسف یعقوب کندی“ نے ان لوگوں کی تردید میں متعدد درسا لے تحریر کئے، جن میں ایک تحریر ”کتاب إبطال دعوی المدعیین صناعة الذهب والفضة من غیر معادنہا“ کے عنوان سے معروف ہے، کندی کی تحریروں سے مناقشہ کا وہ دروازہ کھلا جو صدیوں تک بند نہ ہو سکا، مسلم کیمیا داں دو گروہوں میں بٹ گئے، ایک اس کا قائل تھا کہ تمام دھاتیں ایک ہی نوع سے تعلق رکھتی ہیں؛ اس لئے انہیں ایک دوسرے میں تبدیل کرنا ممکن ہے، دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ ایسا کرنا ناممکن اور محال ہے، کندی کے بعد ”ابو بکر رازی“ نے کیمیا کے موضوع پر ۲۱ کتابیں تحریر کیں، جن میں سے سب سے مشہور تصنیف ”سر الأسرار“ ہے، رازی کو کیمیا گری سے دلچسپی تھی؛ اس لئے انہوں نے اپنی تحریروں میں کندی پر سخت حملے کئے، کیمیا دانی میں قابل داد مہارت کی بنا پر انہیں جابر بن حیان کا بڑا جانشین مانا جاتا ہے، عہد عباسی میں ”ابن امیل النمسی“ نے ”مفتاح الحکمة العظمی“ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، اسی دور میں مشہور جغرافیہ داں ”الحمدانی“ نے اپنی کتاب تصنیف کی جس کے تیسرے حصہ ”جوہر تین العتیقین“ میں انہوں نے دھات کاری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب عربی زبان میں اس موضوع پر اولین اور بہترین تحریر مانی جاتی ہے۔ مشہور مفکروں میں فارابی دھاتوں کی قلب ماہیت کے امکان کے قائل تھے، انہوں نے اس موضوع پر ”فی مقالة وجوب صناعة الکیمیا“ کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی، چوتھی صدی ہجری میں اسپین کے ماہر ہیئت ”مسلمہ بن احمد الجریطی“ نے ”رتبہ الحکیم“ اور ”غایۃ الحکیم“ کے عنوانوں سے دو کتابیں تصنیف کیں، اول الذکر تصنیف میں انہوں نے بیش بہا دھاتوں کے فارمولوں اور ان کے طریقہ حصول پر بحث کی ہے۔

کیمیا گری کے مخالفین میں ”ابو حیان توحیدی“ (المتوفی: ۴۱۴ھ / ۱۰۲۴ء) اور ”ابن سینا“ مشہور ہیں، ان دونوں نے یہ خیال پیش کیا کہ کیمیا کی عمل سے دھات کی ظاہری صورت میں تبدیل ہو سکتی ہے، اصلیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

جابر بن حیان کے بعد کیمیا گری میں سب سے مشہور شخصیت ”ابو الحکیم محمد بن المثلک الصالحی الخوارزمی الکائی“ (نواح: ۴۲۵ھ / ۱۰۳۴ء) ہیں، انہوں نے ”عین الصنعة وعون الصناع“ کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی، جو صدیوں تک کیمیا کے شائقین کے لئے مرجع کا کام دیتی رہی۔

کیمیا گری کا دفاع کرنے والوں میں سب سے اہم شخصیت وزیر مؤید الدین طغرانی ہیں، انہوں نے ”حقائب الاستشهاد، کتاب الأنور والمفاتیح“، ”مفاتیح الرحمة“ اور ”انوار الحکمة“ تصنیف کیں، طغرانی نے اپنی تحریروں میں ابن سینا کو نشانہ بنایا، چھٹی صدی ہجری میں ”ابو الحسن موسی بن ارفع الانصاری“ (المتوفی: ۵۵۳ھ / ۱۱۹۷ء) نے اس موضوع پر ”شذوذ الذہب“ تحریر کی جس کی مختلف شرحیں لکھی گئیں۔

کیمیا کے موضوع پر ”ابو القاسم محمد بن احمد العراقي فی السیماوی“ نے ”الکمتب فی زراعة الذهب“ کے نام سے تصنیف تیار کی، ان کے بعد آٹھویں صدی میں ”علی بن ایدمر بن علی الجلدکی“ (۳۳۳ھ / ۱۳۴۲ء) اور ”ابو الاصلغ بن تمام العراقي“ (۶۲۲ھ / ۱۳۶۰ء) نے اس موضوع پر قابل ذکر تحریریں قلم بند کیں۔

کیمیا گری کے نامور مخالفین میں علمائے اسلام ابن حزم، امام ابن تیمیہ، اور ابن قیم پیش پیش ہیں، ابن قیم الجوزی نے ”مفتاح دار السعادة“ میں کیمیا اور اس طرح کے تمام علوم کی مخالفت کی، مورخین میں ابن خلدون نے کیمیا گری کو ایک قسم کا جادو قرار دیا۔ یہ علم کیمیا کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ تھا، چوں کہ اس علم کا مقصد ایک خاص عمل سے کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنا تھا، اس لئے لوگ مختلف تجربات کیا کرتے تھے، جن سے بجائے خود بعض نئی چیزوں کا انکشاف ہوتا، اسی کیمیائی عمل نے موجودہ کیمسٹری کو جنم دیا، کیمیا کے حصول کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے، وہ کیمسٹری کے عمل قرار پائے، جس اکسیر کی تلاش میں مسلم سائنسدان شب و روز منہمک رہتے تھے، وہ تو ملنے سے رہا، اس کے بجائے جدید کیمسٹری ان کے ہاتھ آئی جو تاثیر میں اکسیر سے ہزار درجہ بڑھ کر تھی۔

ول دوران لکھتے ہیں:

”علم کیمیا گری جو مسلمانوں نے مصر سے ورثے میں پائی ہے، ہزار اتفاقی دریافتوں سے کیمسٹری کو مالا مال کر دیا، ان کے اس کیمیائی عمل سے بھی کیمسٹری کو ترقی ملی، جو عہد وسطی کے طریقوں میں سب سے سائنٹفک طریقہ تھا“۔ (۱)

علم کیمیا میں تجربہ کی اہمیت - مسلمانوں کی ایجاد

علم کیمیا میں مسلمانوں نے تجربہ کی اہمیت پر زور دیا، مشہور سائنسدان جابر بن حیان نے کہا تھا ”کیمیا میں سب سے ضروری شے تجربہ ہے، جو شخص اپنے علم کی بنیاد تجربے پر نہیں رکھتا، وہ ہمیشہ ٹھوکر کھاتا ہے، صرف اسی علم کو صحیح جاننا چاہیے جو تجربے سے ثابت ہو جائے، جابر کے یہ الفاظ مسلم سائنسدانوں کے لئے راہنما اصول بن گئے انہوں نے نظری علم کے ساتھ ساتھ تجربی تحقیق کا طریقہ اختیار کیا، اسی تجربی تحقیق نے آگے چل کر کیمسٹری کو فروغ دیا، ڈیپر مسلمانوں کے تجربی اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”یہی وہ چیز تھی جس نے انہیں کیمسٹری کا موجد بنایا اور جس نے ان سے تقطیر، تصعید، تسبیج اور ترویق کے لئے تمام قسم کے آلات ایجاد کرائے“ (۲)

تجرباتی اعمال کی جو نئی روایت قائم ہوئی، اس کے بانی جابر بن حیان تھے، جابر نے کیمیائی تجربوں کا آغاز کر کے حقیقی معنوں میں جدید کیمسٹری کی بنیاد رکھی، انہوں نے تحلیل (Solution) تقطیر، تبخیر، کشید، تبلیر، تکلیس، تصعید جیسے عملوں کو فروغ دیا، ان میں سے بعض تجرباتی اعمال مثلاً تکلیس (Calcination)، آکسائیڈیشن اور تحلیل (Solution) وغیرہ خود ان کی اپنی دریافتیں ہیں، انہوں نے ان تمام کیمیائی عملوں کو اپنے معامل میں برتا جو عہد وسطی سے لے کر آج تک استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

جابر بن حیان نے کیمیا کی صنعتی استعمال میں بھی دنیا کی رہنمائی کی ہے، انہوں

نے اپنی کتابوں میں فولاد سازی، فلزات کی صفائی، لوہے کے رنگ سے حفاظت، چمڑے کی رنگائی، شیشے کو رنگیں بنانے، دھاتوں کے مرکبات تیار کرنے، لوہے اور وارنش کرنے، بالوں کے لئے خصاب تیار کرنے اور موم جامہ تیار کرنے کے طریقہ بیان کئے، ان کے علاوہ ان کی کتابوں میں بیسیوں مفید اشیاء تیار کرنے کے طریقے بھی بیان کئے گئے ہیں۔

گستاوی بان لکھتے ہیں:

”جابر کی تصنیفات میں ایسے بہت سے مرکبات کا ذکر ہے، جو اس سے قبل معلوم نہ تھے، مثلاً شورے کا تیزاب، ماء الملوک، ملح القلی، نوشادر، چاندی کا شورہ، زمینق سلیمانی، راسب الاحر وغیرہ، اسی کی تصنیفات میں سب سے پہلے کیمیائی عملیات، عرق کشی، تصعید، قلم بندی، پانی میں حل کرنے گلانے وغیرہ کا بھی بیان ہے“ (۱)

جابر بن حیان کی کتابوں کے ترجمے بارہویں صدی میں کئے گئے، سب سے پہلے ایک انگریز رابرٹ آف چسٹر نے ۱۱۴۴ء میں ان کی ایک کتاب الکیمیا کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ جابر کی ایک دوسری تصنیف ”کتاب السبعین“ کو ”جرار قرمونی“ نے لاطینی کا جامہ پہنایا۔

☆ جابر کے بعد یعقوب کندی نے اپنی تصنیفات میں فولاد سازی، عطر سازی اور رنگ سازی پر پیش قیمت معلومات بہم کیں، مسلمان سائنسدانوں کی ان صنعتی خدمات سے نباتات سے عطر بنانے، شیشہ سازی، روغن سازی، روشنائی کی کئی قسمیں تیار کرنے کی صنعت کو ترقی ہوئی۔

☆ اطباء میں سب سے بڑی کیمیا داں ابو بکر رازی تھے، انہوں نے اپنے تمام کیمیائی علموں کو عام فہم زبان میں بیان کیا، کیمیائی عملوں میں کام آنے والے پچیس آلات کی تشریح کی اور کیمیائی مادوں کو جمادات، نباتات اور حیوانات میں

تقسیم کر کے علم الکیمیا کی ترقی کی راہ ہموار کی۔

مسلمانوں نے ایک اہم کارنامہ یہ انجام دیا کہ انہوں نے کیمسٹری سے دواسازی کو فروغ دیا، ڈرپہر کا بیان ہے:

”عربوں نے نظری اور عملی طب پر کیمسٹری کے اطلاق کی ابتداء کی، انہوں نے

انسانی جسم کے وظیفے کی وضاحت اور بیماریوں کے علاج میں استعمال کیا“ (۱)

ایک ماہر طب کے بقول علم طب میں کیمیا کی بنیاد عربوں نے رکھی، چنانچہ عربوں نے پہلی مرتبہ، ترشح، تقطیر، تذویب اور تبلور کے طریقے بیان کئے اور بے شمار کیمیادوی مرکبات مثلاً نائٹرک ایسڈ، سلفیورک ایسڈ، نائٹروہائڈرکلورک ایسڈ، لائیکرایمونیام، مرکری کلورائیڈ، مرکری آکسائیڈ پوٹاشیم، فائٹریٹ، فرائی سلفاس وغیرہ بنائے، مختلف قسم کے کھار اور تیزاب تیار کئے، نیرالکحل سے طبی دنیا کو روشناس کرا دیا۔

خلاصہ بحث یہ کہ مسلمانوں نے کیمسٹری کے میدان میں جو خدمات انجام دیں ان

کا اجمال یہ ہے:

- ۱۔ تجربی تحقیق اور ریاضیاتی تجزیہ کو ملا کر جدید کیمسٹری کی بنیاد رکھی۔
- ۲۔ تجربی علموں کو رواج دیا یعنی ترشح، تبخیر، تقطیر، تکلیس، تصعید، تحلیل، تعفین، آکسائیڈیشن، تبلیر، تبید، تخمیر اور تشمیع“ سے دنیا کو روشناس کرایا۔
- ۳۔ تجربی علموں کے لئے آلات تیار کئے، ابوبکر رازی نے پچیس آلات کا ذکر کیا ہے، جو کیمیائی عملوں کے دوران استعمال ہوتے ہیں، مغربی زبانوں میں (alembic) اور (aludel) مسلمانوں ہی کی یادگاریں ہیں، جو بالترتیب عربی الفاظ ”الانبیق“ اور ”الاثال“ سے ماخوذ ہیں، ان کے علاوہ لاطینی زبان میں متعدد الفاظ موجود ہیں۔

۴۔ مسلمانوں نے کھار اور تیزاب کو الگ الگ کر کے ان میں فرق کیا انہوں نے نباتاتی اور معدنیاتی تیزاب تیار کئے۔

Arsenic sulphide, lead carbonate chloric acid, nitric acid antimonisulphde, silsic acid, antimony, phosphorus, mercury oxide, mercury chloride, sodium carbonate nitrate of silver, sulphuric acid, potaxxium nitrate.

جیسے مرکبات دریافت اور تیار کئے، انہوں نے تابنے اور سیسے کے مرکبات کے زہریلے اثرات اور ان بچے چوہے میں بال دور کرنے کی خاصیت کا پتہ لگایا۔

۵۔ مرکبات کو ادویہ میں استعمال کیا، سمیات کو حیات بخش ادویہ میں تبدیل کیا۔

۶۔ مسلمانوں نے سائنسی بنیادوں پر معدنیات کی درجہ بندی کی، سب سے پہلے

ابوبکر رازی نے کیمیائی مادوں کو جمادات اور حیوانات میں تقسیم کر کے نئی روایت قائم کی، معدنیات کو انہوں نے ارواح، اجسام، اجار تیزابات سہاگوں اور نمکیات میں بانٹ دیا، انہوں نے طیران پذیر (Volatite) اجسام اور غیر طیران پذیر ارواح میں فرق کیا، مؤخر الذکر میں انہوں نے گندھک، پارہ، سٹکھیا اور (salmiac) شامل کئے۔

۷۔ مسلمانوں نے ایسی چیزیں ایجاد کیں، جن سے صنعت و حرفت کو بے حد فروغ ملا، جابر بن حیان نے ایسا کاغذ ایجاد کیا جسے آگ نہیں جلا سکتی تھی، لوہے کے زنگ سے ایسی روشنائی تیار کی جس سے لکھے گئے شاہی فرامین رات کی تاریکی میں پڑھے جاسکتے تھے، نیز انہوں نے ایسے وارنش تیار کئے جس سے کپڑا بھگنے سے، لکڑی جلنے سے اور لوہا زنگ لگنے سے محفوظ رہتا تھا، جابر ہی نے ایسا پتھر ایجاد کیا جس سے زخموں کو خشک کرنے اور فاسد عضلات کو داغنے کا لیا جاتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے ماء الملوک جیسا طاقتور تیزاب دریافت کیا، جو سونے کو بھی پگھلا دیتا ہے۔



عربی کتابیں

- ✽ القرآن الکریم
- ✽ صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل البخاری
- ✽ صحیح مسلم، مسلم بن حجاج القشیری
- ✽ مسند أبی یعلیٰ، احمد بن علی
- ✽ المستدرک، ابو عبد اللہ حاکم النیشافوری
- ✽ شعب الإیمان، احمد بن حسن البیہقی
- ✽ طبقات ابن سعد، محمد بن سعد بن منیع
- ✽ کنز العمال، علی بن حسام الدین المتقی
- ✽ المعجم الکبیر للطبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد
- ✽ مرقاة المفاتیح، علی بن سلطان القاری
- ✽ کشف الخفاء، اسماعیل بن احمد الجراحی
- ✽ فیض القدر، عبد الرؤف المناوی
- ✽ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ
- ✽ لفقیة والمتفقه
- ✽ إحياء علوم الدین
- ✽ ماذا قدم المسلمون إلى العالم
- ✽ دار ابن کثیر بیروت
- ✽ دار احیاء التراث العربی
- ✽ دار المأمون للتراث، دمشق
- ✽ دار الکتب العلمیة، بیروت
- ✽ دار الکتب العلمیة، بیروت
- ✽ دار صادر، بیروت
- ✽ مؤسسة الرسالة، بیروت
- ✽ مكتبة الزهراء، موصل
- ✽ دار الکتب العلمیة، بیروت
- ✽ دار احیاء التراث العربی
- ✽ دار الکتب العلمیة
- ✽ دار الوفاء، بیروت
- ✽ دار ابن الجوزی السعودیة
- ✽ دار المعرفة، بیروت
- ✽ د-راغب السرجانی

جدید کیمسٹری کے ارتقاء میں مسلم سائنسدانوں کی ان تصنیفات کو بنیادی رول رہا ہے، جن کے ترجمے لاطینی زبان میں کئے گئے، لاطینی مغرب کے علماء عہد وسطی کے دوران، جن سائنسدانوں کی کتابوں کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے، ان میں خالد بن یزید اور جابر بن حیان سرفہرست ہیں، خالد بن یزید جنہیں (calid filius jezidi) کہا جاتا تھا، کی تحریریں عام تھیں، جابر بن حیان کی تحریروں کی مانگ زیادہ تھی، لاطینی ترجموں میں ابن وحشیہ کی کتابیں بھی شامل تھیں، ان ترجموں نے یورپ پر یونانیوں سے زیادہ اثرات ڈالے، جس سے کیمسٹری کے سائنس کو ترقی ملی۔

M.Ullmann لکھتے ہیں:

”یہ یونانیوں کی کتابیں نہیں؛ بلکہ یہی عربوں کی تصنیفات تھیں، جنہوں نے مغربی علم الکیمیاء کے لئے راستہ ہموار کیا، انہوں نے ایک ایسا طریقہ رائج کیا، جس نے آرنلڈ آف ولینوف، لاطینی جبر، پیرسیس کے توسط سے رابرٹ بونکے، جوزف بلیک، جوزف پریٹلے، انٹونین لارن لویز اور آخر میں جدید کیمسٹری تک رہنمائی کی، یہی نہیں عربوں کی ان کیمیائی تحریروں نے یورپ کی ثقافتی تاریخ کو بھی اہم محرکات فراہم کئے، جس کے لئے جیکب بوم کا نام لینا کافی ہوگا“ (۱)

یورپ والوں کے یہاں ایک عام وطیرہ ہے کہ کسی بھی سائنس کا سلسلہ نسب قدیم یا جدید یورپ کے کسی سائنسدان سے جوڑ دیتے ہیں، کیمسٹری کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس کے موجد فرانسیسی سائنسدان انٹونین لاوراں لوئی زیر ہیں، حالانکہ یورپ کے بعض علماء نے اس دعویٰ کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ لوئی زیر نے اپنی طرف سے کوئی چیز پیش نہیں کی ہے؛ بلکہ انہوں نے صرف دوسروں کی دریافتوں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

* موسوعة علماء العرب والمسلمين د- محمد فارس

* معجم علماء العرب د- کورکيس عود

* أخبار القضاة، ابوبکر محمد بن خلف الملقب بوبکيع المكتبة التجارية الكبرى ،

مصر

* عيون الأنباء في طبقات الأطباء، ابن أبي صبيعه دار مكتبة الحياة، بيروت

* تهذيب الكمال، عبد الرحمن المزى مؤسسة الرسالة، بيروت

* وفيات الأعيان، محمد بن أبي بكر خلکان دار صادر، بيروت

* شذرات الذهب، عبد الحى بن احمد العكرى دار ابن كثير، دمشق

* تهذيب التهذيب، ابن حجر العسقلانى دار الفكر، بيروت

* تاريخ دمشق، على بن الحسن بن العساكر

* الطرق الحكمية، ابو عبد الله شمس الدين المزى مطبعة المدنى، القاهرة

* البداية والنهاية، اسماعيل بن عمرو بن كثير مكتبة المعارف، بيروت

* تاريخ بغداد، ابوبكر الخطيب البغدادى دار الكتب العلمية، بيروت

* تذكرة الحفاظ، ابو عبد الله شمس الدين الذهبى دار الكتب العلمية، بيروت

* تهذيب الأسماء، للنووى دار الكتب العلمية، بيروت

* مناقب الإمام الأعظم، للموفق دائرة المعارف النظامية، حيدرآباد

* مناقب الإمام الأعظم، للكردرى دائرة المعارف النظامية، حيدرآباد

* معجم الأدباء، ابو عبد الله يعقوب الرومى دار الكتب العلمية، بيروت

* دور الجامعات الإسلامية المطلوب، ابو الحسن ندوى مجمع الإسلامى العلمى، ندوة العلماء

* تاريخ الخلفاء، علامہ جلال الدين السيوطى مطبعة السعادة، مصر-

* كتاب الأذكياء، لابن الجوزى مكتبة الغزالي

* حياة الصحابة، يوسف الكاندهلوى مؤسسة الرسالة، بيروت

اردو کتابیں

* معارف القرآن

حضرت مولانا مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ

* ایک قرآن

حضرت مولانا قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ

* اسلام اور سائنس

حضرت قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ

* دین و علم کا دائمی رشتہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* دین و علم کی خدمت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* انسانیت کے زوال کا سبب

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* خطبات مسلم پرسنل بورڈ

(مجلس تحقیقات و نشریات)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* خطبہ استقبالیہ دینی تعلیمی کنونشن منعقدہ لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* مسلمان غیر اسلامی ماحول میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* نسل نو کے ایمان و عقیدہ کی فکر کیجئے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* نظام تعلیم کی اہمیت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* مسلمانوں کا عروج و زوال

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

* مسلمان سائنسدانوں کی علمی خدمات

محمد ابراہیم عمادی

* ۱۰۰ عظیم مسلم سائنسدان

محمد ابراہیم عمادی، رفیق انجم

* سنہرے فیصلے

عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دار السلام)

* سنہرے حروف

عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دار السلام)

* سنہرے نقوش

عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دار السلام)

* سنہری کرنیں

عبدالمالک مجاہد (مکتبہ دار السلام)

* مسلمان فلسفی

میر ولی الدین

* ہمارا تعلیمی نظام

* اسلام اور جدت پسندی

* جہاد

* سیر الصحابہ

* تاریخ الطب

* سائنسی ترقی میں مسلمانوں کی خدمات

* اسلامی عدالت

* اطباء کے حیرت انگیز کارنامے

* سوانح شاہ عبدالقادر رائے پوری

* فتاویٰ رحیمیہ

* دینی و عصری تعلیم

* طب العرب

* ساحل

* ذاکر نانک، ایک تجزیہ، ایک تحقیق

* سب کے لئے مؤف ابن غوری

* پرانے چراغ، مولانا ابوالحسن ندویؒ

* عدل و انصاف کے حیرت انگیز واقعات

* علامہ اقبال کا نظریہ تعلیم، محمد حبیب الدین احمد

* اسلام کا نظریہ تعلیم پروفیسر خورشید احمد

* دنیائے اسلام میں سائنس و طب کا عروج

* ڈاکٹر حفیظ الرحمن صدیقی

* اسلام میں خدمت خلق

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ

حضرت مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ

شاہ معین الدین ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حکیم سید حسان نگرانی

حافظ زاہد علی، (اریب پبلیکیشنز)

حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

حکیم عبدالناصر فاروقی (ہمدردنگر، دہلی)

ابوالحسن الندوی رحمۃ اللہ علیہ (مکتبہ اسلام، لکھنؤ)

مفتی عبدالرحیم لاچپوری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا سید احمد و میض ندوی مدظلہ

ایڈورڈ جی، براؤن

(میگزین، پاکستان)

سمیع الحق (مکتبہ عمر فاروق، کراچی)

آئی جی پبلیشرز، حیدرآباد

مکتبہ فردوس، لکھنؤ

مدرسہ اصلاح البنات، گنٹور

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی

اریب پبلیکیشنز، نئی دہلی

حضرت مولانا جلال الدین عمری

* محاضرات تجارت، ڈاکٹر محمود احمد غازی

* قرون وسطی کے مسلمان سائنسدان

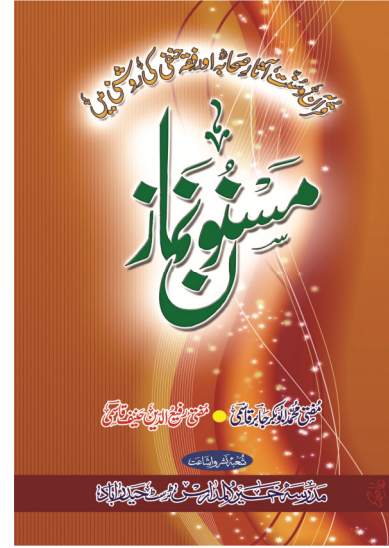
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی

اریب پبلیکیشنز، دہلی

غلام قادر لون



مسنون نماز

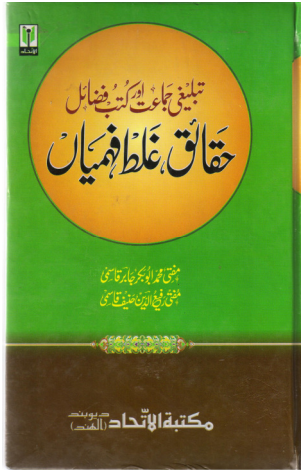


یہ کتاب قرآن و سنت اور فقہ حنفی کی روشنی میں لکھی گئی ہے، جس سے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ احناف کی نماز دلائل شرعیہ سے ثابت ہے، دیگر مسالک شافعی، مالکی اور حنبلی بھی اہل حق ہیں اور ان کے دلائل ان کی اپنی کتابوں میں موجود ہیں ان کی تردید یا تنقیص اس کتاب کا مقصود نہیں ہے (مرتب)

اس کتاب کے ذریعے انشاء اللہ احناف کے طریقہ نماز کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کر کے انتشار پھیلانے والوں کے شر سے نوجوانوں کو محفوظ رکھنے میں مدد ملے گی، اور خود غیر مقلدین کے لئے بھی یہ کتاب نہایت مفید ہوگی کہ بہت سی احادیث صحیحہ کو اب تک اصحاب الرائے کی آراء کہہ کر انکار حدیث کے جرم میں مبتلا ہو رہے تھے، اس سے خود کو بچا سکیں گے۔

(حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب مدظلہ، امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش)

تبلیغی جماعت اور کتب فضائل حقائق، غلط فہمیاں

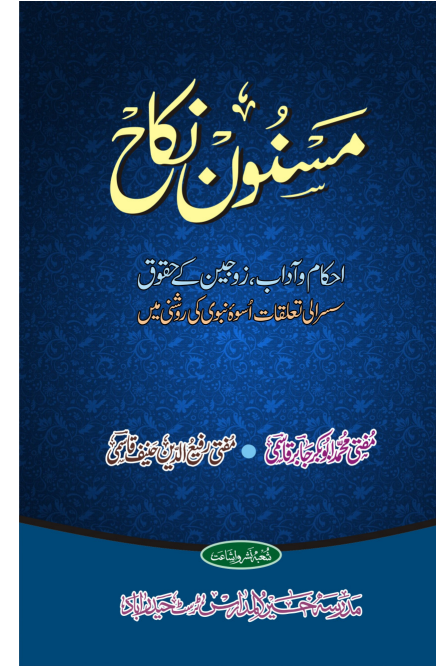


اپنے باتو فیق ناظرین سے التجاء ہے کہ خلو ذہن، سلامت فہم اور طلب صادق کے جذبہ کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کریں، دعوت کا کام صرف کتابوں سے پورا نہیں سمجھا جاسکتا، دعوت کی حقیقت، قرآن و حدیث، اسلاف امت کے عمیق علم، نہایت وسیع تجربات اور غیر معمولی احتیاط و حساس مصالح پر مبنی اصول کا سمجھنا بقدر عملی شرکت ہوگا، مجاہدہ کے بغیر حقائق کا ادراک مشکل ہے۔ (مرتب)

جماعت کے طریقہ کار میں معترضین کے جوابات میں مشغول ہونے کے بجائے اپنے کام میں مثبت طریقہ سے لگے رہنا ہے، پھر بھی بعض اہل علم نے اہتمام حجت کے لئے لکھا ہے، غیر متعصب اذہان کے لئے یہ کتاب باعث اطمینان اور غلط فہمیوں کے ازالہ میں معاون ثابت ہوگی، اہل علم سے خراج تحسین حاصل کرے گی، بڑی تعداد میں اہل علم و تبلیغ دونوں کو بالخصوص اور عموماً سب کو بھرپور استفادہ کرنا چاہئے۔

(حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب مدظلہ، امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش)

مسنون نکاح

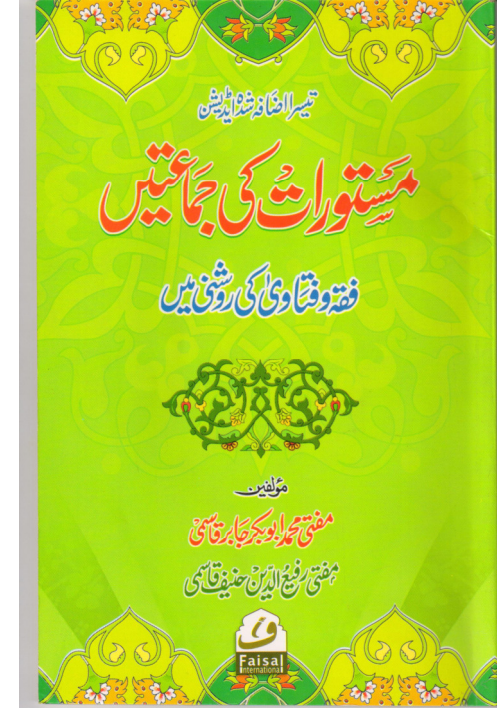


ہمارے صوبے کے مشہور واعظ، بزرگ عالم دین حضرت مولانا محمد حمید الدین عاقل صاحب حسامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: ایک خاتون نے مجھ سے آکر کہا: جب تک میں بہوتھی تو مجھے ساس بری لگتی تھی اور جب میں ساس بن گئی تو مجھے بہو بری لگنے لگتی ہے، حضرت نے جواب دیا: نہ ساس بری، نہ بہو، برائی تم میں تھی، جب تک تم بہو تھیں بڑوں کی ماننا، خدمت کے ذریعہ دل جیتنا، غصہ کو قابو کرنا اور ساس کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا تمہیں نہ آیا اور جب تم ساس بن گئیں تو وسعتِ ظرفی، چھوٹوں کو معاف کرنا، ان کی خوبیوں کو بتلا کر ان کی خامیوں پر پردہ ڈالنا، چھوٹوں کیلئے پیٹھ پیچھے دُعا کرنا نہ اپنایا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت والا کا یہ ملفوظ ہزاروں خاندانوں اور اس حساس رشتہ کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھتا ہے، معاشرت کا توازن، ادائیگی حقوق میں عدل، زندگی کے سرد گرم میں حسن اخلاق اور استقامت، ماں اور بیوی، باپ اور اولاد، بھائی اور سالے خود اپنے اور اللہ کے درمیان کے رشتہ میں اعتدال کا باقی رکھنا اور پھرنا ہموار طبعیتوں کو نبھانا، یہ سارے وہ مسائل ہیں، اگر علم دین نہ ہو اور حسن تدبیر کی دولت نہ ملی ہو، اور اللہ والوں کی صحبت سے بھی محروم ہو تو اچھے اچھوں کے قدم پھسل جاتے ہیں، بیوی کو ماں کے ساتھ رکھنا بھی ضروری نہیں، ماں باپ کی پیرانہ سالی بھی اور ماں، بیوی کی طرف سے آنے والے متنوع، متضاد تقاضوں میں آدمی شریعت پر بھی قائم رہے اور رشتے بھی جڑے رہیں، یہ بہت نازک کام ہوتا ہے، بیوی کا دیوروں سے پردہ بھی ہو، اور پس پردہ نامحرموں کی خدمت بھی ہو، اس کیلئے نہایت تجربہ کار اہل دل علماء اور اہل اللہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔



مستورات کی جماعتیں



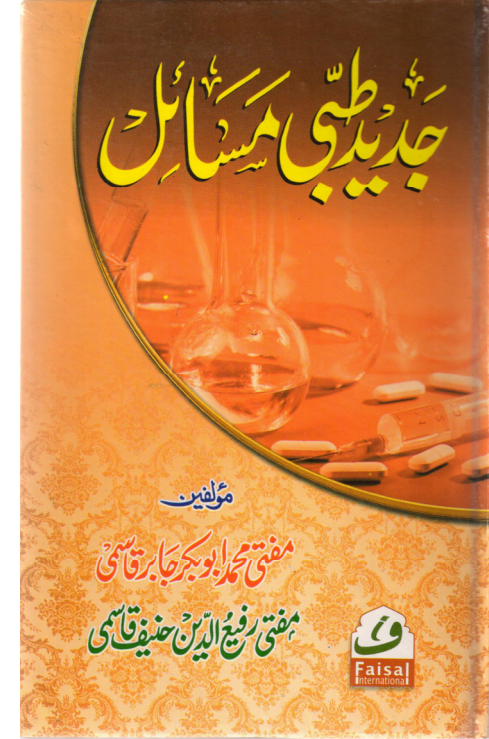
ہر زمانے میں شیطان نے عورت کے پھندے کو استعمال کیا اور اُسے آلہ کار بنا کر حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے باہر کر دیا، اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان عورتوں میں دین کے شعور کو بیدار کرنے کیلئے ان میں دین کی محنت کی جائے، ان میں سادگی و جفاکشی، فکرِ آخرت، دین کے مٹنے کا غم کی وہ روح پھونکی جائے کہ وہ نہ صرف حدودِ شرع میں رہ کر اس فریضہٴ احیاءِ دین کو لے کر کھڑی ہوں؛ بلکہ اپنے شوہر، اولاد اور بھائی وغیرہ کی بھی معاون بنی رہے، اس مقصد کے خاطر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے مستورات

کے کام کو بھی جاری کیا، اور کام کے دیگر جزئیات کی طرح مستورات کے اس طریقہ کار پر بھی زمانے کے اکابر سے مہر تصدیق و توثیق ثبت کروائی، آج کل بھی مستورات کے کام کے بے پناہ اچھے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں، مشرقی اور مغربی ممالک اور ریشیا وغیرہ جیسے الحاد زدہ علاقوں میں ان مستورات کی جماعتوں سے پردہ زندہ ہو رہا ہے، ارتداد زدہ دیہاتوں میں بہنیں دوبارہ اسلام میں داخل ہو رہی ہیں۔

مستورات کے کام کی کڑی شرطیں ہیں، جو مزاج شریعت کو سامنے رکھ کر طے کئے گئے ہیں، اور دن بہ دن اُس میں قیودات و التزامات کا اضافہ ہی کیا جا رہا ہے، ان اصولوں کے مذاکرے نکلنے سے پہلے، پھر نظام الدین میں، پھر جہاں اُن کا رُخ طے ہوا ہے اس جگہ بار بار کئے جاتے ہیں، بے اصولی نظر آنے پر پوری جماعت کو فوراً واپس کر دیا جاتا ہے، احقر کو پتہ چلا کہ ایک جگہ صرف دستانے نہ پہننے پر علاقہ والوں نے جماعت کو مرکز واپس کر دیا۔ ویسے یہ بات مسلم ہے کہ دین و دنیا کے جس شعبہ میں انسان کام کر رہے ہوں، اس میں کچھ نہ کچھ کوتاہیاں ہو ہی جاتی ہیں؛ لیکن الحمد للہ اہل اللہ کو اس پر اطمینان ہے کہ اس کام میں خیر غالب ہے۔

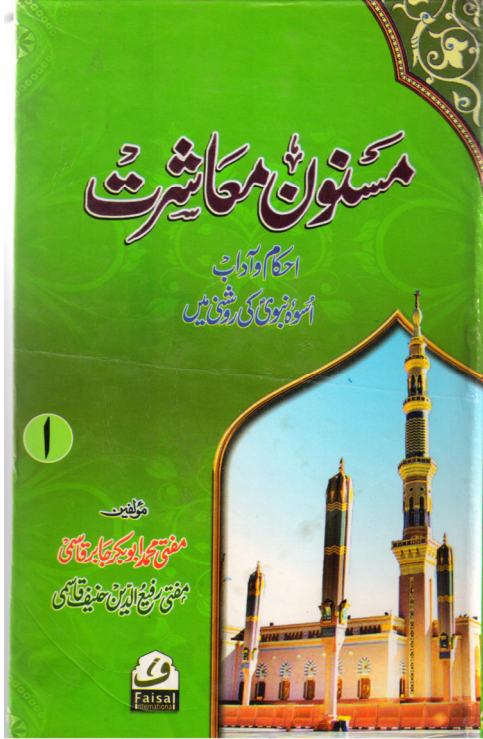


جدید طبی مسائل



صحاب افتاء، میڈیکل سائنس کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے گراں قدر تحفہ آپریشن کے جائز و ناجائز اقسام، فارمیسی و دوا سازی کے جائز و ناجائز پہلو، کمیشن کے حلال و حرام اقسام، مریضوں کو پیش آنے وضو، تیمم، نماز، روزہ، حج سے متعلق نئے مسائل، عربی اور اردو کا ممکنہ مواد سامنے رکھ کر ترتیب دیئے گئے، مفتی محمد طاہر صاحب صدر مفتی مظاہر العلوم کی مکمل نظر ثانی بھی ہوئی، عام فہم زبان، ہندو پاک کے اکابر کی آراء کو سامنے رکھا گیا، منفی و مثبت دلائل کے ساتھ نہایت مختصر و مدلل، اردو زبان میں اس عنوان پر اتنی جامع کتاب پہلی بار منظر عام پر آئی ہے۔

مسنون معاشرت (۲/جلد)



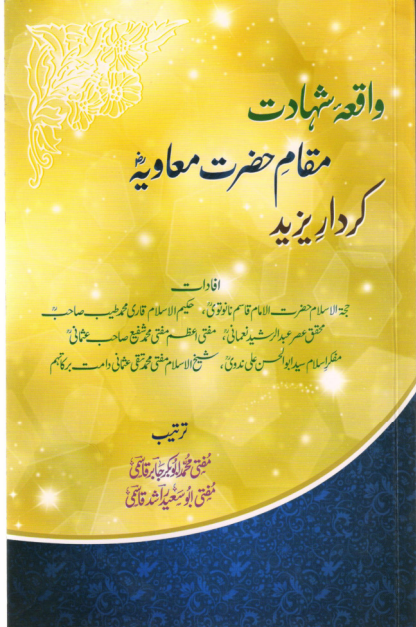
شریعت خداوندی کو عمل کے اعتبار سے دو خانوں میں بانٹنے کی یہ لعنت امت مسلمہ میں بھی در آئی ہے، چنانچہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ وہ ہے جس کی نگاہ میں دین صرف عقائد اور چند عبادات کا نام ہے اور دین کے باقی شعبوں کو اس نے عمل سے بالکل خارج کر دیا ہے، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات میں وہ خود کو دین کی پابندیوں سے آزاد خیال کرتا ہے، بہت سے وہ مسلمان جو نماز اور ذکر و تلاوت کے پابند سمجھے جاتے ہیں معاملات میں نہایت کھوٹے ہوتے ہیں اور ان کی اخلاقی سطح انتہائی نچلی ہوتی ہے، موجودہ دور کے مسلمانوں نے دین کے جن شعبوں پر سب سے زیادہ ظلم کیا ہے ان میں

سے ایک معاشرتی شعبہ ہے جب کہ دین اسلام میں معاشرتی معاملات کی درستی پر بے انتہا زور دیا ہے، بعض احادیث میں معاشرتی کوتاہیوں پر ایمان کی کی نفی کر دی گئی ہے، اسلام ایک مستحکم اور صالح معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے جس کے لئے اسلامی تعلیمات میں واضح ہدایات موجود ہیں، اسلام کی ٹھوس تعلیمات پر عمل آوری کے بغیر مسلم معاشروں کی اصلاح ممکن نہیں، اکابر علماء میں حضرت تھانویؒ کا امتیاز تھا کہ وہ معاشرت کی درستی پر بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے، حضرت کے خلفاء کا بھی یہی امتیاز ہے، اسلام کی معاشرتی تعلیمات کو مسلم معاشروں میں رواج دینے اور معاشرتی کوتاہیوں سے مسلم معاشروں کو پاک کرنے کے لئے ایسی کتاب کی شدید ضرورت تھی جس میں آسان اور عام فہم زبان میں جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام کی تمام معاشرتی تعلیمات بالتفصیل مدلل بیان کی جائیں، زیر نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل ہے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مفتی ابوبکر جابر قاسمی و مفتی رفیع الدین قاسمی زید مجدہما کو ان دونوں فاضل مفتیان کرام نے بڑی عرق ریزی اور بے پناہ جانفشانی کے ساتھ اسوہ حسنہ اور احادیث کے ذخیرہ کو چھان کر مسنون معاشرت کے نام سے نبوی معاشرت کا ایک ایسا گلدستہ پیش کر دیا ہے، جس میں معاشرتی زندگی کی اصلاح کا خواہشمند مسلمان باسانی اپنی مراد پاسکتا ہے، ویسے اسلامی معاشرت پر اردو میں کتابوں کی کمی نہیں ہے؛ لیکن زیر نظر کتاب موضوع کے احاطہ، حوالہ جات کے اہتمام، بعض عصری پہلوؤں کی شمولیت اور زبان و بیان کی سلاست کے اعتبار سے غیر معمولی انفرادیت رکھی ہے، کتاب کے مشتملات کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معاشرت سے متعلق تمام پہلوؤں کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے، یہ کتاب عوام و علماء دونوں کے لئے یکساں مفید ہے، ائمہ و خطباء کے لئے ایک پیش بہا تحفہ ہے، معاشرتی موضوعات پر سارا مواد اکٹھے فراہم ہو جاتا ہے، نیز اس کے مضامین اس قابل ہیں کہ روزانہ ان کا کچھ حصہ کسی نماز کے بعد پڑھ کر سنایا جائے۔

(مولانا سید احمد و میض ندوی، استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد)

واقعہ شہادت

مقام حضرت معاویہؓ، کردار یزید



تقریباً ہر عنوان پر ہمارے اکابر کی علمی تحقیقات بکثرت موجود ہیں، دن بہ دن ہمارا رشتہ ان کی کتابوں سے کمزور ہوتا جا رہا ہے، دوسری طرف ہر زمانے کی زبان و بیان کا انداز بدلتا رہتا ہے، موجودہ زمانے میں مثبت، علمی، سنجیدہ تحریروں کو آسانی سے قبول کر لیا جاتا ہے، احقر کا یہ خیال ہے کہ ہم اخلاف اپنے اسلاف کی تحریروں کو عصر حاضر کے لب و لہجہ میں جمع و ترتیب کا کام بھی کر دیں تو بہت بڑی سعادت ہے، واقعہ شہادت حسینؑ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقام اور یزید کی شخصیت اور اس سے متعلقہ تمام جزئیات پر اگلے اور پچھلے اکابر کی بہت جگہ کاوی، بے نفسی سے لکھی گئی اور ان سب سے بڑھ کر اہل سنت والجماعت کے مسلک سے سر مو انحراف کئے بغیر مبسوط تحریریں موجود ہیں جس میں کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔